BROWN BOOK

UNIVERSAL LIBRARY

هو المستعان

رجسٹرڈ نمبر اے ۳۰۰۵

الناظر

ایڈیٹر ـــــ ظفر الملک ـــــ علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۸/

جلد ۳۴ نمبر ۱

فہرست مضامین بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول بنایا جائے دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں، یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے اُنکو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کیجائیگی۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلاء نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے۔ چنانچہ پروفیسر انڈریڈ ڈی۔ایس سی۔پی۔ایچ ڈی؛ پروفیسر پرا سیدلش پروفیسر برلن یونیورسٹی، اور پروفیسر سر آرتھر کیتھ کے مضامین وصول ہو چکے ہیں، جنکے ترجمے اس رسالے میں شایع ہونگے۔ متعدد بلاک بھی ہونگے۔

رسالہ ماہ جنوری ۱۹۲۸ء میں شایع ہوگا۔ تقطیع بڑی رسالہ اُردو کی ہوگی $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$ سالانہ چندہ آٹھ روپیہ سکۂ انگریزی۔

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شایق اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔

المشتہر؛ انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد دکن

فسانۂ جوش۔ اُردو کے مشہور فسانہ نگار اور ظریف انشاپرداز مسٹر سلطان حیدر جوش کے اُن دلچسپ اور مؤثر فسانوں اور دلآویز و پُرکیف مضامین کا مجموعہ، جو وقتاً فوقتاً رسالہ الناظر میں شایع ہوئے۔ حجم ۲۰۰ صفحے۔ قیمت عہ

سفرنامۂ برہما۔ جسمیں برہما کی اخلاقی معاشرتی تجارتی تعلیمی سیاسی زندگی کو تفصیل تحریر کیا گیا ہے اور عہد موجودہ کے تمام چشم دید حالات و واقعات درج ہیں۔ مصنفہ مولانا سید ابوظفر ندوی پروفیسر مہاودیالے کالج۔ احمد آباد علا

المشتہر: منیجر الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱ جلد ۳۴

جنوری سنہ ۲۸ ۱۹ء

فارسی ڈراما

مضمون ذیل ایک فارسی ڈراما "وکلاے مرافعہ" کا مقدمہ ہے جو زیر طبع ہے

اب سے ایک صدی پیشتر فارسی ادبیات میں ڈراما (تمثیل) کا وجود نہ تھا۔ اگرچہ عشرہ محرم میں واقعات کربلا اسٹیج پر دکھانے کا دستور عرصے سے جاری ہے جسے ... "رسم تعزیہ" کہتے ہیں، مگر ہر سال ایک خاص جذبۂ انسانی (غم یا ہمدردی) کی برانگیختگی، ایک ہی اسلوب کلام، ایک ہی وضع ولباس، ایک سے سانگ، ایک ہی عبارت کی تکرار، مقررہ مقامات پر ماتم سرائی کی قیود نے اس رسم میں فرسودگی پیدا کر دی ہے۔ رسم تعزیہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے نہ قابل تغیر ہے نہ ترقی پذیر۔ اس لیے اسے ڈراما سے کوئی نسبت نہیں۔ ڈراما یا تمثیل مختلف جذبات غم، غصہ، خوشی، استعجاب، ہمدردی، جرات، غیرت کو حرکت میں لاتی، سوسائٹی کے مختلف طبقات، حالات ومدارج کو آنکھوں سے دکھاتی، مختلف ملکوں اور زمانوں کے خصوصیات، عادات واطوار کی تصویریں پیش نظر کرتی اور افراد واقوام کے اخلاق پر دیرپا اثر ڈالتی ہے۔ غرض یہ حیات شخصی وملی کے ہر پہلو کو محیط ہے اور دل ودماغ کے لیے ایک ایسی جولاں گاہ ہے جسکی حد وپایاں نہیں۔ اسی لیے یورپ میں جب سے یہ فن سرزمین وجود میں آیا ہے، اسکی ترقی تمدن کے تمام شعبوں کے دوش بدوش نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط سے جب ایران یورپ کی مداخلت سے متاثر ہونے لگا اور ایران کا شمالی حصہ قفقاز اور وہ علاقے جن کو روسی ترکستان کہتے تھے زار روس کے قلمرو میں داخل ہوگئے تو یہ قومیں مغربی تہذیب وتمدن سے آشنا ہوئیں۔ صدر مقام تفلس میں ۱۸۵۱ء میں ایک تھیٹر قائم کیا گیا، جس میں روسی حکام کی تفریح کے لیے روسی زبان میں یورپی ڈرامے کھیلے جاتے روسی زبان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں یہ اس قدر مقبول ہوئے کہ اپنی زبان میں اس دلچسپ صنفِ ادب کی آرزو پیدا ہو گئی۔

اسی جدید تعلیم یافتہ گروہ میں قراچہ داغ کا ایک نوجوان کپتان مرزا فتح علی آخونزادہ تھا۔ اس نے تھیٹر کے لیے اپنی زبان آذری ترکی میں جو فارسی اور ترکی سے مرکب ہے چھ تمثیلیں لکھیں:

(۱) مُلا ابراہیم خلیل کیمیاگر ۱۸۵۰ء میں
(۲) موسیو ژوردان یا حکیم نباتات ۱۸۵۰ء میں
(۳) خرس قولدورباسان ۱۸۵۱ء میں
(۴) وزیر خان سراب ۱۸۵۱ء میں
(۵) مردِ خسیس ۱۸۵۲ء میں
(۶) وکلائے مرافعہ ۱۸۵۵ء میں

انکے علاوہ ایک ناول "قصہ یوسف شاہ سراج" ۱۸۵۷ء میں لکھا اور ۱۸۵۹ء میں ان سب کو یکجا شایع کیا۔ اس مجموعہ کی ایک جلد مصنف نے شہزادہ جلال الدین مرزا پسر فتح علی شاہ قاچار کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھیجی کہ اسکو زبان فارسی میں منتقل کرا دیا جائے مگر شہزادے کو مدت تک اسکی طرف توجہ کا موقع نہ ملا

قراچہ داغ ہی کا ایک صاحب ذوق اہل قلم مرزا جعفر شہزادہ جلال الدین مرزا کے علمی دربار کی زینت تھا۔ اسکی گوہر شناس نظر اس مجموعہ پر پڑی تو اس نے اس کا فارسی ترجمہ شروع کر دیا۔ ۱۸۷۱ء میں مُلا ابراہیم خلیل کیمیاگر اور موسیو ژوردان کا فارسی ترجمہ تمام کر دیا۔ اس اثنا میں شہزادہ کی بے وقت وفات نے مرزا کو بے پناہ کر دیا۔ ایران کی فضا اور تھی۔ مغربی تہذیب وتمدن کا اس پر سایہ نہ تھا۔ اہل ایران مغربی تمثیل کے مزے سے نا آشنا تھے۔ نا رمناشی سے چونکہ سرپرستی و قدر دانی سے محروم رہ کر بھی یہ فدائے علم ہمت نہ ہارا۔ ۱۸۷۴ء تک مرزا فتح علی کی کُل آذری تمثیلات اور افسانے کا ترجمہ کر کے انکو طہران سے یکجا شایع کر دیا۔ گر اہل علم نے انکی طرف

کوئی توجہ نہ کی - یہ تمثیلیں نہ کسی تھیٹر میں کھیلی گئیں، نہ مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل کی گئیں - اس ناقدری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انکی زبان عام تکلمی روزمرہ اور سوقیانہ ہے، جسے پڑھنا پڑھانا اہل زبان عیب سمجھے۔ دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ ان میں عام دزدیوں، ملاؤں، نجومیوں کیمیا گروں کی ہجو اڑائی گئی ہے۔ عام اہل ایران کے دلوں میں انکی عظمت جاگزیں ہے - وہ اس تضحیک کی تاب نہ لا سکتے تھے - پولیس اور عدالت کے طرز عمل پر نکتہ چینیاں ہیں، جنکو شخصی حکومت گوارا نہ کرتی تھی - غرض مصنف و مترجم کے مقاصد میں سے نہ اصلاح معیشت کا مقصد حاصل ہوا، نہ تعلیم اطفال کا - البتہ ایک غرض پوری ہوئی - ایران حاضر کے روزمرہ اور جدید محاورات و مصطلحات زبان کی واقفیت حاصل کرکے اور ترکستان و ایران کے سرحدی قبائل کی معاشرت و تخئیل کے معلوم کرنے کے لیے غیراقوام نے انکو قدر کے ہاتھوں سے لیا اور شوق کی آنکھوں سے پڑھا خصوصاً فارسی حال کے سیکھنے میں بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ فرانس، جرمنی، انگلستان میں انکی اشاعت ہوئی، ترجمے کیے گئے، فرہنگیں مرتب ہوئیں - ہندوستان میں اب تک تین تمثیلیں مع حل لغات و مقدمہ شایع ہو چکی ہیں - مرد خسیس اور حکیم نباتات لاہور[۵۱] سے اور تیسری تمثیل وکلاے مرافعہ ٹینہ سے، جس کا مقدمہ یہ مضمون ہے۔

مرزا جعفر ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ خاتم الشعرا قاآنی ۱۸۵۴ء میں رحلت کر چکا تھا - مرزا جعفر کی موت پر ایران میں انیسویں صدی کی حرکات ذہنیہ کا خاتمہ ہو گیا - گر بیسویں صدی کے آغاز نے ایران کی علمی جد و جہد میں ایک نیا باب کھول دیا۔ ۱۹۰۶ء کے انقلاب مشروطی سے ایران ہر شعبۂ زندگی میں بیداری کے آثار ظاہر کرنے لگا ہے - اس عرصے میں اصلاح ملکی و معاشرتی پر متعدد کتابیں اور مضامین نظم و نثر میں شایع ہوے - ان میں چند تمثیلیں بھی نظر آتی ہیں - مثلاً شہزادہ ملکم خاں نظام الدولہ متوفی ۱۹۰۸ء کی تین تمثیلیں، کچھ شیکسپیر کے ترجمے بعض مشاہیر تاریخ پر طبعزاد تمثیلیں فارسی حال میں موجود ہیں - اگرچہ اب بھی اس صنف سخن کو قبول عام حاصل نہیں -

مغربی ڈراموں کے مقابلے میں قراجہ داغی کی مذکورہ چھ تمثیلات کوئی بلند رتبہ نہیں رکھتیں۔ قصہ کا دروبست (پلاٹ) عموماً سست اور بودا ہوتا ہے - عشق و محبت کی واردات مجمل، ناقص اور کسی قدر خشک ہوتی ہیں - اصل افسانہ کے پہلو بہ پہلو کوئی ضمنی حکایت نہیں ہوتی - شاعری موسیقی

---

[۵۱] یہ دونوں تمثیلیں ہمارے کرم فرما پروفیسر قاضی فضل حق ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور نے نہایت قابلیت اور محنت سے مرتب کرکے شایع کی ہیں - مسلم

ناپید ہے۔ خاتمہ حیرت انگیز نہیں ہوتا اس لیے مسرت انگیز بھی نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک بھی تمثیلِ مسببت (ٹریجڈی) نہیں، سبھی تمثیل بہجت (کومیڈی) ہیں۔ حالانکہ ایرانیوں کو بیانِ مسیبت میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی جس سے ٹریجڈی اور تمثیل (ایکٹ کرنے) دونوں میں اعلیٰ کامیابی کی توقع کی جاتی تھی۔

مگر ان فروگذاشتوں کے باوجود نقشِ اول کی حیثیت سے یہ نہایت مغتنم اور قابل قدر ہیں۔ زبان سیدھی سادی، روزمرہ، ہر تکلف اور تصنع سے پاک۔ ان میں ایک خاص صفت جو سب سے زیادہ ممتاز نظر آتی ہے، وہ ظرافت ہے شستہ ولطیف۔ اس میں باوقار طنز اور ملیح ہجو کی وہ پُر لطف چاشنی پائی جاتی ہے جو ایران کی قومی خصوصیت ہے۔ جدید فارسی شاعری میں وہ فراوانیِ تخیل، قدرتِ بیان، جدت طرازی اور موسیقیت موجود ہے کہ ان زیوروں سے آراستگی کے بعد فارسی تمثیل میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کی گنجایش معلوم ہوتی ہے۔

ذیل میں ایک فرانسیسی تمثیل نویس مولیر کی ایک تمثیل کے فارسی ترجمہ "گزارشِ مردم گریز" کا ایک منظر ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ تمثیل ۱۸۶۹ء میں قسطنطنیہ سے شایع ہوئی تھی، اور تمثیل منظوم کی کوشش کا نمونہ ہے۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت بھی پیش کرتی ہے کہ نظمِ مغربی کو مشرقی مذاقِ سخن قبول میں کوتاہ صنفِ مثنوی میں خاصی روانی اور برجستگی پیدا کی جا سکتی ہے:۔

مونس۔ (بہ پیش فراش سر رود) .... چہ ہست فرایش؟

بیا بہ نیم

فراش۔ دارم دو حرف! سرکار

مونس۔ تو آں دو حرف خوبت را کنی بلند اظہار

فراش۔ رئیس دیوان آں را بندہ ام فراش
مرا بدست بداد دست حکم حاضر باش
تو ....

مونس۔ بکہ؟ بمن؟

فراش۔ آرے بتو

مونس برائے چہ کار

فراش۔ بحرفِ مغنت امید ی د حضرتِ سرکار

حقیقہ (بناصح) چہ سال؟

ناصح۔ امیدی داد گشتہ اند دست و بغل
چند شعر کہ گذاشت ست وقع و محل
کنوں ز پیش بخواہند بہت دادہ کار

مونس۔ من ورد اہتہ ہرگز نمی کنم اقرار

ناصح۔ ولایت حکم چنیں رفتہ ایں سبب از جا

مونس۔ بیان! چہ بخواہند داد صلح و صفا
بجاہاے بزرگاں مگر بود تنسیق
کہ شعرہاے بد مرد ال کنی تصدیق
از انچہ گفتہ ام انکار نیست زاں مرجع
براست ہر چہ بخواہی

ناصح۔ ولایت مضمون نو

مونس۔ نمی تواں گذرم شعرہاے و پیچ است

ناصح۔ قبول راے تو خواہند و جاے خواہش ہست
برو تو

مونس۔ می روم اما نمی تواں ابدا
ز راے خویش بگردم

ناصح۔ برو تو، خود بنما

مونس۔ اگر بحکم شہی خاص گردد منسوب
کہ شعرہاے ستیزیدہ یافت باید خوب
وگرنہ فاش بگویم کہ شعرہاش براند
بباید ایں کہ چنیں شاعراں بدار کشند

(بہ نعماں بیگ و نعیم بیگ ہیں کہ وید می خندند)

حقیقۃ کہ چنیں سخرہ ہم نبود گماں
کہ بودہ باشم و مستہم نشاں

ناصح - روان شوہان

فتینہ - کجا شما را باید ......

مونس روم ولے در روم

بیائیم ایں جا تا کش کش برم از ہم[41]

ہندوستان کے سنجیدہ اہل قلم کی طرح ایران کے متین و موقر ادبا بھی اس صنفِ سخن کو علمی وقار و تمکنت کے خلاف سمجھتے ہیں - اس کا نتیجہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے حق میں ایک ہی ہوا - فن تمثیل یا ڈراما ذلیل اور پست حالت سے کچھ زیادہ اُبھر نہ سکا -

محمد مسلم - ایم اے - ایم او ایل
از ہزاری باغ

لہ یہ تمثیل پروفیسر براؤن مرحوم کے کتبخانہ میں موجود ہے - اب نایاب ہے - یہ حصہ پروفیسر کی تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم سے منقول ہے - مصنف کا نام پروفیسر کے نسخے پر درج نہیں -

غزل

گُل بھی ہے میری قبر پہ شمع مزار بھی
دہ دیکھکر ہنسے بھی ہوے اشکبار بھی

عاشق بھی دخترِ رز کے ہیں اُمیدوار بھی
میخانے میں ہیں رند بھی پرہیزگار بھی

شوقِ وصال بھی ہے غم کوے یار بھی
ہم بھی اُدھر چلے ہیں دلِ بیقرار بھی

انداز اپنے غنچۂ دل کا وہی رہا
گزرے خزاں کے دن ہوئی رخصت بہار بھی

جن نامیوں کا نام تھا سارے جہان میں
باقی نہیں اب اُن کا نشان مزار بھی

آئینہ رکھکے سامنے زلفیں بھی تم بناؤ
اور اپنے باغِ حسن کی لوٹو بہار بھی

جو ہے وہ معتقد مرے پیر مغاں کا ہے
صحبت میں بادہ کش بھی ہیں پرہیزگار بھی

موسیٰ نے ہوش کھوئے تری جلوہ گاہ میں
دیکھا بھی مصطفےٰ نے رہے ہوشیار بھی

ہستیِ بے ثبات پہ ہنستے ہیں راہ میں
نقشِ قدم بھی دہر کے نقش و نگار بھی

صیاد ہم قفس میں نہ ہوتے اگر اسیر
رنگِ چمن بھی دیکھتے لطفِ بہار بھی

پوچھا کیے وہ شمع سے کچھ میری قبر پہ
پڑھتے رہے نوشتۂ لوحِ مزار بھی

بیٹھے ہیں رکھکے ہاتھ کلیجے پہ ہم جگر
دل کے ساتھ لیگئے صبر و قرار بھی

حکیم جگر صدیقی بسوانی

اخلاق وتصوف کی رباعیاں

(حضرت شفق رضوی عماد پوری کے مجموعۂ دلِ صد پارہ کا ایک غیر مطبوعہ ٹکڑا)

طلب مولیٰ

دُنیا مانگوں کہ تجھ سے عقبیٰ مانگوں   کوثر مانگوں کہ خُلد و طوبیٰ مانگوں
سب کچھ تیرا، تجھی سے سب کچھ مولا   میں تجھ سے ترے سوا بتا کیا مانگوں

طلب مغفرت

زاہد ہیں، کہ ہم صلے میں جنت مانگیں   مزدور نہیں کہ مُزدِ طاعت مانگیں
آمرزشِ عصیاں ہو، بقدرِ رحمت   مانگیں تو باندازۂ ہمت مانگیں

توبہ وندامت

پڑھ کر کلمہ تائبِ عصیاں ہولوں   شرمندۂ غفلت ہوں پشیماں ہولوں
کہتا ہوں اجل سے کہ ذرا صبر تو کر   مرنا ہی ہے آخر تو مسلماں ہولوں

گریۂ آخرت

ہے دانۂ اشک سبز ہونے کے لیے   نیکی کا تخم دل میں بونے کے لیے
سینچا کرو اِن سے آخرت کی کھیتی   آنکھیں پیدا ہوئی ہیں رونے کے لیے

مُزدِ طاعت

لذت دنیا کی جب نہ قسمت میں ملی   راحت عقبیٰ کی مُزدِ طاعت میں ملی
طاعت میں ہوس کو کر لیا ہے شامل   جنت بھی تجھے ملی تو اُجرت میں ملی

گوش وچشم وقلب وزباں

سننے کو بُرا بھلا ملے ہیں دو کان   دو آنکھوں سے نیک بد کو دیکھ او ناداں
مان ایک کو ایک بات ایمان کی بول   سینے میں دل ایک مُنہ میں ہے ایک زباں

رضائے معبود

جس بندہ سے ہو وہ بندہ پرور راضی   دنیا کے ہوں بندے اُس سے کیونکر راضی
ہوں ایک غلام کے اگر دو آقا   دونوں کو وہ رکھ سکے گا کیونکر راضی

تسبیح ریائی

طاعت میں ریا فریبِ شیطانی ہے — بیفائدہ شغلِ سبحہ گردانی ہے
ناداں نہ بن تو ہو کے دانا زاہد — گننا دانوں کا صرف نادانی ہے

سجدۂ ریائی

اسلام کا ننگ وہ مسلمانی ہے — جس سے بیگانہ ذوقِ ایمانی ہے
دل ہی میں نہ ہو جو نورِ ایماں زاہد — سجدہ ترا صاف داغِ پیشانی ہے

تنبیہ غفلت

غفلت لیے تجھکو جابجا پھرتی ہے — غافل تری گھات میں قضا پھرتی ہے
دانا ہے تو گردشِ فلک سے ہشیار — ناداں ترے سر پہ آسیا پھرتی ہے

وزن تواضع

زیور ہے تواضع کے اگر ہو عاری — زردار کو زر سے نہ ملے سرداری
تو عقل کی میزاں میں ذرا تول کے دیکھ — جھکتا ہے جو ہو وزن میں پلّہ بھاری

تونگر بے ہنر

ایسا ہی ہے بے ہنر تونگر خالی — جیسے ہو نگیں سے خاتمِ زر خالی
شکلِ طبل تہی ہے ناداں منعم — باہر سے ہے پوست اور اندر خالی

خالی ظرف تہی مایہ

گل سے ہے چمن، چمن سے صحرا خالی — گوہر سے صدف، صدف سے دریا خالی
ہے گنبدِ آسماں تہی مایہ شفیق — اتنا بڑا ظرف اور ایسا خالی

خمیر خاکساری

انسان میں کچھ نہیں جو ادراک نہیں — بیکار بشر ہے شر سے جب پاک نہیں
طینت کا خمیر خاکساری ہے شفیق — جو خاک نہیں وہ آدمی خاک نہیں

دلیل انکساری

ملتی ہے تیر سے کماں بھی جھک کر — دبتے ہیں پیر سے جواں بھی جھک کر
دیکھی ہے یہ سب سے انکساری کی دلیل — چلتا ہے زمیں پہ آسماں بھی جھک کر

"ہندوستاں ہمارا"

ہندوستان محض ہمارا ہے - یا - محض آپ کا ؟ —— ہمارا اور آپ کا مشترکہ ہے ؟ ——
یا - (اور یہ ہی زیادہ قرینِ قیاس ہے) نہ ہمارا ہے نہ آپ کا، بلکہ کسی اور کا ہے ؟ —— اِن سوالات کا جواب اگر پیچیدہ نہ ہوتا تو "ہندوستاں ہمارا" کے مصنف کو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر "سارا جہاں ہمارا" کی کینچلی نہ بدلنی پڑتی - میں اُس سرزمین کی مردم خیز آب و ہوا کا یقیناً قائل ہوں جہاں "ہندوستاں ہمارا" - اور "سارا جہاں ہمارا" کی سرخیوں سے مشہور ہونیوالی نظموں نے جنم لیا، میں کیا ؟ - کوئی ذی فہم اس خطۂ آبدار کی مردم خیزی سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا - یہ ناممکن ہے کہ "امرت دھارا" سے "آبِ حیات" تک - اور "خضاب لاجواب" سے "مردمی کے کیپسول" تک، جس قدر گوناگوں ایجادات و اختراعات اِس صوبے سے وجود میں آئی ہیں اُن کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے - مگر اس اقبالِ خوش اعتقادی کے باوجود سوالات مذکورہ کا جواب غالباً اُس سرزمین پر بھی ابھی تک عنقا ہی ماننا پڑتا ہے - میرا خیال ہے کہ اِن کا شافی جواب، پنجاب تو درکنار، ہفت اقلیم نہیں دے سکتی ؛ غالباً ایک درجن لالہ جی اور کوڑی بھر مالویہ نہیں دے سکتے، یک سینکڑہ عبدالرحیم اور ایک ہزار جناح نہیں دے سکتے -

ان سوالات کا جواب نہ دے سکنے کی وجہ سوالات کی اہمیت ہو یا نہ ہو، مگر جواب دینے والوں کا ناقابلِ اعتماد "گرگٹ پن" ضرور ہے -

+ + + + + + + + +

ہمارا مستقبل ہمیشہ ہمارے سر پر منڈلایا کرتا ہے - یا - پسِ پشت سیٹی بجاتا معلوم ہوتا ہے - ایک بچہ کہانی سننے میں محو ہو کر "ہنستا درخت اور بولتی چڑیا" - "سبز پری اور گلفام" - غرض ہر دلکش چیز اپنے پسِ پشت موجود تصور کر لیتا ہے، اور یہ ہی وجہ ہے کہ بعض اوقات "تنہائی یا اندھیرے میں" کالے دیو - یا بھوت پلید" کے قرب کا احساس اُسے دفعتاً چیخ اُٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے - اس سے مترشح ہوتا ہے کہ پسندیدہ مستقبل کو اپنے پسِ پشت سمجھنے کا انسان فطرتاً عادی ہے -
پرستان کو دیکھنے کے لیے ایک بچہ دفعتاً اپنی پیٹھ کی طرف مڑتا ہے، مگر وہ پرستانِ خیالی بھی اُس بچے کے ساتھ ساتھ اس کے پسِ پشت بھاگ جاتا ہے —— نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ چکر کھا یا

کرتا ہے اور پرستان ہمیشہ اُس کے پسِ پُشت ہی رہتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اپنی خواہشِ دِلی سے دوچار ہونے کی غرض سے، جس کو وہ پسِ پُشت موجود سمجھتا ہے، مسلسل پُشت کی طرف مُڑنے - یا - لٹو کی طرح چکر کھانے میں مصروف ہے۔ ممکن ہے کہ خود کرۂ ارض کی محوری گردش کا راز بھی تلاشِ مقصد پر مبنی ہو۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

سائنس اپنے مقاصد و متعلقات کے بُعد پر نازاں ہے اور شاعری و مذہب قربِ مقصد کا اعلان کرتے ہیں۔

سائنس کو ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ کی مسافت، ایک حالت سے دوسری حالت کا عرصہ، ایک شے سے دوسری شے کا بُعد، نہایت لمبے اعداد میں بیان کرنے میں عظمت نظر آتی ہے۔ شاعری و مذہب کو اس میں لطف آتا ہے کہ قیامت کو فردا کا قُرب حاصل ہو اور کراماً کاتبین ہر متنفس کے کندھوں پر سوار ہوں۔ سائنس اور شاعری کے باہمی تناقضات کا فیصلہ کسی صورت سے ممکن ہو یا نہ ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ عقل کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔

بذاتِ خود، مجھ کو اسی نظریہ میں لطف آتا ہے کہ میرا مقصدِ حیات میری شہ رگ سے بھی قریب تر ہو۔ اگر میں اُس کو سات سمندر پار تصور کرنے کی کوشش کروں تو تمام زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

قربِ مستقبل کے نظریہ میں سب سے بڑی نزاکت ... جو سائنس کی عینک سے حماقت ہو- سکتی ہے کہ فاقہ مست کو بھی کل صبح جاگنے پر "بیک گردشِ چرخِ نیلوفری" مسٹر ہنری فورڈ بن جانے کی اُمید ہو سکتی ہے؛ ایک نابینا کو بھی کسی پُراسرار ہستی کی پھونک سے آنکھوں کے گوہرِ شب چراغ ہو جانے کی ڈھارس ہو سکتی ہے! اور ایک مبتلائے خمارِ آلام کو بھی یقین آ سکتا ہے کہ ساقی کے زیرِ فیض وہ میخانہ سے یہ پڑھتا ہوا برآمد ہوگا کہ:—

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو عالم بدل گیا!!

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ان معتقدات کے زیرِ سایہ، اس کا قطعی امکان ہے کہ میں آج صبح کی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہوں اور شام کو ریل ٹھہرنے پر معلوم ہو کہ پشاور آ گیا — یا — میں شام کو ٹہلتا ہوا [illegible] کلب کی طرف چلوں اور

دو ایک موڑ کے بعد اپنے آپ کو ٹمبکٹو میں پاؤں؛ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے اتفاقات کے واقعی پیش آجانے پر مجھے ہرگز حیرت نہیں ہو سکتی - اور غالباً نہیں ہوگی - میرے معتقدات کو اگر صدمۂ عظیم پہونچ سکتا ہے اور ناقابلِ بیان حیرت ہو سکتی ہے تو کسی ایسے واقعۂ عجیب سے کہ میں لاہور کی ٹھنڈی ٹھنڈی سڑکوں پر چہل قدمی کے لیے نکلوں اور دائیں بائیں مڑتا ہوا، ایک آدھ چکّر کے بعد، اپنے آپ کو فی الحقیقت ہندوستان میں پاؤں!!

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے مستقبلِ مفروضہ کے قُرب میں لطف پاتا ہوں مگر احوال اذہی کے بُعد میں۔

* * * * * * * * *

اس اجمال کی تفصیل میں ایک واقعہ کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں۔

ایک دن، صبح کے وقت، میں شکار کی غرض سے باہر جانے کی تیاری میں مصروف تھا کہ ایک بے تکلف عنایت فرما، مرگِ مفاجات کی طرح نازل ہوئے۔ اس سے پیشتر کہ میں اُن کی شانِ نزول معلوم کر سکتا، اُنھوں نے اپنے سوالات کی چاند ماری سے مجھے مغلوب کر لیا۔ کم و بیش ایک درجن سوالات کے بعد اُنھوں نے پوچھا: "کس طرف کا ارادہ ہے؟"

"اپنے گھر کا" - میں نے جواب دیا۔

"میں اِس جملے کی شوخی سمجھنے سے قاصر ہوں"

"اس میں کوئی شوخی نہیں —— محض اصلیت ہے" میں نے کہا۔

"یعنی؟"

"یعنی —— میں ایک روز گھڑیال کے شکار میں تند واری کے قریب صرف کروں گا، دو روز گڈریہ کے جنگل میں گلدار کی خاطر گذاروں گا اور چوتھے روز گھر واپس آؤں گا" میں نے جواب دیا۔

"اب آپ کا پہلا جواب صحیح سمجھا جائے یا غلط؟" اُنھوں نے پھر کہا۔

"قطعی صحیح!" میں نے جواب دیا "آپ اگر لکھنؤ جانے کے ارادہ سے سفر اختیار کر رہے ہوں تو دریافت کیے جانے پر صرف لکھنؤ کا نام لیں گے، درمیانی مقامات کے لیے بعد دیگرے گنانے کی آپ سے اُمید نہیں کی جا سکتی۔ میرا سفر گھر پر ختم ہوتا ہے اس لیے میرا ارادہ گھر کا ہے"۔

"مگر منشائے سفر تو شکار ہے جو گھر سے باہر ہوگا؟" اُنھوں نے پھر اعتراض کیا۔

"مجھے اوّل تو منشائے سفر میں بھی اختلاف ہے، دوسرے منشائے سفر کو مقام سفر بیان کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ عارضی طور پر گھر چھوڑنے کی اصلی غرض شکار نہیں ہے بلکہ دراصل گھر کی زندگی میں ازسرِ نو دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ گھر میں رہتے رہتے گھر کی زندگی کا لطف زائل ہو جاتا ہے۔ اب چند روز گھر سے باہر رہتے ہیں، واپسی پر، گھر کا لطف بڑھ جائے گا۔ شکار اور جنگل کے فوائد مقصدِ سفر نہیں، بلکہ۔ وحشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ۔ منشائے نقل و حرکت ہے۔"

مجھے احتمال قوی ہے کہ وہ میرا مطلب سمجھ سکے یا نہیں، مگر میں اپنی بندوق اٹھا کر ان سے رخصت ہو گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

خدانخواستہ اگر آپ گھر والوں پر، یا آپ پر گھر والے، بار ہونے لگیں تو سب سے سہل نسخہ تبدیلِ مقام ہے ـــ وقتاً اور بلا اطلاع و اظہارِ ارادہ، برائے چندے، مفقودالخبر ہو جانا گوارا کیجیے، واپسی پر گھر والے آپ کے لیے اور آپ گھر والوں کے لیے مجموعۂ لطف و انبساط بن جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی دلکشی کا راز بُعد میں مضمر ہے۔ کشتی کی قدر اسی وقت نظر آتی ہے جب امواج کا شکار بننے پر کشتی سے بُعد ہو جائے؛ عبادت خانہ کی عظمت اسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ دَر میخانہ پر لاکوب ساقی کے زیرِ عشق رہ کر ایک مدت عبادت خانہ سے بعید رہ جائے؛ راست بازی کی وقعت اسی رنگ سے ذہن نشین ہو سکتی ہے کہ عرصۂ دراز تک دروغ گوئی شعارِ حیات بنالی جائے؛ حکومت کا صحیح احساس اسی صورت سے پیدا ہو سکتا ہے کہ صدیوں تک غلامی کی زندگی بسر کی جائے!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہزاروں مادی اشیاء سے آپ کو اپنی زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے اور انکی ظاہری و باطنی صفات آپ کی توجہ کا دامن پکڑا کرتی ہیں، لیکن دلچسپی۔ یا قیامِ توجہ ۔ ان ہی اشیاء سے پیدا ہوتی ہے جو ہر وقت آپ کے پس و پیش نہ منڈلایا کریں۔

مہوبہ کے باشندہ کو مہوبہ کے پان اسقدر لذیذ نہیں معلوم ہو سکتے جسقدر دلی والے کو معلوم ہوتے ہیں؛ کالنجر کا رہنے والا کالنجر کے قلعہ اور پہاڑیوں میں وہ عظمت نہیں پاتا جو ایک سیاح کی آنکھ کو نظر آتی ہے؛ ہندوستانی کو ہندوستان کی اندرونی خوبیوں کا علم اس حد تک نہیں

ہو سکتا جس حد تک ایک غیر ملکی کو ہوگا ــــ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ــــ ہندوستان میں رہنے بسنے والے کو، سرے سے، ہندوستان کے وجود ہی کا احساس باقی نہیں رہتا۔

البتہ ــــ بمبئی سے رخصت ہوتے ہوئے، جہاز پر سے ساحل ہند کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مشاہدہ کرنے سے ہندوستان کے احساس وجود کا آغاز ہو سکتا ہے یا ہر سوئیز سے گذرتے ہوئے روشنیوں کا دلکش نظارہ دیکھ کر، ڈفرن برج دہلی پہ کھڑے ہونے سے دکھائی دینے والی رنگ برنگی ریلوے کی روشنیاں اور بجلی کے ہنڈے یاد آسکتے ہیں: لندن کی تہ بہ تہ آبادی اور کہر اور دھوئیں سے بھرا ہوا آسمان ہندوستان کی تاروں بھری رات اور کھلی ہوئی فضا پیش نظر کر سکتا ہے ــــ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہندوستان سے بُعد ہو جائے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ لاہور کی سڑکوں پر چہل قدمی کرنے سے اگر مجھ میں ہندوستان کے وجود کا احساس دفعتاً پیدا ہو جائے تو کس قدر حیرت انگیز ہوگا؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہندوستان کی اندرونی حالت ایک ایسا راز ہے جو کم از کم ہندوستانی آنکھوں سے نظر آنا ناممکن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس راز کو آج تک کوئی کما حقہٗ معلوم ہی نہیں کر سکا ــــ ہندوستانی تو درکنار یورپین بھی اندھے ہی رہے ــــ اس کے صحیح انکشاف کا سہرا امریکہ کے سر رہنے والا تھا جو مس میو کے واقعات نگار قلم نے پہلی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ اس ہندی کی چندی نکالنے کی قابلیت پیدا ہونے کا معجزہ صرف اس حقیقت پر مبنی ہے کہ امریکہ کو ہندوستان سے بُعدِ بعید حاصل ہے اور مس میو کی ذاتِ والاصفات کو ہندوستانیوں سے ــــ بہ استثنائے چند نوجوان نفوس کے ــــ کوئی قرب میسر نہیں۔

مس میو کی نگاہِ دُوربیں، ہندوستان کے افرادِ مذکر کے ۲۵ برس سے ۳۵ برس تک کی عمر والے جوانوں کا جائزہ لینے میں، دس میں سے آٹھ کو نامرد پاتی ہے ــــ اور ــــ ایک ۸ برس کی ہندوستانی لڑکی کا اپنی ماں سے صرف گھنٹہ بھر کے لیے جدا ہو جانا اس کی عصمت دری کا مقدمۂ مُبَرم سمجھتی ہے۔

مجھ کو اپنے ذاتی علم کی بنا پر ان خیالات سے قطعی اختلاف ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ مجھے ہندوستان سے اس قدر بعد نصیب نہیں ہے جو مس میو جیسی دلچسپی آمیز نظر پیدا کر سکے۔ نوجوانانِ ہند کے دس میں سے آٹھ افراد کی نامردی، ایک ایسی واقعیت ہے جس سے کسی ہندوستانی کو نفیاً اسے موجودہ میں اختلاف کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ

کے متعلق ہندوستانی گفتگو صفت بیوی کی شہادت، جس کی تعریفِ مردمی محض اپنے ٹوٹے پھوٹے شوہر کے تجربہ پر مبنی ہوتی ہے، مطلق وقیع نہیں سمجھی جا سکتی۔ ایسے مسئلہ کے لیے اُس آزاد ہستی کی تعریفِ مردمی قولِ فیصل ہو سکتی ہے جسکے تجربات و مشاہدات کافی طور پر وسیع ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اِس ہندوستانی نامردی کے معاملہ میں مس میو کا علم اپنی ذاتی معلومات کے علاوہ، اُن آزادمنش انگریزی اُٹھتی جوانی والیوں کی تائید پر بھی مبنی ہوگا جن کو ولایت جانے والے ہندوستانی نوجوانوں کی خلوت و جلوت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع لندن یا اُسکے مضافات میں مل چکا ہو۔

اب رہا دوسرا معاملہ ـــــ یعنی ایک ۸ سالہ لڑکی کی محض گھنٹہ بھر کی علیحدگی میں عصمت دری ـــــ اس کے متعلق بھی مس میو کے ذاتی زاویۂ نظر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مغربی کیفیتِ زندگی کی تصویر کھینچنے کے لیے مسٹر آئیر کے قلم کی ضرورت ہوگی - میں صرف ایک لطیفہ پر اکتفا کرتا ہوں جو ایک ولایتی اخبار کے توسل سے میری نظروں تک پہنچا تھا۔

ایک صاحبِ ثروت یوروپین کو اپنی حسین بیوی اور اُن کے ایک معصوم دوست کے متعلق کچھ جہالت آمیز شبہات پیدا ہو چلے اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچے کہ اُن صاحب کو اپنی بے گناہ بیوی کو طلاق دینے اور بیک بینی و دوگوش تاتہ بدر کر دینے کی دھمکی دینی پڑی۔ بیوی صاحبہ کے لیے میاں سے - یا کم از کم میاں کی دولت و ثروت سے - کنارہ کرنا ناقابلِ برداشت تھا اس لیے خانہ جنگی کا خاتمہ اِس صلح نامہ پر ہوا کہ بیوی نے میاں کی حکومت خود اقتیاری قطعی طور پر تسلیم کر لی اور آئندہ کے لیے نہایت بھاری بھرکم الفاظ میں اپنے دوست سے یکقلم ترک کر دینے کا عہد و پیمان کیا۔ برسوں جنارے گھر کی فضا نہایت مسرت انگیز رہی اور میاں کو بیوی کے راہِ راست پر آجانے کا گمان ہو چلا۔ اتفاقاً میاں کو ایک کام کے لیے اپنے وطن سے باہر جانا پڑا اور چلتے وقت بیوی نے نہایت مایوسی اور چشمِ پُر آب کے ساتھ اُنکو خدا کو سونپا۔ اتفاق کہیے یا شومیٔ قسمت۔ میاں کو دفعتاً آٹھویں روز پردیس سے مکان واپس آنے کی ضرورت درپیش آئی اور گھر پہنچ کر بیوی کو غائب پایا۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور محض عدم موجودگی چنداں عتاب انگیز نہ ہوتی، مگر نوکر چاکروں سے یہ معلوم ہونا غضب ہو گیا کہ بیچاری بیوی تنہائی کے عالم میں، محض اوقات کشی کی خاطر، ممنوعہ دوست سے ہی تبادلۂ خیالات میں مصروف رہیں اور آج بھی اُن ہی کے ساتھ تبدیلِ آب و ہوا کی خاطر کہیں تشریف لے گئی ہیں۔ میاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ریوالور

سنبھال کر تھیئٹر کا رخ کیا۔ وہاں پہنچے تو تھیئٹر کے دربان نے ان کی خشم آلود چشم و ابرو سے بہت کچھ بھانپ لیا اور باتوں ہی باتوں میں ان کا ارادہ دریافت کر لیا۔ ان کا مقصدِ قتل معلوم کر لینے پر اس نے بہ لطائف الحیل ان کو اندر جانے سے باز رکھا اور اس بات پر راضی کر لیا کہ باہر والے بڑے دروازہ پر انتظار کریں اور جب تماشہ ختم ہونے پر ان کی بیوی اپنے دوست کے ساتھ باہر نکلیں تو دونوں کو بہ آسانی جہنم واصل کر دیں۔ اِدھر تو یہ دروازہ پر سایۂ دیوار کی طرح قائم ہوئے، اُدھر دربان نے تھیئٹر کے منیجر کو اس مصیبتِ ناگہانی کی خفیہ اطلاع دی۔ منیجر کی طرف سے میاں اور بیوی دونوں بھاڑ میں جائیں، مگر اس کو اپنے تھیئٹر کی بدنامی کا خوف دامنگیر ہوا۔ اس بدنامی کو بچانے کی خاطر اس نے ڈراپ سین کے موقعہ پر تھیئٹر کے اندر جاکر بہ آوازِ بلند اعلان کیا کہ "ایک صاحب بھرا ہوا ریوالور تھامے بڑے دروازہ پر اس ارادہ سے موجود ہیں کہ اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو باہر نکلنے کے وقت ٹھنڈا کر دیں؛ اس لیے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ اگر وہ بیوی اور ان کے آشنا یہاں موجود ہوں تو براہِ مہربانی میرے پاس چلے آئیں تاکہ میں ان دونوں کو ایک چور دروازہ سے باہر نکال دوں اور وہ بعافیت چلے جائیں۔"

اس اعلان کے جواب میں، حاضرین کے انبوہ میں سے، صرف ۶۵ جوڑے بیویوں اور آشناؤں کے کھڑے ہو گئے!!

غور کیجیے! ایک ایسے ملک میں جہاں صرف ایک رات میں، اور صرف ایک تماشہ گاہ کے حدود میں، ۶۵ بیویاں اپنے دوستوں کے ساتھ، خلافِ مرضیِ شوہراں، موجود پائی جائیں۔ اور ان کی عصمت دری کا کوئی خطرہ بعید بھی نہ کیا جا سکتا ہو، وہاں ایک ۸ سالہ لڑکی کی ماں کے دماغ میں محض ایک گھنٹہ کی جدائی سے کوئی احتمال پیدا ہو جانا انتہائے جہالت، بلکہ مقتضائے بربریت نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہندوستان کے لیے کوئی متفقہ رائے معلوم کرنا اسی قدر محال ہے جس قدر طاعون کا حکمی علاج دریافت کرنا۔ ہندوستان کے اندر والے اور باہر والے ہندوستان کو اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہمیشہ مختلف نتائج نکالتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں غلط بیانی - یا - غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اندر والے دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی قابل نہیں مگر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ہم سب قابل ہیں ——

باہر والے یہ جانتے ہیں کہ وہ سب قابل ہیں مگر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی قابل نہیں۔

* * * * * * * *

اس سوال کا جواب اب بھی باقی ہے کہ "ہندوستان کس کا ہے"؟ — اور غالباً اس کا جواب دینا سائمن کمیشن کے حق میں محفوظ رہیگا۔

میری ذاتی رائے کی اگر اجازت ہو تو میں ڈنکے کی چوٹ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ

ہندوستان نہ ہمارا ہے اور نہ آپ کا — بلکہ، بلاشرکتِ غیرے، محض مس میو کی تنہا ملکیت ہے، جنھوں نے "مادرِ ہند" کی بیش بہا تصنیف میں، اس ناکارہ ملک کی صحیح تصویر کھینچنے میں، صداقت و حقیقت نگاری کو اس خوبی کے ساتھ گُلِ حکمت کیا ہے کہ باید و شاید!!

الا یا ساقیا! مے دہ! بجانِ من پیاپے دہ!
دمادم مے خور و مے دہ کہ می ترسم خمار آید!!

سلطان حیدر-جوش

کلامِ اقدس

اُمنڈ جاتا اگر طوفان بلائے ناگہانی کا
نہ آتا پھر لبِ ساحل سفینہ زندگانی کا

نظر ہر پھر کے پڑتی ہے کبھی یہ اب زمانے کی
بکھر جانا قیامت ہو گیا رنگِ جوانی کا

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظارِ وعدۂ محشر
یہی لے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا

بھیانک رات ہے، دریا مہیب اور دُور ہے ساحل
تھپیڑوں میں ہے موجوں کے سفینہ زندگانی کا

ہمیں واقف ہیں ایذائیں اُٹھائیں ہر نفس جتنی
بھلا ہو دور میں الفت کے دورِ آسمانی کا

خدا معلوم آخر کب چھٹیں گے قیدِ ہستی سے
مقرر ہی نہیں ہے وقت مرگِ ناگہانی کا

ذرا اے بیخودیِ شوق اب مجھکو سنبھلنے دے
کہ پیہم کان میں آتا ہے نغمہ لن ترانی کا

دلِ ناعاقبت اندیش اب تو ہی بتا مجھکو
پسِ پردہ رہے گا راز کب تک زندگانی کا

ہمیں آماجگاہ ناوکِ صد رنج و غم ٹھہرے
ہمیں پر تنگ عرصہ ہو گیا ہے زندگانی کا

کوئی پُرسانِ حال اپنا نظر آتا نہیں اقدس
گلی کوچوں میں ذکرِ خیر ہے اُسکی جوانی کا

حیاتِ ابدی

مضمون ذیل، حیدرآباد کے ایک ہونہار نوجوان نے تحریر کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے زیر تعلیم اور فارغ طلباء کی تحریریں خاص ہمت افزائی کی مستحق ہیں۔ اسلیے کہ ان نوجوانوں نے مُلکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرکے ذہنی ترقی کی منزل کو اپنے اوپر آسان کرلیا ہے۔ اور یہ اُمید بیجا نہ ہوگی کہ مطالعہ میں وسعت اور تحریر میں مہارت پیدا ہوجانے کے بعد یہی لوگ اُردو زبان و ادب کو عروج و کمال پر پہونچا سکیں گے۔

فلسفیانہ تحریروں کے لیے الناظر کے سابق محرر خصوصی مولوی عبدالماجد صاحب اور جامعہ عثمانیہ کے معلم فلسفہ مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا اسلوب تحریر، اگر حیدرآبادی عزیز کے پیش نظر رہے تو اُنکی تحریریں انشاءاللہ زیادہ کامیاب رہیں گی۔ ایڈیٹر

تمام دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہے کہ علوم مغربیہ اور فلسفہ جدیدہ نے تمام قدیم قیاسات وعقائد کا اس طرح استیصال کردیا ہے کہ اب انکے جانبر ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی اور قدیم فلسفہ چونکہ زیادہ تر قیاسات و مفروضات پر مبنی تھا لہذا وہ اس معرکہ میں کامیاب نہ ہوسکا اس میں شک نہیں کہ انسان کی باہمی کشمکش کی بدولت آج ہمیں سیکڑوں ایجادات دکھائی دیتے ہیں اور اسکی متجسس نگاہوں اور عقلی کاوشوں کی وجہ سے وہ پنہاں راز جن کا خیال کرتے ہوے انسان گھبراتا تھا اور جنھیں خطرناک اور مقدس فرض کرتا تھا، آج ہمارے سامنے روز روشن کی طرح منور نہیں تو کم ازکم اس طرح عیاں ہیں کہ ہماری کچھ نہ کچھ تشفی ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ہماری موجودہ جستجو وسرگردانی کے نتائج متقدمین کے خیالات کے بالکل خلاف اور ہر بات میں برعکس ہیں، ایک حد تک نازیبا ہے کیونکہ بعض وہی باتیں جو عقائد مذہبی کا حکم کی صورت میں زمانۂ سلف میں موجود تھیں، آج بھی جب ہم نئے علوم کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو بجاے اسکے کہ ہم اُنکا انکار کریں بلا خوف تردید اُنھیں تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اہل حقیقت نے اتنے اختلافات کے باوجود بعض مسائل کو کسی نہ کسی طرح بڑے پیچ وتاب کے بعد آخر تسلیم ہی کرلیا۔ فلسفہ نے کئی فرقے پیدا کیے لیکن یہ جدید

حیرت انگیز ہے کہ کم و بیش ہر فرقہ کے فلاسفہ نے ماہرانہ بحث کے بعد بالآخر وہی نتائج نکالے جو پہلے نکل چکے تھے

اس عالم ناپیداکنار میں ایسے متخالف بلکہ متبائن خیالات و عقائد نظر آتے ہیں کہ اگر انسان اُن پر کافی بحث کرتا چلا جائے تو شاید اُس کی محدود عمر وفا نہ کرے لیکن انسانی فکر مضطرب اس ناامیدی پر قرار نہیں لیتی بلکہ کسی نہ کسی خیال کو اپنا مطمح نظر بنا کر اُس پر بحث کرنے کے بعد اپنی پیاس کو بجھا ہی لیتی ہے۔

انسان، خردمند انسان جب عالم طفلی سے وداع ہو کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ اسکے گوناگوں تغیرات اور نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے مستقبل کے متعلق غور کرنے لگتا ہے، کبھی تو یہ مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور کبھی اس کے خیالات ایسی مایوسی کے بھنور میں گرفتار کر دیتے ہیں جس سے وہ گھبراتا ہے اور عدم یقین و شک کی نگاہ سے اپنے ماحول کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ سوچنے والی اور خیال کرنے والی ذات نہیں چاہتی کہ چند روزہ محدود زندگی کے بعد فنا کے گرداب میں پھنس جائے۔ اسکا مجتہدانہ دماغ کبھی فانی ہونے کو قبول نہیں کرتا۔ پس وہ اپنے انجام کے متعلق براہِ راست اور واضح ترین علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر کسی نہ کسی طریقہ سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ وہ فانی نہیں، بلکہ غیر فانی یعنی محدود نہیں بلکہ لامحدود ذات ہے۔ اب ہم اس خیال کی وضاحت کریں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ مختلف دماغوں نے اپنے آپ کو کس طرح تسلی دے لی۔

اگر تاریخ کی ورق گردانی کیجائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ "حیاتِ ابدی" کا خیال نو پیدا نہیں، بلکہ قدیم ہے۔ زمانۂ سابق میں بھی ماہرین فلسفہ نے اس پر کسی نہ کسی طرح سے بحث کر کے زیادہ تر اثبات اور بہت کم انکار کیا ہے۔ اگر انکے خیالات پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے جائیں تو شاید یہ مضمون ایک کتاب کی صورت اختیار کر لے' اس لیے ہم متاخرین و متقدمین میں سے بعض کے خیالات و رجحانات کو اجمالاً بیان کریں گے۔

یہ معلوم ہو چکا کہ انسان فنا ہونا نہیں چاہتا، لہٰذا وہ استدلال کر کے بالآخر مذہباً یا عقلاً یا وجداناً بقائیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ "بقائیت" یا "حیاتِ ابدی" نام ہے ایسی حالت یا صفت کا جو ہم کو فنا یا نیست ہونے سے بری کر دے۔ کانٹ[1] نے اسکو اپنے الفاظ

---

[1] Kant جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء)

میں یوں ادا کیا ہے کہ ابدیت یا بقائیت نام ہے استحکام شخصیت کا اور شخصیت سے مراد وہ مستقل شعوری وحدت ہے جو ایک فرد کی زندگی کے مختلف مدارج میں تسلسل قائم رکھتی ہو[1]۔ اس مختصر سی تشریح کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کیوں حیات ابدی کے اثبات پر مجبور رہے۔

دیگر مباحث کی طرح حیاتِ ابدی کی حقیقت عظیم کے انکشاف کا فخر یونانیوں ہی کو حاصل ہے اس لیے کہ ابتدائً بعض یونانی فلاسفہ نے اس پر کسی نہ کسی اسلوب سے بحث کی ہے۔ فیثا غورثیوں[2] کا خیال ہے کہ فرد چونکہ عناصر مادی کے عارضی اتحاد کی ایک نسبت کا نام ہے اس لیے وہ فانی ہے۔ کیونکہ وہ عناصر اتحاد بدلتے رہتے ہیں جسکا نام ہم مرض، انحطاط، اور موت رکھتے ہیں۔ لیکن اس ظرف شکستہ کا تصوری مظروف جو ایک مستقل اور غیر متغیر عدد ہے فنا سے محفوظ ہے جو موت کے بعد بھی اپنے اعمال کے لحاظ سے بہتر یا بدتر یا مساوی حالت میں ہوتا ہے اور اسی کا نام تناسخ[3] یا آواگون ہے۔ فلاطون[4] اپنی مشہور کتاب جمہوریت[5] میں لکھتا ہے کہ انسانی روح جسم کی طرح فنا نہیں ہوتی، بلکہ باقی رہتی ہے۔ ارسطو[6] کا خیال ہے کہ عقل فعال[7] یا عقل بسیط غیر فانی ہے جو جسم سے قابلِ انفکاک ہے اور اسکی توجیہ جسم کے افعال سے نہیں ہو سکتی ہے، وہ فطرت کی مخلوق نہیں بلکہ اس جسم سے پہلے بھی موجود تھی اور قطعاً غیر فانی، غیر مادی، اور ازلی ہے۔ اسکے بعد ابیقوریت[8] والوں کا دعوے ہے، کہ روح تمامتر مادی شے ہے جو فسادِ مادہ ہی کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، موت کا خوف دراصل ایک مغالطہ پر مبنی ہے یعنی آدمی مرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو مردہ تصور نہیں کرتا، بلکہ خیال کرتا ہے کہ موت کے بعد اُسکو لذاتِ زندگی سے محروم ہونا پڑیگا۔ لیکن دراصل موت کا وجود ہی نہیں، اس لیے کہ جب تک ہم زندہ ہیں موت نہیں، اور جب موت آئے گی تو ہم نہ ہونگے۔ ایک دوسرے مسلک رواقیت[9] والوں کا خیال ہے کہ فنا کے معنی یہ نہیں کہ جوہر فنا ہو جاتا ہے بلکہ قطرہ (جزو) دریا (کل) میں مل جاتا ہے۔ ع

قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہو جائے

اب قرون وسطیٰ کے مشہور فلسفی فلاطینوس[10] کا بیان سنیئے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم ذاتِ مطلق

۱۔ سو کیو کنٹ کی کتاب "انتقاد عقل خالص" (Critique of Pure Reason) کتاب ۲، باب ۱۱، فقرہ ۴۔

۲۔ Pythagorian School ۳۔ Transmigration ۴۔ Plato ۴۲۹ تا ۳۴۷ سنہ ق م۔ قدیم مشہور فلسفی۔ ۵۔ Republic ۶۔ Aristotle ۳۸۴ تا ۳۲۲ سنہ ق م۔ قدیم یونانی مشہور فلسفی ۷۔ Active reason ۸۔ Epicureanism ۹۔ Stoicism ۱۰۔ Plotinus

سے اس طرح پیدا ہوا جس طرح آفتاب سے روشنی، ہر چیز اُسی سے نکلتی اور اُسی کی طرف لوٹتی ہے۔ انسانی ارواح ہمیشہ سے اجسام میں مقید نہ تھے بلکہ یہ سماوی ارواح تھے جن کو خود خدا کے سوا اپنا بھی شعور نہ تھا لیکن خود غرضانہ انفرادیت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے حیاتِ کلی سے اپنے آپ کو منفصل کر لیا۔ یہ انفصال ایک قسم کا تنزل تھا جو آزادانہ فعل کی سزا ہے۔ اب روح کا کمال ترقی یہ ہے کہ اس انفرادیت کے قفس سے آزاد ہو کر کُل میں مل جائے۔

ان مختلف متقدمین فلاسفہ کے خیالات معلوم کرنے کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں 'حیاتِ ابدی' کا خیال کس طرح متغیر اور مستحکم ہوتا گیا۔ اسکے بعد جب مذہب عیسائیت کا ظہور ہوا تو حیاتِ ابدی کے جاننے کا ایک اور طریقہ ایجاد کیا گیا۔ یعنی اُس نے عقل کے بجائے الہام کو اپنا مشعلِ راہ بنایا اور لوگوں کے سامنے دوزخ و جنت کو پیش کر کے اس کا یقین دلایا کہ وہ فانی نہیں بلکہ غیر فانی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اندھے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُسکو کسی نہ کسی طرح آنکھیں مل جائیں۔ اور بعض افراد کی اسی طرح تشفی ہو جاتی ہے، لیکن متجسس دماغوں کو اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ اور وہ عقل و استدلال سے اسکو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں بہر حال کرۂ ارضی سے لیکر مرکز آفتاب تک ساری کائنات تغیر و بے ثباتی کا تماشہ ہی کیوں نہ نظر آئے، انسان اس سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ ان تغیرات کے باوجود بقا کا متمنی اور اس اعتباری پردہ کے پیچھے ثبات کا امیدوار رہتا ہے۔

موجودہ ترقی یافتہ زمانہ کی ہمہ گیر واقفیت اور وسعت نظر کے لحاظ سے یہ نہایت حیرت انگیز بات ہے کہ جدید حکما و فلاسفہ کے نتائج سے جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے انسان مطمئن نہیں ہوتا بلکہ وہ ترقی کی جس حد تک پہونچ چکا ہے اس سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر لحظہ منزلِ مقصود کو اگرچہ نظر سے دُور پاتا ہے لیکن اس سے مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی کوشش میں اور اضافہ کر کے اسی تگ و دَو میں مصروف رہتا ہے۔ یہی ہوس ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو کسی زمانہ میں چین نہیں لینے دیتی اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سامان آسایش جو پہلے میسر تھا اب راحت طلبی کا مادہ بڑھنے کی وجہ سے بیکار ہو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ گُر جو ماضی کو تاریک اور مستقبل کو روشن بناتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ دُنیا کا کوئی حصہ چاہے ترقی یافتہ ہے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو،

اپنے داخلی سوالات کے حل کرنے پر فطرتاً مجبور ہے، عالم ہو یا جاہل، افریقہ کا وحشی ہو یا یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ لیکن انفرادی رائے و خیال، اجتماعی و تمدنی حالات اور منطقی دلائل و استدلالات مختلف انسانوں کو مختلف راستوں پر چلاتے ہیں لیکن یہ بھٹکے ہوئے مسافر جب منزل مقصود پر پہنچتے ہیں تو سب کو ایک جگہ پاتے ہیں۔ اس طرح حیات ابدی کے متعلق بھی مختلف گروہوں نے مختلف نظریات پیش کیے لیکن ان سب کا آخری نتیجہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا۔

اب ہم اجمالاً میلان بقا کے ان نکات کو بیان کریں گے جو فی الوقت مختلف نظریات کی صورت میں موجود ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا مدعیانہ اصرار ہے کہ بقائے دوام کا تصور خود ہی اُسکے وجود کا اہم ثبوت ہے جس طرح ڈیکارٹ[1] کا وجود مطلق کے متعلق استنباطی ثبوت تھا۔ یعنی جس میں معلول (تصور) سے علت (خدا) کا استنباط کیا گیا تھا۔

(۲) دوسرے گروہ کا خیال جو کسی قدر قدیم ہے یہ ہے کہ روح ایک ایسی روحانی شے ہے جسکا قیام ہمیشہ کے لیے ایک محدود مادی جسم میں نہیں رہ سکتا۔ پس وہ فنا نہیں ہوتی بلکہ اپنے جسمانی لبادے کو بدلتی رہتی ہے۔ یہ لوگ فخریہ کہتے ہیں کہ

صد ہزاراں سال بودم در مطار　　　ہمچو ذراتِ ہوا بے اختیار

از جمادی مردم و نامی شدم　　　وز نما مردم ز حیواں سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم　　　پس چہ ترسم کے ز مردم کم شوم
(مولانا روم)

ظاہر ہے کہ تشکیک کا سدِ باب کُلّی طور پر نا ممکن ہے اس لیے بعض دماغوں کی اس سے تسلی نہیں ہوتی اور وہ اپنی پیاس اس طرح بجھاتے ہیں کہ

(۳) اس کائنات میں روزانہ ہر لمحہ غیر شعوری تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کُلّی تغیر یکایک اور شعوری ہوتا ہے تو اسکو عجیب و غریب تباہ کن لفظ "موت" یعنی فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسان اس سے گھبراتا ہے لیکن اگر حقیقت دریافت کی جائے تو اس

---

[1] Rene Descartas فلسفۂ جدیدہ کا مشہور فرانسیسی فلاسفر (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء)

موت میں بھی ایک حیاتِ جاوید مضمر ہے جسکو ایک شاعر یوں بیان کرتا ہے کہ

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

(۴) اب چوتھی جماعت بقاے دوام کا اس طرح اثبات کرتی ہے کہ انسان کے خواہشات وجذبات جیسے جیسے وہ اُن پر قابو حاصل کرتا جاتا ہے غیر محدود ولا متناہی دکھائی دیتے ہیں اس کا ماضی تاریک اور مستقبل شاندار نظر آتا ہے اور وہ خود کو گذشتہ کی بہ نسبت زیادہ عقلمند اور دُور اندیش پاتا ہے۔ اب یہ کہنا کہ وہ اپنے نصب العین کو پہونچنے سے پہلے فنا کردیا جاتا ہے، خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس عالمگیر تاریکی کی پیشین گوئی کو ہرگز قبول نہیں کرتا، بلکہ وہ غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ فطرت پر یہ الزام لگانا کہ اُس نے پیاس تو پیدا کی لیکن اسکی تشفی کا سامان مہیا نہ کیا، ایک بے معنی مفروضہ ہے۔ اس بیان کو عقل قبول نہیں کرسکتی کیونکہ تقاضاے فطرت کے پورے ہونے کے لیے بڑے قوانین موجود ہیں اور فطرت کا یہ حال ہے کہ علت کے ساتھ ہی معلول پیدا کردیتی ہے اور ضروریات کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی آلات بھی پیدا کردیتی ہے۔ تو پھر یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ہماری لا متناہی خواہشات کی تکمیل کا سامان ہمیں میسر نہیں۔ جدید حیاتیات بھی اس بیان کی اس طرح تائید کرتی ہے کہ قوانینِ فطرت مجبور ہیں کہ علت کے ساتھ لازمی طور پر معلول بھی پیدا کردیں۔ مثلاً عورت کے پستان میں ضرورت کے وقت فوراً دودھ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں موت نیست نہیں کرتی بلکہ جس طرح ایک تخم کو چند روز کے بعد گملہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اُسی طرح بقول گیٹے[1] کے روح کی پختگی کے ساتھ جسم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اِس قفس سے آزاد ہوکر دوسری جگہ تلاش کرلیتی ہے۔

اس لحاظ سے مولانا روم کا خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ہر چیز کائنات میں حاجت سے پیدا ہوتی ہے۔ جرمنی کا مشہور فلسفی ہیگل[2] لکھتا ہے کہ ہر چیز ایک نظام کے تحت پیدا ہوتی اور متغیر ہوتی رہتی ہے۔ اس بنا پر انسان دنیاوی زندگی کو چھوڑ کر جو خسارہ اُٹھاتا ہے اُسکی تلافی آنے والی ابدی زندگی سے ہوجاتی ہے۔

۱۔ Johann Wolfgang Von Goethe مشہور جرمنی شاعر ۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء

۲۔ G. W. F. Hegel ۱۷۷۰ء تا ۱۸۳۱ء

اس قسم کے اعتراف سے بھی بعض اشخاص کی تشفی نہیں ہوتی اس لیے وہ ایک اور طریقہ سے اس طرح اثبات کرتے ہیں کہ

(۵) فطرت زندگی کے بقا کی سخت کوشش کرتی ہے، وہ لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد کو پیدا اور فنا کرتی ہے بس خاص شخصیتیں تو فنا ہو جاتی ہیں لیکن آنے والا چونکہ اپنے پیشرو کا قائم مقام ہوتا ہے اس لیے نوع باقی رہتی ہے - تو اب یہ کہنا کہ انسان فنا ہو جاتا ہے کچھ معنی نہیں رکھتا- اسی خیال کو بعضوں نے یوں ادا کیا ہے کہ فطرت حقیقی کامل انسان کی متلاشی ہے - لہذا جب وہ اپنی کوشش کے نتیجہ کو نامکمل پاتی ہے تو اسے مٹاتی جاتی ہے -

(۶) ایک اور خیال یہ ہے کہ افراد نوع میں باقی رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کا نقش دوسروں کے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں - اور یہی وہ چیز ہے جو آب حیات کا کام کرکے انکی ابدیت کا باعث ہوتی ہے -

(۷) اس نوعی بقائیت کے علاوہ ایک اور مشروط خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے عناصر ترکیبی زبردست ہوں تو ہم زیادہ ورنہ کم باقی رہتے ہیں - یعنی یہی وجہ ہے کہ بعض شخصیتیں دنیا کے نشیب و فراز سے متاثر نہ ہوکر خضر ثانی بنی ہوئی ہیں اور بعض طوفان فنا کے ایک جھونکے کے ساتھ اس طرح غائب ہو گئی ہیں کہ ان کا نشان بھی باقی نہیں رہا - اس کا مطلب یہ ہے کہ ابدیت یا بقائے دوام خلقی نہیں بلکہ اکتسابی ہے - اقبال نے اسی خیال کو موزونیت کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے کہ

بمیری گر بہ تن جانے نداری اگر جانے بہ تن داری نہ میری

بعض ہستیوں کو حیات ابدی کے متعلق ان خیالات کے معلوم کرنے کے بعد بھی وہ اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا جسکے حصول کی تمنا بادشاہ سے لیکر گدا تک کو ہے - لہذا وہ اپنے آپ کو سمندر کا ایک قطرہ فرض کرکے اپنی موت کو سمندر میں جا ملنا قرار دیتے ہیں - بہرحال ہر گروہ نے کسی نہ کسی طرح سے ابدیت کی تائید ہی کی ہے -

موجودہ زمانہ میں چونکہ جدید تعلیم یافتہ اشخاص بغیر مستند علما و فضلاء کی تائید کے ہر بات لے آمادہ ہو جاتے ہیں - اسی لیے یہاں چند مستند فلاسفۂ جدید کے خیالات بھی درج کیے جاتے ہیں - فلسفۂ جدیدہ کی اہم ہستی اسپنوزا[۱] اپنے وحدۃ الوجودی فلسفہ کے باوجود کہتا ہے کہ انسانی ذہن (روح) کلی طور پر فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اسکا ایک جزو باقی

---

[۱] Baruch Spinoza ۱۶۳۲ء تا ۱۶۷۷ء

رہ جاتا ہے جو ازلی اور ابدی ہوتا ہے - لائبنٹز[1] کا خیال ہے کہ انسان اپنے عالم ان موناڈ (روح) اور محکوم مناوات (جسم یا مادہ) کا مجموعہ ہوتا ہے، اور ان مناوات میں جو تعامل نظر آتا ہے وہ اسکی توجیہ توافق مقدر سے کرتا ہے اس طرح اس کا دعوے ہے کہ انسان فانی نہیں بلکہ غیر فانی ہے کیونکہ موت نام ہے انفصال مناوات کا - ایک دوسرا فلسفی پامپونزی کہتا ہے کہ بقاے دوام کی نہ تو ہم کلی طور پر تردید کرسکتے ہیں اور نہ اسکو ثابت کرسکتے ہیں۔ جرمنی کی اعلیٰ ہستی ہیگل کا خیال ہے کہ انسان کی حقیقت نفس ہے اور یہ نفس پہلے فردی حالت میں ہوتا ہے لیکن جب سیاسی اور اجتماعی زندگی میں وہ اعلیٰ تشفی نہیں پاتی جسکی وہ تلاش کرتا ہے تو وہ روح مطلق بن جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ طبعی میلانات کی رہنمائی سے الگ ہوکر جب انسان عقل کی روشنی میں حقائق کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو یا تو اس کا علم زیادہ روشن اور جلی ہوجاتا ہے یا بجاے اسکے کہ سکون و طمانیت حاصل ہو اُسکو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے - یہی حال مادیین کا ہے یعنی وہ اپنی پیچیدہ حیرانیوں میں سرگردانی کے بعد اپنے آپ کو پہلے کی بہ نسبت اور بدتری میں پاتے ہیں - یہ مسلک نہایت قدیم ہے اس کے پیرو بقاکے منکر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مختلف مرکبات کے ناپائدار خواص میں تحلیل ہوجاتا ہے اور وہ مرکبات ایک نئی شکل اختیار کرلیتے ہیں جو بقاے انسانی کے لیے مفید نہیں ہوتے۔ اس مسلک کے علمبردار صرف خارج کو حقیقی سمجھتے ہیں اور روح کے سرے ہی سے قائل نہیں ہوتے کیونکہ انکے یہاں ساری کائنات کی اصل ایک بے شعور و بے حس مادہ ہے جسکی ترکیب و تحلیل سے مختلف صورتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہور ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

چونکہ یہ خیال ہماری زندگی میں ممد نہیں لہذا اسکے پیرو دنیا میں بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں اُنکے متعلق بھی ہمیں معلوم نہیں کہ اپنے اس دعوے پر وہ کس قدر کاربند ہیں - یہاں یہ ظاہر کردینا بیجا نہ ہوگا کہ مادیت کے خلاف موجودہے جسکو روحانیت کہا جاتا ہے - اسکے معتقدین صرف روح کے وجود کے قائل ہوکر روح کے وجود ہی کو اسکے بقاکے ثبوت میں پیش کرتے ہیں

بہرحال عام طور پر جب ہم دنیا کی دوزندگی پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض

Pompanazzi ۲ Monades ۲ Leibnitz ۱

انسان ممکنہ کوشش و مشقت کے باوجود آسائش و آرام سے محروم ہیں اور بعض بلا کسی فکر و تردد کے مزے سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اب اگر ان بدنصیبوں سے یہ کہا جائے کہ ان کا مستقبل تاریک ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی کوشش ختم ہو جائیں گی۔ اور اس طرح دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ انکی مشقتوں کا ثمرہ آنے والی ابدی زندگی ہے، تو اس سے اُن کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور اس طرح اُنکی ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں۔

اس بیان کا یہ مطلب نہیں کہ حیات ابدی کا خیال ہماری خواہش پر مبنی ہے، بلکہ اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی ہر نقطۂ نظر سے قرین عقل ہے۔ کیونکہ اگر یہ پیش نظر نہ ہو تو زندگی بے مزہ ہو جاتی ہے اور ہم کھوئے سے جاتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کا وجود ہیولیٰ کے سوا باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ حق و باطل اور خیر و شر کی تمیز ہی باقی نہیں رہتی۔ آخر میں ارنسٹ رینان کے اس جملہ پر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے، کہ

"جس روز حیات ابدی کا خیال مٹ جائے گا، اُسی روز اخلاقیت اور روحانیت دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا"

محمد مظہر حسین حیدرآبادی
(متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

غزل

گر بند چشم ظاہر۔ پھر دیکھ اگر نظر ہے
اس جسم و جاں کے اندر کیا نور جلوہ گر ہے

ہستی سے اپنی غافل۔ اور ماسوا کے مائل
ہے کس طرف ترا دل تو جا رہا کدھر ہے

ہے سمن ہے تجھ میں۔ رنگِ چمن ہے تجھ میں
ہر بانکپن ہے تجھ میں۔ اپنی تجھے خبر ہے؟

ہم کیا ہیں کچھ نہیں ہیں۔ دل بھی نہیں ہے اپنا
اُسکو جو دیکھتے ہیں وہ بھی تمہارا گھر ہے

ہر ذرہ ہے بیاباں ہر قطرہ بحر و طوفاں
اِس دورِ ارتقا میں ہر طفل ابو البشر ہے

اِس صفحۂ جہاں میں پست و بلند یکساں
صورت بھی ایک سی ہے جز زیر و زبر ہے

مہجور شکل نرگس باغ جہاں میں ہم نے
کھولی ہیں جب سے آنکھیں اللہ پر نظر ہے

سراج الدین احمد مہجور
(نبیرۂ صہبائی مغفور دہلوی)

آئین اردو

(مولفہ مولانا محمد زین العابدین صاحب فرجاد کوثانوی)

کتاب مذکور کی تالیف میں فاضل مولف نے بہت محنت کی ہے، اور اردو کے غیر آئینی ملک کو آئینی بنانا چاہا ہے جس پر "عظیم دار المصنفین اعظم گڈھ" مولانا سلیمان صاحب ندوی کی یہ ایک الفاظ تائید و تصدیق بھی شایع کی گئی ہے "میں نے ماہ رمضان کی فرصت میں آپ کی پوری کتاب (آئین اردو) دیکھی۔ مجھے تو کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہ ملی۔ زبان سہل اور طریقۂ ادا نہایت آسان ہے"۔ اس موقر ریمارک کو پڑھ کر اور عظیم دار المصنفین اعظم گڈھ کی زبردست شخصیت اور قابلیت پر نظر رکھتے ہوئے مجھ ہیچمداں کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ آئین اردو پر تنقید کرنے کا خیال کروں۔ لیکن تنقید کورانہ تقلید سے بالکل بیگانہ ہے۔ ہر نقاد کا فرض ہے کہ وہ دوسرے نا تدبر عظام کی رائے کا کتاب کے اصل مضمون کو پڑھ کر احترام کرے، اور اگر اسکی ناچیز رائے کچھ مختلف ہو تو اسکے اظہار میں پس و پیش نہ کرے۔ مری مولانا الحاج ظفر الملک کا ارشاد بھی اس قابل نہیں کہ میں اس پر توجہ نہ کروں۔ بہر حال میں تنقید کے اہم فرض کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دینے کی کوشش کروں گا۔ اور عظیم دار المصنفین اعظم گڈھ سے اپنی اس جسارت کی معافی چاہتا ہوں۔

مولانا فرجاد صاحب نے مصباح القواعد اور قواعد اردو کو صرف و نحو اردو کے لیے کافی خیال نہیں فرمایا، اس وجہ سے آئین اردو کی تالیف کی زحمت گوارا فرمائی۔ اپنے اس دعوے کو مدلل بنانے کے لیے مولوی فتح محمد خاں صاحب اور مولوی عبد الحق صاحب مؤلفان کتب مذکور پر ایک سلسلہ اعتراضات کا بھی شامل آئین اردو فرمایا۔ با قتضائے بشریت ان مؤلفان سے غلطی کا ہو جانا ناممکن نہیں ہے، لیکن اکثر جگہ اس سلسلۂ تعریض میں فاضل مؤلف آئین اردو نے بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ اگر میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک اعتراض کی پڑتال کروں تو یہ تنقید خود ایک ضخیم کتاب بنجائے گی، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے، تاکہ فرجاد صاحب کو معلوم ہو جائے کہ ہر آدمی سے لغزش ہو جانا ممکن ہے، اور کسی دوسرے شخص پر نکتہ چینی کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

آئینِ اُردو صفحہ ۳ پر لکھا گیا ہے کہ مصباح القواعد کے صفحہ ۲۱ پر تحریر ہے
"اور کوئی بجز فالق الاصباح نہیں"

اس مصرع میں اِصباح کا کسرہ ال کو دیا گیا" فرجاد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ اصباح بالکسر باب افعال کا مصدر ہے اور اسکے معنی ہیں صبح کرنا، اور اَصباح بفتح جمع ہے۔ اور اس مصرعہ میں جمع برتی گئی ہے نہ کہ مصدر۔ فی الواقع صبح اور اصباح بالکسر الف دونوں مصدر ہیں، اور حاصل مصدر کے معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ فرجاد صاحب کا اعتراض غلط ہے مصرعۂ مذکور میں اَصباح بفتح الف نہیں ہے بلکہ اِصباح بکسرۂ الف ہے۔ سورہ انعام پارہ ۷ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ - آیۂ مذکورہ میں لفظ اِصباح کو مع لفظ فالق دیکھنے کے بعد یقیناً جناب فرجاد اعتراف فرمائیں گے کہ انکا اعتراض غلط تھا۔ لیکن اِصباح بالکسر الف سے مولف مصباح القواعد نے جس قاعدہ کا استنباط کیا ہے وہ صاف لفظوں میں نہیں بیان کیا گیا۔ مولانا فرجاد نے بھی اُس قاعدے پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے ہم بھی اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

آئینِ اُردو صفحہ ۴ پر لکھا گیا ہے کہ مصباح القواعد صفحہ ۴۴ پر تحریر ہے "بعض مصدر ایسے ہیں کہ لازم کچھ ہیں متعدی کچھ، جیسے پڑنا سے ڈالنا" فرجاد صاحب فرماتے ہیں ڈالنا کا لازم ڈلنا بھی آتا ہے۔ میں گزارش کرتا ہوں کہ مولف مصباح القواعد نے یہ نہیں لکھا تھا کہ بعض متعدی کچھ ہیں اور لازم کچھ۔ اس لیے فرجاد صاحب اگر پڑنا کا متعدی پاڑنا (صریحاً غلط ہے) بنا سکتے تو کافی تعاقب ہوتا۔ آپ نے ڈالنا کا لازم ڈلنا تلاش کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ میری محدود معلومات میں یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے پڑی کے بجائے ڈلی، یا پڑا کے بجائے ڈلا بولتے ہوئے کسی کو نہیں سنا۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کسی حصہ میں ڈلنا اور اُس کے مشتقات، پڑنا اور اسکے مشتقات کے بجائے استعمال کیے جاتے ہوں۔

فاضل مولف آئینِ اُردو نے دیباچہ میں مولانا فتح محمد صاحب پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "آریں زبان یعنی اُردو کا لگاؤ سامی زبان یعنی عربی سے ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے" بایں ہمہ پھر بھی آپ نے عربی زبان ہی کے قواعد سے اُردو کو ملبوس کرنے کی کوشش کی ہے اور کہیں کہیں اس کوشش میں شدید ناکامی بھی ہوئی ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۲۳ پر میں دفی) سے (من: دعن اتک (الی حتی) پر۔

پہ - اوپر (علی) واسطے - لیے (ل) کو کلماتِ جَرّ یعنی جار اور اُس کلمہ کو جو اُن سے متأثر ہو، مجرور لکھا ہے - اس مد میں اور الفاظ بھی داخل کیے ہیں - اگر فرجاد صاحب انکو حروفِ روابط میں داخل ہنے دیتے تو اچھا ہوتا - لغوی معنی کی کھینچ تان سے انکا نام اُردو میں جار مجرور قرار دینا صحیح نہیں ہے - عربی اصطلاح میں جر زیر کو کہتے ہیں - چونکہ حرفِ جار اپنے مابعد لفظ کو زیر کا اعراب دیتے ہیں اس لیے ان دونوں کو جار مجرور کہنا صحیح ہے، اُردو میں بلکہ فارسی اور انگریزی میں بھی اعرابی عمل کا پتہ نہیں ہے - اب فرجاد صاحب کی یہ جدت اگر عربی کی کورانہ تقلید نہیں ہے تو اور کیا ہے -

مولانا فرجاد نے اصطلاحی ناموں کے تجویز فرمانے میں اس قدر فراخ حوصلگی سے کام لیا ہے کہ مبتدی یا منتہی کوئی بھی اُنھیں اپنے دماغ میں محفوظ نہیں رکھ سکتا - شلاً اضافت کے اقسام کو دیکھیے صـــــ۲۲۶ - اضافت مطلق، اضافت مالک، اضافت ابنی، اضافت ظرفی، اضافت بہ ادنیٰ تعلق، اضافت توضیحی، اضافتِ مادی، اضافت علت، اضافتِ شبہی، اضافت استعارہ، اضافتِ وصفی - کیا فارسی اور عربی میں اضافت نہیں ہے، مولف خود ہی غور فرمائیں کہ دیگر اہل زبان نے کیا کام کیا ہے اور آپ نے کیا طریقہ اختیار فرمایا ہے، اور آپ کے کام میں اختصار کی کس قدر گنجائش تھی - اسی طرح کلمات کی اصطلاحی افراط توجہ کے قابل ہے - کلمات جر، کلماتِ شمول، کلماتِ حصر و تخصیص، کلمات تاکید، کلماتِ قسم، کلمات تشبیہ، کلمات تفریع، کلمات تسلسل کلام، کلمات خلاصۂ کلام، کلمات عطف، کلمات تردید، کلمات اضراب، کلمات استدراک، کلمات استثنا، کلماتِ علت، کلمات شرط، کلمات جزا، کلمات ندا، کلمات جواب، کلمات ایجاب، کلمات تفسیر، کلمات تمنا، کلمات تحقیر، کلمات تزئین کلام، کلمات طبعی، کلمات تاسف و ندبہ، کلمات تحسین، کلمات نفرین، کلمات نفرت، کلمات سختی و شدت، کلمات تعجب، کلمات انبساط، کلمات تہنیت، کلمات قدوم، اگر ایسی ہی اولوالعزمی سے کام لیا جائے تو کلمہ کے اصناف و اقسام اس سے کہیں زیادہ پھیلائے جا سکتے ہیں، کیونکہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے اگر بامعنی ہے تو کسی نہ کسی کیفیت کو لیے ہوتا ہے، اور اُس کیفیت کی نسبت سے اُسکو ایک نیا نام دیا جا سکتا ہے - لکھنے والا سب کچھ لکھ سکتا ہے لیکن یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ یاد کرنے والے پہ کیا گزرے گی - مرکبات میں بھی اسماے اصطلاحی کی ہی ریل پیل ہے -

---

فاضل مولف آئینِ اُردو نے صفحہ ۲۱ - عربی کے خاص حروف ث - ح - ذ - ص - ض - ط - ظ - ع - ق - درج کیے ہیں اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ نو حرف ہندی یا فارسی لفظوں میں نہیں

آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بطور حاشیہ ایک نوٹ بھی دیا ہے " بعض فارسی الفاظ میں جو ان حرفوں کے لکھنے کا رواج پڑ گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے جیسے گذرگاہ، گذشتہ، صد، شصت، طپش، طشت، چاقو، درحقیقت انکو یوں لکھنا چاہیے : گزرگاہ، گزشتہ، سد، شست، تشت، چاکو۔ لفظ خانقاہ میں جو کاف ہے وہ فارسی لفظ گاہ کی جگہ نہیں ہے بلکہ قاہ ترکی لفظ ہے اور خان فارسی۔ خان کے معنی گھر اور قاہ کے معنی عبادت، یعنی عبادت کا گھر۔ اب مقبرہ کے معنی میں مستعمل ہے"۔

اس موقع پر مولانا فرحاد کو زیادہ تفصیل سے کام لینا چاہیے تھا۔ گزرگاہ وغیرہ کی کتابت ذال اور زے، دونوں سے ہوتی ہے، لیکن بہتر ہے۔ (ز) سے لکھنا چاہیے۔ لیکن صد، شصت وغیرہ میں یہ طریقۂ کتابت ضرورتاً اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہی الفاظ سد۔ شست کے دوسرے معانی سے ممیز رہیں اس لیے اس ترمیم کو قطعاً غلط کہدینا مناسب نہیں ہے۔ فارسی زبان میں بہت سے الفاظ ترکی شامل ہوگئے ہیں اور اس زبان نے یہاں تک اُن پر تصرف کر لیا ہے کہ اگر اب اُنھیں مفرّس کہیں تو بیجا نہیں ہے۔ خود اُردو میں روزمرہ کثرت سے ترکی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں حروف مخصوصہ عربی کے موجود ہیں۔ مثلاً چاق چوبند، تاب، تاق، قانون، قرق، قرمزی رنگ، قزلباش، قشقہ، قندھار وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر آئین اُردو کا پڑھنے والا ان الفاظ کو عربی سمجھے گا تو غلطی ہوگی۔ اگر ان پر غلط ہونے کا فتوی لگائیگا تو بھی صحیح نہ ہوگا۔ اس وجہ سے فرحاد صاحب کو یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ حروف مخصوصۂ عربی اُردو زبان میں غیر عربی الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چاقو بھی ترکی لفظ ہے اور اہل فارس اسکو نظم و نثر میں چاقو ہی لکھتے ہیں چاکو نہیں لکھتے ہیں۔ خانقاہ کی بھی جو لغوی تحقیق محقق موصوف نے کی ہے اُس سے بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ صاحب بہار عجم اور دیگر مؤلفان کتب لغت کی رائے میں گاہ کا قاہ بنا لیا گیا ہے۔ اور یہ تصرف عرب سیاحوں اور عقیدتمندوں کا معلوم ہوتا ہے۔ خانقاہ اُس قیامگاہ یا نشستگاہ کو کہتے ہیں جس میں درویش لوگ ٹھہرتے ہیں یا مجلس سماع منعقد ہوتی ہے۔ مقبرہ کو خانقاہ نہیں کہا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی خانقاہ میں کسی بزرگ کی قبر ہو جانے کے بعد اُسکو مقبرہ کہنے لگیں۔ لفظ کاغذ کا بھی روزمرہ اُردو میں کثرت سے استعمال ہے، فاضل مولف اسکی بابت کیا کہیں گے۔ کیا اسکی کتابت بھی (ز) سے ہونا چاہیے؟ یہ صحیح ہے کہ اصل میں کاغذ دال کے ساتھ تھا۔ لیکن اب کاغذ ہو گیا، اور کوئی طاقت لفظ کاغذ سے ذال کو جدا نہیں کرسکتی۔

فاضل مؤلف اگر اس کتاب میں یہ امر بھی پیش نظر رکھتے کہ اُردو زبان کی ترکیب و تعمیر میں غیر فصیح الفاظ

خارج ہو جائیں یا فصیح اور غیر فصیح الفاظ میں کوئی حد، تیار ہو قائم ہو سکے تو بھی آپ کی تالیف کی ضرورت با سانی ذہن نشین ہو سکتی تھی۔ مگر آپ نے تو لفظ ہار سے اسم فاعل بنانے کا قاعدہ ہی بنا دیا ہے۔ جو کسی وقت صحیح بھی ہو گر اب موجودہ اُردو اُسکے جذب کرنے کو عموماً تیار نہیں ہے۔ مولانا فرجاد، مرن ہار (مرنے والا) اور جان ہار (جانے والا) کو بھی اُردو زبان سے خارج فرماکر دائرۂ اُردو کو تنگ کرنا نہیں چاہتے۔

اِن ترتیب و تحقیق کی بعض معمولی لغزشوں کے باوجود مولانا فرجاد نے جس محنت سے یہ کتاب تیار کی ہے، اُسکی داد نہ دینا حق فراموشی ہے۔

علم ہجا کی تعریف و تفصیل نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ کی ہے۔ اصطلاحیں قائم کرنے میں کچھ طوالت ضرور واقع ہوئی، لیکن کافی ذہانت صرف کی ہے۔ تذکیر و تانیث الفاظ کا کوئی کلیہ قطعی قائم نہیں ہوسکا، نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جس حد تک ہو سکا ہے انتہائی تحقیق سے کام لیا ہے۔ ضمائر پر بھی بلیغ بحث کی ہے۔ اسما و افعال پر غائر توجہ بذول کی گئی ہے۔ اور اُردو زبان کو ایک سرمایہ دار زبان بنانے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال اُردو زبان میں آئین اُردو ایک اچھا اضافہ ہے خدا مؤلف کی مساعی کو بار آور کرے۔

کتاب کا کاغذ اور طباعت قابل تعریف ہے۔ ضخامت ۲۱۶ صفحے کی ہے۔ قیمت ۸ہ ہے۔ کتاب نامی بکڈپو اور نامی پریس میرٹھ سے مل سکتی ہے۔

امیر تقا و بدایونی

غزل رقم لکھنوی

جنونِ محبت کو رسوا نہ کرنا — کبھی عقل و دانش کا کہنا نہ کرنا
کتابِ محبت کی تعلیم یہ ہے — کبھی فکرِ دُنیا و عقبیٰ نہ کرنا
یہ ہے میرا مسلک یہ ہے میرا مذہب — کسی کو سوا تیرے سجدا نہ کرنا
نہیں خیر اب زُہد اور اِتقا کی — ستم ہے حسینوں کا پروا نہ کرنا
نہ یوں بے حجابانہ پانی میں اُترو — کہیں خضر کو غرقِ دریا نہ کرنا
ہیں گستاخ بادِ بہاری کے جھونکے — کبھی باغ کی سَیر تنہا نہ کرنا
سُنانا تو فرہاد و مجنوں کے قصے — مگر بھُولیں ذکر میرا نہ کرنا
مبارک تمھیں شوقِ قتلِ دو عالم — فقط ایک خونِ تمنا نہ کرنا
تجھے کیا خبر کس کے ہیں زیرِ سایہ — ہُما اہم فقیروں پہ سایا نہ کرنا
تمہیں دل تو لے لیں گے قیمت نہ دیں گے — رقم تاو ہندوں سے سودا نہ کرنا

نظرے خوش گزرے

۱۹۲۸ء کا اختتام دو المناک حادثوں پر ہوا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی نے رفعتہ رامپور میں انتقال کیا، اور ہندوستان ایک بڑے قومی سردار کی خدمات سے اس نازک وقت میں محروم ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم صاحب مرحوم کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ ایک خاندانی نامور اور حاذق طبیب ہونے کے علاوہ، وہ ایک وسیع الخیال و بلند حوصلہ رئیس، روشن خیال و خوش فکر مدبر اور بابمت و باہمت خادم ملک وملت تھے اور گذشتہ ربع صدی کے اندر اس ملک میں جتنی قومی تحریکات رونما ہوئیں سب میں وہ نمایاں حصہ لیتے رہے اور اپنی ہوشمندی و معاملہ فہمی کے بدولت رفتہ رفتہ مسلمانان ہند کے قافلہ سالار قرار پائے۔

دہلی کا طبیہ کالج، آیورویدک طبی کانفرنس، دائیوں کا مدرسہ اور ہندوستانی دواخانہ جن کے انتظامات دلشوونما میں حکیم صاحب کا بہترین عہد زندگی صرف ہوا، انکی طبی خدمات کے عظیم الشان کارنامے ہیں۔ اور جس فیاضی و ایثار سے انھوں نے ہندوستانی دواخانہ کو جسکی آمدنی سوا یا ڈیڑھ لاکھ سالانہ ہے، طبی کالج کے مصارف کے لیے وقف کردیا۔ اسکی بدولت امید ہے کہ انکے معزز پیشہ طبابت کی آنے والی نسلیں ہمیشہ انکے کارناموں پر بجا طور پر افتخار کرسکیں گی۔

تمام اسلامی تحریکات میں سے ندوۃ العلماء، مسلم لیگ، ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی سب ہی انکی خدمت و اعانت کے رہین منت ہیں۔ خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کی تو بنیاد وہی انکے ہاتھوں پڑی تھی۔ اور حق یہ ہے کہ انکی خدمت و اعانت میں حکیم صاحب نے اس درجہ شغف و انہماک ظاہر کیا کہ انکی صحت نے بالآخر جواب دیدیا۔

ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد ابتدا ہی سے انکے عزیز ترین مقاصد زندگی میں شامل تھا۔ پھر جب ترکی سلطنت کے مصائب و آلام اور پنجاب کے دردناک دولت آفریں واقعات سے متاثر ہوکر وہ سیاسیات ملکی میں ہمہ تن منہمک ہوئے تو اسوقت بھی اس مسلک کے سب سے بڑے علمبردار وہی رہے۔ اور ملکی آزادی کی جنگ میں جو نمایاں حصہ انھوں نے لیا انکی بدولت وہ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے سردار بن گئے۔ اور اگرچہ گذشتہ چار پانچ سال سے

دردانگیز افتراق اور باہمی خانہ جنگیوں نے مرحوم کو بے حد دل شکستہ کر دیا تھا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نازک سے نازک مواقع پر بھی حکیم صاحب مرحوم نے اتحادِ باہمی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں ہونے دیا اور ہر ممکن ذریعہ سے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے جد و جہد کرتا وہ آخر وقت تک اپنا نصب العین سمجھتے رہے۔

حکیم صاحب مرحوم، خاندانی رئیس تھے، رئیسوں ہی کی صحبت میں رہتے تھے، مگر اُن کا بڑا کمال یہ تھا کہ اُنھوں نے اپنے ماحول کے خراب اثرات کو اپنی طبعی سلامت پسندی و میانہ روی سے ہمیشہ قابو میں رکھا اور اپنے اثر و اقتدار سے نوعِ انسانی اور ملک و ملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے۔ انکسار و تواضع، حلم و بردباری، سیر چشمی و فیاضی، متانت و سنجیدگی، اور قدیم مشرقی تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے اُنکی ذات اس دَورِ انحطاط میں مغتنمات میں سے تھی۔

مبارک ہیں وہ لوگ، جو دنیا میں ایسی اچھی مصروفیتوں میں زندگی بسر کریں اور اتنی عظیم کامیابیاں حاصل کر کے رخصت ہوں۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

کے بموجب، جو کام اُنکے رہ گئے ہیں اُن میں سے فوری توجہ کا مستحق جامعۂ ملیہ اسلامیہ ہے۔ جامعہ کو علی گڈھ سے دہلی اُٹھا لانے کے بعد حکیم صاحب مرحوم نے اسکی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں اور زندگی وفا کرتی تو اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ طبیہ کالج کی طرح یہ قومی یونیورسٹی بھی اُنھیں کے ہاتھوں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جاتی۔ مگر قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ چنانچہ حکیم صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد نہایت بجا طور پر سردارانِ قوم و بہی خواہانِ ملک کی توجہ اس اہم کام کی طرف منعطف ہوئی ہے، اور اُمید کرنا چاہیے کہ انشاءاللہ بہت جلد اسکے لیے ضروری سرمایہ کا انتظام ہو جائے گا۔ حکیم صاحب مرحوم جیسے باکمال بزرگ کے لیے حقیقتاً کسی قسم کی یادگار قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اُنکی زندگی بجائے خود ایک یادگار ہے، لیکن اگر کوئی یادگار قائم کرنا ہے تو پھر اس قومی یونیورسٹی سے بہتر کیا یادگار ہو سکتی ہے۔

حکیم صاحب مرحوم میں منجملہ دوسری خوبیوں کے ایک بڑی صفت یہ تھی کہ سفارش کے ذریعہ سے وہ ہزاروں ضرورتمندوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف کو بھی مرحوم کی اس صفت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا تھا، اس لیے یہاں اس کا تذکرہ بے موقع نہ ہوگا:

موسیو سیدیو فرانسیسی کی تاریخ عرب کا ترجمہ شایع کرنا منظور تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں بھوپال جانے کا

اتفاق ہوا تو کرسی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ کے مشورہ سے علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں اس کی طباعت کے لیے درخواست اعانت پیش کی گئی۔ مگر علیا حضرت نے فرمایا کہ اس وقت موقع نہیں ہے۔ اتفاق سے اسی دن حکیم صاحب مرحوم بھوپال پہونچے۔ رات کو محمد امین صاحب کی معیت میں میں بھی شرف نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب محل سلطانی سے واپس تشریف لائے اور اثنائے گفتگو میں محمد امین صاحب سے کہا کہ آپ نے جس کتاب کے لیے درخواست اعانت پیش کی تھی سرکار عالیہ نے اسکے لیے چھ سو روپیہ عطا فرمانے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ بعد کو مرحوم کے بیان سے یہ منکشف ہوا کہ اگرچہ انکو اس درخواست کا کوئی علم نہ تھا مگر خدا معلوم کیسے بیگم صاحبہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ حکیم صاحب اس درخواست کے مؤید ہیں اور چونکہ علیا حضرت کو ان کی خاطرداری کا خاص خیال تھا اس لیے حکیم صاحب سے ملاقات کے دوران میں از خود فرمایا کہ آپ نے جس کتاب کے لیے سفارش کی ہے اس کے واسطے چھ سو روپے منظور کیے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب نے یہ خیال کر کے کہ کسی کا کام بن جائے گا فوراً علیا حضرت کی اس عنایت و توجہ کا شکریہ ادا کیا اور لاعلم محض ہونے کے باوجود یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ انکو اس درخواست سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دلی دعا ہے کہ مرحوم کو جنت نعیم سے سرفراز کریں اور انکے پسماندگان علی الخصوص انکے فرزند ارجمند حکیم محمد جمیل خاں صاحب کو توفیق صبر عطا فرمائیں۔ آمین۔

امید ہے کہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب بھی اپنے پدر نامدار کے نقش قدم پر چل کر قوم و ملک کی خدمت میں وہ درجہ امتیاز حاصل کریں گے اور ہر طرح اہل ہند اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے وہ حکیم صاحب مرحوم کے نعم البدل ثابت ہوں گے۔

دوسرا حادثہ وہ بدبختانہ افتراق ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مسلمان سرداروں میں رونما ہوا۔ ایک طرف سائمن کمیشن کی تحقیر آمیز ٹھوکر نے اگر ہندوؤں کے بعض ایسے سرداروں کو اتحاد کی راہ دکھا دی جو کل تک فرقہ وارانہ جذبات برانگیختہ کر کے ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد عمل ناممکن بنانے اور اس طرح اپنی گم گشتہ راہی نمایاں کر رہے تھے تو دوسری طرف وہ لوگ جو کل تک ہندوؤں سے گفت و شنید کرنے اور ان سے مسلمانوں کے حقوق منوانے کے لیے دوش بدوش کام کر کے جماعتی یکجہتی کی ایک اچھی مثال پیش کر رہے تھے آج نہایت ہی سطحی اور غیر وقیع بنیادوں پر لڑ جھگڑ رہے اور ساری قوم کو دو گروہوں میں منقسم کرنے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں

سر شفیع کی رہنمائی میں، نواب محمد یوسف (وزیر صوبۂ متحدہ) ملک نون خاں (وزیر پنجاب) او مسٹر غزنوی (معزول شدہ وزیر بنگال) اور سرکار دولتمدار کے دو نامی خدمتگاروں خواجہ حسن نظامی اور اور مولانا انیس احمد موجد آل انڈیا مسلم فیڈریشن کی جدوجہد سے لاہور میں ایک جلسہ مسلم لیگ کے نام سے منعقد کرکے ایک نئی آل انڈیا مسلم لیگ بنائی گئی ہے جس کا مقصد وحید یہ ہوگا کہ حکومت کے منشا و مقصد کے مطابق مسلمانوں کی جانب سے سائمن کمیشن کے مقاطعہ کو ناکامیاب بنایا جائے۔

اس جماعت سے توقع بھی اسی قسم کی حرکتوں کی ہوا چاہیے تھی۔ البتہ افسوس ہوتا ہے کہ حسرت و اقبال کی سی ہستیاں بھی اس تماشہ میں حصہ دار بننے پر رضامند ہوئیں، اور لاہور کے جدید روزنامہ انقلاب نے جسکے لائق ایڈیٹروں سے ملک و قوم کی بہترین توقعات وابستہ تھیں اس جماعت کی ہمت افزائی گوارا کی۔

حسرت خدا انکی مغفرت کرے، عرصہ ہوا کہ سیاسی حیثیت سے مرحومین میں شمار ہونے کے مستحق ہوگئے ہیں۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی سے تو انکو عداوت تھی ہی، اب مسلم لیگ کے ساتھ بھی وہ اتحاد عمل نہیں کرسکتے۔ اور چونکہ غریب نے لیڈری کا پیشہ اختیار کرلیا ہے، اس لیے ناممکن ہے کہ خاموشی کی زندگی بسر ہو۔ قوم کی خدمت سیاسی نہیں ہوسکتی تو سیاسی بھوت بنکر قومی سردار کو پریشاں کیوں نہ کیا جائے۔ العظمۃ للہ

اقبال کا شاعری کے کمالات پر قناعت نہ کرنا اور سیاسیات کے اکھاڑے میں کود پڑنا مسلمانان ہند کی انتہائی بدنصیبی کی دلیل ہے، اور وضع شئی غیر محلہ کی اس سے واضح تر مثال ملنا آسان نہیں اے خدا ہمیں ہمارے دوستوں سے بچا! ورنہ حسرت کو خان بہادر، اور اقبال کو عدالت العالیہ پنجاب کا جج کردے!

اس پرچہ میں مسٹر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی مصنف دنیائے افسانہ کا ایک تنقیدی مضمون بطور مستقل رسالہ کے شایع کیا جارہا ہے۔ دنیائے افسانہ پر مفصل ریویو کی ابھی نوبت نہیں آئی جس سے اندازہ ہوسکتا کہ جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کے ادبی کارنامے کس قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، اور بوستان خیال جیسی کتابوں کو تعلیمیافتہ اصحاب نے اب تک قابل اعتنا نہیں سمجھا، بلکہ وہ محض عوام الناس کے دل بہلانے کا ذریعہ سمجھی جاتی رہیں، حالانکہ اگر سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے تو انکے مصنفین کی جانکاہی اور دماغ سوزی شاید ایسی عبث و بیکار نہ ظاہر ہو۔

عمرو عیّار

اُردو ادبیات میں اعلیٰ ظریفانہ تحریروں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ ادب لطیف کا دامن بھی اس چیز سے خالی نظر آتا ہے حالانکہ ہمیں اس قسم کی تحریرات کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارے شاعر ہجو کی سرحد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ شاعری کی طرح افسانوں میں بھی اعلیٰ پایہ ظرافت نگاری کے نمونے کمیاب ہیں۔ ادنیٰ درجے کے مذاق تو شاید ہر جگہ دستیاب ہو جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی تحریریں بھی ادب عالی میں داخل ہو سکتی ہیں، یا کم سے کم ادبیات ہی کا جزوِ بدن بننے کی قابلیت رکھتی ہیں؟ اعلیٰ ظریفانہ تحریریں تو ہر زبان میں وہی رتبہ حاصل کر لیتی ہیں جو شاعری یا افسانہ نگاری کو حاصل ہے۔ اور یہ ایک بڑی حد تک ادب اور زبان کی خدمت کرتی ہیں۔ لیکن ادنیٰ مذاق ادبیات کے لیے باعث ننگ بن جاتا ہے۔ اگر کسی زبان کے ادب کو ہم ایک جسم سے تشبیہ دے سکیں، تو ظریفانہ تحریریں یقیناً اُسکی روح رواں کہلانے کی مستحق ہیں۔ جن سے ادب میں لطافت اور زندگی کی ایک لہر پیدا ہو جاتی ہے۔

شاید ہی کوئی دماغ ہوگا جو اعلیٰ مذاق سے حظ نہ حاصل کرتا ہو، لیکن ظریفانہ تحریروں کی اہمیت کا اندازہ کچھ وہی شخص خوب لگا سکتا ہے، جس نے اپنی حیات کے لیے ایک سخت نظامِ عمل مرتب کر لیا ہو۔ اور جسکے پاس تفریحات کا وقت بمشکل نکل سکتا ہو۔ ایسے دل اور دماغوں کے لیے یہ تحریریں دراصل "زندگی کا وقفہ" ہیں، جو اُنکو "دم لیکر آگے چلنے" پر مستعد بنا دیتی ہیں۔

اُردو میں ایک جانسن، ایک برک، ایک کارلائل، ایک اسکاٹ وغیرہ تو مل بھی سکیں گے لیکن ایک سوئفٹ، ایک اڈیسن اور ایک والٹیر کا ملنا مشکل ہے۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو، کہ اُردو ادب کو زمانہ نے اس طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ قدیم اخلاقی تعلیمات نے اُردو کے ارباب حل وعقد کے مزاجوں میں اس قدر سنجیدگی پیدا کر دی تھی کہ انکے نزدیک ظرافت، مسخرہ پن کے مترادف، اور اس لیے ایک ذلیل چیز سمجھی جاتی تھی۔ انکی نظروں میں مرزا انشاءاللہ خاں یا جرأت جیسے صاحب قلم کی تحریریں نظر تا "چوا چانی" دکھائی دیتیں۔ جان صاحب اور رنگین وغیرہ تو "نرے بھانڈ" تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فضا کے درمیان لطیف اور ظریف تحریروں کے میدان میں اُتر کر، کون ملامت کے تیروں کا ہدف بننا قبول کرتا؟ ایک ادبی حیات کو خطرے میں

ڈال کر، اس میدان میں اُترنے والے کے لیے نہایت قوی اخلاقی جرأت کی ضرورت تھی۔

رنگین، جرأت وغیرہ اور سب سے پیش پیش مرزا انشاء نے اس میدان میں اُترنے کی ضرور کوشش کی، لیکن کچھ تو طبیعت کی شدت، بگڑے ماحول اور معیار کے فقدان کی وجہ سے انکی تحریریں انتہائیت کے نقطے تک پہونچ گئیں اور کچھ روشن خیالوں کی بے توجہی نے انکے اس جذبہ کو کما حقہٗ نشو و نما پانے نہیں دیا۔ اگر انشا اور اُنکے معاصرین کو اس کا پورا خدشہ ہوتا کہ انکی ادبی کاوشوں کی داد سوسائٹی میں کہیں نہیں ملیگی اور انکی متاعِ علمی کو ہر جگہ مقلوب سکّہ کی طرح پھیر دیا جائیگا، تو یقیناً انکو ایسی تحریریں پیش کرنے کی خواہش ہی نہ ہوتی۔ بہرحال کچھ بھی ہو، اسکو قسمت کی ستم ظریفی ہی سمجھنا چاہیے جو چیز انشا کی "ہرفنی" قابلیت کے چہرے پر ایک بدنما داغ سمجھی گئی ہے، وہی انکی اصلی متاع اور یہی اُنکا اصلی کردار تھا!

انشا کی انتہا پسندی نے انکے تابعین کرام کو، راہِ راست سے بھٹکا کر، بدقسمتی سے ہزلیات میں محو کر دیا۔ آغاز اچھا ہوتا، تو اس قسم کی تحریروں کے لیے ایک شاندار مستقبل خیر مقدم کرنے کے لیے یقیناً تیار تھا۔

ادبِ لطیف کی پیدائش کا زمانہ عموماً خوش حالی کا ہوا کرتا ہے۔ اُردو ادب میں یہ زمانہ زبان کا ابتدائی دَور ہے، جو صاحبِ مذاق بزرگوں کی بے توجہی اور اپنے اختصار کے سبب ہاتھ سے جاتا رہا۔ اسکے بعد ہی نئی روشنی کی ضو فشانیوں اور سرسید کی تحریکات نے ساری اُردو فضا میں ایک ایسی ہلچل پیدا کر دی کہ اگلا جمود و سکون اضطراب سے بدل گیا۔ اس بڑی ہستی نے اپنے معاصرین اور تابعین کے آگے اس قدر مشکل اور اہم مطمح نظر نکال کر رکھ دیے، کہ کسی کو ادبِ لطیف کی طرف توجہ منعطف کرنے کی مہلت ہی نہیں نصیب ہوئی۔ سرسید ہی کے دھکّے سے ہم آج تک لُڑھکتے ہوے چلے جا رہے ہیں اور انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کی عمارتوں کے نمونے پر اپنے محلوں میں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اس قدر مصروف ہیں، کہ انکی آرائش و زیبائش کی طرف ہمارا ذہن جا ہی نہیں سکا۔ خود ہماری اپنی ضرورتیں بھی ہماری ان سرگرمیوں میں اضافہ کر رہی ہیں۔

آزاد کا علمی مذاق انھیں کی حد تک رہا۔ افسوس ہے کہ غالب کے "حیوانِ ظریف" کی ادبی زندگی کے بجاے خانگی زندگی ظرافت میں زیادہ بسر ہوئی، ورنہ ایک اعلیٰ ظریفانہ ادب کا اُردو زبان میں اضافہ یقینی امر تھا۔ اس شعبۂ ادب میں قحط الرجال پر نظر کرتے، جو کچھ صاحبِ مذاق بزرگوار اس طرف توجہ کر رہے ہیں وہ غنیمت ہیں۔ سجاد حسین، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، مسٹر پطرس،

عظمت اللہ[1] خاں، مرزا فرحت اللہ بیگ (مرزا الم نشرح) نے جس لطیف ادب کی تخلیق پر کمر باندھی ہے وہ اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اور اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو انھیں متذکرہ بالا حضرات کے نقش قدم پر چل کر ایک جدید دنیا کی فتوحات کا سنگ بنیاد رکھیں۔

(۲)

یہ تمہید ایک جملۂ معترضہ تھی۔ مقصد اس کا اُردو ادب کے واحد ظریفانہ کردار پر روشنی ڈالنا ہے۔ ان حضرت کی بھی عجب ہستی ہے جنکا اسم گرامی زیب دہ عنوان ہے۔ اُردو زبان کے جاننے والوں میں کون ایسا ہوگا جس نے آپ کے سوانح حیات کو ایک سے زیادہ مرتبہ مزے لے لے کر نہ پڑھا ہوگا۔ عمرو عیار ظریف ادبی کردار کے زندہ نمونوں کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کردار کی پیدائش کے وقت معلوم نہیں کہ مصنفِ قصہ کا طائرِ تخئیل کس بلند پروازی میں مشغول ہوگا کہ حمزہ کی مہمات کی چار ضخیم داستانوں میں اس کا ذکر ہر جگہ یکسانیت کے ساتھ وراۓ فطری[2] آن بان میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا؟

یہ کردار اپنی انفرادی نوعیت میں ایسا یکتا ہے کہ اسکی مثال دُنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتی۔ کیونکہ عمرو عیار کا ماحول سوائے اُردو زبان کے اور کونسی زبان میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہر دلعزیزی کے لحاظ سے اگر کوئی دوسرا ادبی کردار عمرو عیار کا مدمقابل ہو سکتا ہے تو وہ انگریزی زبان کا فالسٹاف ہے۔ عمرو عیار کی طرح فالسٹاف کی شخصیت بھی صرف نام کی حد تک تاریخ کی ممنون احسان ہے۔ باقی دوسرے واقعات محض افسانہ ہیں۔ فالسٹاف کے کردار نے اپنی ظریفانہ سرشت کی اعلیٰ پائگی کے سبب سے بڑے بڑے ادیبوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ شکسپیر کا مشہور نقاد مورمن تو فالسٹاف کو "دنیائے ادب کا سب سے زیادہ ظریف کردار" تصور کرتا ہے۔ ہم کیوں اپنی پیداوار کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان نہ ہوں؟ ہماری نظر میں تو جو عناصر فالسٹاف کے کردار میں مشاہدہ کرتی ہیں، وہی یہاں بھی پاتی ہیں۔ فرق صرف قدیم اصول اور جدید طرز کا ہے۔ ہمارے پاس عمرو عیار کو فالسٹاف سے زیادہ دلچسپ سمجھنے کی بھی ایک وجہ ہے کہ اول الذکر ہماری طرز معاشرت کا آئینہ ہے

اگر عمرو عیار کے کردار کی عام دلچسپی پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اندر ایک عنصر لگاوٹ ہی

[1] اس مضمون کے لکھے جانے کے وقت تک آپ ہمارے ساتھ تھے لیکن افسوس کہ اب خداوند تعالی کے جوارِ رحمت میں ہیں۔

[2] Preter natural

جو باوجود بعض اسقام کے ہمارے دلوں کو اسکی طرف کھینچ رہی ہے۔ اور یہی دلچسپی ہمارے اخلاقی احساس کو بھی متاثر کرتی ہے۔ جسکی وجہ سے ہم اسکی ان تمام بدمعاشیوں کو بھی مستحسن نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں، جن میں ظرافت کی ذرا سی بھی چاشنی موجود ہوتی ہے۔ عمروعیار کے کردار کی دلچسپی کا ایک بڑا راز یہ بھی ہے کہ عام حالت سے اسکی بیگانہ روی ہمارے خیالات کو اپنی چالبازیوں میں زیادہ اُلجھا لیتی ہے۔ جب ہم ٹھنڈے دل سے اخلاقی عینک لگا کر اسکے کرداری عناصر کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں، تو مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ حریص، بزدل، شریر اور دغاباز ہے۔ لیکن جب ہم اسکے سامنے ہوکر اسکی حالت کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں تو معلوم نہیں کہ ہماری اخلاقی جرأت کہاں چلی جاتی ہے کہ ہم ان اصولوں کا انطباق اُسکے افعال پر نہیں کرنا چاہتے۔ اسکی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ اسکی ظرافت اپنی دلچسپیوں کے ہاتھوں بیچ دیتی ہے۔

عمروعیار کا کردار عجیب مختلف اور متضاد صفات کا مجموعہ ہے۔ وہ نوعمر بھی ہے اور بوڑھا بھی، دُبلا بھی ہے مگر مقابلے پر تیار۔ بدمعاش ہے لیکن بدطینت نہیں۔ اسکی زندگی کا کوئی اصول نہیں تاہم وہ ہر کام میں مستعد ہے۔ ظاہر میں تو بُزدل نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ جھوٹ کہنے سے اُسے کوئی عار نہیں، لیکن اسکے ذریعہ کبھی وہ ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں ہوا۔ وہ ایک سپاہی ہے جسکو عزت کا خیال نہیں۔ شریف النفس ہے لیکن شرارت اسکی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ خلاف توقع صفات کا اجتماع اسکی حیات کے دوران میں ہر جگہ ایک حیرت انگیز فضا پیدا کرتا جاتا ہے جسکی توقع ہم کو پہلے سے نہیں ہوتی۔ جزیرۂ سراندیپ میں اس کے کارنامے کس قدر خوش کن اور حیرت خیز پیرایہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسکی چالاکی شاید سب سے زیادہ تعجب خیز چیز ہے جسکی بدولت وہ بزرجمہر جیسے عالم کو بھی اپنی عمر میں ایک مرتبہ ضرور سبق سکھا گیا ہے۔ چالاکی اور ظرافت کا کسی ایک کردار میں باہم موجود ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ ادبی کرداروں میں بہت سے ایسے کردار ملیں گے جن میں متذکرہ بالا صفات میں سے صرف ایک موجود ہوتی ہے۔ لیکن عمروعیار کے کردار میں ان دونوں کی آمیزش ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اسکی ظرافت اسکے افعال کو اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔ ایک خاص بات قابل دید یہ ہے کہ ظرافت نہ صرف خود اس کردار میں مضمر ہے، بلکہ اسکے اثر سے دوسرے کردار میں ظرافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے اور بختک کے تعلقات اس نظر سے ملاحظہ ہوں۔

عمروعیار کی زندگی میں اگر کوئی سنجیدہ مقصد ہے تو صرف یہ کہ حمزہ کو خوش کیا جائے۔ بالکل یہی حالت فالسٹاف کی بھی ہے۔ وہ "شہزادہ ہال" کو مسرور کرنے کی خاطر اپنے آپ کو

بھول جاتا ہے۔

(۳)

ادبی تحریروں، خصوصاً ادبی کرداروں میں ظرافت پیدا کرنے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلا اور سب سے آسان طریقہ شخص قصہ کی بول چال میں ظرافت کا پہلو پیدا کر دیا ہے۔ اسکی ایک عمدہ مثال آغا صادق[1] کا کردار ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ظرافت اُن الفاظ میں رکھی جاتی ہے جو مصنف خود شخص کے بیانات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسکی توضیح اُن ناولوں سے بخوبی ہو سکتی ہے جو "اودھ پنچ" میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ مُلّا رموزی کی تحریریں بھی ظرافت کی چاشنی الفاظ کے نشست و برخاست سے پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے آخری قسم کی ظرافت کی وہ ہے جو شخص قصہ کے افعال اور اقوال سے بحیثیت مجموعی ظاہر ہو۔ عمرو عیار کے کردار کی ظرافت بھی اسی قسم کی ہے۔ آپ اسکی پوری سوانح عمری پڑھ لیجیے، آپ محسوس فرمائیں گے کہ عمرو عیار کے کردار میں ظرافت کی پیدایش مصنف کے ذاتی بیانات کی بہ نسبت خود اپنے مجموعی حالات پر زیادہ منحصر ہے۔ مصنف کے بیانات کے کسی انفرادی حصہ میں ظرافت پوشیدہ نہیں۔ بلکہ واقعات زندگی بحیثیت مجموعی ایک سادہ مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ خیال کرنا محض غلط ہے کہ ظریفانہ تحریریں وقتی مطالعہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ جن حضرات کا یہ خیال ہے اُن کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ مُلّا رموزی، رشید احمد صدیقی یا مرزا فرحت اللہ بیگ کی اُن تحریروں کو اپنے مطالعہ میں رکھیں جو سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل پر حاوی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ جس طرح سنجیدہ تحریریں ہمارے خیالات کو عمر بھر کے لیے اپنے آپ میں جذب کر لینے کی قابلیت رکھتی ہیں، اسی طرح بعض ظریفانہ تحریریں بھی ہمارے تھکے ماندے دماغوں کو لطف مسرت سے مالا مال کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتی ہیں۔ کردار عمرو میں جو ظرافت پوشیدہ ہے، وہ ہم کو ہر وقت ایک نئی طرح مسرور کرتی ہے۔ اسکی خاص وجہ یہاں یہ ہے کہ اسکی شرارتوں میں اس قدر رنگا رنگی اور بوقلمونی مدنظر رکھی گئی ہے، اور خود اسکی حیات اس قدر طولانی ہے کہ ہم ایک حصہ کو ختم کر کے دوسرے حصہ تک پہونچتے پہونچتے، پچھلے واقعات کو بھول جاتے ہیں۔ گو اُن کا اثر ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہتا ہے۔ یہی ہمارے دلوں کو مجبور کرتی ہے کہ جب ہم داستان ہاتھ میں لیں، ایک دو واقعات صرف اُسکی عیاری کے کارناموں کے ضرور پڑھ لیں۔

---

[1] "آغا صادق کی شادی"

داستان کے قصے کا پلاٹ ذاتی اور خاندانی عناد کی وجہ سے دو جماعتوں کی کشمکش کا ایک نتیجہ ہے۔ ظاہر میں یہ عناد النقش (پدر بختک) کے بخت جمال کو مارنے اور بزرجمہر ابن بخت جمال کے النقش کو قتل کرنے کی وجہ سے ان دونوں خاندانوں کے اخلاف یعنی بختک اور بزرجمہر کے درمیان پیدا ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آگے چل کر بزرجمہر کے ساتھ جب حمزہ کی جماعت بھی مل جاتی ہے تو یہ ذاتی اور خاندانی عناد قومی پشت پناہی بھی حاصل کر لیتا ہے۔ غرض یہ دو مخالف اور مرکزی قوتیں آپس میں کشمکش شروع کرتی ہیں۔ جسکے اظہار کے لیے نوشیروان عادل شہنشاہِ ایران کی زبردست شخصیت ایک عجیب افسانوی طرز میں 'زمین یا "دنگل" بنائی گئی ہے۔ امیر حمزہ کی پارٹی کا اثر، اسکی خوبیوں کی وجہ سے نوشیرواں پر فطرتاً پڑنے لگتا ہے۔ دوسری طرف بختک متمنی ہے کہ یہ اثر زائل ہو کر خود اپنا عمل دخل ہو جائے۔ بختک کا مطمح نظر ذاتی یا قومی مفاد نہیں بلکہ وہ صرف اُن بدبخت اور حاسد انسانوں کا ایک نمونہ ہے جنکی تمنا محض یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اپنے مقابل کو پست کیا جائے، خواہ اس میں خود اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ اُسکی زندگی اُن شریر النفس آدمیوں کی ایک اچھی مثال ہے جو مخالفت کو کسی مقصد کا ذریعہ نہیں، بلکہ خود مقصد بنا کر لوگوں سے اُلجھ جاتے ہیں۔

اگر ان دو مخالف جماعتوں میں سے ایک بھی وجود میں نہ آتی تو پلاٹ موجودہ شکل اختیار ہی نہیں کر سکتا تھا

متذکرۂ بالا کشمکش تو اصلی اور مرکزی ہے، لیکن اسکے علاوہ قصہ نگار نے ایک اور لطیف اور ضمنی کشمکش کے اضافہ سے قصہ کے دلچسپ پہلو کو سہارا دینے کی کوشش کی ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تجربہ کام دے سکتا ہے۔ ہم کہ سکتے ہیں قصہ نگار کا یہ مقصد بوجوہ احسن تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔ اس ضمنی کشمکش کی دو مخالف جماعتوں میں ایک طرف جناب عمرو عیار رہیں، اور دوسری جانب بختک کی ذات مشترک ہے۔

عمرو اور بختک کی دشمنی کسی ذاتی، خاندانی یا قومی احساس پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وہ امیر حمزہ کے ساتھ عمرو کی دوستی کا لازمی نتیجہ ہے۔

غرض اس طرح تمام داستان کے اشخاصِ قصہ دو وسیع جماعتوں پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں:۔

(۱) بختک کی جماعت (۲) حمزہ کی جماعت۔ ان دونوں کی مساعی کا مرکز و محل نوشیروان عادل کی

ذات ہے۔ قصہ میں کچھ مدارج طے ہو جانے کے بعد عشق و عاشقی کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے جو افسانوں کا جزو لاینفک ہے۔ اس منزل سے ہماری مرکزی دلچسپی امیر حمزہ اور ملکہ مہرنگار بنت نوشیرواں عادل کے عشقیہ حالات میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے قصے کے دو اجزاء ایک دوسرے سے ممیز ہو جاتے ہیں۔ حمزہ کا مرکز نظر اب نوشیرواں نہیں رہتا، بلکہ اسکی دلچسپی ملکۂ مہرنگار کے ساتھ متعلق ہو جاتی ہے۔ مگر بختک کا مقصد اب بھی وہی باقی ہے۔ وہ حمزہ اور مہرنگار کے تعلقات سے ڈرتا ہے کہ کہیں یہ شگوفہ رنگ نہ لائے، اور حمزہ نوشیرواں کا داماد بن کر اسکے دل و دماغ کا مالک نہ بن بیٹھے۔ اسی لیے وہ حمزہ کا بدستور پیچھا کرتا ہے۔ اور چونکہ خود اپنی کوششوں سے حمزہ کو شکست نہیں دے سکتا۔ اس لیے وہ زبردستانہ کارروائیوں یعنے سازشوں کے شرمناک راستوں سے نوشیرواں کی جانب بڑھتا ہے اور اس مہتم بالشان قوت کے ذریعہ اپنے مخالف کو تنگ کرتا ہے جو خود اسکی اور حمزہ دونوں کی قسمتوں پر حکمراں ہے۔ اسی اندھا دھند مات خبط میں جا بجا اس کی ہمارے ہیرو سے مٹ بھیڑ ہوتی جاتی ہے۔

اس "شہنشاہ عیاراں" کی مساعی کا ماحصل امیر حمزہ کو بامراد دیکھنا ہے۔ حمزہ سے اسکو دلی محبت ہے۔ جسکا تفصیلی ذکر ہم آیندہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے وہ یہ نہیں دیکھ سکتا کہ ایک کمزور سازشی ہستی کا وار امیر حمزہ پر چل جائے۔

ممکن تھا کہ قصہ نگار امیر حمزہ کے اس معاون عنصر کو انہیں کے یا انکے ساتھی مقبل کے سنجیدہ لباس میں پیش کرتا، لیکن یاد رہے کہ یہ قصے کی موت تھی۔ کیونکہ تمام قصے میں سوائے عمر و عیار کے کردار کے شاید ہی کوئی چیز ایسی ہوگی، جو تمام دنیا اور ہر شخص کے لیے ہر زمانے میں دلچسپی رکھنے والی ہو۔

(۵)

داستان کے اشخاص قصہ کو جماعتوں کی حیثیت سے جانچنے کے بعد ہم انکے مدارج کی اہمیت کے لحاظ سے قائم کریں گے، تاکہ زیر بحث کردار کا وزن ہم آسانی کے ساتھ معلوم کر سکیں۔ اس زاویۂ نظر سے اشخاص قصہ کے حسب ذیل مدارج ہونگے

(۱) نوشیرواں۔ یہ قصے کے دو مخالف عناصر کا درمیانی واسطہ ہے۔ اسی کی ذات تک پہونچنے کے لیے دونوں جماعتیں مختلف راستوں سے اپنی پوری قوت کے ساتھ بڑھتی ہیں۔ لیکن یہ دونوں کی قسمتوں کا مالک اور دونوں پر حکمراں ہے۔ حمزہ اور بختک کے اثرات

اسی کے ذریعہ ایک دوسرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ اسکے نفاذ کے لیے اسکی منظوری کی ضرورت ہے۔ وہ دونوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ایسی ایک اعلیٰ قوت کی قصے کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے سخت ضرورت تھی۔

(۲) نوشیرواں کی حالت ایک صدر جمہوریت کی تھی۔ لیکن اصلی کارکن حمزہ اور بختک ہیں۔ اور حقیقت میں اصلی اشخاص قصہ یہی کہلا سکتے ہیں۔ ان میں سے امیر حمزہ کے کردار کو قصہ نگار زیادہ مہتم بالشان کرکے دکھانا چاہتا تھا۔ اسی لیے بختک کی ذات پر امیر حمزہ کے کمالات کے اظہار کے لیے بطور آئینہ کے استعمال کی گئی ہے۔ قصہ نگار کا اصلی مطمح نظر بھی امیر حمزہ کی مقدس شخصیت ہے۔ اور وہ ہر معرکہ میں انھیں کو فتحمند دکھانا چاہتا ہے۔ اسکے برخلاف بختک کی تمام کوششیں امیر حمزہ کے سامنے اور انکے مقابلہ میں پست اور بے سود ثابت کی گئی ہیں۔ بختک کی مساعی کو دیکھ کر غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

نالاں یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

(۳) تیسرے درجے کے کرداروں میں عمرو عیار اور بختک رکھے جاسکتے ہیں۔ کرداروں کا یہ طبقہ محض اول الذکر سنجیدہ قسم کے کرداروں کے موازنہ کی خاطر قائم کیا گیا ہے اور یہی "داستانِ امیر حمزہ" کا ظریفانہ پہلو ہے۔ اس فضا کی روح رواں اور اس حصۂ داستان کا ہیرو عمرو عیار ہے۔ غریب بختک یہاں بھی عمرو کے کمالات کے لیے ([illegible]) کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے اور حقیقت میں حمزہ کا صحیح مخاطب بختک نہیں بلکہ نوشیرواں ہے اور عمرو عیار کا مد مقابل بختک ہو سکتا ہے نہ کہ اور کوئی دوسرا۔ عمرو کے اوصاف بلکہ خود اسکے کردار کے ظاہر کرنے میں بختک کی ناعاقبت اندیشیوں کو ایک بڑی حد تک دخل ہے۔

(۶)

یہ امر خاص طور سے توجہ طلب ہے کہ قصہ نگار کا خیال کسی حال میں بھی عمرو عیار کے کردار کو اس قدر اہم صورت عطا کرنے کا نہ تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ امیر حمزہ کی تاریخی شخصیت کو تمام افسانوی اور تصوری کمالات میں ملبوس کرکے دنیا کے سامنے (بلکہ زیادہ صحیح ہوگا کہ "اپنے مخاطب کے سامنے" پیش کرے۔ امیر حمزہ کا ذاتی تقدس بھی اس میں شک نہیں کہ قصے کے اثرات کو مستقل بنا رہا ہے۔ ہمکو اس کا یقین ہے کہ اپنے زمانے میں قصہ نگار کی یہ کوشش مستحسن نظروں سے دیکھی جاتی ہوگی۔ لیکن اردو داںوں کی ذہنیت میں اب اس قدر عظیم الشان انقلاب ہو چکا

ہو چکا ہے کہ وہ اس قسم کے نرے تخیلات کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے کی اپنے آپ میں صلاحیت نہیں پاتے ۔ یہی وجہ ہے کہ حمزہ کی تاریخی شخصیت، بہ حیثیت شخص قصہ ہمارے لیے مردہ ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس ہستی کو مصنف صرف ایک افسانوی اور وقتی دلچسپی کا سبب بنانا چاہتا تھا۔ وہ بقائے دوام کے سر منزل تک پہنچتی نظر آ رہی ہے۔ یہ امر بھی ادبیات کے تعجبات میں سے ایک ہے۔ " قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است"۔

حمزہ کے کردار میں کیا چیز ہے جو موجودہ ذہنیتوں کو اپیل کر سکتی ہے؟ لیکن اسکے خلاف جن عناصر سے عمرو عیار کا کردار پیدا کیا گیا ہے' ان میں زیادہ ایسے ہیں' جو کسی خاص زمانے کے لیے مخصوص یا کسی خاص جماعت کو متاثر کرنے والے نہیں ہیں۔ اور یہی ایک ایسی چیز ہے جو ادبی تحریروں کو فنا کے درجے سے بلند کر دیتی ہے۔

ان تفصیلات کو پیش کرنے کے بعد ہم عمرو عیار کے کرداری عناصر کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ خیال رہے کہ عمرو عیار ایک داستان کا شخص قصہ ہے۔ تاہم دیکھنا چاہیے کہ جو خوبیاں اس میں مضمر ہیں وہ کہاں تک موجودہ کردارنگاری کے اصول پر ٹھیک اُتر سکتی ہیں؟

(۷)

داستان حمزہ اپنے وسیع معنوں میں تاریخی افسانہ ہے۔ جسکے تمام بڑے بڑے کردار نوشیرواں' امیر حمزہ، قباد، بزرجمہر' عبدالمطلب وغیرہ تاریخی شخصیتیں ہیں۔ قصہ کا پلاٹ بھی مدائن کا تاریخی شہر دکھایا ہے جو ایران قدیم کا ایک عظیم الشان شہر ہے۔ قصہ کی عام فضا پر بھی ایرانی تاریخ کا رنگ غالب ہے۔ شاید یہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کہ قدیم ایرانی تمدن کے چوکھٹے میں " مغل ہندی" معاشرت کی تصویریں قائم کی گئی ہیں۔ حمزہ کے کردار کو اُٹھاتے وقت مصنف کے دماغ پر شاید "شاہنامہ" کے ہیرو رستم بن زال کا خیال غالب تھا۔ نوشیرواں ضرورت داستان کو پورا کرنے کی غرض سے ایک عجیب اور مہمل سے دُور شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ بزرجمہر کا کردار بھی حقیقت سے دُور جا پڑا ہے۔ غرض قصہ نگار تاریخ سے سوائے چند ناموں کے دوسرے واقعات کا احسان کش ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے داستان کو تاریخی حقائق سے بہت کم سروکار رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ اصول کے اعتبار سے تاریخی اشخاص قصہ میں ہم حسب دلخواہ تبدیلی پیدا کر لینے کے مجاز ہیں' لیکن یہ رعایت محض اُنکی خانگی زندگی تک محدود ہے۔ انکی پبلک زندگی میں دست اندازی کرنے سے

محترز رہنا چاہیے۔

داستان کے تاریخی پہلو کو چھوڑ کر ہم افسانوی پہلو کو جانچتے ہیں۔ یہ حصہ داستان کا نہایت دلچسپ ہے اور محض تخلیقی۔ اس حصہ کا ہیرو عمرو عیار بھی تخلیقی پیداوار ہے۔ قصہ نگار حقیقت سے ضرور آشنا ہے کہ تاریخی شخصیت سے زیادہ خیالی مخلوق کے ساتھ اپنے حسب صوابدید عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اُسکو اس امر کا خوف نہیں تھا کہ ایسے کردار کے متعلق بے سروپا باتیں بیان کرنے سے کوئی اُسکا معترض ہوگا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، عمرو عیار کے کردار کی پیش کشی میں قصہ نگار کی قابلیتیں بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئیں۔ اُردو ادب کا ظریفانہ شعبہ بھی عمرو کی پیدائش کا ممنون ہے۔ اسکا نہ ہونا اُردو افسانوں کے لیے ایک خسارہ تھا۔

یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ عمرو عیار کا کردار قطعاً فوق فطری ہے، مناسب نہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اسکی حیات میں جو عناصر فوق الفطرت شامل کیے گئے ہیں، اسکی سیرت کو ایک واقعی اور اصلی سیرت سے ممیز اور روحانیت سے پُر حیثیت عطا کرتے ہیں۔ لیکن اس عنصر کے دُور کرنے کے بعد بھی اسکے چند فطری اوصاف ایسے باقی رہ جاتے ہیں کہ جو اگر کسی نئے شخص قصہ سے چسپاں کر کے آجکل کے ناولوں کے ذریعہ پیش کیے جائیں تو یقین ہے کہ یہ ایک نہایت دلچسپ چیز ہوگی اور غالباً ایسے کردار کی بدولت ایک ناول ادبیات میں عرصے تک زندہ رہ سکے گا۔

عمرو عیار کے کردار سے غیر فطری اجزا کو دور کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہتا ہے وہ ایک پیشہ ور "عیار" کی سیرت کا حقیقی، دلچسپ اور نہایت خوبصورت فوٹو ہوگا۔ یہاں اس امر کے واضح کرنے کی ضرورت تو نہیں کہ "عیاری" ایک پیشہ کی اہمیت رکھتی ہے۔ جسکا رواج قرون ماضیہ کی اکثر اقوام میں پایا جاتا ہے۔ اس پیشہ کی بنا محض بادشاہوں اور امیروں کی دلچسپی کے لیے ہوئی تھی۔ ہر جگہ یہ پیشہ ایک نئے نام سے ظاہر ہوا۔ یورپ کے اکثر ممالک خصوصاً انگلستان میں بادشاہی عیار "کورٹ جسٹر" کہلاتے تھے۔ اس فرقہ کے دلچسپ کارناموں سے اسکاٹ، شکسپیر وغیرہ کے قصے اور ڈرامے مملو ہیں۔

ایرانیوں نے اس خاص پیشہ میں کس حد تک ترقی کی تھی؟ اسکا ثبوت ہمکو عمرو عیار کی شکل میں مجسم ملتا ہے۔ عیاروں کی زندگی کے اصول اور ضوابط تک موجود تھے۔ انکی خدمت ہمیشہ بادشاہوں کو مسرور کرنا تھا۔ لیکن کبھی کبھی ان سے اہم خدمات بھی لے لیے جاتے تھے۔ وقتاً فوقتاً انھیں صورت تبدیل کرنا بھی پڑتا تھا۔ عیاری میں وہی شخص کامیاب سمجھا جاتا تھا جو چست اور چالاک

اور حاضر دماغ ہو - تیز رفتاری بھی اس طرز زندگی کی لازمی شرط تھی - جنگ کے وقت بادشاہ کے تمام عیار قطار در قطار میدان جنگ میں جمع ہوتے اور دشمن کو شکست دینے میں اپنے ہاتھ سے جو بن پڑتا کرتے - ان کا ایک سردار ان میں انتظام قائم رکھتا تھا - بے وجہ کسی شخص کو مارنا اُنکے مذہب میں گناہ خیال کیا جاتا تھا - کسی کو صرف اس قدر ستایا جاتا تھا کہ وہ بیزار ہو جائے، نہ کہ تکلیف میں مبتلا - عیاروں کی چال اور خود ہیئت کذائی بھی اس قابل ہوتی تھی کہ انکو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آ جائے - ان کا لباس بھی عجیب طرح کا اور قیمتی ہوتا تھا، جسکا ذکر قصہ نگار نے نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے[1] - اس قسم کی تمام معلومات کا واحد ذریعہ ہمارے پاس عمرو عیار کا کردار ہے -

جہاں تک ہمارا علم رہبری کر سکتا ہے، ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں عمرو عیار کا کردار نہ صرف اُردو زبان میں یکتا حیثیت رکھتا ہے بلکہ شاید یورپ کی وسیع ترین زبان بھی اس کردار کا ماثل مشکل سے پیش کر سکے -

(۸)

ادبی کرداروں کی پیدائش کے دو طریقے ممکن ہیں - ایک تو یہ کہ شخصِ قصہ کا مکمل خاکہ پہلے ہی ذہن میں مرتب کر لیا جائے، اور پھر اُسکے مناسب فضا افسانہ میں پیدا کی جائے - دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اشخاص قصہ کے متعلق چند اصولی امور کو پیش نظر رکھ کر قصہ کا آغاز کیا جائے، اور بعد میں حسب ضرورت اور حسب موقع کرداری خصوصیات کا اضافہ ہوتا جائے - پہلی شکل میں قصے کا تمام پلاٹ شخصِ قصہ پر منحصر ہوتا ہے، لیکن دوسری شکل میں شخصِ قصہ پلاٹ کے ارتقا کے ماتحت ہے - پہلی قسم کے قصوں میں افسانہ نگار شخص قصے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے - اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو ہم یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ عمرو عیار کا کرداری نقش قصہ نگار کے ذہن میں آغاز داستان سے پہلے ہی مرتب ہو چکا تھا - کیونکہ عمرو کے کردار کی بعض بے ربطیاں ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہیں - ہاں یہ صحیح ہے کہ عمرو کے کردار کی پیدائش میں وقتی افسانوں کو بڑی حد تک دخل ہے -

عمرو عیار سے تعارف کراتے وقت ہی قصہ نگار ایسے قرائن پیدا کر دیتا ہے کہ پڑھنے والے چونکتے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ کسی انوکھے اور عجیب و غریب شخص سے ملاقات کریں - عمرو عیار کے

[1] اس مقالہ میں جہاں جہاں داستان کے صفحات کے حوالے درج ہیں وہ نولکشور کے مطبوعہ نسخہ ۱۹۱۲ء میں تصور ہوں

کے پدر بزرگوار کا تعارف ہم سے اس طرح کرایا گیا ہے :-

" بشیر رخصت ہو کر اپنے گھر کی طرف چلا - راہ میں آمیہ ضمیری نامی ساربان سے ملاقی ہوا۔ اُس نے بشیر سے پوچھا کہ کہاں سے آتا ہے اور یہ توڑا اشرفیوں کا کیونکر ہمراہ لاتا ہے ؟ اُس نے مفصل حال بیان کیا۔ اُمیہ ضمیری خوشی خوشی اپنے گھر میں گیا اور سارا قصہ سنایا۔ اور وہاں جاکر اپنی جورو سے کہنے لگا کہ " تو ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ میں پیٹ سے ہوں، جلدی لڑکا جن، کہ روپئے اشرفیاں ہاتھ آئیں " اور خوشی خوشی عیش و عشرت میں اٹھائیں "۔ اُس نے کہا کہ " تجھے خیر ہے ! ہوش کے ناخن لے۔ مجھے ابھی ساتواں مہینہ شروع ہے، نوج میرے ابھی لڑکا ہوئے۔ میرے دشمنوں کو اندوں وردپیر کا دھڑکا ہوئے "۔ اُمیہ نے کہا " تو گھانسنا شروع کر البتہ لڑکا ہوگا - اگر آجکل فرزند تولد ہوا تو فہو المراد۔ ورنہ اور دو مہینے کے بعد جو پیدا ہوا تو مجکو فائدہ کیا ہوگا "۔ وہ جھنجلا کے کہنے لگی۔ " مردوے کی عقل ماری گئی ہے ہے۔ دو دن لڑکا جنوا تا ہے۔ دور نظلم۔ عقل کی کوتاہی، مجھے آنکھیں دکھاتا ہے "۔ اُمیہ کو جو طیش آیا ایک لات اُسکے پیٹ پر اس زور سے ماری کہ وہ بیچاری بلبلا کر دو کے مارے لوٹنے لگی - بچہ تو اُسکے پیٹ سے نکل پڑا اور اُسکا دم فنا ہوگیا۔ " (داستان امیر حمزہ - دفتر اول - صـ۳۶)

یہی حضرت عمرو عیار کے باپ ہیں - جنکے سپوت ایسے نہ ہوں تو تعجب ہے - عمرو عیار نے حرص اور آز اپنے باپ سے وراثتاً پائی، جسکا ثبوت اپنی حیات کے دوران میں سیکڑوں طرح دیا ہے - اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ اُمیہ ضمیری ہی سے عمرو نے اس سے زیادہ اوصاف حاصل کیے جتنے سرسری نظر میں ہم معلوم کرسکتے ہیں۔

(۹)

لالچ، بزدلی، ستم ظریفی، دور اندیشی اور رفاقت وہمدردی عمرو عیار کے عناصر اربعہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر قریبی تعلق رکھتی ہیں کہ عموماً ایک کا دوسرے کے ساتھ پایا جانا بعید از قیاس نہیں یہ ایک اصولی بات تھی جس پر مصنف داستان حمزہ کی نگاہ ضرور پڑی ہوگی اگر وہ اوصاف کی فہرست میں زیادتی کی خاطر اسکے ساتھ ساتھ عمرو میں سخاوت، شجاعت وغیرہ بھی شامل کردیتا تو یقیناً کردار کو وہ اہمیت ہی نصیب نہیں ہوسکتی تھی جو اب حاصل ہے - یہی ایک بڑا راز ہے جو عمرو کے کردار کو اپنے معاصرین سے زیادہ طولانی حیات بخش رہا ہے - اور حقیقت تو یہ ہے کہ خود عمرو عیار کے مقدس اور محترم مربی امیر حمزہ صاحبقراں سے بھی زیادہ متاثر

حیثیت عطا کر رہا ہے

ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا تھا کہ بیٹا باپ کا ثانی بلکہ اُس سے افضل ثابت ہوا۔ اور "میراث پدر" کا حقدار ہونے کے لیے عمرو نے "علم پدر" کے شرائط کی بھی تکمیل کر لی۔

زمین پر گرتے ہی اُس کا سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے خواجہ بزرجمہر کی اُنگلی سے انگشتری اُس وقت چرالی جبکہ اُنھوں نے اُسکو خاموش کرنے کی غرض سے اُنگلی منہ میں دی تھی۔ انگشتری اگر ڈھیلی ہو تو اُس کا ایک کمسن لڑکے کے ہونٹوں کے اشارے سے ایسے شخص کی اُنگلی سے نکل جانا جو باتوں میں منہمک ہو، چنداں قابل تعجب تو نہیں۔ یہ سب سے پہلا واقعہ ہے جس سے قصہ نگار نے عمرو عیار کے کردار کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ آگے چل کر تو اس عجیب الخلقت لڑکے نے صرف کھانے پینے کے معاملات میں امیر حمزہ اور مقبل کو چارپائی کے نیچے ڈھکیل کر عامیہ بانو کی دونوں چھاتیوں سے دودھ پینے بلکہ امیر کے جھولے کا ہیرا چرانے اور مہمانوں کے زیورات چھپانے سے بھی اپنی حد سے بڑھی ہوئی حرص و آز کی قوتوں کا ثبوت دیا ہے۔

عمرو عیار کی طمع اس قدر شدید تھی کہ روپیہ پیسہ کے سامنے وہ خود اپنی جان کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ روپیہ پیسہ اُسکے پاس کسی مقصد کا ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ جارج الیٹ کے مشہور ناول "سلاس مارنر" کے ہیرو سلاس مارنر کی طرح اُسکے پاس بھی دولت بذات خود ایک مقصد اور ایک مطمح نظر تھی۔ اور وہ دولت کو اس لیے جمع کرتا تھا کہ وہ دولت ہے سلاس مارنر اور عمرو عیار کے دولت جمع کرنے کی خواہش میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر اسکو اس لیے چاہتا تھا کہ وہ اسکے دل کے گوشہ محبت کو پُر کرتی۔ لیکن موخر الذکر کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچاتی تھی۔ ہندوستان کے سفر میں جب حمزہ کا جہاز گرداب میں پھنس گیا تو عمرو نے جہاز والوں کے ہاتھ اپنی جان روپیوں کے معاوضہ میں فروخت کرنا قبول کر لیا۔ کیا یہ حرص کی انتہائی صورت نہیں ہے؟

ان خلاف عادت مثالوں کو چھوڑ کر بھی اس مجسم حرص و آز کی بعض کارروائیاں ایسی پاکیزہ اور حریص رہنماؤں کی خامکاریوں کا نمونہ ہیں کہ انکو پڑھ کر شاید ہی کوئی شخص دیر تک لطف اندوز نہ ہوا ہو۔ کوہ سراندیپ پر پھرتا پھرتا تھک جاتا ہے اور اس اثناء میں سالم نامی ایک باخدا بزرگ سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ عمرو عیار کو قدم آدم کا راستہ بتلاتے ہیں اور تاکید اً کہدیتے ہیں کہ وہاں کے زر و جواہر پر نگاہ نہ ڈالنا۔ ورنہ راستہ نہ مل سکے گا۔ میاں عیار وہاں سے تو وعدے وعید کرکے راستہ معلوم کر لیتے ہیں، لیکن زیارت سے واپس ہوتے ہیں تو جواہرات کی مصر لگا دیتے

انکے دامن دل کو اس شدت کے ساتھ کھینچ لیتی ہے کہ انکے

"منہ میں پانی بھر آیا۔ دل میں لالچ کر آیا۔ سوچا کہ حضرت آدم کے قدم کی زیارت تو تو کر چکا۔ اب ان جواہرات کو لیکر یہاں سے جلدی اپنے لشکر کی راہ لے۔ یہاں کون دیکھتا ہے؟ کون قید کرکے لیجاتا ہے۔ کملی بچھا کر تمام جواہرات کو سمیٹا۔ لیکن جب دروازہ کے پاس پہونچا تو دروازہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ...... عمرو نے پھر اُلٹے پاؤں آکر جہاں جواہر پڑا تھا وہیں ڈال دیا۔ دروازے پر جو نگاہ کی دروازہ بدستور دکھائی دیا۔ عمرو نے پھر تجویز کیا کہ پہلے اس دروازے پر نشان رکھ آیا چاہیے، تب جواہر کو یہاں سے لیجانا چاہیے۔ ......

نیم تاج اپنا دروازے کی چوکھٹ کی زد پر رکھ کر جواہروں کے ڈھیر کے پاس کھڑے ہو کر دروازے کو تاکا، دروازہ اور تاج دکھائی دیا"۔ .... (ص ۱۳۴)

دوسری مثال اسکے حرص و آز کی، جو دلچسپی میں پہلی مثال سے کسی طرح کم نہیں ہے، وہ ہے جہاں اس نے روپئے پیسے کے لالچ میں اپنی جان تک دینا گوارا کر لیا۔ امیر حمزہ کا جہاز سراندیپ کے سفر میں گرداب بلا سے تہ و بالا ہو کر ڈوبنے لگتا ہے۔ بچنے کی صرف ایک تدبیر معلوم ہوئی کہ امیر حمزہ یا انکے نائب جب تک "سد سکندری" پر چڑھ کر طبل سکندری نہ بجائیں گے جہاز گرداب سے نکل نہیں سکے گا۔ امیر حمزہ اوپر جانے کے لیے تیار ہوئے تو عمرو کو ایسے موقع سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھانے کی سوجھی۔ اور سب لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا،

"یارو تم لوگوں کا بل بکرا ہوتا ہوں۔ اسوقت تو گرہ کھولتے جاو۔ شاید بچ رہوں تو اپنی محنت کا اجورہ پاؤں"

ہر ایک کو جان کی فکر لگی ہوئی تھی اس لیے

"ہر ایک نے ایک کی جگہ سو اور سو کی جگہ لاکھ دینار کا تمسک لکھ کر عمرو کے حوالے کیا۔ عمرو نے یہ شعر پڑھا

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان شور افزا	دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسہا"

اور دم سادھ کر ایک جست لگائی اور سد سکندری پر بہزار خرابی جو پہنچ گیا" (ص ۱۲۸)

(۱۰)

عمرو عیار کی بیہودہ حرکتیں اور ڈرپوک کوششیں بھی اسکے کردار کو کچھ کم دلچسپ نہیں بنا رہی ہیں ۔ عام طور پر یہ چیز کسی کردار کو نہ صرف ساقط از اعتبار اور مضحکہ خیز بلکہ مذموم بنا دیتی ہے

یہ عنصر بختک کے کردار کا بھی ایک جزو ہے۔ لیکن اسکی وجہ سے اسکا کردار جس قدر ذلیل معلوم ہوتا ہے، اُسی قدر عمر و عیار کا کردار زیادہ دلچسپ بن جاتا ہے۔ اسی موقع پر کسی فلسفی کا وہ خیال ہمکو یاد آجاتا ہے کہ چیزیں بذاتِ خود اچھی اور بُری نہیں ہوتیں، بلکہ اچھے اور بُرے خود اُنکے استعمال کے طریقے ہوتے ہیں۔ بختک کی مثال میں بُزدلی اور نامردی کا اظہار جن واقعات کے اندر کیا گیا ہے وہ اُسکی اس خاص حالت پر ایسے براہِ راست موثر ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کی نظروں میں اسکی صرف بُزدلی ہی بُزدلی دکھائی دیتی ہے، جسکی وجہ سے ہر پڑھنے والا اُسکے متعلق نہایت ذلیل و خوار خیالات قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ احول جس کے درمیان اس خصلت کا اظہار ہوا ہے، اسکو نمایاں صورت نہیں دیتا، تو ناظرین کے پاس اسکی کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی اور وہ گرد و پیش کے بہت سے واقعات میں کا ایک معمولی واقعہ بن جاتی ہے۔ اور جب کسی کردار کے بُزدلانہ افعال سے نفرت خراش نتیجے کے بجائے مسرت خیز نتیجہ مرتب ہو رہا ہو تو قاری اس خاص خصلت کی بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ذیل میں ہم عمر و عیار اور بختک کی بُزدلی کی چند مثالیں پیش کرکے اپنے بیانات کو مصدق بنانا چاہتے ہیں۔ عمرو مکتب کے مُلّا کو ہزار طرح ستا کر اور تکلیفیں پہونچا کر کوہ ابو قبیس پر مع حمزہ اور مقبل جا رہتا ہے۔ عبدالمطلب کے فرمانے پر مُلّا مکتب کے چند لڑکوں کو لیکر اسکو گرفتار کرنے آتا ہے۔ عمرو نے اس دفعہ مُلّا صاحب کا احترام اور تقدس قطعاً بالائے طاق رکھ کر پہلے تو اُن کے چیلے ابوجہل کا منہ سنگریزوں سے زخمی کیا۔ اور اسکے بعد جب خود مُلّا آگے بڑھا تو ایک بڑا سا پتھر پھینک کر اُس کا سر ہی توڑ دیا۔ اس واقعے پر خواجہ عبدالمطلب آگ بگولا ہوکر نکلے اور عمرو کو بھی اسکی خبر پہونچی تو اُسکے پیر اُکھڑ گئے اور ارے ڈر کے ایسا بھاگا کہ خود اپنے یار غار حمزہ کی طرف بھی منہ پھیر کر نہ دیکھا کہ کس حال میں ہے۔

مکہ سے رخصت ہوکر امیر حمزہ مدائن کی طرف پہلی دفعہ کوچ کرتے ہیں۔ راستے میں ایک دوراہا ملتا ہے جہاں سے دو راستے مدائن کو جاتے ہیں۔ لوگوں نے امیر سے کہا کہ پہلا راستہ صاف مگر چکر کا ہے۔ دوسرا راستہ نزدیک کا ایک آدم خوار شیر کی بود و باش کی وجہ سے نہایت خوفناک اور ناقابل گزر بن گیا ہے۔ امیر نے دُور کے صاف راستے سے تو فوج کو روانہ کیا، اور آپ خود عمرو کو ساتھ لے کر پُرخطر راستے سے چل پڑے۔ "بیشۂ فیض" میں پہونچ کر کچھ ستا رہے تھے "دفعتاً نیستاں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ جانور کی آمد کی آہٹ ہویدا ہوئی۔ اور ایک

شیر اُس میں سے نکلا ۔ عمرو نے تمام عمر مٹی کا شیر بھی نہ دیکھا تھا ۔ جوں ہی اُسکو دیکھا خوف سے گھوڑے کو چھوڑ کر ایک عظیم الشان درخت پر چڑھ گیا ۔ اور امیر کو پکار پکار کر کہنے لگا ،
" حمزہ ! ایک شیر بڑا ہی لمبا چوڑا امتیاں سے نکلا ہے اور آپ کی طرف چلا آتا ہے ۔ خدا کے واسطے چشمے پر سے بھاگ کر میرے پاس چلے آئیے یا بھاگ کر کسی درخت پر چڑھ جائیے "
امیر ، عمرو کی یہ بات سُن کر بہت ہنسے اور فرمانے لگے ، " روباہ خصلت ، کیوں بدحواس ہوا جاتا ہے کچھ دیوانہ اور سودائی ہے ، خود اس کے مارنے کے واسطے میں اس راہ سے آیا ہوں ...... وغیرہ "

عمرو عیار کی بزدلی میں اُسکے اعتقادات کو بھی ایک بڑی حد تک دخل ہے ۔ وہ امیر کے ساتھ سراندیپ جانے سے اس بنا پر معافی مانگتا ہے کہ " جن ، جادو ، اور پانی ، تین چیزوں سے اُسے بہت ڈر لگتا ہے " عمرو کے جیسے کردار والے شخص میں بزدلی کا نہ ہونا تعجب سے خالی نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ ایک مکمل ظریفانہ کردار پیش کرنے میں جہاں تک ممکن ہو ایسے تمام عناصر سے دامن بچانا مناسب ہے جن سے کردار میں سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ جبن کا نہ ہونا شجاعت کا سبب ہوگا ۔ اور شجیع آدمی ہمیشہ خوددار اور سنجیدہ ہوتا ہے ۔ گویا ایک معمولی نفسیاتی کیفیت پر خیال نہ رکھنے سے ایک بہتر سے بہتر کردار نہایت پست بنایا جا سکتا ہے

اسکے بالکل برعکس حالت بختک کی بزدلی کی ہے ۔ امیر حمزہ کا مقابلہ کرنے سے ڈر کر جب وہ کستہم پہلوان کو حمزہ سے قوت آزمائی کرنے پر اُبھارتا ہے تو حمزہ بلکہ تمام اشخاص قصہ کے آگے اُس کا کردار بیحد حقیر اور ذلیل معلوم ہونے لگتا ہے ۔ اسکے علاوہ بختک کی پوشیدہ ریشہ دوانیاں اور شرمناک تدبیریں جو حمزہ کو شکست دینے کے لیے اختیار کی گئیں ، اُن سے اُسکا کردار کس قدر ذلیل معلوم ہونے لگتا ہے ، اسکا اندازہ خود داستان پڑھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے ۔

(۱۱)

اب ہم عمرو عیار کے کردار کے ایک اہم بالشان عنصر یعنی اُسکی شوخ کرداری کو جانچنا چاہتے ہیں ، جس میں ظرافت کا بڑا امتزاج ہے ۔ شرارت کبھی تو کسی مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائی جاتی ہے ، اور کبھی وہ خود مقصد ہوتی ہے ۔ عمرو کی شوخیاں عموماً پہلی نوعیت کی ہیں ۔ اسکی شرارتیں ہر جگہ معنی خیز اور نتیجہ پیدا کرنے والی ہیں ۔ اس قسم کی شرارتیں اس طرح صادر ہو جاتی ہیں کہ ایک کام جو ایک عام اور معمولی طریقے پر انجام دیا جا سکتا ہو ، اُسی کو جدت طبع کی آمیزش سے

ایک دلچسپ اور ظریفانہ انداز میں ختم کیا جائے ۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ عمرو عیار کا مدمقابل، بختک مشخص ہوا ہے ۔ اور اسی کو زمین بنا کر عمرو عیار کی شرارتوں کی رنگ آمیزی سے نفس قصہ میں عجیب عجیب شگوفے کھلائے گئے ہیں ۔ امیر حمزہ کا دوست تھا، اور بختک اس کا دشمن ۔ عمرو کو فطرتاً اپنے دوست کے بدخواہوں کے ساتھ عداوت ہونی چاہیے تھی ۔ لیکن حمزہ کے دشمنوں میں صرف غریب بختک ہی ایسا ہی جو قصہ نگار کے ہتھے چڑھ کر عمرو عیار کا مشق ستم بن گیا ہے ۔ لیکن اس تمام محشرستان ظرافت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تخلیق میں خود بختک کی نادانیوں کو بڑی حد تک دخل ہے ۔

عمرو کی شوخیوں کو ہم اگر "ستم ظریفی" کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا ۔ کیونکہ وہ اپنی شرارتوں کا ہدف ہر وقت کسی نہ کسی کو بناتا اور خود مسرور ہوتا اور اپنے ناظرین کو محظوظ کرتا ہے ۔ اگر ہم اس عیار کی شرارتوں کا فرداً فرداً حساب لگانا چاہیں تو یقیناً ایک کتاب اتنی ہی ضخیم تیار ہو جائے جتنی خود اسکی سوانحعمری ہو سکتی ہے ۔ اسکے رشتۂ حیات میں ظرافت کے تار اس طرح پیوست کیے گئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے جدا کرنا دقت طلب امر ہے ۔

عمرو عیار کی شوخیوں کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ وہ نوعیت میں نہایت معمولی بلکہ اکثر عامیانہ ہیں ۔ لیکن ہندوستانی لڑکوں کی فطرت کے اس قدر مطابق ہیں کہ خواہ مخواہ انکی وقعت دل میں سما جاتی ہے ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہندی نوعمر لڑکے اور وہ بھی کتب میں پڑھنے والے، اور ایک ظریف انسان کے کردار کے نقشے اس قدر وسیع اور خوبصورت پیمانے پر ہم کو اُردو ادب میں کہیں دستیاب نہیں ہو سکتے ۔ اول تو ظریفانہ ادب کی اُردو میں کمی ہے، اور جہاں خال خال حضرات نے اس طرف توجہ کی بھی ہے تو اس قسم کے گھریلو امور انکی توجہ کے محتاج رہے ۔ حالانکہ آج کل روزانہ زندگی کے معمولی اور گھریلو امور کو خوشگوار انداز میں پیش کرنے کی طرف دماغوں نے جو پلٹا کھایا ہے اسکے اعتبار سے اس صنف کے کردار بھی مزید پیش کیے جاتے چاہیے تھے ۔ بہرحال متذکرۂ بالا سبب، اُردو ادب میں ظریفانہ ادبی کرداروں کا فقدان اور کئی مماثل اسباب ہیں جو عمرو عیار کے کردار کو اُردو ادب میں ایک دلچسپ اور ممتاز حیثیت عطا کر رہے ہیں ۔

ہم یہاں پر صرف ایک دو ایسے واقعات اس "بابائے دوندگان اور عیاران جہاں" کی حیات افسانوں سے انتخاب کرکے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جن میں کوئی نمایاں خصوصیت مل سکتی ہے

عمر و عیار کی تعلیمی زندگی، غریب مُلّا کی پریشاں حالیوں کا دُکھڑا، اور اسکی جدت طرازانہ شوخیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ فطرتاً آپ بد شوق اور کھیل کود کی طرف مائل، خواجہ عبدالمطلب کے ڈر اور امیر حمزہ کی رفاقت کے خیال نے مکتب میں لا بٹھایا تو کیا ہوا۔ روز روز کی شرارتوں سے مُلّا اور تمام لڑکوں کا دَم ناک میں آگیا تھا۔ الف، بے، تے پر مُلّا سے اچھی خاصی جھڑپ ہوگئی۔ ایک روز لڑکوں کے کھانے مُلّا کے کپڑوں میں چھپا دیے جاتے ہیں۔ کسی روز خضاب میں ہڑتال شریک کرکے بیچارے مُلّا کے چہرہ کو داڑھی کے بار سے سبکدوش کروا دیا جاتا ہے۔ مُلّا کی مار پیٹ کا بدلہ اُسکے جسم کو سوئیوں سے چھلنی کرکے نکالا جاتا ہے۔ ابھی "بابا شملہ" کی مٹھائی کے جانفرسا سانحہ سے مُلّا کی طبیعت عمرو سے صاف نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے روز صبح سویرے آپ سب سے اول مکتب میں جاکر اُسکو جھاڑ، صاف کرکے پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ حضرت مُلّا صاحب کو دُنیا کی اونچ نیچ کی کیا خبر تھی۔ انھوں نے دل میں کہا کہ اس پر میرا خوف غالب ہے سب سے پہلے آیا ہے۔ آج اسکو کچھ نہ کہا چاہیے۔ "بھلا وا دیا چاہیے" حالانکہ یہ بھی عمرو کی ایک مجہول شرارت تھی۔ اسکی اس تمام کارروائی کا مقصد صرف یہ تھا کہ مُلّا جی کو ایک نفسیاتی مغالطہ دیا جائے۔ اور اسکے دل پر اپنی انفعالیت اور شرمندگی کا نقش جماکر دوسری بڑی شرارت کے لیے راستہ تیار کرلیا جائے۔ چنانچہ

"مُلّا نے سب کو سبق دیکر.... خضاب تیار کرکے عمرو کے ہاتھ پہلے سے حمام میں بھیج دیا اور پیچھے آپ قصد حمام کا کیا۔ عمرو نے راہ میں فرصت پاکر دھبڑ ہڑتال خوب باریک پیس کر خضاب میں ملا دیا۔ ہرگاہ ملا جی حمام میں گئے، وہ خضاب داڑھی و مونچھوں میں لگا کر ایک ساعت کے بعد گرم پانی سے جو دھویا، تو مونچھ داڑھی کا صفایا ہوگیا" (صفحہ ۲۲)

ایک معمولی واقعہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عمرو کے خیالات کی پرواز کس جہان میں رہتی تھی۔ ظرافت اور شرارت اُسکی زندگی کے اصول بن گئے تھے۔ اور خود اسکی چلبلی، جدت طراز اور مضطرب طبیعت نے اُسکو ہر وقت ایک نئی مہم کے سر کرنے پر اُبھارا۔ اسکے مشاہدے کا زاویہ نگاہ عمومیت سے مختلف تھا۔ ہر وہ واقعہ جو اُسکی نظروں کے سامنے سے گذرتا تھا، وہ اُسکو اس خاص غرض سے مطالعہ کرتا تھا کہ اُسکے کن پہلوؤں سے ظرافت پیدا کی جا سکتی ہے۔

عام طور سے بچپن کی مسرت بخش فضا ضرور اس طرز زندگی کی مؤید ہو سکتی ہے۔ لیکن عمرو کی خاص خاص حالات میں عملی زندگی و جوانی اور بڑھاپے کے ایام زندگی میں کسی قسم کا فرق محسوس ہی نہیں ہوتا

نوشیرواں باغ داد میں دعوت کا سامان امیر حمزہ کے لیے فراہم کرکے امیر حمزہ کو مدعو کرتا ہے - بختک اور عمرو کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی - باغ کے مدخل پر عادی پہلوان کو اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ کسی کو پادشاہ کی اجازت کے بغیر اندر نہ آنے دے - عمرو کے لیے ایسی رکاوٹیں کب قطعی ہو سکتی تھیں ؟ عادی کی آنکھوں میں خاک جھونک آپ اندر ہو رہے اور اندر پہونچنے کے بعد آپ نے جو جو کام کیے وہ نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں -

عمرو مشکل سے یا آسانی سے غرض بہرحال اندر تو پہونچ گیا - اب نوشیرواں کی محفلِ عیش میں بار کس طرح پا سکتا تھا ؟ امیر کسی طرح اسکو اپنے پاس نہیں بلا سکتے تھے، کیونکہ بادشاہ کا حکم ان پر قابلِ پابندی تھا - نوشیرواں اسکی فتنہ پردازیوں سے مخوف تھا کہ اسکی موجودگی محلِ عشرت میں ضرور تفرقہ اندازی کا باعث ہوگی - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عیار نے اندر آنے سے پہلے ہی مجلس میں داخل ہونے کی تدبیر سوچ لی تھی -

"گلگشت کرتا ہوا اُس قصر کی طرف گیا جہاں بادشاہ اور امیر بزم افروز تھے ..... متصل اس قصر کے ایک درخت چنار کا تھا - اُسکے نیچے بیٹھ کے دوتارا ملا کر گانے لگا - عمرو کا گانا مُردے کو جلاتا تھا - ..... امیر کے کان میں جو آواز گئی، مقبل وفادار سے فرمانے لگے کہ "عمرو کی سی آواز آتی ہے ..... ہم نے عادی کو منع کر دیا تھا کہ عمرو کو باغ میں نہ آنے دے ..... پھر یہ کیونکر آ گیا ؟ جاؤ عادی کو تو بلا لاؤ" - بادشاہ نے امیر کو برہم دیکھ کر کہا کہ "عادی کو بلانا کچھ ضرور نہیں - ہمنے عمرو کا قصور معاف کیا - ہاں عمرو کو بلا لو - ....." (ص ۹۲)

غرض عمرو کے کمالِ موسیقی نے اُسکو بزم شاہ تک پہونچا دیا - لیکن یہاں پہونچ کر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اس طرح دھوکے سے باغ میں آنے کی غرض کوئی ذاتی منفعت نہیں تھی، بلکہ امیر سے ملاقات کرنی منظور تھی - باغ میں داخل ہونے کے بعد سے اُسکی پیش بینی نے اسکو اس امر کا یقین دلا دیا تھا کہ بختک بھی ضرور اندر آنے کی کوشش کریگا - اس خیال نے اُسکو "جھاڑی جھاڑی گلبن گلبن بوٹا بوٹا" دیکھنے پر مجبور کر دیا - اس معائنہ کے دَوران میں،

"بدرو پر جو نگاہ پڑی، بغور جو نظر کی، دیکھا کہ کوئی شخص سر نکال کر ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے اور پھر سر کو اندر کھینچ لیتا ہے - سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ بختک ہے - ..... خواجہ ملمع پوش سے کہ مہتر باغبانوں کا تھا جا کر کہا کہ "بوالعجب غفلت میں سُکھ نیندیں لے رہا ہے اور باغ میں ایک چور بدرو کی راہ سے گھسا چاہتا ہے - میں نے آہٹ پا کر تجھے خبر دی ... اب

توجان اور تیرا کام جانے اور بادشاہ کا انتظام جانے۔ ..... وہ گھبرا کے مع چند باغبانوں کے پیچھے لیکر اُٹھا۔ اور بدرو سے متصل دیوار باغ سے لگ رہا۔ جوہیں بختک بدرو سے نکلا، باغبانوں نے لپٹ کر پکڑ لیا۔ ہر چند اُس نے کہا کہ "میں بختک ہوں" کسی نے نہ مانا۔ ایک درخت کے ٹہنے میں لٹکا کر ہر ایک نے بجائے خود زدوکوب کرنی شروع کی ..... جب خوب ہڈیاں بختک کی نرم ہو چکیں، اور پیٹھ اور پسلیاں ورم کر گئیں"

تو اسکو ایک درخت سے بندھوا دیا۔ اور ادھر بادشاہ کو اُبھار کر سیر گلگشت پر مائل کیا، تاکہ وہ سب ارکان دولت کے ساتھ اپنے وزیر بختک کی شرمناک صورت دیکھے۔ غریب بختک کی شامت آئی تھی جو یہاں اس طرح چلا آیا۔ اس فضیحت کے بعد جب دربار میں جگہ ملی اُس نے پھر اپنے کرتوتوں سے اپنے آپ کو عمرو کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکا دیا۔ امیر حمزہ کی نگاہ جب سے مہرنگار پر پڑی تھی ہر گھڑی اُٹھ کر باہر جاتے اور بام دلدار پر نگاہ ڈال آتے۔ بختک تاڑ گیا اور اُنکو روکنے کی کوشش شروع کی، اور بادشاہ سے کہا کہ

"لوگ ہر گھڑی محفل سے اُٹھ اُٹھ کر باہر جاتے ہیں، مجلس کا لطف جاتا ہے ..... حکم دیجیے کہ جو کوئی بلا ضرورت مجلس سے باہر کا قصد کریگا اسکو اس پر سو تمن جرمانہ دینا پڑے گا۔"

امیر نے بھی اسکی تائید کی۔ لیکن اُٹھنا کم نہ ہوا، اور جرمانے بھرتے رہے۔ بزرجمہر کے اشارے پر عمرو نے بختک کو جن جن طریقوں سے رُسوا کیا اُسکا منظر صفحہ ۱۰۵۔ اور ۱۰۶ پر ملاحظہ فرمائیے۔

(۱۲)

عمرو عیار کا کردار کتنے ہی مضحکہ خیز اور دلچسپ صفات کا مجموعہ کیوں نہ ہو، لیکن چند عمدہ صفات سے کلیتہً خالی نہیں ہے۔ عمرو عیار، لالچی، چور، شریر غرض سب کچھ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت عاقل اور فرزانہ بھی تھا۔ اسکے دُور اندیش ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔ اسکے اس خاص وصف کو ہم اسکے کردار کے عمیق مطالعہ کے بعد اخذ کر سکتے ہیں۔

عمرو بلحاظ نام اور باعتبار کردار ایک عیار ہے۔ اور عیار بھی کیسا؟ شاید اسکے جیسے لندہاہیہ عیار بہت کم گذرے ہونگے۔ ظاہر ہے کہ اس پیشہ کی تمام خدمات انجام دینے کے لیے جس قماش کے آدمی کی ضرورت ہوگی وہ نہایت ذکی اور سریع الفہم ہوگا۔ کیونکہ اسکے بغیر اس پیشہ میں کامیابی ممکن نہیں۔ بے معنی مذاق اور لغو شرارت بیوقوفی کی علامات ہیں۔ اس قسم کے مذاق سے عمرو عیار کے کردار کا دامن عموماً پاک ہے۔ اس کا مذاق موزوں اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔

وہ تمام فطری افعال بھی جو عمرو سے منسوب کیے گئے ہیں، ایسے نہیں ہیں کہ ہر کس و ناکس ان کا سرانجام کر سکے۔ اس نے اپنی عقل خداداد کی مدد سے امیر حمزہ کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے سے بچایا ہے۔ امیر حمزہ ایک شجیع اور بہادر انسان ہیں، جنکی طبیعت ہر بہادر انسان کی طرح سادہ اور اینچ پیچ سے بیخبر واقع ہوئی ہے۔ وہ فتنہ پردازانہ پیچیدگیوں سے کماحقہٗ ناواقف ہیں۔ کیونکہ انکو اپنی قوتِ بازو پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ کمزور انسان ہوتا ہے جسکی ہمت شرمناک ریشہ دوانیوں میں صرف ہوتی ہے۔ جب قوت طبیعی سے کامیابی حاصل کرنا اُسکے حصہ میں نہیں ہوتا، تو وہ مجبوراً اور فطرتاً سازشوں پر اُتر آتا ہے۔ حمزہ جیسے دلیر شخص پر ایک روک تھام کی کل بھی ہونی ضروری تھی، جو اُسکو اونچ نیچ سے آگاہ کرتی رہے۔ یہ کام عمرو عیار کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عمرو عیار کی تمام افسانوی حیات کا کس قدر حصہ خود اپنی ذات کے لیے صرف ہوا ہے، اور کتنا امیر حمزہ کے لیے وقف ہے؟ صرف اسکی حرص تو ہم کو کہیں کہیں اس کا شبہہ دلاتی ہے کہ اسکو اپنا خیال ہے۔ اسکے سوا اور کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرو نے کوئی کام ذاتی نفع کی خاطر انجام دیا ہے۔

اس خاص نقطۂ نظر سے بھی عمرو کی حالت واضح ہو جانے کے بعد ہم کو اسکی پیش بینی، ذکاوت اور فراست کی اہمیت کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ عمرو عیار کی ہوشیاری سے آجکل کے ڈاکٹر بھی سبق لے سکتے ہیں۔ گستہم پہلوان نے دھوکے سے امیر اور اُنکے رفقا کو اپنے مکان میں دعوت پر بلایا۔ بے خبری کے عالم میں چار سو مسلح سپاہی امیر پر آن پڑے۔ ایسی نازک حالت میں امیر کے جاں نثار رفقا میں سے بہرام نے سینہ سپر کرکے اُس وار کو اپنے شکم پر لیا جو امیر پر اترا چاہتا تھا۔ اس صدمہ سے اُسکی آنتیں پیٹ کے باہر نکل پڑیں۔ اور سسکنے لگا۔ بزرجمہر جنکی ذات میں ایک "قدیم حکیم" کے پورے لوازم جمع تھے نہایت پریشان تھے کہ بہرام "وہ دل پر ہاتھ لگانے سے فوراً مرجائے گا" اور یہ غیر ممکن ہے کہ وہ دل کو ہاتھ نہ لگایا جائے، اور زخم کے سینے کی کوئی تدبیر عمل میں آسکے"۔

"عمرو بولا" خواجہ! واقع میں آپ حکیم حاذق ہیں اور میرے اُستاد صادق ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ حکمت بہت مشکل ہے"..... یہ کہکر ایک استرہ جیب سے نکالا۔ بہرام کو دونوں پاؤں کے درمیان دباکر ہاتھ پیٹ کی طرف بڑھایا۔ بزرجمہر نے عمرو سے پوچھا کہ ارادہ کیا ہے؟" عمرو نے کہا کہ "جتنی آنتیں پیٹ کے باہر ہیں انکو ہاتھ ڈالے بغیر

معاف کردوں گا .... پھر مرہم لگا کر اچھا کر دوں گا"۔ بہرام نے عمرو کی جو تقریر سنی، سنّاٹے میں آیا۔ زندگی سے مایوس ہو کر نہایت گھبرایا۔ ٹھنڈی سانس جو حسرت سے بھری، تمام آنتیں پیٹ میں جاتی رہیں"۔ (ص۹۲)

اس میں شک نہیں کہ بادی النظر میں عمر کے دانشمندانہ افعال بعض وقت نہایت معمولی نظر آئیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معلوم ہو جانے کے بعد ہر شے آسان ہے۔

نوعیت میں اس سے بالکل مختلف ایک اور مثال اسکی ہوشیاری کی پیش کر کے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امیر حمزہ کا جزیرۂ سراندیپ کو جانا ٹھہر گیا۔ اور بادشاہ نے امیر کی درخواست پر مہرنگار کے ساتھ انکی منگنی کی رسم ادا کیے جانے کا حکم بھی صادر فرما دیا۔ امیر، محل میں جا رہے تھے کہ بختک کے دل میں شرارت کی سمائی کہ چل کر سُننا چاہیے کہ امیر اور مہرنگار میں کیا راز کی باتیں ہوتی ہیں۔ فوراً خچر پر سوار ہو کر نکلا۔ محل کے قریب دونوں کی مُٹ بھیڑ ہوئی۔ عمرو نے امیر سے کہا کہ آپ چلیے میں اس سے سمجھ لوں گا۔ آگے بڑھ کر بختک کے خچر کی باگ پکڑ لی اور ایک پُرانا تمسک اُس کے آگے کر دیا جسکی رُو سے اسکے (۵۰۰) تمن بختک پر واجب الادا تھے۔ عذر کرنے لگا کہ "میں ہندوستان جا رہا ہوں، جیتا واپس ہوتا ہوں یا مُردہ، میری رقم واپس کر دیجیے"۔ بختک کے پاس اُس وقت رقم کہاں تھی، بلطائف الحیل ٹالنا چاہا۔ عمرو اُسکے سر ہو رہا اور زخمی کر کے واپس لوٹا۔

محل میں داخل ہونے کی کوشش کی تو دربان لکڑی اُٹھا کر پیچھے دوڑا۔ عمرو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس زور سے چلّایا کہ امیر بدحواس ہو گئے۔ دربان منت سماجت کرنے لگا۔ غرض اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خود امیر دوڑے ہوے باہر تشریف لائے، اور آنکھوں پر سے ہاتھوں کو علٰحدہ کیا تو دیکھا کہ آنکھیں صاف اور تاراسی چمکتی ہیں۔ شرارت کا سبب پوچھا۔ کہنے لگا "آپ کے سر کی قسم دربان نے لکڑی میرے مارنے کو اُٹھائی تھی۔ اگر لکڑی مارتا تو میری آنکھوں ہی میں لگتی، اور آنکھیں پھوڑ ہی ڈالتی"۔ امیر اسکو اندر لے گئے۔

عمرو کی یہ ساری کوشش صرف اس مقصد کے ماتحت عمل میں آئی کہ کسی طرح اندر جا کر اپنی "سرمایہ دار" معشوقہ فتنہ بانو سے ملے اور کچھ نقد مار لے جائے۔

ان چند مثالوں سے نہ صرف عمرو کی دُور اندیشی، ذکاوت اور ہوشیاری کا ثبوت ملتا ہے، ان سے اسکی دوستانہ ہمدردی، ایثار، رفاقت اور امیر حمزہ کے ساتھ اسکی خود فراموشانہ

محبت کا بھی پتہ چلتا ہے

(۱۳)

ہمارے اوپر کے بیانات اس امر کے کافی مظہر ہیں کہ عمرو عیار کے کرداری عناصر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے اس میں ایک انفرادیت پیدا کر کے اسکو ادبیات کے زندہ کرداروں میں شامل کر رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہم سے یہ کہے کہ عمرو عیار کے کردار میں جدید کردار نگاری کی تمام خوبیاں موجود ہیں یا یہ کہ اسکے کردار میں کوئی عمق ہے، تو شاید ہم اسکو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکیں گے۔ لیکن ہم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ عمرو عیار کے جیسے کردار نہ صرف اُردو ادبیات میں مفقود ہیں بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی بمشکل دستیاب ہو سکیں گے۔ اسکی وجہ ہم نے اوپر کسی مقام پر بالتفصیل بیان کر دی ہے۔ اسکے کردار کی یہ خصوصیت یا وہ صفت اسکو باقی رہنے والے کرداروں کی فہرست میں نہیں شامل کرا رہے ہیں، بلکہ یہ تمام اوصاف ہیں جن کی ہیئت اجتماعی عمرو عیار کے کردار کو ایک چلتے پھرتے، گوشت اور پوست والے انسان کی طرح ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر رہی ہے۔

عمرو عیار کے کردار کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سارے قصے میں رگ و ریشوں کی طرح چاروں طرف دوڑ گیا ہے۔ گو آخری داستان میں اسکا ذکر کم ہے، لیکن پہلی تین داستانیں اسکے کارناموں سے لبریز ہیں۔

ہم نے کردار نگاری کے اصول میں یہ بیان کیا ہے کہ اشخاص قصہ کی ظاہری شکل اور شباہت کے ساتھ ساتھ جب تک اُنکے لباس اور اُسکی خصوصیات کا بھی ذکر نہ کیا جائے، ہم اُن سے مانوس ہو ہی نہیں سکتے۔ اور انکو انسانی نمونوں کے محشرستان سے ممیز نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں چیزیں خصوصاً لباس اشخاص قصہ کی صورتوں کو ہمارے ذہنوں میں معین اور واضح طور پر مشخص کر دیتی ہیں۔ داستانوں میں اشخاص قصہ کے لباس کا ذکر کوئی نئی چیز نہیں۔ لیکن داستان امیر حمزہ کا مصنف برخلاف تمام اصلی اشخاص قصہ کے، عمرو عیار کے لباس کا ذکر بجد تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اور عیاری کے لباس کا بیان اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ہم کو شاید ہی کہیں دستیاب ہو سکے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۷-۵۰) مصنف کی اس دُوربینی کے ہم خاص طور پر ممنون ہیں۔

(۱۴)

اس مقالہ کو ہم اُسوقت تک تشفی کے ساتھ ختم نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چند خامیوں

کی طرف بھی ایک اجمالی اشارہ نہ کرویں، جو قصہ نگار رتنے' بلحاظ کردار نگار، عمرو کی شخصیت کے پیش کرنے میں کی ہیں۔ اگر فوق الفطرت عناصر سے چشم پوشی اس عذر کی بنا پر کر بھی لی جائے کہ کہ قدیم قصوں کا یہ ایک لازمی اصول تھا، پھر بھی بعض ایسے غیر نفسیاتی اور خلافِ فطرتِ انسانی امور کے پیدا کرنے پر قصہ نگار کسی حال میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا، جو اُس کے روزانہ مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ذرا بھی توجہ کی جاتی تو کوئی وجہ نہیں کہ عمرو کا کردار چند معمولی اور مبتذل یا افتادہ اسقام سے پاک نہ ہو جاتا۔

تمام فوق الفطرت قصوں کی طرح "داستان حمزہ" کے کردار بھی اپنی پیدائش کے وقت سے لیکر آخر وقت تک ایک حالت پر قائم رہتے ہیں۔ حمزہ ہو یا عمرو کسی کے بچپن اور بڑھاپے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جس حالت میں کہ دنیائے قصہ میں وہ وجود پذیر ہوتے ہیں اُسی عالم میں راہی عدم بھی۔ عمرو کی زندگی کے ابتدائی اور آخری واقعات کے مقابلی مطالعہ سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

قصہ نگار رتنے ایام شیر خوارگی ہی میں عمرو سے ایسے افعال سرزد کرائے ہیں جو کسی حال میں بھی بے سمجھ لڑکوں سے سرانجام نہیں پا سکتے۔ اگر عمرو کی پہلی شرارت یعنی بزرجمہر کی انگشتری کے چُرا لینے کو ایک اتفاق سمجھ کر ہمارا ذہن تسلیم بھی کر لے تاہم یہ قرینِ قیاس ہے . . . . کہ چار ماہ کا بچہ دو اپنے سے زیادہ قوی لڑکوں کو قصداً پلنگ سے نیچے گرا کر دایہ کی دونوں چھاتیوں سے آپ اکیلا دودھ پی جائے!

اس مثال سے زیادہ بعید از قیاس عمرو کا حمزہ کے جھولے سے لعل چُرانا ہے۔ عمرو نے مکتب کے مُلّا سے پہلے سبق پر جو حجت کی تھی وہ ایسی ہے کہ شاید آجکل کے بعض انٹرنس کے طالبعلموں کی سمجھ میں بھی اچھی طرح نہ آسکے۔ یہ وہ غلطی ہے جسکا ازتکاب نذیر احمد نے بھی اپنی ہر دلعزیز تصنیف "توبۃ النصوح" میں کیا ہے۔ اور جس کا ذکر ہم نے اپنی کتاب میں بالتفصیل کیا ہے جہاں عمر اور بچے میں مطابقت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے[1]۔

"...... عمرو سے جب اُس نے کہا کہ "الف" بولا "راست اور برحق ہے"۔ مُلّا نے کہا کہ "میں کہتا ہوں کہ "الف" کہہ، تو کہتا ہے کہ "راست اور برحق ہے"۔ یہ کیا بات ہے؟ کیسا احمق ہے! عمرو نے کہا کہ "جو آپ کہتے ہیں اُس کا جواب دیتا ہوں۔ جو بات میں سمجھا

---

[1] ملاحظہ ہو "دنیائے افسانہ" صلا۹۔

ہوں وہی خدمتِ عالی میں عرض کر رہا ہوں۔ یعنی آپ کہتے ہیں "الف" میں کہتا ہوں "ذات اور بر حق ہے" اس میں سرِمو فرق نہیں۔ مطلق ہے۔ یعنی الف سیدھا ہے۔ اور الف کا عدد ایک ہے۔ اور ذات وحدہ لاشریک کی بھی واحد ہے۔ اگر یہ غلط اور لغو کہتا ہوں تو آپ تادیب اور تنبیہ فرمائیے۔ مجھے قائل کیجیے۔ اور کسی طور پر سمجھائیے۔ آپ اس میں کیا کہتے ہیں؟ کیا خدا واحد نہیں ہے؟ اور کوئی بھی اُس سے مشارکت رکھتا ہے؟ اُس کے سوا اور کوئی شان وحدانیت رکھتا ہے؟ ..." وغیرہ۔ (ص ۱۴۲ تا ۱۴۳)

یہاں ہم بخوفِ طوالت صرف ایک نمونے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان تمام خلافِ عادت واقعات کو پڑھنے کے بعد قاری کے دل میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوگا کہ جس شخص نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں، اور نہ صرف سیاہ کیے بلکہ ان میں ایسی دلچسپی مضمر رکھی ہے کہ آج تک لوگ داستان کو برابر پڑھے چلے جا رہے ہیں، ایسا کیا یہ قوت تھا کہ اُس میں سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کا شعور نہ تھا؟ قصے کی سیرتوں کے طویل سلسلے، پلاٹ کا ایک حد تک انتظام، تخیل کی بلندی، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو ایک لغو نگار کے قلم کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ قصہ نگار غیر معمولی ذہانت کا آدمی نہ تصور کیا جائے، تاہم اُسکے دیوانہ ہونے کا کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ ایک سمجھدار آدمی بعض وقت کسی خبط کے دورہ میں بے سر و پا باتیں کہنے لگے!

واقعہ یہ ہے کہ قدیم قصہ نگاروں کی ذہنیت موجودہ قصہ نگاروں سے بالکل مختلف تھی ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے اُنکے قصے کا پیش ہونا ہی اُنکی ہر دلعزیزی کے لیے کافی تھا۔ پڑھنے والے "تنقید کا کوڑا" لیکر تو نہیں بیٹھتے تھے۔ جو کچھ ایک بلند تخیل کا نتیجہ ہوتا، اسکے استقبال کے لیے عوام خندہ پیشانی تیار رہتے تھے۔ یہ اسباب تھے جو قدیم داستانوں کی پیشکشی کا باعث ہوئے

لیکن اس اختلاف کے باوجود قدیم اور جدید قصہ نگاروں کی ذہنیت میں ایک چیز منزول مشترک بھی پائی جاتی ہے۔ اور وہ کردار کے مکمل کرنے کے لیے مواد کی جستجو ہے۔ جس طرح ایک جدید ناول نگار ہیجان خیز اور تعجب انگیز واقعات کے اندر سے ایک شخص قصہ کو بامراد نکال لاتا ہے، اُسی طرح قدما نے بھی اسکی کوشش کی۔ صرف طریقے مختلف ہیں۔ جن افسانوی معمول کو ہم معمولی اور مطابق فطرت واقعات کی باریکیوں سے سلجھاتے ہیں، قدما اُسی کو غیر معمولی اور فوق فطری ذریعہ سے سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسکے اس فعل میں بعض وقت خود اُن کے مخاطبین کے اعتقادات کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اگلے لوگوں نے جو کچھ کیا وہ اُنکے زمانے کا

تقاضہ تھا۔ اور ہم جو فطرت کا راگ گا رہے ہیں، یہ نتیجہ ہے ہمارے معاصرین کی اس طرف توجہ کا۔ قدما عجائبات کے تلاش میں رہتے تھے۔ یہ چیزیں اب ہماری معاشرۃ کو مسرور کرنے سے قاصر ہیں۔
اس کے علاوہ قدیم اور جدید اصول افسانہ نگاری میں ایک اور بین فرق پڑگیا ہے۔ قدیم افسانہ نگاری کا اصول تصوریت Idealism تھا، اور موجودہ افسانے حقیقیت Realism کے اصول پر لکھے جاتے ہیں۔ قدیم لوگ تصوری دنیا کی تخلیق کو زیادہ پسند کرتے تھے جس کی ہر شے اپنی انتہائی کمالات اور قوتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی تھی حقیقیت ایک حد تک افسانہ نگاری کے دائرہ سے باہر تصور کی جاتی تھی۔ اس لیے انکا تخیل جب کبھی ایک مکمل دنیا کے اجزا کی جستجو کی طرف جولانی پاتا، تو وسائل کی کمی کی وجہ سے ایسے راستے اختیار کرتا، جو خود عمرو عیاری کی کردار نگاری میں اختیار کیے گئے ہیں۔ قدیم قصوں میں جہاں ایک ہیرو خدائی قوتوں کا مظہر ہوتا ہے، شیطانی طاقتوں کا حامل بھی ہیرو کے مخالف کی شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ اسکے بغیر دو برابر کی ٹکریں نہیں ہو سکتیں۔
ان اصولوں کی روشنی میں عمرو عیار کے کردار کا مطالعہ، اُس کے کردار کے چند اسقام کو یقیناً غیر اہم بنا دے گا۔ کسی کارنامے سے مانوس ہونے اور اُسکی کما حقہ وقعت قائم کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ ہم اسکا مطالعہ اُس اصول کے ماتحت کریں جسکو اسکوتھ Asquith "تاریخی نظریہ تنقید" Historical method of criticism کے نام سے موسوم کرتا ہے[1]۔ اس اصول کی رو سے ہر کارنامے کو اسی خاص ماحول کے درمیان رکھکر جانچا جاتا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا، کسی ادیب یا مشہور شخص کی اہمیت کا صحیح اندازہ قائم کرنے میں ہم کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو قدیم شاعر کی طرح افسانہ نگار کو بھی مجبوراً یہ کہنا پڑے گا

" قصۂ مرا بمدرسہ کہ بُرد؟ "

محمد عبدالقادر سروری

ایم اے، ایل ایل بی

---

[1] اوکسفرڈ ایڈریسز۔ باب "تنقید"

احسان اپنے سر پر لینا باعث عدم توجہ کا ہوتا تھا چنانچہ اوس مین دو تین امر کو مین نقل کرتا ہون۔ جس عرصے مین غازی الدین حیدر کے آخر زمانے مین نواب معتمد الدولہ برسرکار تھے اور جناب چھوٹے چچا صاحب بادشاہ اودھ کے سفیر کلکتہ مین تھے تب نواب معتمد الدولہ نے جناب ممدوح سے جب لارڈ ہسٹ گورنر جنرل کے ساتھ لکھنؤ مین آئے زبانی کہا کہ مین چاہتا ہون کہ میرے اور تمھارے درمیان مین کوئی شخص میرا اور تمھارا دونون کا معتمد مقرر ہو۔ جناب چچا صاحب نے جناب والد ماجد مغفور کا ذکر کیا کہ اون سے بہتر کوئی شخص نہین ملیگا نواب معتمد الدولہ راضی ہوئے اور یہ قرار دیا کہ ایک نیا عہدہ عدالت کا واسطے انفصال معاملات سرحدی بادشاہی اور انگریزی کے ہزار روپیہ درماہہ کا مقرر کیا جائے وہ جناب ممدوح کے نامزد ہو اس ذریعہ سے جناب والد مغفور دربار مین حاضر رہین گے اور معاملات مخفیہ کی تحریرات حضرت کے ہاتھ سے ہوا کریگی۔ جب اس بندوبست کی جناب والد ماجد مغفور کو اطلاع کی گئی تو آپ نے اس کو قبول اس شرط پر کیا کہ بادشاہ کی طرف سے گورنر جنرل کے نام پر تحریر آپ کے تقرر اور طلب کی کی جائے اور گورنر جنرل بموجب اس کے آپ کو تحریری حکم دیوین اس صورت مین وہ عہدہ آپ کو قبول ہوگا۔ چونکہ اون دنون مین معاملات سرحدی کی بدنظمی کی اکثر گورنر جنرل کی طرف سے شکایت ہوا کرتی تھی نواب معتمد الدولہ اور چھوٹے چچا صاحب کو یہ موقع ملا کہ نواب نے یہان رزیڈنٹ سے اور چچا صاحب نے کلکتہ مین دفتر فارسی کے سکرتر سے اوس کو تذکرہ کرکے منظور کروایا۔ رزیڈنٹ راضی ہوئے کہ بادشاہ کا خط جناب والد ماجد کے طلب اور تقرر کا گورنر جنرل کے پاس بھیج دین گے اور سفارش اوس کی منظوری کی کرین گے اور سکرتر راضی ہوئے کہ جب ایسی درخواست بادشاہ کی آویگی تو حکم تحریری جناب والد ماجد کے نام پر جائے گا۔ یہ امر تو بخوبی طے ہوگیا صرف خط بادشاہ کا گورنر جنرل کے نام پر لکھنا باقی تھا اور اوس کا بھی مسودہ دفتر مین ہوا تھا

بیان بابت جناب والد ماجد کے تقرر کا دربار شاہی و دولتی سرکار کے لیے
[illegible]

مگر اجرا اوس کا غازی الدین حیدر بادشاہ کی بیماری کے سبب سے ملتوی رہا اور بادشاہ اوسی بیماری مین قضا کر گئے۔ جب میر فضل علی نصیر الدین حیدر بادشاہ کے نایب ہوئے اور جناب چچا صاحب کی عہدۂ سفارت سے برخاست ہوئی۔ اون کی جگہ پر جناب عاشق علی خان بہادر جو قرابت مین راقم کے ماموں ہوتے تھے مقرر ہوے۔ میر فضل علی کو جناب والد ماجد سے فی الجملہ محبت تھی۔ جب اون کے ہنگام قیام مین فرخ آباد مین جناب والد ماجد دورۂ عدالت دایر و سایر کے واسطے آتے تھے تو میر فضل علی کی آپ کی فرودگاہ مین کثرت سے آمد و رفت رہتی تھی اور جناب عاشق علی خان صاحب مغفور واسطے رفع شکایت برادرانہ کے کہ جناب چچا صاحب کی موقوفی کے بعد عہدۂ سفارت پر مقرر ہوئے تھے کہ علی العموم موقوف کرانا اونھین کی طرف منتسب تھا دونون صاحب نے آپس مین مشورہ کرکے یہ تجویز کیا کہ جو بندوبست جناب والد ماجد کے واسطے ہوا تھا اور بنا اوس کی نواب معتمد الدولہ ڈال چکے تھے اوس کی تکمیل کی جائے بموجب لوس کے ایک خط میر فضل علی کا اوسی مضمون کا جناب عاشق علی خان صاحب کے خط مین ملفوف بریلی مین اوس عرصے مین پہونچا کہ جب راقم بھی حضرت کے ہمراہ تھا اور عاشق علی خان صاحب اور سبحان علی خان صاحب کمبوہ جو میر فضل علی کے پیشدست تھے اُن دونون کا خط نہایت اصرار اور مبالغے کا اوس عہدے کے قبول کا آیا اور راقم نے بہت اصرار سے عرض کیا کہ راقم کو یہان اپنا قایم مقام مقرر کرا کے آپ تشریف لیجائین مگر جناب والد ماجد مغفور نے احسان اون سب صاحبون کا ایسی حالت مین کہ چھوٹے چچا صاحب کی معزولی ہوئی ہرگز گوارا نہ کیا اور اون خطوط کا جواب بھی نہ لکھا۔ اور حکیم مہدی علی خان جب پہلے نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد مین اور جب دوسری دفعہ محمد علی شاہ بادشاہ کے عہد مین مدار المہام مقرر ہوئے چونکہ وہ جناب جد امجد مغفور کے شاگرد تھے اس نظر سے اون کو اور ہمارے اہتمام کی طرف توجہ نہ تھا مگر جناب والد ماجد مغفور سے بہت

حکیم مہدی علی خان کی مدار المہامی مین لکھنؤ کی سلطنت
واسطے حصول وظیفہ ... منظور ہو چکی

محبت اور تپاک کرتے تھے چنانچہ جب والد ماجد فرخ آباد مین دورے کے واسطے تشریف لاتے تھے ایک کوٹھی اپنے مکانات مین سے آپ کی سکونت کے واسطے خالی کردیا کرتے تھے اور مکرر دعوت بھی کرتے تھے کچھ اس مین شبہ نہ تھا کہ اگر آپ اون کی حالت نیابت اور مدار المہامی مین مجھے سپرد کرتے تو خواہ مخواہ کوئی عہدہ معقول مجھے دیتے باوصف میرے اصرار کے آپ کو اسطرف توجہ نہ ہوئی۔ اور نواب روشن الدولہ کی مدار المہامی مین جب سبحان علی خان صاحب کمبوہ کو نہایت مداخلت تھی ایسی کہ گویا وہی مدار المہام تھے تو اوس عرصے مین خان صاحب ممدوح لکھنؤ مین ایک دن آپ کی ملاقات کے واسطے آئے۔ راقم بھی موجود تھا۔ سبحان علی خان نے از خود بغیر کچھ ادھر کی تحریک کے جناب والد ماجد مغفور سے کہا کہ ان کو بالفعل یہان وطن مین چھوڑ جائیے مین ان کے واسطے کچھ تجویز کرداؤن آپ نے انکار کیا اور فرمایا ان کی مفارقت مجھے منظور نہین ہے۔ اوسی عرصے مین جناب چھوٹے چچا صاحب نے ایک عہدہ لکھنؤ مین میرے واسطے تجویز کروایا اور وہ عہدہ میری اپنی غلطی سے نہ ہاتھ آیا۔ یعنی جناب ممدوح نے مجھ سے اوس کے ظہور تک اوس کے اخفا کی تاکید کی تھی۔ اس خیال سے کہ بعضے اورا عزہ اگر سنین گے تو تمھارے اوپر مجھکو اون کی تقدیم کرنا پڑیگی۔ اور جب دفعۃً تمھارا تقرر ہو جائے گا تو اون کی گفتگو کا محل نہ رہے گا۔ یہ امر مین نے آپ کے ایک مشیر کار سے جس کی طرف میرا گمان تھا کہ وہ اوس راز سے واقف ہین اوس کا ذکر کیا حالانکہ آپ نے اون سے بھی مخفی کیا تھا۔ غرض اونھین کی زبان سے شہرہ ہو گیا اور وہ امر بھی واقع نہ ہوا۔ غرض ان سب خیبت رجا سے جو مکرر واقع ہوئین مین نہایت رنجیدہ اور متفکر رہا کرتا تھا مگر جیسا پیشتر ذکر ہوا ہے وہ سب خیبت رجا موجب بہتری کی میرے واسطے ہوئین اس واسطے کہ اون سب امیدواریون مین ڈیڑھ دو سو روپیہ مہینے سے زیادہ کسی مین امید ملنے کی نہ تھی اور اگر کسی ایک عہدے سے اون مین سے مین متعلق

سبحان علی خان کمبوہ جو نواب روشن الدولہ کی مدار المہامی مین بڑے صاحب اختیار تھے خود بجائے ان کے مدار المہام ہونا چاہتے تھے کو کسی عہدہ پر مقرر کروانا چاہتے تھے وہ آپ نے قبول نہ کیا

ہو جاتا تو ظہور اوس ترقی کا اور فلاح کا جو میرے واسطے ہوئی ہرگز نہ ہوتا۔ الغرض اسی عرصے مین کہ مین کان پور مین جناب والد ماجد مغفور کے ساتھ تھا آگرے کی گورنری بنگالے کی گورنری سے یعنی گورنر جنرل سے علیحدہ مقرر ہوئی۔ اور ایک گورنر مع جمیع دفاتر کے جداگانہ مقرر ہو کے الہ آباد مین آیا اور پہلے مقر اوس کا وہی الہ آباد مقرر ہوا اون کے ہمراہ مسٹر مکسوین جو آگرے کے کمشنر تھے اور جناب بھائی صاحب مغفور سے بہت مواعید ترقی کے کر کے گئے تھے اور اونھین کے ایما سے بھائی صاحب نے مجھکو آگرے مین طلب کیا تھا اور کوئی امر میرے واسطے ظہور مین نہ آیا سکرٹری ہو کے آئے اس واسطے جناب بھائی صاحب مغفور نے اکبرآباد سے مجھکو لکھا کہ تم اس عرصے مین الہ آباد مین جاؤ اور مسٹر مکسوین سے ملاقات کر کے میرے واسطے بھی یاد دہی کرو اور اپنے تقرر کے واسطے بھی عرض کرو۔ چنانچہ مین نے الہ آباد کے سفر کی جناب والد ماجد مغفور سے اجازت طلب کی آپ نے بنظر تحریر بھائی صاحب کے نہایت بکراہ اجازت دی۔ غرض مین الہ آباد مین پہنچا اور بعد دو تین ملاقات کے حاکم ممدوح سے اگرچہ اوس عرصے مین صورت ترقی اور فلاح کی بھائی صاحب کے واسطے نہین ہوئی مگر مسٹر مکسوین نے راقم کے تئین اپنے دفتر کے فارسی کے کام کے واسطے منشی مقرر کیا۔ تقریب میرے تقرر کی عجیب و غریب ہوئی۔ دو تین ملاقات کے بعد جب معلوم ہوا کہ کچھ مطلب اون سے نہین نکلتا تو ایک دن مین اون سے رخصت ہونے کے واسطے گیا باتون باتون مین مین نے اپنے تعلق کا حال قایم مقامی مین عہدہ افتا کے اکبرآباد مین مذکور کیا۔ کچھ اسناد انگریزی جو اوس عرصے مین متعلق میری کارگزاری کے تھے اوس کی نقل مین نے اپنے ہاتھ سے کی تھی فی الجملہ اوس مین خامی تھی وہ نقول مین نے اون کے دیکھنے کے واسطے پیش کین۔ اونھون نے وہ دیکھ کے پوچھا یہ کس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہین مین نے اپنے ہاتھ سے لکھنا بیان کیا۔ اون کی میز پر ایک مسودہ دفتر کی ایک چٹھی کا ظاہر اونھین کا اپنا لکھا ہوا ہوگا رکھا تھا وہ مجھے دیا کہ اس کو

[illegible]

پڑھو چونکہ ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھیون کے پڑھنے کی کچھ مشق مین نے کی تھی مین اوس کو اول سے آخر تک پڑھ گیا۔ کچھ الفاظ نہین معلوم ہوئے وہ اونھین نے خود بتا دیے چونکہ اوس عرصے مین حکام کی نہایت خواہش تھی کہ یہان کے شرفا انگریزی سیکھین۔ اور خصوص اہل اسلام کے بڑے بڑے خاندانون کے لوگون کی نفرت انگریزی سیکھنے سے سب کے دلون مین تھی۔ اسی قدر میری مشق اور توجہ انگریزی مین موجب نہایت ادن کی مسرت کا ہوا اوسی وقت مجھے دفتر مین حکم حاضر رہنے کا کیا اور اوس دن کا فارسی کا کام میرے ہاتھ سے لیا پھر گورنر سے استجازت کر کے مجھکو اپنے دفاتر عدالت اور مال مین میر منشی مقرر کیا۔ رپوٹ میرے تقرر کے واسطے جو گورنر کو لکھا تھا اوس کا مضمون یہ تھا۔ ہمارے دفتر مین فارسی کام اتنا کم ہے کہ دس روپیہ مہینے کا ایک متصدی اوس کو انجام کر سکتا ہے لیکن یہ دفتر بہت عالی ہے۔ کم رتبہ آدمی کا یہان رہنا مصلحت نہین ہے اور فلانا شخص جس کو تین پشت سے مین جانتا ہون اگرچہ وہ اوس خاندان کا ہے کہ اطلاق لقب منشی کا اپنے اوپر عار سمجھے گا لیکن اس بڑے دفتر مین خصوص میرے سکرٹیری کے سبب سے البتہ وہ قبول کریگا۔ مین چاہتا ہون کہ سو روپیہ ماہیانہ اوس کے واسطے مین مقرر کر کے ان دفاتر مین منشی مقرر کرون گورنر نے منظور کیا اور ۱۸۳۴ء مین راقم اوس عہدے پر مامور ہوا قریب ایک برس کے اوس زمانے سے وہ سب دفاتر مع گورنر وغیرہ الہ آباد مین مقیم رہے اوس کے بعد گورنری آگرہ کی جو پہلے ولایت سے منظور ہوئی تھی اوس کا تقرر پھر موقوف ہو گیا اور حکم ہوا وہان صرف لفٹنٹ گورنر ہندوستان کے گورنر جنرل کی تبعیت مین رہے چنانچہ کچھ ذکر اوس کا تیسرے باب مین ہندوستان کے ذکر مین ہو چکا ہے مگر اوس کے ساتھ یہ حکم ہوا کہ مقر گورنری کا اکبر آباد مقرر ہو اس سبب سے سارے دفاتر اکبر آباد مین منتقل ہوئے اور راقم چند سال معیت اپنے بڑے بھائی کے بہت آسایش سے رہا اگرچہ بسبب اپنی فضولیون کے اکثر زیر بار رہا مگر مشہور ہے خاک برداری از تودہ کلان

بہتر ہے اوس عہدے پر دو تین کام بہت عمدہ میرے ہاتھ سے بن پڑے۔ ایک مرتبہ کانپور کے حکام نے تحریک کی کہ جناب عم والا مقام مولوی حکیم الدین خان بہادر مغفور کی تبدیلی اوس ضلع سے کی جائے صدر کے حکام نے بموجب اون کی تحریک کے تبدیلی جناب ممدوح کی میرٹھ کے ضلع مین قرار دی اور گورنر کے پاس رپوٹ کی جناب چچا صاحب وہان کی تبدیلی سے اتنے ناراض تھے کہ مستعد استعفا دینے پر تھے اوس عرصے مین گورنر مسٹر الگزنڈر راس نام ایک صاحب تھے راقم اون کے پاس گیا اور دو عرضیان ایک چچا صاحب کی طرف سے اور ایک حضرت والد ماجد کی طرف سے لکھ کے لے گیا چونکہ صاحب ممدوح بریلی کی عدالت دایر و سایر مین مدت تک رہے تھے اور وہان جناب والد ماجد مغفور دایر و سایر کے قاضی تھے اس سبب سے اون کو بہت محبت جناب والد ماجد سے تھی چنانچہ جب راقم کی اطلاع ہوئی مجھے بلالیا اور پوچھا کہان آئے مین نے عرض کیا کہ ایک ظلم شدید جناب چچا صاحب اور جناب والد ماجد پر ہوا ہے اوس کی دادرسی کے واسطے حاضر ہوا ہون۔ جواب مین جناب والد ماجد مغفور کا نام لے کے کہا کہ وہ میرے بڑے دوست ہین ہرگز مین روا نہ رکھون گا کہ اون کو کچھ رنج پہونچے جب راقم نے سب کیفیت بیان کی تب اون کی میز پر ایک بکس کاغذات کا بھرا رکھا تھا اوس کو کھولا اور وہ رپوٹ جو صدر عدالت سے اس باب مین آیا تھا دیکھا اور دیکھ کے کہا مجھکو دونون صاحبون کی دیانت اور امانت مین کچھ شبہ نہین ہے لیکن اون مقدمات مین جو ایک محکمہ کا مرافعہ دوسرے محکمہ مین ہو البتہ متخاصمین کو محل گفتگو اور اعتراض کا ہوگا کہ بھائی کی خاطر سے دوسرے بھائی نے اتفاق اون کی تجویز پر کیا اس سبب سے تبدیلی ایک کسی کی ضرور ہے بعد اوس کے خود کہا۔ مولوی حکیم الدین خانصاحب کا عذر تبدیلی سے بیان کرو مین نے عرض کیا بسبب قلت تنخواہ کے اور کثرت مصارف جو اس تبدیلی کے سبب سے پڑین گے اوس کے متحمل نہو سکتے۔ بیس پچیس برس کے قیام مین کانپور مین ایک مکان سکونت کا بنایا تھا

سعی مصنف سے تبدیلی جناب عم والا مقام مولوی حکیم الدین خان مغفور کی ملتوی رہی

وہ ضایع ہوگا اور جہان جائین گے وہان مکان بنانا پڑیگا۔ اور یہان سے بسبب قرب وطن کے بہت مصارف مین تخفیف تھی۔ ان عذرات کو قبول نہ کیا پھر خود کہنے لگے کہ اگر تمھارے چچا کی بدلی ہو تو تمھارے والد کو کیا عذر ہے۔ مین نے عذر کیا کہ حضور کو غالبًا معلوم ہے کہ کانپور کے حکام نے پہلے عہدہ صدر الصدوری کا والد کے واسطے تجویز کیا تھا چونکہ اوس مین استحقاق چچا صاحب کا فوت ہوتا تھا اونھون نے قبول نہ کیا اور اون کے تحت چونکہ بڑے بھائی ہین صدر امینی کے قبول کرنے مین انکار نہ ہوا۔ اب اگر چچا صاحب کی بدلی ہوگی تو غیر صدر الصدور کے تحت رہنا ہوگا۔ یہ امر بعد تیس برس سرکار کی نوکری کرنے کے عہدہ عہدون پر منظور نہین ہے مجبوری سے استعفا دین گے فرمایا البتہ یہ عذر تمھارے والد کا قبول کرنے کے قابل ہے لیکن اگر اون کی اپنی تبدیلی بہ ترقی کسی ضلع مین ہو کہ وہ خود کہین کے صدر الصدور مقرر کیے جائین تو کیا عذر ہے۔ مین نے عرض کیا اس صورت مین کیا عذر کی جگہ ہے یہ تو عین آرزو ہے فرمایا خاطر جمع رکھو اسی طرح سے تبدیلی ہوگی اور اوسی وقت اوس رپوٹ پر حکم لکھا کہ بسبب معذرت قابل قبول مولوی علیم الدین خان کے بالفعل تبدیلی مولوی حکیم الدین خان کی مناسب نہین ہے جب کسی ضلع مین صدر الصدوری کا عہدہ خالی ہو تو وہ اوس عہدے پر مقرر کیے جادین اس جواب کے جانے سے صدر کے حکام خصوص کانپور کے سب حکام بہت متعجب ہوے جب حقیقت حال منکشف ہوئی تو اوس عرصے مین مسٹر کالڈکٹ نام ایک صاحب کانپور کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے اور ظاہرا وہی بہت محرک چچا صاحب کی تبدیلی کے تھے ایک دن چچا صاحب سے کہنے لگے کہ ایک بیٹے قاضی علیم الدین خان صاحب کے بہت معتبر عہدے پر جو آپ لوگون کے بڑے فائدے کا ہے نوکر ہین۔ اس عرصے سے قریب دو برس کے بعد اٹاوہ مین نیا ضلع قرار پایا کہ وہان جج اور صدر الصدور وغیرہ نئے بھرتی کرنے کا حکم ہوا۔ صدر کے حکام نے مولوی ولایت علی خان نام جو فرخ آباد کے رہنے والے اور وہین کے صدر امین تھے

تقرر جناب والد ماجد مغفور اٹاوہ کی صدر الصدوری پر راقم کی تحریر سے

اون کے واسطے رپوٹ کیا کہ وہ اٹاوہ کے صدر الصدور مقرر ہون۔ جب یہ رپوٹ آیا تو راقم نے ایک عرضی جناب والد ماجد مغفور کی طرف سے لکھ کے اور الگزنڈر اس صاحب کا پچھلا حکم جو چچا صاحب کی بدلی کی رپوٹ پر ہوا تھا دفتر سے نکلوا کے ولایت علی خان کی رپوٹ کے ساتھ شامل کروا کے لفٹنٹ گورنر کے بکس مین رکھدی۔ اس عرصے مین مسٹر ٹمکاف آگرہ کی گورنری کی موقوفی کے بعد بلقب لفٹنٹ گورنر معین ہوے تھے اونھون نے سب کاغذات دیکھ کے حکام صدر سے ایک رپوٹ طلب کی اس مضمون کی کہ باوصف الگزنڈر اس کے حکم کے درباب تقرر مولوی علیم الدین خان جو صدر سے تقدیم مولوی ولایت علی خان کی ہوئی تو کیا اون کا استحقاق اور لیاقت اور دیانت مولوی علیم الدین خان سے زیادہ ہے اس استفسار کی کیفیت جو جناب والد ماجد مغفور نے سنی بہت آزردگی کا خط مجھکو لکھا کہ تم نے عبث یہ تحریک کی اگر حکام صدر نے اپنی پچھلی رائے کے بموجب تقدیم مولوی ولایت علی خان کی کی تو نہایت موجب سبکی کا میرے واسطے ہے لیکن چونکہ اوس وقت مین صدر کے حکام بہت پرانے اور فہمیدہ اور منصف تھے اونھون نے جواب مین لکھا کہ کسی طرح سے مولوی علیم الدین خان پر ولایت علی خان کو ترجیح نہین ہو سکتی اور چونکہ اٹاوہ کے ضلع کی تجویز کے وقت مولوی علیم الدین خان کا نام زیر نظر نہ تھا اور فرخ آباد مین قلت مقدمات صدر امینی کی زیر نظر تھی اس واسطے وہ تجویز کی گئی تھی حقیقت مین تقرر مولوی علیم الدین خان کا اٹاوہ کی صدر الصدوری پر چاہیے چنانچہ حسب الطلب ممدوح وہان مامور ہوئے

مولوی شہاب الدین خان مغفور والد ماجد کے عم زاد کا تقرر سہارنپور کی صدر الصدوری پر راقم کی تحریر سے

اور تیسرا امر راقم کی کوشش کا تقرر جناب مولوی شہاب الدین خان مغفور کا جو بنی عم حضرت والد ماجد کے تھے سہارنپور کی صدر الصدوری پر ہوا۔ اوس کی حقیقت یہ ہے کہ جناب ممدوح اوس ضلع مین مفتی اور صدر امین پچھلے بندوبست کے تھے جب نیا بندوبست پیش ہوا وہان کے جج کی تحریک سے حکام صدر نے تجویز کیا کہ اوس ضلع مین بسبب قلت مقدمات کے نہ حاجت صدر الصدوری کی ہے نہ صدر امینی کی مفتی عدالت عہدہ افتا اور مفتی شہر

پر مقرر ہون اور اون کا درماہہ بدستور باقی رہے - جناب ممدوح نے ایک عرضی اپنے فوت
استحقاق کی گورنر جنرل کے نام پر میرے پاس بھیجی - اوس عرصے مین مسٹر طامسن سکرٹری
آگرے کی لفٹنٹی کے تھے جس کا کام بھی لارڈ آکلنڈ گورنر جنرل شملہ کے مقام مین کرتے تھے
مین نے وہ عرضی طامسن صاحب کے پاس پیش کی - اونھون نے کہا بڑا افسوس ہے کہ اوس
ضلع مین بسبب قلت مقدمات کے صدر الصدوری اور صدر امینی تجویز نہین ہے - مین نے
عرض کیا کہ صدر الصدوری تجویز نہ ہونے سے صرف تین سو روپیہ مہینے کی تخفیف ہوئی اگر
وہان قلت مقدمات ہے صرف وہان ایک صدر الصدور رہے اور ضلع میرٹھ سے متعلق
ہو جائے تو کئی ہزار روپے مہینے کی تخفیف ہوتی ہے چونکہ طامسن صاحب کے مزاج مین بڑی
گنجایش تھی یہ امر اون کے دل مین جم گیا اوس رپوٹ کے جواب مین حکام صدر کو لکھا گیا
بالفعل وہان صدر الصدور مقرر کیا جاے اور اوس ضلع کے توڑنے کی فکر اور دیوانی کا کام میرٹھ وغیرہ
سے متعلق کرنے کا بندوبست آیندہ ہوگا - چنانچہ جب راقم عہدۂ میر منشی پر فارسی دفتر گورنر جنرل کے
مقرر ہوا اور کلکتہ کے جانے کے وقت رخصت ہونے کے واسطے اٹاوے مین جناب والد ماجد
مغفور کے پاس گیا آپ نے ارشاد کیا کہ جناب اقدس آلہی کو اصل تیرا تقرر اسی عہدے پر منظور
تھا اور پہلے اوس سے جو اکبراباد کی گورنری کے دفتر پر تیری ماموری ہوئی تھی صرف ان
تینون امور عمدہ کے اہتمام کے لیے ہوئی تھی - الغرض ۱۸۳۷ء مین جب لارڈ اکلنڈ گورنر جنرل
نے کلکتہ سے ممالک مغربیہ ہندوستان کا سفر کیا اور دستور کے موافق لفٹنٹ گورنر آگرے کے برخاست ہوکے وہ کام
بھی گورنر جنرل کے ذمے پر ہوا اور چونکہ وہ جا کے شملہ پر ٹھہرے تو وہان آگرے کی گورنری کے
دفتر بھی طلب کیے راقم بھی بموجب طلب کے شاہجہان آباد مین لشکر کے شامل ہوا - چونکہ
سفر مین دستور ہے مشاہرۂ معینہ ہر شخص کا جو حضر مین ہوتا ہے گورنری کے دفاتر مین
بڑھ جایا کرتا ہے اس سبب سے اور بسبب سیر و سیاحت کے ایک گونہ تنعم حاصل ہوا مگر
کوہستان پر بسبب تنہائی بہت کچھ اوراد اور وظایف بڑھ گئے اور اوس کی برکت سے

..... بموجب طلب گورنر جنرل کے آگرے مین

رندمشربی اور آزادی جو طبیعت مین باقتضاے سن شباب تھی وہ جاتی رہی کچھ تقوے زیادہ ہوگیا۔ اور چونکہ جب سے شادی ہوئی تھی دو لڑکے پیدا ہوئے تھے اور وہ کمسنی مین گذر گئے اوس کے بعد میرے گھر کے لوگون کو ایک ایسا عارضہ پیدا ہوا کہ مکرر سقوط حمل ہوا اور اولاد کی طرف سے ایک صورت یاس کی سی ہوگئی تھی وہین کوہستان مین خبر ولادت ایک لڑکی کی آئی کہ غرۂ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ مین وطن مین پیدا ہوئی۔ یہ خبر سن کے راقم نے نہایت گریہ و زاری سے جناب اقدس الٰہی کے حضور مین دعا اوس کی حیات کی کی جس سے مین گویا مایوس ہوگیا تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اوس کی زندگی مین بھی برکت دی اور اوس کی ولادت اتنی مبارک میرے واسطے ہوئی کہ اوس کے روز ولادت کے چوتھے یا پانچوین دن گورنر جنرل کی طرف سے مجھے خطاب خانی اور بہادری کا عطا ہوا اور پھر روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ تھوڑے دنون کے بعد خلعت کارچوبی اور سرپیچ مرصع عطا ہوا۔ اور اوس کی ولادت سے آٹھ مہینے کے بعد عہدہ میر منشی فارسی دفتر گورنر جنرل کا عطا ہوا اور برکت اوراد اور ادعیۂ ماثورہ سے اوس عرصے مین طبیعت مین نہایت فرحت اور بشاشت رہتی تھی اور مدت سے جو ایک انقباض اور دل بستگی بسبب زیرباری کے تھی اگرچہ وہ زیرباری کچھ عرصے کے بعد رفع ہوئی مگر قبض اور دل بستگی اوسی عرصے سے رفع ہوئی اور نہایت بسط طبیعت حاصل ہونا شروع ہوا جو لامحالہ میرے عقیدے مین برکت سے اوراد اور وظایف کے اور تقوے کے حاصل ہوا۔ غرض حکم میرے خطاب کے چھاپنے کا کلکتے کے گورنمنٹ گیازٹ مین اور دہلی گیازٹ مین اور آگرہ کے ایک انگریزی اخبار مین جو اوس عرصے مین بنام آگرہ اخبار مشہور تھا اس مضمون سے گیا کہ فلانے شخص کو خطاب خانی اور بہادری کا بنظر حسن کارگزاری اور دیانت اور امانت ذاتی اور حسن خدمت اور قدامت اون کے جد قاضی القضات قاضی نجم الدین علیخان بہادر اور اون کے والد مولوی علیم الدین خان بہادر نانا و ... کے صدر الصدور کے گورنر جنرل بہادر نے عطا کیا تاکہ ہر شخص اون کو اس خطاب کے ساتھ یاد

خطاب خانی اور بہادری کا لارڈ گورنر جنرل نے عطا کیا اور اوس تقریب
مین خلعت بھی دیا اور وہ خطاب سلطان دہلی مین اور گورنمنٹ گیازٹ مین چھپا

کرے۔ چنانچہ دہلی گیازٹ کے آٹھوین اگست سنہ ۱۸۳۸ء کے پرچے مین اور آگرہ اخبار کے گیارھوین اوسی مہینے کے پرچے مین اور گورمنٹ گیازٹ کلکتہ کے اٹھارھوین اوسی مہینے کے پرچے مین یہ حکم مشتہر کیا گیا۔ ہر شخص کو اس امر سے بہت تعجب تھا کہ اوس زمانے تک روزگار پیشہ لوگون کو کبھی اس نہج سے خطاب نہین ہوا تھا۔ مجھ سے پیشتر روزگار پیشہ لوگون مین صرف دو آدمیون کو یہ خطاب ملا تھا۔ ایک مولوی صاحب علی خان مرحوم کو جو مجھ سے پیشتر میر منشی تھے۔ اور ایک التفات حسین خان لکھنؤ کی رزیڈنٹی کے میر منشی کو مگر اون دونون کو صرف سند ملی تھی گیازٹ وغیرہ مین وہ حکم نہین چھاپا گیا تھا۔ سند جو راقم کو ملی اوس مین آدھے صفحہ مین انگریزی اور آدھے مین فارسی عبارت ہے اور فارسی عبارت کے اوپر گورنر جنرل کی بڑی مہر ہے جو خطوط کے لفافون پر ہوتی ہے اور انگریزی عبارت کے نیچے گورنر جنرل کے اپنے ہاتھ کے دستخط ہین۔ اس مقام پر صرف فارسی عبارت کی نقل مناسب معلوم ہوئی

سند نواب مستطاب معلی القاب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ بنام مولوی مسیح الدین خان بہادر منشی دفاتر عدالت و مال علاقۂ ملک مغرب

چون حسن خدمات و قدامت و نیکنامی بزرگان ایشان و نیز امانت و دیانت خود شان بانجام امور متعلقہ عہدۂ ایشان پسندیدہ خاطر دریا مقاطر آمدہ بنا بران درین زمان از راہ مزید عنایت و الطاف خطاب خانی و بہادری مرحمت گردیدہ سند ہذا اسمت مضا پذیرفت لازم کہ بیش از بیش بدیانت و امانت مستعد انجام و انصرام امور متعلقہ خود باشند و این سند را ذریعۂ فخر و اعزاز بین الامثال خود شناسند تحریر فی التاریخ دوم ماہ اگست سنہ ۱۸۳۸ء مطابق یازدہم شہر جمادی الاولی سنہ ۱۲۵۴ھ مقام شملہ۔ اب اس مقام پر نقل ایک حکایت عجیب کی ضرور ہوئی جو حقیقت مین وہی واقعہ موجب عطاے خطاب کا مجھکو اور فی الجملہ موجب ترقی کا عہدۂ میر منشی پر ہوا اور بعد اوس کے وہی واقعہ بانضمام بعضے اور وقایع کے موجب بے خاست کا

میر منشی کے عہدے سے ہوا۔ چونکہ اس عرصے مین ہنری طارنس نام ایک ارباب قلم مین سے نائب سکرٹیری گورنر جنرل کے تھے اور اہتمام فارسی دفتر کا اونھین سے متعلق تھا اور لارڈ آکلنڈ کو ایک شفقت خاص اون پر تھی اور اون کو بہت معتمد رکھتے تھے شملہ مین اونھون نے الف لیلہ ولیلہ عربی کی مجھ سے پڑھ کے اوس کا انگریزی مین ترجمہ کیا تھا اس سبب سے اون کو ایک توجہ باطنی میری طرف تھی۔ میرے بہت خیر طلب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی عہدے پر میری ترقی ہو۔ اس عرصے مین لکھنؤ کے اخبار سے معلوم ہوا کہ التفات حسین خان میر منشی لکھنؤ کی رزیڈنسی کے قضا کر گئے۔ ہنری طارنس نے مجھ سے مطلق کچھ نہین کہا اور ایک اپنی خانگی چٹھی مین کرنیل لو کو جو اوس عرصے مین لکھنؤ کے رزیڈنٹ تھے میری سفارش کی لکھ بھیجی اس مضمون سے کہ مین ایک شخص بڑے عالی خاندان اور فاضل مستعد اور بالیاقت کی تمکو نشان دیتا ہون جو بالفعل گورنر جنرل کے دفاتر مین متعلق ہے اگر تم اپنا میر منشی اونکو کرو تو وضع شے کی اپنے محل پر ہو گی اور مین بھی تمھاری مہربانی کا ممنون ہونگا۔ مین نے التفات حسین خان کے مرنے کی خبر بھی نہین سنی تھی۔ مولوی صاحب علی خان مرحوم جو اوس عرصے مین میر منشی تھے اونھون نے آکے مجھے اس کی اطلاع کی اور چونکہ اوس عرصے مین ہنری طارنس قائم مقام سکرٹری تھے اس سبب سے کہ ولیم جی مکناٹن سکرٹیری مستقل چند عرصے کے واسطے ایک اور کام پر گئے تھے اس سبب سے مولوی ممدوح کو یقین کلی میرے تقرر کا اوس عہدے پر تھا اس واسطے اونھون نے آکے مجھے مبارکباد دی۔ مین نے جاکے ہنری طارنس کے پاس نہایت اپنا امتنان ایسے حفظ الغیب کا بیان کیا اور چونکہ اوس عرصے مین وہ منصب بہت بااعتبار اور اعزاز خصوص لکھنؤ کے ارباب اقتدار کے قلوب مین تھا۔ اور کرنل لو نے ظاہر اکسی سے کچھ میرے کوائف بھی پوچھے ہون گے اور شاید وہ کیفیت سفارش ہنری طارنس کی بھی نقل کی ہو گی کہ بعضے وہان کے معتمد لوگون کے خطوط بطور اُستلاف کے اس واقعے کی اطلاع کے واسطے اور حقیقت حال دریافت کرنے کے واسطے

..... رزیڈنسی سے میر منشی کا انتقال ہونا ..... سے واسطے کرنیل لو سے سعی کرنا اور درد و نیکا مولوی اولاد علی [illegible] سے نوکری سے عذر کرنا

میرے نام پر آئے۔ اور وہان کی کیفیت یہ تھی کہ کرنل لو نے بمجرد التفات حسین خان کے انتقال کے مولوی اعزالدین مرحوم سندیلہ کے رہنے والے کو جو گوالیرمین رزیڈنٹی کے سیرمنشی تھے اور وہان سے استعفا دیکے اور پنشن لے کے چلے آئے تھے اوس عہدے پر مقرر کر دیا تھا۔ کرنل لو نے ہنری طارنس کے خط کا جواب نہ لکھا اور راقم نے خبر تقرر مولوی اعزالدین مرحوم کی سن کے اون سے جا کے عرض کیا کہ آپ نے غائبانہ میرے حال پر شفقت کی مگر اپنی شومی بخت کا کیا علاج ہے اوس عہدے پر دوسرا شخص مقرر ہو گیا چونکہ سررشتہ کے موافق منظوری اوس عہدے کے تقرر کی گورنر جنرل کی طرف سے ہوتی تھی اور ہنری طارنس نوجوان آدمی بہت زود رنج تھے اونھون نے فرمایا اب تک تقرر نہین ہوا یہان منظوری کے واسطے رپوٹ نہین آیا ہے اور کرنل لو بہت عاقل ہے ایسے آدمی کو جسکو کبرسنی سے اور ہاتھ مین رعشہ ہو جانے سے جب طاقت لکھنے کی باقی نہین رہی اوس وقت پنشن ملی ہے ہرگز ایسے عہدے پر مقرر نہین کریگا مطلب اونکا یہ تھا کہ اگر یہان رپوٹ بھیجین گے تو وہ نامنظور ہوگی چنانچہ اس امر کو نہایت غصہ مین آکے پھر صاف کہا کہ اونکی وجہ نامنظوری کی تو کھلی ہوئی ہے کسی کے واسطے رپورٹ وہ کرینگے ہرگز منظور نہین ہوگی مجھے کرنل لو چھوکرا سمجھے ہین ہمارے خط کی کچھ وقعت نہ کی جواب بھی نہین بھیجا۔ اور فوراً گورنر جنرل کے یہان سے مجھے مخاطب خانی اور بہادری کے خطاب کا کردا دیا تاکہ کرنل لو کے دل مین میری ہیبت وقعت ہو جاوے اور ظاہرا ہنری طارنس نے یہ تقریر کرنیل لو کی شکایت کی جو مجھ سے کی تھی کسی اپنے دوست کو لکھنؤ مین بھی لکھ بھیجی تھی یا کوئی افسر لکھنؤ کا بہار ون پر آیا تھا اوس سے زبانی کہا ہو کہ یہ خبر کرنل لو کو ہو گئی اون کو خوف اپنی رپوٹ کی نامنظوری کا ہوا اس واسطے مکناٹن صاحب کی معاودت تک اپنے عہدے پر اونھون نے رپوٹ نہ بھیجی جب وہ پھر اپنے عہدے پر آئے تب رپوٹ بھیجی اور اوس کے ساتھ ہنری طارنس کے خط کا بھی جواب بھیجا اوس مین نہایت معذرت لکھی کہ چونکہ قبل آپ کے خط پہونچنے کے ہم نے فلانے شخص کو مقرر کیا اگر اوس کو برخاست کر کے ہم فلانے شخص کو مقرر کرتے تو علی العموم اہل ہند کے دل مین

آتا کہ گورنر جنرل نے ہماری تجویز کو نامنظور کر کے اپنے دفتر سے ایک شخص کو مقرر کر کے بھیجا
اوس مین قطع نظر میری سبکی کے ہندوستانی ریاست مین ایسے امور کے تصور سے احتمال
مفاسد کا بھی تھا۔ اس واسطے آپ کی مہربانی سے امید ہے کہ ہماری رپوٹ کو منظور
کروا نیے اور میرے اوپر احسان کیجیے۔ اور رپوٹ مین لکھا کہ مولوی اعزالدین کو مین نے اس
نظر سے مقرر کیا کہ میرا بہت اعتماد اون پر تھا۔ اور چونکہ گوالیار مین مخالفت آب وہوا سے
وہ مریض ہو گئے تھے اپنے وطن جب آئے تو اون کو صحت ہو گئی۔ اور اون کے تقرر سے سرکار
کا نفع ہے کہ اون کی پنشن تخفیف کی مدین آجائیگی۔ الغرض جب یہ رپوٹ اور ہنری طارنس
کے خط کا جواب آیا تو پھر وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اب رپوٹ نامنظور کرانا بڑی نامردی ہے
پھر آپ کے واسطے انشاء اللہ تعالی کوئی اور فکر لطیف کی جائیگی۔ اور ظاہرا اوسی وقت
سے اپنے دل مین تصمیم عزیمت کر لی کہ دفتر فارسی کا میرمنشی راقم کو مقرر کرے اس واسطے
کہ مکناٹن صاحب کی روانگی کابل کی طرف زیر تجویز تھی اور وہ مولوی صاحب علی خان
مرحوم کو ساتھ لیجانے کے واسطے باہم قرار دے چکے تھے لیکن چونکہ اوس وقت تک یہ
امر کھلا نہ تھا شرح اوس کی نہین کی۔ اس عرصے مین کرنیل لو رخصت لیکے ولایت کو چلے
گئے اور اون کی جگہ پر کرنیل کالفیلڈ نام ایک صاحب مقرر ہوے اور اتفاقات سے مولوی
اعزالدین بھی قضا کر گئے راقم نے جا کے ہنری طارنس سے بیان کیا اور درخواست کی
کہ اب پھر موقع آیا ہے آپ میرے لیے اوس عہدے کے واسطے کوشش فرمائین میرے
نام پر مقرر ہو جاے گا۔ چونکہ صاحب ممدوح اپنے دل مین عزم مصمم میرے تقرر کا دفتر فارسی
مین کر چکے تھے اس امر کی طرف مین نے اون کو کچھ ملتفت نہ پایا مگر مین نے نہایت اصرار
کیا اس سبب سے کہ اپنے وطن مین ایسے معزز عہدے کے حاصل ہونے کو مین ایک
فوز عظیم جانتا تھا۔ اوس وقت اونھون نے فرمایا کہ ہمارا سفارش کرنے کا جی نہین چاہتا
اس واسطے کہ جو ہماری سفارش نہین مانتا ہے تو اوس سے ہم کو عداوت ہو جاتی ہے

مولوی اعزالدین کا انتقال کرنا اور کرنیل کالفیلڈ ریزیڈنٹ سے مؤلف کی درخواست عہدہ میرمنشی ریزیڈنٹی کی بابت ہونا

لیکن خیر اگر تمھاری مرضی یہی ہے تو گورنر جنرل کے نام پر درخواست لکھو ہم کوشش کرینگے کہ تم کو یہین سے مقرر کرکے بھیج دیوین ۔ بموجب اون کے ایما کے مین نے گورنر جنرل کو درخواست دی ۔ اب میرے اوپر یہ امر منکشف ہوا کہ ہنری طارنس جو عزم مصمم میرے تقرر کا میر منشی کے عہدے پر کرچکے تھے اس سبب سے اونھون نے اوس سعی مین جس کا وعدہ کیا تھا قصور کیا یا گورنر جنرل نے خود مقرر کرکے بھیجنے مین مصلحت نہ سمجھی ۔ میری درخواست پر حکم لکھا جو اونھین ہنری طارنس کے خط کے ذریعے سے مجھے ملا کہ گورنر جنرل کو میری دیانت اور امانت اور لیاقت اور علو خاندان پر یقین حاصل ہے لیکن چونکہ اس منصب مین جس کے تقرر کی درخواست مین کرتا ہون اول سفارش رزیڈنٹ کی ضرور ہے اس واسطے مجھے چاہیے کہ مین رزیڈنٹ سے درخواست کرون یقین ہے کہ وہ بنظر میرے علم اور فضل اور علو خاندان کے ضرور میرے واسطے رپوٹ کرین گے اوس وقت یہان سے منظوری ہوگی یہ حکم لاہور مین اواسط نومبر ۱۸۴۳ء مین صادر ہوا ۔ لیکن چونکہ راقم نے ہنری طارنس کو اس امر مین خوب مستعد نہ پایا بلکہ بعضے قراین سے یہ میری درخواست اون کے خلاف مزاج معلوم ہوئی مین نے صاحب رزیڈنٹ کے پاس تین مہینے تک درخواست نہ بھیجی ۔ جب اواسط فبرواری مین راقم لشکر کے ساتھ شاہجہان آباد مین پہونچا جناب بھائی صاحب مغفور جو وہان کے صدر امین مقرر ہوئے تھے وہ میرے اس تامل سے اس درخواست کے بھیجنے مین رزیڈنٹ کے پاس میری راے کا تخطیہ کیا اور تاکید کی کہ اب تک چونکہ رپوٹ نہین آیا ہے مضایقہ نہین ہے اب بھی درخواست بھیج دو جب یہ میری درخواست لکھنؤ مین پہونچی اوس وقت وہ رپوٹ روانہ کرچکے تھے ۔ مجھے ایک انگریزی خط لکھا کہ اون کو بڑا افسوس ہے میری درخواست کے پہونچنے سے پیشتر وہ رپوٹ روانہ کرچکے اور رپوٹ بھی حقیقت مین بھیج چکے تھے لیکن اوسمین لکھا تھا کہ ہمارے پاس اس عہدے کے واسطے بہت سی درخواستین گذری ہین اوس مین سے چھ آدمیون کا نام ہم نے منتخب کیا ہے جن کی درخواستین اس

رپوٹ کے ساتھ ملفوف ہین ۔ ان چھ درخواستون مین ایک درخواست قاضی محفوظ علیخان مرحوم راقم کے عمہ زاد بھائی کی تھی ۔ اور ایک درخواست مولوی مجید الدین خان مرحوم راقم کے والد ماجد کے بنی عم بھائی کے بیٹے کی تھی اور چار درخواستین اور تھین ۔ غالب ایسا ہے کہ اگر قبل رپوٹ روانہ ہونے کے میری درخواست پہونچتی تو میری درخواست بھی وہ بھیج دیتے اور ظن غالب قریب بہ یقین ہے کہ گورنر جنرل میری درخواست کو منظور فرماتے ۔ اس واسطے کہ اُن چھ درخواستون مین جس کی درخواست کو کرنل کالفیلڈ نے ترجیح دی تھی وہ گورنر جنرل نے نامنظور کی ۔ اوس کی نامنظوری کا عجب قصہ ہے جس کو مین بیان کرتا ہون ۔ الغرض جب کرنل کالفیلڈ کی چٹھی میرے نام پر جس کا مین نے اوپر ذکر کیا آئی مین اوس چٹھی کو لیکے مسٹر ہنری طارنس کے پاس گیا اونھون نے وہ چٹھی دیکھ کے فرمایا کہ ہان رپوٹ آئی مگر جس کے واسطے اونھون نے رپوٹ کی اوس کا تقرر نامنظور رہا اب یقین ہے کہ وہ تمھارے واسطے رپوٹ کرین گے ۔ مین نے کہا اگر ارشاد کیجیے تو مین پھر ایک درخواست اون کے پاس بھیج دون اونھون نے نہایت تاکید سے منع کیا کہ تم ہرگز اب درخواست نہ بھیجو رزیڈنٹ اہل فوج سے ہے جو نہایت غصہ ور اور تنک مزاج لوگ ہوتے ہین اوس کی سمجھ مین آوے گا کہ نامنظوری اوس کی رپوٹ کی تمھارے ہی تقرر کے واسطے تھی تو وہ اپنی رزیڈنٹی چھوڑ دیگا مگر تمھین ہرگز نہ مقرر کرے گا ۔ میری سمجھ مین اس مسٹر ہنری طارنس کی ممانعت کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ بہ نظر اوس جواب کے جو اوس رپوٹ کا گیا تھا میری عقل مین یہ آیا کہ اگر مین دوسری درخواست نہ بھیجون گا تو کرنل کالفیلڈ سمجھین گے کہ مین مطمئن ہون کہ گورنر جنرل مجھے مقرر کرین گے اور اگر مین دوسری درخواست بھیجون گا تو اون کے ذہن مین یہ آویگا کہ مجھے یقین ہے کہ بغیر اون کے رپوٹ کرنے کے مین نہین مقرر رہ سکتا ۔ الغرض مین نے دوسری درخواست کرنل کالفیلڈ کے نام پر اس مضمون کی لکھ بھیجی کہ آپ کا عنایت نامہ متضمن اس امر کے کہ آپ کو

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب
- انشائے سرور

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات مکمل
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- مینائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو
- مضمونہائے دلکش
- نظم نگارین
- رسالۂ تذکیر و تانیث
- افادۂ تاریخ
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس حسین ہوش مرحوم

- فسانۂ نادر جہان
- پیاری سہیلی
- دختر مہر
- الیمون

منشی افضل حسین ثابت

- حیات دبیر
- دربار حسین

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ کامل ۴ ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزا مغل
- مار آستین
- بنگالی دلہن
- معشوقۂ فرنگ
- پرتاب
- زود پشیمان

پریم چند

- پریم پچیسی
- [illegible]

مولانا عبد الحلیم شرر

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم جدال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- افسانۂ [illegible]

حکیم محمد علی خاں مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر حسینیہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال
- گنجینہ
- سیکفرن اور لوسی

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- جان اردو
- شاعری کی پہلی کتاب
- دوسری کتاب
- تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

- مجموعۂ گلگشت
- جام مہر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

- یاد ایام
- تذکرۂ گل رعنا

حکیم محمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- ایضاً دوم
- ایضاً سوم
- ایضاً چہارم
- ایضاً پنجم
- ایضاً ششم
- ایضاً ہفتم
- ایضاً ہشتم
- ایضاً نہم
- ایضاً دہم
- ایضاً یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

- الاسلام والنصرانیہ
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء [illegible]

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات طارق عمر بن عثمان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب اقصیٰ

منشی سید احمد دہلوی

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

گوتم بدھ - مہاتما بدھ کی مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۴ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- ذکر مارد فی

خواجہ عبد الاسد اختر
- صدیق اکبر
- حضرت عائشہ
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- دمشق
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو الظفر
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- کاس الکلام
- لسان الغیب جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم

سید مسعود بی اے
- نصاب اردو
- جاپان کا تعلیمی نظم
- انتخاب زرین

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کمل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- حکایات و احساسات
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے
- نورون کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفۂ سائنس
- بادل کے بچے
- خونابۂ عشق

حکیم محمد شجاع بی اے
- پاپ کا گناہ
- حسن کی قیمت

منشی عبد المجید سالک بی اے
- ماہ و انجم منزلہا
- چیاد دیگر افسانے
- چترا (ٹیگور)

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلایو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفےٰ
- صحف سماوی
- شمع سخن

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت چار حصہ
- معرفت حق
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہؓ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- تفرقۂ اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی اور یورپ

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک
- کرشن جیون
- شاہی جہاد
- سیپارۂ دل
- کم توسنت
- بیگمات کے آنسو
- اتالیق خطوط نویسی
- روزنامچہ
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- انگریزی کہانیاں
- سیر دہلی
- سفرنامۂ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اوراد و دعائیں
- تسکین احساس
- روزنامچۂ ہند
- اسلام کا انجام
- تسخیر مہر و قمر

مولوی عبد الرشید الخیری
- الزہرا
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی
- دُرِ شہوار
- منازل السائرہ
- سراب مغرب
- بنت الوقت
- قطرات اشک
- جوہر عصمت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- محبوب خداوند
- سودائے

نیاز فتح پوری
- گلستان جلی
- جذبات بھاشا
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن
- نشتر یاس

تاریخ اندلس، دیسی مورخوں کے استقلال، مسلمانوں کی تجارت اور انگریزی دین کی حکمت کا آئینہ، خانی خان، جلد

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

هو المستعان

رجسٹرڈ نمبر لے ۴۷۹

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
[illegible] کی روانگی پر آدھا
اور
[illegible] کی روانگی پر پورا

ہدیہ بیجیے
[illegible] کی روانگی پر الناظر ایک سال
اور
[illegible] کی روانگی پر [illegible] کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اُردوئے معلی
- عود ہندی
- دیوان غالب جیبی
- مکمل دیوان غالب

سرسید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- سیرت فریدیہ
- خطوط سرسید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبۃ والشوق
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ برنیر جلد ثانیہ

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈرامہ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد
- نصیحت کا کرنپھول
- جانورستان
- بیاض آزاد
- تذکرہ علما
- لغت آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجمہ
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش
- مراۃ العروس
- توبۃ النصوح
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانہ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعہ لکچر بے نظیر
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نورجہاں بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- حیات جاوید
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوہ ہند

مولوی بشیر الدین احمد
- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز طفلان
- تماشائے عمر
- عصائے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دلہن
- تسہیل ہدایت
- انشائے بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول
- جلد دوم
- سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم
- پنجم
- موازنہ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغا خان اسلام
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- قرزن نامہ
- آئین قیصری
- صحیفہ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم
- جغرافیہ ریاضیہ
- جغرافیہ طبعی
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ
- رسالہ علم مناسب
- معاون الحساب
- مساحت تاجبنشر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون حق دعوم

مولوی نذیر احمد [illegible]
- المذہب والاسلام
- تحریر المراۃ

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

جلد ۳۴	فہرست مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۲۸ء	نمبر ۳

[illegible] خود نوشت مولوی مسیح الدین خاں بہادر مرحوم ۸۱/۹۶

نئی کتابیں

تاریخ فقہ اسلامی - علامہ محمد الخضری کی کتاب التشریع الاسلامی کا ترجمہ - ازمولانا عبدالسلام ندوی جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بہ تفصیل بیان کی گئی ہیں حجم ۳۰ جزو - قیمت للعہ

شاما - پنڈت کشن پرشاد کول بی اے رکن انجمن خادمان ہند کا دلچسپ ناول، جس پر الناظر کے گزشتہ نمبر میں مولوی عبدالماجد صاحب کا ریویو شایع کیا گیا تھا - قیمت عہ

وکلاے مرافعہ - اس فارسی ڈرامہ کا مقدمہ جنوری کے الناظر میں شایع ہو چکا ہے۔ اصل ڈرامہ ترکی زبان میں لکھا گیا تھا - یہ فارسی ترجمہ ہے، جسے مولوی محمد مسلم عظیم آبادی ایم اے، ایم او ایل نے مرتب کیا ہے - قیمت عمر

صبح پیری کا ستارہ - حضرت شفق عمادپوری کی پچاس رباعیوں کا مجموعہ - سب رباعیاں پیری کے متعلق کہی گئی ہیں - ہر رباعی ایک صفحہ پر چھپی ہے - قیمت ۶ر

دلِ سی پارہ - حضرت شفق کی تیس رباعیوں کا مجموعہ - سب رباعیاں دل کے متعلق کہی گئی ہیں - ہر رباعی ایک صفحہ پر چھپی ہے - قیمت ۴ر

لمعاتِ اختر - الناظر کے پرانے قلمی معاون حضرت اختر جوناگڑھی کی نظموں کا مجموعہ جن میں سے بعض الناظر میں بقیہ دوسرے رسائل میں چھپی ہیں - قیمت ۸ر

خیالات اِروِنگ - امریکہ کے مشہور مورخ و انشاپرداز واشنگٹن اِروِنگ کے بعض دلچسپ اور مفید مضامین کا ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل - قیمت ۸ر

تنقیدی مقالات - مولوی سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے مصنف روح تنقید کے دو مضامین جن میں اُن اصولوں کے ماتحت مختلف اساتذہ کے نثر و نظم پر تنقید لکھی گئی ہے جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں - قیمت سہ

اُردو کے اسالیب بیان: نثر اُردو پر مصنف روح تنقید کا دلچسپ تبصرہ - قیمت عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب - عہد محمود غزنوی کے شعرا کے حالات، اُنکے ادبی کارنامے اور محمود کے معاصر حکمرانوں کی ادبی دلچسپیوں کی تفصیل - مصنف روح تنقید کے قلم سے - قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:- **الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۳ جلد ۳۴ — مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

ادبِ اُردو کی تاریخ

نومبر سنہ ۲۷ء کے الناظر میں مسٹر رام بابو سکسینہ کی جس انگریزی تالیف کا ذکر کیا گیا تھا اُسکا اُردو ترجمہ مکرمی جناب مرزا محمد عسکری صاحب کر رہے ہیں اور نصف کے قریب کتاب چھپ بھی گئی ہے۔ اُردو ترجمہ کا ایک دلچسپ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے، جس کے مطالعہ سے لائق مصنف کی محنت و جانفشانی کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ امید ہے کہ سال رواں کے اندر اندر اُردو ترجمہ شایع ہو جائے گا اور اُردو داں طبقہ میں بہت جلد حسن قبول حاصل کریگا۔

ایڈیٹر

باب ۱۲ - طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج

دلی کا ازسرِ نو پھر عروج ہوا۔ صفحاتِ گزشتہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُردو شاعری کا مرکز ترقی دلی سے لکھنؤ منتقل ہو کر آگیا تھا، لیکن قدما کی تخم ریزی بیکار نہیں گئی، اُنکی کوششیں سرسبز ہوئیں، اور وہ درخت جسکو دلی کے قدیم شاعروں نے بڑی کد و کاوش سے سینچا تھا، اب وہ نئے سرے سے پھیلنا شروع ہوا۔ دنیا میں مد و جزر، ترقی و تنزل، اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے، یہی دلی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے سے عرصے کی خاموشی کے بعد شاعری دلی

کی بلبل ہزار داستاں نے پھر نغمہ سرائی شروع کی، اور تمام اُردو داں پبلک کو اپنی خوشنوائیوں کا گرویدہ بنا لیا۔ غالب، ظفر، ذوق، مومن وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعرا ہیں۔ غالب کی خدا داد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دُنیا کے بہترین شعرا سے کیا جا سکتا ہے۔ ذوق و مومن گو کہ غالب کے مقابلے میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ ظفر بھی کوئی معمولی درجے کے شاعر نہ تھے، اور چونکہ مشاغلِ حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے شعر کے مشغلے سے دل بہلاتے رہتے تھے، وہ ذوق و غالب کے شاگرد تھے۔ اُس زمانے کے شعرائے دہلی جدید طرزِ لکھنؤ کے بالکل متبع نہ تھے، جہاں تصنع، تکلف اور رعایتِ لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مملو ہے۔ غالب اور مومن کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں، اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زباندان اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدا کی سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر انکی جگہ فارسی الفاظ رکھ دیے ہیں۔ اس زمانے کا اُن کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہندی لفظ اور محاورے یہ اُسی وقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا حُسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبۂ فارسی میں ایک معتد بہ کمی واقع ہوئی، جملوں کی ترکیبیں سہل ہو گئیں، شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے غالب و مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے۔ مثال کے لیے حالی، سالک، ظہیر، انور اور مجروح کے کلام کو دیکھنا چاہیے۔

مومن۔ ۱۲۱۵ھ لغایت ۱۲۶۸ھ
مطابق ۱۸۰۰ء لغایت ۱۸۵۱ء

حکیم مومن خاں، حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ انکے دادا حکیم نامدار خاں جنکی اصل نجبائے کشمیر سے تھی، سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں آکر شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ اور شاہ عالم کے زمانے میں چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ جب سرکارِ انگریزی کی حکومت ہوئی تو انکی پنشن مقرر ہو گئی، جسکا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد ان میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا، جو بات سنتے تھے، فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فنِ طب جو انکا موروثی پیشہ تھا، اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی اُنھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ بہم پہونچایا تھا، کہ اُنکے احکام (پیشین گوئیاں) سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ اکثر احکام کے صحیح ہونے

کے سبب سے لوگ اُنکے بہت معتقد تھے، اور اکثر آیندہ کی باتیں اُن سے دریافت کیا کرتے تھے۔ شطرنج سے بھی اُنکو کامل مناسبت تھی، اور دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو اُنھوں نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ عشقبازی کے لیے دلی ایسا وسیع شہر پایا تھا۔ جہاں اُنکے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زبان زد تھے۔ جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہوگئی تو اُنھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی تھی، اور نماز و روزے کے سختی سے پابند ہوگئے تھے۔ جو کلام اُنکی جوانی اور آزادہ روی کے زمانے کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے، مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی۔ اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ دلّی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رامپور، سہسوان، جہانگیر آباد، اور سہارنپور کی سیر کی۔ چنانچہ کہتے ہیں

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق ویرانہ چھوڑ، آئے ہیں ویرانتر میں ہم

چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بُلالیا۔ جب مرزا غالب نے ۱۸۴۲ء میں دلّی کالج کی پرشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا، تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بمشاہرۂ اسّی روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں، مومن خاں کو دینا چاہی، مگر اُنھوں نے باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپورتھلہ بھی بمشاہرۂ تین سو پچاس نہ گئے، کیونکہ سُن لیا تھا کہ وہاں ایک گوَیّے کی بھی یہی تنخواہ ہے۔ نواب وزیر الدولہ بہادر، والیِ ٹونک نے ایک مرتبہ اُنکو بُلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا، مگر اُنھوں اس بنا پر انکار کردیا کہ ٹونک میں دلّی کی پُر لُطف صحبتیں کہاں میسر ہونگی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج، قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی درباداری اور خوشامد سے اُنکو سخت نفرت، اور عار تھا۔ یہی اُنکے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ ان کا دیوان اُمرا کے مدحیہ قصائد سے خالی ہے، سوائے اُس قصیدہ کے، جسکا مطلع ہے:۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری

کثرتِ دُود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

یہ قصیدہ بطور اظہار شکریہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیسِ پٹیالہ کی شان میں لکھا تھا، جنھوں نے اُنکو ایک ہتھنی بطور تحفے کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اسکے مقابلے میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستانِ سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے۔ جب سعدی کی نسبت اُنکا ایسا خیال تھا، تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرے میں لاتے۔ اُنکے کلام کو نگاہِ حقارت سے دیکھتے اور اُنکا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ تاریخ گوئی میں اُنکو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخرجہ اور تعمیہ بُرا سمجھا جاتا ہے، مگر انکی طبع رسانے اِسکو محسنات میں داخل کردیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقے سے نکالتے تھے۔ مثلاً اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخِ وفات کہی :-

خاک بر فرقِ دولتِ دُنیا   می فشاندم خزانہ بر سرِ خاک

اس میں "خزانہ" کے اعداد بر سرِ خاک یعنی "خ" کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ نکلتے ہیں۔ ایک بیٹی کی ولادت کی تاریخ اس طرح کہی :-

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے   کہی تاریخ دخترِ مومن

"دخترِ مومن" کے اعداد سے "نال" کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقے سے نکالی ہے :

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے   فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اس میں دوسرے مصرعے کے الفاظ کے صرف بیچ کے حروف سے مادۂ تاریخ ۱۲۳۹ھ نکالا ہے۔

تصانیف تصانیف میں ایک دیوان جسمیں چھ مثنویاں شامل ہیں، یادگار چھوڑا۔ دیوان میں جمیع اصنافِ سخن جو شعرائے اُردو کو مطبوع ہیں، بکثرت موجود ہیں۔ دیوان کی ترتیب اُنکے مشہور شاگرد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے کی تھی، اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب مولفِ تذکرۂ شعرائے ہند نے اُسکو شایع کیا۔

رنگِ کلام مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے۔ اُنکی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اُس میں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز اُنکو طرزِ لکھنؤ سے علٰحدہ کردیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ اُستادِ کامل ہیں۔ اُنکی علمی لیاقت اور طباعی اُنکو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں۔ کیونکہ فارسی میں اُنکو بھی وہی تبحر حاصل تھا۔ بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی، اور کلام کو سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ اُنکی مثنویاں سر تیز نشتر ہیں، جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوزِ محبت

کا اظہار ہے - وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں، اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ اُن میں یہ کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرزِ ادا بلند نہیں ہے - اس معنی میں وہ طلسم الفت اور زہرِ عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جا سکتی ہیں - مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے - اور اسی لفظی ہیر پھیر سے تخیل کے نئے راستے کھلجاتے ہیں - مثالاً چند شعر درج ہیں :-

روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پسِ شکستنِ خُمُ زجرِ محتسب مقبول — گنہگار نے سمجھا گنہگار مجھے
نقد جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف — خونِ فرہاد بسرِ گردنِ فرہاد رہا
کیوں عشق ہوئے دیکھ آئینے کو — کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم
آئینہ زنگابِ غم سے توڑا — کیونکر اُسے مُنہ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ بحیثیتِ شاعر مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں - نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے، یا اس لیے کہ اُنکے معاصرین اُنکی بڑی قدر کرتے تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں، جنکے پیرو نسیم دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، حسرت موہانی وغیرہ ایسے نامبرآوردہ لوگ ہیں - مومن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں : نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب دیوان و تذکرۂ گلشن بے خار، میر حسین تسکین، میر غلام علی وحشت، اصغر علیخاں نسیم وغیرہ - مومن کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا - اُنھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے، یا پانچ برس میں مر جاؤں گا - چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے - مرنے کی تاریخ خود کہی تھی - دست و بازو بشکست - چونکہ اُسی سال انتقال ہو گیا تھا، لہذا یہی تاریخ اُنکے مرنے کی سمجھنا چاہیے -
۱۲ ۶۸

شیفتہ - ۱۲۲۱ھ لغایت ۱۲۸۶ھ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خاں، جنھوں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے تھے، اور اُسکے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا، علاقۂ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب مصطفیٰ خاں صاحب نے خرید کیا - جو ابتک اُنکی اولاد کے قبضے میں ہے - نواب صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں دہلی میں ہوئی - اور غدر ۱۸۵۷ء تک وہیں قیام رہا - اسکے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوئے - نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی - پُرگو شاعر تھے - فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے - مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اُردو

میں مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شاید واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے ہوں اور انکے بعد غالب سے جو انکے بہت بڑے دوست تھے، رجوع کی ہو۔ شیفتہ کی قابلیت کا نشوونما، علم و فن اور شعر و سخن نے جمگھٹے میں ہوا۔ جس میں مولوی امام بخش صہبائی، عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خاں، آزردہ، غالب، ذوق، شاہ نصیر، احسان، تسکین، حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے۔ مفتی صدرالدین خاں اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اہلِ کمال اُس میں جمع ہو کر لطف سخن اُٹھاتے تھے۔ نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحبِ کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے؛

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
نوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ اُنکی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوے کہتے ہیں:

غالب ز حسرتی چہ سرایم کہ در غزل چوں او تلاش معنی و مضموں نکردہ کس

نواب صاحب کو سفرِ حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی تھی۔ کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے، زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے، اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ تصانیف میں ایک فارسی دیوان، ایک اُردو دیوان، ایک مجموعۂ انشاے فارسی، جو فارسی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے، ایک سفرنامہ موسوم بہ ترغیب السالک، الیٰ احسن المسالک، جسکا فارسی نام رہ آورد ہے، اور ایک مبسوط تذکرۂ شعراے اُردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشنِ بیخار اُنکی یادگار ہیں۔

شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں بھی انکو یہی شہرت حاصل تھی اور اُردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجے کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ انکا تذکرہ گلشن بیخار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔ اُردو میں شیفتہ اپنے اُستاد مومن کے پیرو ہیں۔ ان کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے۔ اُنکے کلام میں وارفتگی مطلق نہیں ہے۔ اُنکے اردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر بلند مضامین، صفائی اور با محاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجے کے شعرا میں اُن کا درجہ ممتاز ہے۔ اُنکے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں نے اُنکا اُردو و فارسی کلام مع ایک مفید دیباچہ اور حالات کے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپوا کر

شایع کیا۔

تسکین۔ ۱۲۱۹ھ تا ۱۲۶۸ھ

میر حسین تسکین، میر حسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ اُنکے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوے اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہ ہوئی، تو رامپور آرہے۔ جہاں نواب یوسف علی خاں نے اُنکی بڑی قدردانی کی۔ چند روز رامپور میں آرام سے بسر کرکے پچاس برس کے سن میں ۱۲۶۸ھ میں رامپور ہی میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اپنے اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ بلکہ کلام میں اس قدر ہمرنگی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کردیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسی رامپور میں نواب کلب علیخاں کے زمانے تک تھے۔ یہ بھی ایک نامبرآوردہ شاعر تھے۔

نسیم دہلوی

۱۲۱۴ھ تا ۱۲۸۴ھ

مرزا اصغر علیخاں متخلص بہ نسیم، نواب آقا علیخاں کے بیٹے تھے۔ دلی میں ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوے، اور وہیں نشو و نما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہوگئی، اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علیخاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کرکے لانا چاہا، مگر انھوں نے ایک نہ مانا۔ اور پھر دلی نہیں گئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں رہے، مگر کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب، اور احکام قرآنی کے سختی سے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نولکشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوے۔ ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی، جو اُنکو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علٰحدہ ہوگئے۔ انکے بعد منشی طوطا رام شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جس وقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر تھا اُسی وقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بڑے زود گو تھے۔ مگر اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اس قدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اُسکی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ جسکی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہوگیا۔ اُنکا دیوان اُنکے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا۔ مگر اسکو وہ اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے۔ اُنکی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود

دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اُسکی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہل لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوے - جن میں عبد اللہ خاں مہر، منشی اشرف علی اشرف، منشی امیر اللہ تسلیم مشہور ہیں -

طرز کلام

نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے - اُنکا نہایت ہی لطیف طرز بیان نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے، جو مومن کا فیض تھا - نسیم کو تازگیِ کلام اور صحتِ محاورات کا بہت خیال تھا - لکھنؤ کے تصنعات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے - انکے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے - اپنے اُستاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے ہیں اور نزاکت خیال اور طرز بندش اور روانی کلام میں بھی اُنھیں کے پیرو ہیں - نسیم کا مرتبہ درجۂ دوم میں بہت برتر ہے -

ذوق - سنہ ۱۲۰۴ھ لغایت سنہ ۱۲۷۱ھ
مطابق سنہ ۱۷۸۹ء لغایت سنہ ۱۸۵۴ء

شیخ ابراہیم ذوق، ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے - جن کو نواب لطف علی خاں رئیس دہلی کی حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی - گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے - گر اپنے جوہر ذاتی اور فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھکر مشہور ہوے - اُنکی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی، جو معمولی درجے کے شاعر بھی تھے اور جنکے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے - حافظ صاحب کو شعر سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے - اُنھیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوق بھی مشاعروں میں جایا کرتے تھے - جہاں لوگوں کے اشعار سُن کر اُنکو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا - اُس زمانے میں اکثر اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور اُنکو بار بار پڑھا کرتے تھے - اُس زمانے کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور اُنھیں سے اصلاح لیتے تھے - ذوق کے ہم محلہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہوگئے - جنکا اُسوقت دلی میں بڑا شہرہ تھا - اُنکی دیکھا دیکھی ذوق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں - چنانچہ ایسا ہی کیا، اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جاکر شاہ صاحب کے شاگرد ہوگئے - نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار اُستاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرد اُستاد سے بڑھ جائے - اسی خیال سے وہ کبھی اُنکی غزلوں کو بغیر اصلاح پھیر دیتے، کبھی منہ بناکر کہتے یہ کچھ نہیں، طبیعت پر زور ڈال کر کہو - اُدھر ذوق کو اُنکے دوستوں نے اُستاد کے خلاف اُبھار دیا غرضکہ انھیں وجوہ سے رشتۂ اُستادی و شاگردی منقطع ہوگیا - ذوق اپنے کلام کو بنظر اصلاح خود دیکھنے لگے اور اُسکی درستی و چستی میں بڑی کدو کاوش کرنے لگے - اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنکے کلام نے

جلد شہرت حاصل کر لی اور اُنکی غزلیں محفلوں اور مجلسوں، حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں مرزا ابو المظفر ولیعہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں۔ جس سے شاعرانہ جودت اور تیز ہوتی تھی اور نوآموز شعرا کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ اِن مشاعروں میں اکثر پرانے اور کہنہ مشق شاعر مثلاً فراق، احسان، شکیبا، قاسم، عظیم، سنّت وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے۔ انھیں میں بہ توسط میر کاظم حسین بیقرار ذوق کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانے میں شاہ نصیر دلّی چھوڑکر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولیعہد سلطنت ظفر کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی۔ اتفاقاً اُنکو بھی بحیثیت میر منشی جان الفنسٹن صاحب کہیں باہر جانا پڑا۔ اور اب اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہوگیا۔ جس کا صلہ چار روپیہ ابو اربطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی، مگر اس کی تلافی اُنکی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہوگئی۔ اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنہ مشق شاعر اُنکو اُستاد ماننے لگے۔ دلّی میں نواب الٰہی بخش خاں تخلص بہ معروف (مرزا غالب کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری سے باخبر ہونے کے علاوہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے، جب ذوق کا شہرہ ہوا تو اُنھیں بھی اشتیاق ہوا، اور (بقول مولانا آزاد) ذوق کے شاگرد ہوگئے۔ اسوقت ذوق کی عمر تقریباً انیس سال تھی۔ ان دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوق کی شہرت میں اضافہ ہوا، بلکہ اُنکو اپنے کلام کی پختگی و صفائی کا انتہائی خیال ہوا۔ اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے۔ اور یہی مشق آیندہ اُنکے کام آئی۔ کیونکہ اُنکو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاوش کرنا پڑتی تھی، اور اُنکی غزلوں کو جو کبھی سودا، کبھی جرأت، کبھی درد کے طرز میں ہوتی تھیں، بڑی دقیقہ نظر سے بنانا پڑتا تھا[1]۔

شاہ نصیر سے معرکہ جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا عَلَم اُستادی پھر بلند کیا۔ اودھر

[1] مصنف تذکرہ گل رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ "آزاد نے آبِ حیات میں جس طرح سے ظفر مرحوم کی کاوش پر پانی پھیرا ہے، اسکے (معروف کے) بھی نتائج فکر کو اپنے اُستاد ذوق کے ذہن کمال سے وابستہ کیا ہے۔ باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اسوقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہونگے۔ مگر مرحوم بقیہ میں اسکا خیال نہیں رہا۔" (تذکرہ گل رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۴) اور نیز نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقے سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔

ہوشیار اور طباع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کدوکاوش نے اور بڑھادیا تھا۔ مشکل مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشاقی اور روانی پیدا ہوگئی تھی۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمایش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جسکی ردیف تھی "آتش و آب و خاک و باد"۔ وہ غزل دلی کے مشاعرے میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اُسکو میں اُستاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی مبارزطلبی پر ذوق نے مقابلے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ اور ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر تیار کیے۔ شاہ صاحب کو شاگرد کی جرأت و گستاخی بہت ناگوار ہوئی، ایک شاگرد سے اعتراض کرایا۔ جسکے جواب میں ذوق نے اکثر اسناد پیش کیے اور اس مقابلے میں ذوق ہی کو کامیابی ہوئی۔ اسکے بعد سے انکی اُستادی مسلم ہوگئی۔

اُنکے اعلیٰ قصائد[۵] کے صلے میں اکبر شاہ ثانی نے اُنکو "خاقانیِ ہند" کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابوالظفر بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا :

روکش ترے رخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہے ذرہ تیرا پرتوا نورِ سحر رنگِ شفق

اسکے صلے میں اُنکی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہوگئی اور پانچ سے سات۔ رفتہ رفتہ سوتک اضافہ ہوا تھا۔ اور عید بقرعید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ آخر ایام میں ایکدفعہ بادشاہ بیمار ہوے۔ جب شفا پائی تو اُنھوں نے قصیدہ[۶] لکھکر گزرانا۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اسکے صلے میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی مع ہودۂ نقرئی عنایت ہوا۔

پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلہ میں

شب کو میں اپنے سربسترِ خواب راحت

نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

---

۵ مثلاً وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن آب و ایلولہ ہوے نشو و نمائے گلشن

۶ غالباً مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہوگی جس کا مطلع و مقطع ہے :

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوے مہر و مہ تماشائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب شاہ دیندار نے شفا پائی

ایک گاؤں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے بعمر اسٹھ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا[۱]

ذوق اپنی تیزی ذہن، براقیِ طبع اور قوت حافظہ کے لیے مشہور تھے۔ بڑے خداترس، اور ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوفِ خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور مثلاً ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ۔ شعر گوئی سب پر حاوی تھی، اس میں انکو فنائیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گزرتی گئی انکی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ انکو فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی، دنیاوی ترقی کے حوصلے اُن کو مطلق نہ تھے۔ دلّی سے انکو اس قدر محبت تھی کہ جب راجہ چندو لال نے جو شاداں تخلص کرتے تھے اور شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مربّی تھے، انکو حیدرآباد بلوا بھیجا تو اُنھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا

اِن دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس میں کوئی زیب و زینت، بلکہ آرام و آسایش تک کا سامان مہیا نہ تھا۔ اُسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعر و سخن میں محو و مستغرق، دنیا و مافیہا سے بالکل بیخبر رہتے تھے۔ احکام قرآنی کے پورے عامل، اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دن رات میں اکثر ادعیات اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔

تصانیف ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاس برس سے زیادہ شعر و سخن کی مشق میں صرف کیے ہوں، اور سوائے شعر و سخن کے اسکا کوئی مشغلہ نہ رہا ہو۔ امید کی جا سکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اُس نے یادگار چھوڑے ہونگے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اُنھوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اسوقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہو جاتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانۂ غدر کی لوٹ مار میں ضائع ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اُنکے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقے سے اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اُن کا جس قدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُنکی اور حافظ غلام رسول ویران کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے[۲]۔

---

[۱] ظفر نے تاریخ لکھی — شب چہار شنبہ بماہ صفر — بحکم خدا از جہاں رفت ذوق
ظفر روئے اردو بنا خون زغم — خرد شید و فرمود استاد ذوق ۱۲۷۱ھ

[۲] مصنف جمخانۂ جاوید اس سعی میں انور اور ظہیر کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلوی۔

ذوق غزل اور قصیدہ دونوں کے اُستاد کامل تھے۔ جن کی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جس کا نام "نامۂ جہاں سوز" رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا، ایام غدر کی دست برد میں ضایع ہو گیا۔ انھوں نے اکثر مخمس، رباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں، جن میں سے اکثر ضائع ہو گئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کے واسطے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے۔ البتہ سلام اور مرثیہ اور ہجو وغیرہ اُن کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

ذوق کی خدمت زبان کے ساتھ

ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو خوب صاف کیا۔ اور اس پر جلا دی۔ وہ ایک بہت بڑے صناع تھے، اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہٗ واقف تھے، محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ الفاظ کا برمحل استعمال، فن عروض سے واقفیت، موسیقیتِ کلام، زورِ تخیل اور بلندی مضامین یہ سب چیزیں مل کر اُنکے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اس قدر نہیں پائی جاتی۔

انداز کلام

ذوق کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہے اُنکے یہاں تشبیہات و استعارات و دیگر صنائع و بدائع نہایت مناسبت کے ساتھ فی العموم استعمال ہوئے ہیں جسکی وجہ سے شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اُنکے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم بہت ہے۔ اعلیٰ تخیل اور بلندی مضامین کیساتھ الفاظ کی خوبصورتی اور صرف برمحل سے نظم نہیں ہوتی۔ ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے۔ سُرت اشعار اُنکے دیوان میں [illegible]۔ قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اُنکا مقابلہ سودا سے کیا جا سکتا ہے اور اُنھیں سے وہ متبع تھے بھی۔ مگر اُنکے یہاں اور اُستادوں کا بھی رنگ موجود ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد اور جرأت و مصحفی۔ قصیدہ میں وہ کامل اُستاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لیگئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُنکے اکثر قصائد ضائع ہو گئے۔ مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں، وہ اُنکی قادر الکلامی، اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بے مثل نمونے ہیں۔ اس صنف میں وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ اُنکی غزلیں تازگی مضامین، خوبی محاورہ، سادگی اور صفائی کے لیے مشہور ہیں۔ اُنکے کلام میں شاہ نصیر، سودا، درد، مصحفی اور جرأت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستہ کہا ہے رنگا رنگ کہنا بیجا نہیں۔ انکی وہ غزلیں جو جرأت کے رنگ میں ہیں مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں، نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں

انکے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے، اور عام لوگوں کے لیے ہے ایسی صورت میں جبکہ اُنکے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی و عربی داں شاعر تھے، جنکا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا، یہ اعتراض بیجا ہی نہیں۔ نازکخیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں، مگر سادگی اور صفائی اور ترنم الفاظ کے لحاظ سے وہ اُن سے بڑھے ہوے ہیں، اور قصیدہ میں تو اُن سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارا بن کر چمکے اور اُردو کے بہترین شعرا میں انکا شمار کیا جا سکتا ہے۔

تلامذہ انکے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ، ظفر، آزاد، ظہیر اور انور بہت نامور ہیں۔ انکے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسمٰعیل جو انکے فرزندان روحانی کی طرح زمانۂ غدر میں دنیا سے اُٹھ گئے۔

ظہیر متوفی سالہ ۱۹۱۱ء سید ظہیر الدین نام، ظہیر تخلص، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے، دلی کے باشندہ تھے۔ انکے والد ابو ظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں اُستاد، مرصع رقم خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کمسنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہوگئے تھے، اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی۔ شعر و سخن کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ چودہ برس کے سن میں اُستاد ذوق کے شاگرد ہوگئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا۔ جھجر، سونی پت، نجیب آباد ہوتے ہوے بریلی آئے، اور یہاں سے لکھنو کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے ابتر حالات سن کے، کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رامپور چلے گئے۔ وہاں چار برس رہے۔ اسکے بعد دلی آئے اور محکمۂ چنگی میں ملازمت مل گئی۔ اسکے تھوڑے عرصہ کے بعد اخبار جلوۂ طور کے ایڈیٹر ہوگئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ انکے مضامین کو مہاراجہ شیو دھان سنگھ والیِ الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ انکو الور بلوا بھیجا، جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہوگئے۔ مجبور ہوکر پھر دہلی آئے، اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمۂ پولیس میں انکو ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش انیس سال رہے۔ والیِ ریاست کے مرنے پر انکا تعلق ریاست سے منقطع ہوگیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوے تھے کہ نواب محمد علیخاں خلف نواب امیر خاں والیِ ٹونک نے بلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے انکے ساتھ رہے۔ نواب کے مرنے پر اُنکے صاحبزادے نواب ابراہیم علیخاں نے انکا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طریقہ سے تقریباً پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لیکر حیدرآباد گئے، جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد باریابی ہوئی۔ مگر تنخواہ مقرر ہونے

کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ بیکاری کے زمانہ میں جب پریشان حال ہو گئے تھے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اُنکی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پُرگو شاعر تھے۔ تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّٰی "گلستانِ سخن" آگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم و سوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ چوتھا دیوان، جسمیں بہ قول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدس شامل ہیں، اُنکے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن خاں کا رنگ زیادہ پایا ہے۔ جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود اُنھوں نے کیا ہے:

طرز مومن سے نہ آگاہ تھا جبتک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کیا نباہی طرز مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخری دَور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانے میں زبان اور شاعری دونوں کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ انکے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ہیں جو پہلوان سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

انور سید شجاع الدین عرف اُمراؤ مرزا متخلص بہ انور، ظہیر مذکورۂ بالا کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور یہ بھی ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھلاتے تھے۔ نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ جے پور میں عین جوانی میں بعمر ۳۸ سال انتقال کیا۔ انکے تمام معاصرین انکی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ اور یہ اُن سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں جو غدر کے دس سال بعد دلّی میں ہوا کرتے تھے۔ جن میں داغ، حالی، مجروح، سالک، ارشد، مشتاق وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سناتے تھے۔ انکے دو دیوان ضائع ہو گئے۔ مگر محترمی لالہ سری رام صاحب قابل مصنف خمخانۂ جاوید نے بڑی محنت اور شفقت سے متفرق اور پریشان سودوں سے ایک دیوان جمع کر کے چھپوایا ہے۔ انور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوق، غالب، اور مومن تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے۔

غالب۔ ۱۲۱۲ھ لغایت ۱۲۸۵ھ / ۱۷۹۶ء لغایت ۱۸۶۹ء زبانِ اُردو کے بہت بڑے اہر آسمانِ شاعری کے سب سے درخشندہ تارے، اپنے زمانے کے اُستاد و کامل فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ اسد و غالب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ لقب مرزا نوشہ تھا۔

اور خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، بادشاہ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا۔ جیسا کہ اُنکے اکثر اردو و فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے لیے یہ چند شعر کافی ہیں

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم | لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی | بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک | در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم | عقلِ کُل را ہمینہ فرزندیم
تبلا سنجے کہ ہست فیروزیم | بہ معاشے کہ نیست خورسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرئیم | ہمہ بر روزگار می خندیم

اشعار مذکورۂ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایک ترکمانوں سے، جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے، ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطینِ سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی۔ مرزا کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے ایک متلون زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے، پھر حیدرآباد گئے، جہاں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد گھر آئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی، جہاں کسی سرکش گڑھی کی لڑائی کے موقع پر ۱۲۱۲ھ میں مارے گئے۔ اسوقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت انکے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسنِ خدمات اور وفاداری کے صلے میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی۔ ان کا انتقال بھی ۱۲۲۱ھ میں ہوگیا۔ اس وقت غالب کی عمر نو برس کی تھی۔ اسکے بعد انکی خبرگیری انکے ننہال میں ہوتی رہی اور اپنے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی۔ مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشق اُستاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ جب انکی عمر چودہ برس کی ہوئی تو ہرمزد نام ایک پارسی سے جو ژند و پاژند کا عالم اور بڑا سیاح تھا، انکی ملاقات ہوگئی۔ ہرمزد نے آخر میں

مذہب اسلام قبول کرلیا تھا اور عبدالصمد نام رکھا تھا۔ یہ اُنکے ساتھ تقریباً دو برس رہا۔ اور چونکہ فارسی کی طرف اُنکو قدرتی مناسبت تھی لہذا اُس سے اُنھوں نے پوری طرح اکتسابِ کمال کیا۔ اسکے فیضانِ صحبت کا مرزا کو فخر تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُسکی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور بامحاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادہ بخوبی پیدا ہوگیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۲۱۶ھ میں آئے جب اُنکے چچا کی شادی نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہوئی تھی، اور خود انکی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے ساتھ جو نواب فخرالدولہ والیِ لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔ جبکہ ان کا سن تیرہ برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اسوقت شاعری گونج رہی تھی۔ مشاعرے جا بجا ہوا کرتے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، ان سب اسباب سے نوعمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر پڑا۔ شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اس میں بہت کچھ کہا، مگر رفتہ رفتہ اُردو شاعری کی روزافزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اُردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے، جب کسی شخص کا یہ شعر سُنا

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

یہ سُنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہوگئی۔ کیونکہ اُن کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ شرکتِ حال ہونے کو بہت بُرا جانتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ میں "اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب" کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انھیں اسی طرح رہنے دیا۔

مرزا ۱۸۳۰ء میں کلکتہ بھی گئے تھے بسلسلہ اپنی پنشن کے جو انکے چچا کو جاگیر منضبط ہو جانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہوگئی تھی۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی۔ اور ایک قصیدہ نصیرالدین حیدر بادشاہِ اودھ کے واسطے اور ایک نثر وزیر سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچسو روپیہ سال انکے واسطے مقرر ہوے تھے، مگر دو برس بعد جب انتزاعِ سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہوگئے۔ ۱۲۶۳ھ میں غالب تین ماہ کے واسطے کوتوال شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہوگئے تھے۔ مگر قید میں انکے مرتبہ کے موافق ان کا احترام کیا گیا۔

۱۸۴۲ء میں غالب ایک فارسی پروفیسری کے لیے جو دلی کالج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے

مگر چونکہ ٹامسن صاحب سکرٹری گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا، اس لیے انھوں نے اپنی کسر شان سمجھ کر ملازمت قبول نہ کی۔ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۴۹ء) میں خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، بادشاہ نے دربار میں عطا کیا، اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا، اور پچاس روپیہ مہینہ اسکے صلہ میں مقرر کیا۔ ۱۲۷۱ھ میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا، اُستادِ شہ مقرر ہوے اور اصلاح کا کام اُنکے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلۂ ملازمت اور تقربِ شاہی مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہوگئے تھے۔ پنشن بند ہوگئی اور اُنکے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی۔ آخر میں جب پوری صفائی ہوگئی اور یہ بے گناہ ثابت ہوے تو انکی پنشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علیخاں والیِ رامپور کے اُستاد بھی تھے، جو انکو سو روپیہ ماہوار بطور پنشن عمر بھر دیتے رہے۔ غالب کا انتقال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء میں بعمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوے۔

عام حالات اور طبعی عادات

غالب نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوے تھے، اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدردانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا جسکو وہ نہایت باقاعدہ طور پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ دور دراز کے شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مراسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے۔ اُنکی یہ عادت مرتے دم تک جاری رہی۔ محبت و ہمدردی اُنکے خمیر میں پڑی تھی۔ جیسا کہ اُنکے خطوط اور اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلو سے کوسوں دُور تھے۔ سچ پوچھو تو انکا مذہب بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ اُنکی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ انکے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے۔ جن میں سب سے زیادہ نامی وگرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے۔ جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔

گو کہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ وثروت کے اعتبار سے فارغ البال نہیں ہوے مگر پھر بھی جس قدر اُنکی آمدنی تھی، وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے اُسی طرح وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لیے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان اُنکو ظاہر کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے، مگر اس واقعہ کو اُنھوں نے کبھی نہیں

چھپایا، بلکہ اپنے اشعار اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے تھے۔ اور اس طرح گویا وہ اپنی ندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ انکو اپنی خودداری اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امراء سے وہ برابری سے ملتے اور اپنی علو شان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔ جیسا کہ اُس واقعہ سے پایا جاتا ہے، جب انھوں نے دلّی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی اُن کا یہ خیال حدِ اعتدال سے متجاوز بھی ہو جاتا تھا مگر اپنے وسیع حلقۂ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفق و مدارا اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ اُنکے خانگی تعلقات خاطرخواہ اپنی بیوی کے ساتھ شگفتہ نہ تھے۔ مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں ہوئی تھیں، مگر وہ سب بچپنے میں مر گئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فاترالعقل تھے اور مرزا انھیں کے ساتھ رہتے تھے، غدر کے زمانہ میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بہت ہونہار شاعر تھے اور مرزا کے سامنے انکا انتقال ہو گیا تھا۔ انکے دو بچوں سے مرزا کو کمال محبت تھی۔

آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ پھر اس زمانہ میں اُنکی مالی حالت بھی درست نہ تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوئے تھے، اسی وجہ سے انکے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر بیجا نہیں ہے بلکہ اُس سے حسنِ شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں اُنکی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے، جسکی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے۔ اسی

خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقے پر ظاہر کرتے ہیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹجا تا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی انکی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے، جس سے مصائب کی تیرگی کا فور ہو جاتی ہے۔ اُنکی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بد مزگی نہیں ہوتی بلکہ اُس میں مناسبت اور جدتِ اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں اُنکے اُنکے کلام میں بیزاری کا پرتو ہے مگر یہ کیفیت سفر سے پیدا نہیں ہوتی۔ انکی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوٹا۔ حتٰی کہ اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے" اگر ان جیسا کے اِس قسم کے لطائف و ظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیے، جس میں ایسی باتیں بہ کثرت مذکور ہیں۔

غالب بحیثیت شاعر کے — مرزا کا پایہ شاعری میں بہت لبند ہے اور اُسکو سب نے تسلیم کیا ہے۔ وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے۔ اور اُنکے معاصرین بھی اس بارے میں اُنکی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُنکو فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے۔ اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اس قدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ اُنکے کلام کا قدردان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیا ور ید گر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہا ے گفتنی دارد

یہ عجیب بات اور نیرنگی قسمت ہے کہ اُنکی شہرت کا باعث اُنکی فارسی شاعری نہیں، بلکہ اُردو شاعری ہوئی، جسکی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیلِ ذائقہ کے لیے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہلیا کرتے تھے۔ مختلف کتابیں انکی نظر سے گذری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے اُنکو پڑھا تھا۔ قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا اور اُسپر اتنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لیکر پڑھتے اور خود کبھی مول نہ لیتے تھے۔ فی البدیہ اشعار کہنے کی

بھی عادت تھی جیسا کہ اُس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمایش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہہ دیے تھے۔ عربی میں گو انھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فن عروض کے اُستادِ کامل تھے اور اُسکے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کما حقہٗ واقف تھے۔ مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُنکو مطلق دلچسپی نہ تھی۔ گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں۔ اسی طرح مرثیہ اور تاریخگوئی سے بھی اُنکو کوئی لگاؤ نہ تھا[1]۔ البتہ فارسی میں بہت سے نسخے موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور اُنکی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جسکی وجہ سے ایک شاعر کا تبحر ایک معمولی چابکدستی کے ساتھ مل گیا۔

تصانیف حسب ذیل تصانیف اُنکی یادگار ہیں :۔

(۱) عودِ ہندی (۲) اُردوی معلّٰی (۳) کلیاتِ نظم فارسی (۴) کلیاتِ نثر فارسی
(۵) دیوانِ اُردو (۶) لطائفِ غیبی (۷) تیغِ تیز (۸) قاطعِ برہان
(۹) پنج آہنگ (۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہرِ نیمروز (۱۲) دستنبو
(۱۳) سبدِ چین

عودِ ہندی اور اُردوے معلّٰی، اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں، جو اُنھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے، اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شایع ہوے تھے۔ عودِ ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں۔ لطائفِ غیبی، مباحثہ میں ہے، اور "سیف الحق" کے فرضی نام سے لکھی ہے۔ تیغِ تیز اور نامۂ غالب بھی اُسی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطعِ برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

---

[1] یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخگوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یوں تو اُنکے اُردو دیوان میں بھی دو تین تاریخیں موجود ہیں مگر فارسی میں تو متعدد عمدہ تاریخیں اُنکے قطعات میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو تاریخی مادے لکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے ہیں تاریخ وفات مرزا اسیتا بیگ

زسال واقعۂ میرزا اسیتا بیگ — آمت راست شمار ائمۂ امجاد
صحیفہ ہاے سماوی مبین از عشرات — حدیقہ ہاے بہشتی مشخص از آحاد
بحرمتِ دہ و دو ہادی و چہار کتاب — کہ در نشیمنے از ہشت خلد جایش باد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہانیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں :۔ (دیکھیے صفحہ ۲۱)

پنج آہنگ میں فارسی انشا پردازی کے مختلف نمونے ہیں۔ کلیات نظم فارسی، اُنکے فارسی قصائد اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ مہر نیمروز تاریخ ہے۔ مرزا نے اسکو حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا۔ اسکی پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لیکر بہادرشاہ تک کا بھی حال دوسری جلد میں لکھیں اور "ماہ نیم ماہ" نام رکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہوگیا اور وہ کتاب رہ گئی۔ دستنبو میں ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت تباہی شہرادہ اُسکے ساتھ اپنے حالات بیان کیے ہیں۔ سبدچین میں چند قصائد اور قطعات فارسی اور کچھ خطوط ہیں۔

مرزا صاحب سے مباحثے | پہلا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے اُنکے کلام پر کچھ اعتراض کیے اور سند میں قتیل کے اقوال پیش کیے۔ مرزا صاحب جن کا قول تھا

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را　　چہ شناسد قتیل دواقف را

(بقیہ ۲۰)　جستم از سال رحلتش اثرے　　گفت غالب کہ خود زروے شمار

از بروج سپہر بوے آت　　عشرات از کواکب سیار

گفتم آحاد گفت شرمت باد　　از خداوند واحد القہار

اس میں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنی کل ۱۲۷۱ نکلتے ہیں۔

بلہ مرزا کے فارسی قصائد کل چونسٹھ ہیں جن میں سترہ قصیدے حسب ذیل انگریز حکام کی شان میں ہیں۔

نام ممدوح	تعداد قصائد	نام ممدوح	تعداد قصائد
کوئن وکٹوریا	۳	مسٹر اسٹرلنگ	۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱	ولیم فریزر	۱
لارڈ الن برا ایضاً	۲	مسٹر کالون	۱
سر چارلس مٹکاف ایضاً	۱	لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
جیمس ٹامسن	۱	مسٹر ایڈمنسن	۱
مسٹر پرنسپ	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
طامس میڈک	۱	مسٹر منٹگمری لفٹنٹ گورنر	۱

انکے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریز مدوحین کی شان میں ہیں۔

وہ بھلا قتیل کو کب ماننے والے تھے، انھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذۂ اہل زبان پیش کیے اور کہا

طالب و عرفی و نظیری را | دامن از کف کنم چگونہ رہا
آں ظہوری جہانِ معنی را | خامہ روح و روانِ معنی را

مخاصمین جو قتیل کے شاگرد تھے اس پر اور بر افروختہ ہو گئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وار دکیے، یہ سب واقعات انکی مثنوی "بادِ مخالف" میں مذکور ہیں۔

دوسرا مباحثہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت "برہانِ قاطع" پر اعتراض کیے اور انکو کتابی صورت میں شایع کیا اور "قاطع برہان" نام رکھا۔ اُسکے ایک سال بعد اس کتاب کو ترمیم کرکے اسکا نام "درفش کاویانی" رکھا۔ اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے اکثر جواب لکھے گئے۔ کالکتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "موید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اسکا جواب "تیغ تیز" سے دیا اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامۂ غالب" سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بےموقع ہے، مگر اتنا ہم ضرور کہینگے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے اُستاد کامل تھے۔ اور اُن کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی، بیدل و حزیں وغیرہ سے بے تکلف کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور

غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جا سکتی ہے جس سے انکی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔ یہ بات مزید پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اُردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ اُن کا قول تھا

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ | بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اُردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے۔ مگر باایں ہمہ اُنکی ذہانت و طباعی اور اُنکی فطری شاعری کا پورا اثر اُنکے اُردو کلام میں بھی اُسی طرح جلوہ گر ہے جس طرح اُنکے فارسی کلام میں ہے۔ مرزا کا اُردو دیوان تقریباً اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہ ہوگا۔ مگر اُسکو زبان اُردو کا بہترین خزانہ اور اُردو شاعری کا نہایت گراں قدر سرمایہ

سمجھنا چاہیے - مرزا کی شاعری کا پہلا دَور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا - تا عمر پچیس سال جب کہ اُنھوں نے نے اپنے اُردو دیوان کو چھانٹا اور اُس میں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں - اب وہ قدیم کلام جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا ایک عرصہ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے بہم پہونچا کر چھاپا گیا ہے اور اُسکے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں - اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کس قسم کی ہوتی تھیں - نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو اُنھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں انکو پسند تھیں - اس نئے دریافت شدہ کلام کی نازکخیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرونِ وسطیٰ کے اُن یورپی شعرا سے ملتی جلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح میں " اسکولمن " کہتے ہیں - اس دَور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں اور نازکخیالیوں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبدالقادر بیدل کا بہت تتبع معلوم ہوتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں

مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

طرز نازکخیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں - بعض اوقات اُنکی بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے ایسے ہی اشعار پر " کوہ کندن و کاہ برآوردن " کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے - یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا اس وجہ سے کہ اُنکے مزاج کی افتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علٰحدہ رکھنا چاہتے تھے - اسی لیے شاعری میں بھی انھوں نے یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا - اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا - اور فارسی کا ذوق اُنکی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا - یہ طرز اُنکے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک بڑا آلہ کار تھا - مرزا بیدل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ اُنکے معترف بھی بھی ہیں، جیسا کہ مذکورۂ بالا شعروں سے معلوم ہوا - یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا، مگر تھوڑی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا، بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا - جس میں نہ صرف بیدل کی پیروی

ترک کی بلکہ اس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کردیا۔ اُنکے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔ عجیب و غریب تشبیہیں، ایسی بلند پروازیاں جنسے شعر کے معنی مبہم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں وہ سخنہ کاری، وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو انکے بعد کے کلام میں ہیں نہیں پائے جاتے۔ انکے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جنمیں اُردو کی آمیزش محض اس وجہ سے ہے کہ شعر اُردو کہا جاسکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہوجاتا ہے۔ گو اُنکے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا تھا، جیسے کہ حکیم آغا جان عیش نے جل کر کہا کہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے (قطعہ) مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی اُنکے اعلیٰ درجے کی دماغی قوت اور آیندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ انکی اس دور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے۔ اور اُنکی جُودتِ طبع سے معلوم ہوجاتا ہے کہ آیندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ انکی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازک خیالیاں، نئی نئی تخئیلیں اور پُر لطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اُردو شعرا میں کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتیں۔ اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضہ سے آخرکار یہ رنگ ترک کرکے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دَور میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا۔ اس میں زبان صاف ہوگئی ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت ہے۔ اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتد بہ کمی ہے۔ مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاق سلیم کو گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک پُر لطف ہیجان پیدا کردیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دَور اُنکے کمال فن کا لب لباب اور ارتقاے کمال کی آخری منزل ہے۔ اس دور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے اس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے۔ ان میں ایجاز کے ساتھ سلاست و روانی، نازک خیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجہ احسن موجود ہے۔

اور انھیں سے غالب کو شعرائے اُردو کی صفِ اولیں میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

غالب کے خصوصیات۔ پہلی خصوصیت جدت پسندی

ہماری رائے میں مرزا کے قصرِ شاعری کی مستحکم بنیاد اُنکی جدت طرازی پر قائم ہے جس میں جدتِ تخیل، جدتِ طرزِ ادا، جدتِ تشبیہات، جدتِ استعارات، جدتِ محاکات، جدتِ الفاظ، غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کے خاص طرزِ ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات اک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدتِ اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہو جاتا ہے اسی جدت طرازی اور دقیقہ سنجی کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معمے کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے جسکا حل ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ غالب اور اکثر شعرائے اُردو و نیز بعض شعرائے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اُن لوگوں کے یہاں معاملہ برعکس ہے جس سے اُنکے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسی قسم کے کلام سے اُنکے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں خیالات اُنکے تک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

غالب بود شیوۂ من قافیہ بندی ظلمے ست کہ بر کلکِ ورقِ سکیم امشب

دوسری خصوصیت نظر فریبیِ طرزِ تحریر

اسی سے متعلق اور ملتی جلتی اُنکے کلام میں نظر فریبی اور بات سے بات پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا راگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجہول الکیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے، بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اُسکے لوازم جمع کر لیتا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طغرائے امتیاز جادۂ عام سے علحدگی ہے جسکا شوق بلکہ عشق اُنکے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے۔ تخلص بدلنے کا واقعہ جسکا ذکر اوپر ہوا، اسکا بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس، وضع قطع، بات چیت، طرزِ تحریر، غرضکہ ہر چیز میں اسی علحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اُنکے خطوط، اُنکے اشعار، ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

انکی ابتدائی مشکل پسندی اسی علحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اُنکی شاعری سے

لام داغ لطف نہیں اُٹھا سکتے ۔ اُنکے الفاظ میں خیالات کا اس قدر زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالیں گے ۔

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

تیسری خصوصیت ذاتی جذبات کا ادا کرنا

مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انکے اشعار اُنکے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں - وہ زندگی اور مختلف کیفیاتِ زندگی کے ترانے گاتے ہیں - وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنی دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم و الم کے نالے، کہیں اُنکی مانذ عظمت کا مرقع، کہیں اُنکی حرمان نصیبی، کہیں ہجوم نا امیدی، کہیں جاں گداز مصائب، کہیں سعی بے حاصل، کہیں دنیا سے تنفر اور بیزاری، کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد، کہیں تعلقات دنیاوی سے دلبستگی اور اُسکی خوشی اور اُسکے آلام کا بیان ہوتا ہے - غرضکہ اُنکے لطیف اشعار اُنکی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں صحیح بیرامیٹر ہیں -

چوتھی خصوصیت فلسفیت اور حقیقت طرازی

مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور اُنکے اکثر اشعار حقائق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں - وہ رموز حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرا تھے - فرماتے ہیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اور اُنکے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ ان پر پوری طرح عامل تھے - انکی زندگی مذہبی رواداری اور آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی - اسی طرح اُن کا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے - کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اُس میں نہریں جاری ہونگی اور وہی سب لطف حاصل ہونگے جو دنیا میں ہوتے ہیں، وہ متفق نہیں، بلکہ اسکو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں - کہتے ہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

اُنکے نزدیک معیت علمی خود زندگی ہے - جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے - اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبدأ سے جدا ہو جاتا ہے - نغمۂ زندگی کو ایک نغمۂ نے سمجھنا چاہیے، جو نیستاں سے جدا ہونے پر نے سے بے اختیارانہ گرتی رہتی ہے اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں -

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بحیثیت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سُود تھا

کس قدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالمِ ظاہر مظہرِ روحِ حیات ہے مگر خود روحِ حیات نہیں ہے۔ بقول برگسن کے یہی روحِ حیات اجسام میں جلوہ گر ہے۔ مگر وہ خود اس عالم سے منزّہ ہے۔ غالب کہتے ہیں

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پانچویں خصوصیت جذبات نگاری — حقائقِ فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے۔ اُنکے یہاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابلِ برداشت مصیبتیں، جو لازمۂ زندگی ہیں، نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔ گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جسکے ساتھ دُور سے قضا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
شمعِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا کے کلام میں بچوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شیلے کی طرح تنک مزاجی پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ انکو اُنکے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔ اور اُنکے معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بیچّے کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسکو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود اُنھیں کے آلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ انکے اشعار کو پڑھ کر رنج و غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دور ہو کر اُس میں

ایک نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں انتہا درجے کا انکسار اور عاجزی اور دلی پشیمانی اور اپنی بے حقیقتی کا اظہار کس پُراثر اور درد انگیز طریقہ سے کیا ہے:

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

کلام میں شوخی و ظرافت

مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اُس کو اُن کی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دور کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حزن و یاس کے ابر میں ظرافت کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ انکی ظرافت کی لطافت اور شوخیِ کلام کی نزاکت کو ہم ایک شگفتہ نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں مگر انکی ظرافت کبھی حدِ اعتدال سے بڑھ کر پھکڑ نہیں ہو جاتی اور متین سے متین آدمی اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

انکے اکثر اشعار نفسِ شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کی روحِ رواں ہیں۔ سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ۔ اُنکی ہر تصویرِ الفاظ کے پیچھے، اُنکے ہر نقشِ خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے رہتے ہیں جنکی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے۔

غالب ایک کامل مصور ہیں اور اُنکو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے۔

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں — تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب — یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

مرزا کو عجیب قوتِ ایجاز حاصل تھی۔ انکے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات پیدا کرنے کے بے مثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر نہایت پُر تاثیر ہے۔ ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر در پردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جنکے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نڈر اور صاف گو گنہگار کی تصویر ہے، جو خدا سے بے دھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں، مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ ہے، اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے[۱]

---

[۱] مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا، لہٰذا اُنکی حسرت کی بھی داد دی جائے (دیکھیے صفحہ ۲۹۰)

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرا سے

غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھ کر ہیں، علوِ خیال، فلسفۂ حیات، اور ذہانت و طباعی میں، مگر روزمرہ اور سادگی بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق اُن سے بڑھے ہوئے ہیں، گو کہ مومن اس میں بھی اُن سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو انکے معاصر یا قریب العہد تھے اُنکے کلام کا تو اُن شعرا ذیل کے کلام سے کیا جا سکتا ہے

(۱) رابرٹ براوننگ سے، جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سینٹسبری براوننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُسکا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے، معززانِ ادب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقائق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں۔ اُن کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ کے سراپا اسرارِ تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الیٰ آخرہ کوئی فلسفہ ہے، مگر حقائق اور رموز کا انکے کلام میں جا بجا پتہ تو موجود ہے۔ انکو صوفی براوننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چند کہ براوننگ کے کھُردرے پن اور اکھڑ پن سے انکا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن و یاس میں اُنکا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر انکا مد مقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گیٹے" ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل دراک، صوفی کی نگاہ دوربین، چابکدست مصور کا نازک ہاتھ۔ اُنکی صنعت پُرکاری اور پُرکاری صنعت ہے۔ اور حسن حق ہے اور حق حسن ہے۔ وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور اُن کا یہ قول بالکل صحیح ہے:—

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ‏ غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اُن کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں، اور نہ اُنکی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اسکا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸) یعنی اس کا ثمرہ نیک ملے، اسی آیت وافی الہدایت سے ہوتی ہے: و اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْہَوٰی ، فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی ۔

(سورۃ النازعات)

الکحل اور شریعتِ اسلامیہ

دنیائے کیمیا میں الکحل کی حیثیت نہایت اہم ہے۔ کیمیاء الاحیا (organic Chemistry) میں اسکو کسی دوسرے مرکب سے ثانوی حیثیت حاصل نہیں۔ خود کیمیائی تحقیق بہت حد تک اسی کی شرمندۂ احسان ہے۔ اگر یہ محلل محققین و مجربین کے ہاتھوں میں نہ ہوتا، تو بہت سی ایجادات ابھی تک عالم شہود کے بجائے عالم غیب سے متعلق ہوتیں۔ دنیائے طب میں اسکی حیثیت قرابادین کے جزو لاینفک کی ہے۔ قدرتی نباتات، جڑی بوٹیوں، کچی دھاتوں وغیرہ سے دوائی اجزا کے استخراج کے لیے بطور محلل کے استعمال ہوتی ہے۔ سیکڑوں دوائی اجزاء بجز الکحل کے کسی دوسرے بے ضرر محلل میں حل ہی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے بہت سی دواؤں کی ساخت میں اسکو شامل کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ جلد پر ضماد کرنے کی بہت سی دوائیں اسی میں تیار کی جاتی ہیں۔ کاروباری زندگی کی طرف آئیے تو یہاں بھی اسکے بغیر چارہ نہیں۔ نقاش اپنی نقاشی کے لیے اس کا محتاج ہے۔ نجار کو اپنے تیار کردہ فرنیچر پر پالش کرنے کے لیے اس کے استعمال کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ اور پھر گھروں، دیوان خانوں، جلسہ گاہوں وغیرہ کے علاوہ، مسجدوں، صومعوں، اور خانقاہوں کی آرایش بھی اسکی شائستگی کے بغیر بوجہ احسن نہیں ہو سکتی۔ غرض الکحل ایک ایسی شے ہے، جو نہ صرف تہذیب و تمدن کا لازمہ ہے، بلکہ بہت حد تک ضروریات زندگی اسی سے وابستہ ہیں۔

بعض حلقوں میں نہایت نیک نیتی سے اسلام کی مذہبی روایات کی بنا پر اس کا استعمال مخدوش اور مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے، بلکہ حرام تک قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے متوالے، ابنائے ملت، مذہب کو اپنے متمدن معاشرت سے منافی پاکر اس کی روایات سے بے نیاز و متنفر ہو جاتے ہیں اور انھیں اساطیر الاولین سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتے۔ اور یا دوسری طرف مذہب کے نام کے عشاق، تہذیب و تمدن کو دجال کا جال اور شیطان کا چرخہ قرار دیکر اسکے نام تک سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور کنج تنہائی و عزلت کی طرف فرار کے بغیر اپنے لیے مفر نہیں دیکھتے۔ یہ دونوں انتہا پسندی کی مثالیں ہیں اور انتہا میں خیر نہیں۔ خیر الامور اوسطہا۔ یہ آپس کی کشمکش اور باہمی منافرت، بُعد و تضاد کی خلیج کو خدا جانے کہاں تک وسیع کر دے۔ مجھے یقین ہے کہ مذہب اور تہذیب، اور شرع و معاشرت، باہم مخالف و متضاد نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی ممد و معاون ہیں

یعنی ان میں کانچ کنکر کا بیر نہیں، بلکہ چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ میری دلی تمنّا ہے کہ یہ دونوں روٹھے ہوئے گروہ من جائیں، انکی غلط فہمیاں رفع ہوں، اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوکر "اُمّۃً وسطاً" کی مہربان آغوش میں آ بیٹھیں۔ اسی نیت سے میں نے الکحل کے بارے میں اپنے تحقیقی خیالات کو ترتیب دیا ہے ۔ میری خواہش ہے کہ ارباب نظر ان کا تدبر و تعمق کی ترازو میں مخالف مواد سے موازنہ کریں۔ علمائے دین اور فقہاء ان شریعت غرا میری گزارشات کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو ہر وقت اپنی غلطی واپس لینے کے لیے تیار رہوں۔ لیکن اگر میری معروضات صحت کے معیار پر پوری اتریں تو شاید انکی اشاعت مذہب و تہذیب کے درمیان حائل ہونیوالی خلیج کو پاٹنے کی مفید کوشش ثابت ہو۔

اس میں کسی کو بھی اختلاف کی گنجایش نہیں کہ شراب قطعی طور پر حرام ہے اور معنوی حیثیت سے نجس بلکہ اُم الخبائث ہے ۔ اسکے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ شراب نجس اور ناپاک ہے۔ اور چونکہ الکحل شراب سے ماخوذ ہے، اس لیے شراب کے حکم میں ہے ۔ اور جس کسی چیز میں اس کی قلیل سے قلیل مقدار بھی پائی جائے وہ حرام، خبیث اور ناپاک ہے ۔ اس سے استنباط کا سلسلہ بہت دُور تک چلا جاتا ہے ۔ یعنی جس کام میں بھی الکحل استعمال ہو وہ ناجائز، اور بالآخر مغربی علاج اور طب ناجائز و حرام ۔ یہ تمام دعاوی اور انکے دلائل غور طلب ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ایک قسم کی الکحل شراب سے مستخرج ہے ۔ لیکن اسکو شراب کے حکم میں داخل کرنے کا دعویٰ تشنۂ دلیل ہے ۔ قسم اور حکم کا اطلاق عرف پر ہوتا ہے ماہیت پر نہیں ہوتا ۔ مثلاً اگر کوئی قسم کھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا تو مچھلی اور بیضۂ مرغ کھانا اسکی قسم کے منافی نہ ہوگا۔ کیونکہ عرف عام میں بیضۂ مرغ اور مچھلی، گوشت نہیں کہلاتے ۔ حالانکہ انکی ماہیت وہی ہے۔ ایک اور مثال لیجیے ۔ پیشاب خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس سے ملوث ہوکر کپڑا ناپاک ہو جاتا ہے ۔ کیمیائی تحلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیشاب کے ضروری اجزاء پانی، یوریا، نمک وغیرہ ہیں ۔ یہ سب اجزاء کم و بیش مقدار میں پسینے میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن پسینہ آنے سے وضو نہیں ٹوٹتا ۔ اور نہ ہی پسینے میں شرابور ہوکر بھی کپڑا اسکا ناپاک قرار دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ پیشاب کی ماہیت پسینے میں موجود ہے ۔ اسی طرح الکحل شراب کا ایک لطیف جزو تو ہے، لیکن شراب کی طرح کبھی حصولِ سرور و نشاط کی غرض سے استعمال نہیں ہوتا ۔ اور جو نتائج بد شراب سے پیدا ہوتے ہیں، وہ کبھی الکحل سے حاصل نہیں کیے گئے ۔ اس لیے عرفاً اور لہٰذا شرعاً الکحل پر لفظ شراب یا خمر کا اطلاق

نہیں ہو سکتا۔

شراب (خمر) کیا ہے؟ اربعین النووی میں ہے:

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان عمر قال علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اما بعد ایھا الناس انہ نزل تحریم الخمر وھی من خمسۃ: من العنب والتمر والعسل والحنطۃ والشعیر، والخمر ما خامر العقل

یعنی فرمایا کہ شراب حرام ہے اور وہ عام طور پر پانچ چیزوں یعنی انگور، کھجور، شہد، گیہوں، جو، وغیرہ سے تیار ہوتی ہے۔ اور شراب کی مجمل تعریف یہ ہے کہ وہ عقل کھو دے۔

مذکورہ بالا شکر یا نشاستہ دار اشیاء کو ایک خاص درجۂ حرارت پر جب اتھم خمیرہ موجود گی میں خمیر کیا جاتا ہے، تو شکر یا نشاستہ کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ جب اسے کشید کیا جاتا ہے تو یہ تبدیل شدہ نشاستہ یا شکر (یعنی الکحل) اور چند دیگر اجزاء اور خوشبوئیں کھنچ آتی ہیں۔ اس کو زیادہ صاف کر کے اور چند اجزاء معرفہ کے مزج و آمیزش کے بعد کہنہ کرنے کے لیے بند کر دیا جاتا ہے اور جب اس میں حسب پسند ذائقہ و تیزی پیدا ہو جاتی ہے تو اُسے سرور و مستی کے خاطر استعمال کیا جاتا ہے اسی شے کو شراب، خمر، مئے ناب، دخت رز وغیرہ کے نام دیے گئے ہیں۔ اس میں ایک بات یہ ہے کہ یہ جسکے منہ لگ گئی وہ اُسی کا ہو رہا۔ اسی کو پی کر بےخود ہونے والے رفتہ رفتہ خود اسی کے لیے بےخود ہونے لگتے ہیں۔ اور کہیں کے نہیں رہتے۔ اسکے استعمال سے اعتدال کی نہایت نازک حدود کے اندر رہ کر چند فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ذہنی قوٰی کی جلا، ہاضمہ اور اشتہا کی تیزی وغیرہ۔ لیکن اسکی برائیوں کی فہرست اتنی طویل ہے اور اسکی مضرات کا پلہ اس قدر بھاری ہے کہ اسکو منافع ان کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتے: فیھما اثم کبیر و منافع للناس، واثمھما اکبر من نفعھما۔

غالباً یہاں اس اجمال کی تفصیل کی ضرورت نہیں کہ شراب ناب افراد کے لیے وہ سم شیریں ہے جو اُن پر بیک وقت اخلاقی بیماریوں، جسمانی ہلاکتوں اور مالی تباہیوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ جسم قوم و ملت کے لیے جرعۂ لالہ رنگ وہ تیغ شعلہ ریز ہے جو اس کا بند بند اور جوڑ جوڑ جدا کرنے کے لیے کھلی رہتی ہے۔ انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر۔ اور یہ خمر خمار وہ سحر ہے جو مبتلا کی روحانی آنکھوں کو اُس رسی کے دیکھنے سے اندھا، اور اُس بندھن (حبل اللہ) کے محسوس کرنے سے بےحس کر دیتی ہے، جو خالق کو مخلوق سے مربوط کیے ہوئے ہے۔ ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ۔

شراب کا اثر براہ راست دماغ کے اُن حصص پر ہوتا ہے، جو عقل وادراک اور فہم وخرد

یعنی اعلیٰ ملکیت کے خزائن ہیں۔ اسکے عمل سے وہ حصص اس طرح اثر پذیر ہوتے ہیں کہ سب سے پہلے، سب سے اعلیٰ، اور سلسلۂ ارتقاء میں سب سے آخر پیدا ہونیوالی ملکی قوت ماؤف ہو جاتی ہے، مثلاً احساس ذمہ داری سب سے اول مفقود ہوتا ہے۔ اس سے بعد اس سے کم درجہ کی ملکی قوت سلب ہوتی ہے اور علیٰ ہذا قانون تنقیص law of dissolution کے ماتحت ایک ایک کرکے سب ملکی قوٰے مختل ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفلی، حیوانی، وشہوانی قوٰے بے لگام ہو جاتے ہیں اور ان میں انتہائی تحریک اور بدترین انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس عقلی بیہوشی کے دوران میں مبتلاے شراب، زنا، چوری، قتل و غارت جیسے ہر بُرے سے بُرے اور خبیث سے خبیث گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اسی باعث شراب کو اُم الخبائث کہا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرتِ عثمانؓ وغیرہ سے مروی ہے۔

مسلمانوں کو ان جسمانی، نفسی، روحانی، اقتصادی اور دیگر قلبی حیثیات سے مضرت رساں شئے کے سموم اثرات سے بچانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے پہلے تو یہ کھول کر بتا دیا کہ اس شئے میں خوبیاں بھی ہیں، لیکن اسکی بُرائیاں خوبیوں سے کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر اس کے غیر معتدل استعمال سے روکا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حاوی علی الکل علم کے علاوہ ہمارے ناقص و محدود تجربہ ومشاہدہ میں بھی یہ بات غیر مشتبہ اور قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ انسان کی کمزور و حریص طبیعت اس بارے میں اعتدال پر نہیں رہ سکتی، تو اس کا استعمال قطعی طور پر حرام اور ناجائز قرار دے دیا گیا۔

شراب کئی طرح سے پی جاتی ہے :۔ کبھی خالص اور کبھی ملاوٹ کے ساتھ۔ ملاوٹ کی چیزیں پانی، سوڈا، برف، عرقیات اور دیگر فرحیات ہیں۔ بعض لوگ شراب کو اس تاویل اور بہانہ سے پی سکتے تھے کہ شراب کی مقدار سے زیادہ حلال وطیب لوازم کی آمیزش کریں۔ اور کہہ دیا کہ ہماری مشروب میں حلال جزو غالب اور حرام مغلوب ہے، اس لیے اسکے استعمال میں کون حرج ہے؟ اس لیے رسول خدا (فداہ ابی واُمی) نے صاف صاف فرما دیا۔ ما اسکر کثیرہٗ فقلیلہٗ حرامٌ (جس کی قاضی شوکانی اور طحاوی نے ناحقہٗ تفسیر کر دی ہے۔ یعنی خواہ شراب میں کیا کچھ اور کتنا کچھ بھی ملا کر کیوں نہ پیو، یہ حرام ہے پر حرام ہے۔

رہا نجاست کا سوال! سو اسکا کوئی نقلی ثبوت نہیں۔ بعض لوگ اس فرمان ربّی کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں : کہ انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان۔ فاجتنبوہ

لسکم تفلحون - لفظ رجس معنوی پلیدی کے لیے بھی مستعمل ہے، اور اس سے بعض اوقات وہ ناپاکی بھی مراد لی جاتی ہے جسکے چھونے سے ہاتھ اور جسکے لگ جانے سے کپڑا ناپاک ہو جاتا ہے - یہاں معنی اول تو یقیناً مراد ہیں - اور ظاہر ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں پچھلی تین چیزوں یعنی میسر، انصاب، ازلام کی نسبت جیسی ناپاکی کا معنی تو غالباً فقہاء میں سے کسی نے مراد نہیں لیا، بلکہ ان سب چیزوں کو معنوی برائیوں کے باعث قابل اجتناب قرار دیا گیا ہے - اور ساتھ ہی اگلی آیت میں برائیاں کھول کر بیان کر دی گئی ہیں - رہا "خمر" تو یہ ام الخبائث ضرور ہے، جسکے مفہوم کی تشریح اوپر کر چکا ہوں - اور اسکو فقہاء نے نجس فرمایا ہے - سو یہ نجس ہوا کرے، ہمیں اس سے بحث نہیں - ہم تو الکحل کے غیر نجس ثابت کرنے کے درپے ہیں -

تیسے اب الکحل کی ماہیت پر غور کریں - الکحلوں کی فہرست نہایت طویل ہے جن میں میتھیل Methyll ایتھل Ethyl بیوٹل Butal، پروپل وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں - یہ سب آکسیجن، ہائیڈروجن اور کاربن سے مرکب ہیں اور ہر ایک کا مخرج و مبدأ جدا جدا ہے - مثلاً اگر میتھل لکڑی سے حاصل ہوتی ہے، تو ایتھل شکر یا نشاستہ سے تیار ہوتی ہے، وقس علی ہذا - ان سب کے خواص میں باہم گرمشابہت سی ہے، جیسے ایک خاندان کے مختلف افراد میں ایک گونہ یگانگت سی ہوا کرتی ہے - یہاں ہمیں محض ایتھل الکحل سے بحث ہے - جسکو بڑے پیمانے پر حاصل کرنے کے لیے شکر یا نشاستہ کی تخمیر کی جاتی اور جو قدرتی طور پر تھوڑی سی مقدار میں انگور، کھجور، نبیذ وغیرہ میں پائی جاتی ہے - خمیری روٹی پکانے کے لیے جب آٹے کو خمیر کیا جاتا ہے تو تھوڑا سا نشاستہ تحلیل ہو کر الکحل اور کاربانک ایسڈ گیس پیدا کرتا ہے - یہ گیس ہی خمیری روٹی کو مسامدار بناتی ہے - اور الکحل خمیری روٹی کے تجزیہ سے الگ نکالی جا سکتی ہے - چنانچہ الکحل ایک خالص کیمیائی مرکب ہے - جو ایک طرف تو شراب جیسی حرام چیز اور دوسری طرف انگور، خمیری روٹی اور نبیذ جیسی حلال و طیب چیزوں میں پائی جاتی ہے - الکحل کا شراب کے حکم میں نہ ہونے کا ایک مزید ثبوت یہ ہوا کہ شراب کی تو ہر قلیل سے قلیل مقدار حرام ہے - لیکن ہر وہ چیز حرام نہیں قرار دی گئی جس میں الکحل موجود ہے - نبیذ کا استعمال خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے - اور کیمیائی امتحان سے نبیذ میں ابتدا سے الکحل ثابت ہوتی ہے - گرمیوں میں تیسرے دن نبیذ میں الکحل کی مقدار اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس سے صریح سکر پیدا ہونے لگتا ہے - اسوقت نبیذ پہلے مکروہ اور پھر حرام ہو جاتی ہے - اس سے ثابت ہوا کہ کسی چیز میں الکحل کا پایا جانا اسے حرام نہیں کر دیتا، بلکہ جس وقت

الکحل کی مقدار اس قدر بڑھ جائے کہ سُکر پیدا ہونے لگے، اُسوقت وہ چیز حرام ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی خمر کی تعریف "ما خامر العقل" تو ابدالاباد تک صحیح ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کی تفسیر "ما فیہ الکحل" نے کرنے لگے تو یہ سراسر غلطی ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) الکحل شراب کے حکم میں نہیں۔ اس لیے کہ:—

(ا) الکحل عرفاً شراب نہیں۔

(ب) کئی ایسی چیزیں جن میں الکحل موجود ہے تصریحاً کتاب وسنت سے حلال ثابت ہیں۔

(۲) حرمت کا معیار سُکر ہے۔

(۳) الکحل اُن معنوں میں نجس و ناپاک نہیں کہ جسکے چھو جانے سے ہاتھ اور لگ جانے سے کپڑا مکاناً ناپاک ہو جائے۔

اس سے یہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ (۱) پینے کی ادویہ میں، اگر ناگزیر ہو تو الکحل کا استعمال اتنی مقدار میں جائز ہے جس سے سکر پیدا نہ ہو۔ البتہ شراب ہر مقدار میں حرام ہے۔ اور اسکا سوائے اس صورت کے استعمال جائز نہیں جبکہ اس کے بغیر جان نہ بچ سکے۔ اور وہ بھی محض بقدر ضرورت (غیر باغٍ ولا عادٍ)۔

(۲) چونکہ الکحل یا شراب ناپاک نہیں، اس لیے جلد پر ضماد کرنے والی دواؤں کو الکحل میں تیار کرنے سے شریعت مانع نہیں۔ اسی طرح فرنیچر کی پالش اور نقاشی کے لیے الکحل کے استعمال کی اجازت بلا خوفِ تردید دی جاسکتی ہے۔ ان اُرید الا الاصلاح ما استطعت۔ وما توفیقی الا باللہ۔ علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

یحییٰ محمد عبدالقوی (متعلم کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج۔ لاہور)

غزل

جوشِ جنوں میں آج لڑیں گے ہوا سے ہم
چھینینگے بوئے گیسوئے جاناں صبا سے ہم

جاتا ہے تو جہاں ہمیں کھل جائے گا ضرور
اک روز پوچھ لیں گے ترے نقشِ پا سے ہم

کہتے ہیں مجھ سے بڑھکے وہ گیسوئے دلستاں
اتنے بڑے ہوئے ہیں کسی کی دعا سے ہم

جب ہوا اثر تو خوشی سے اُچھل پڑے
ہاتھوں بلند ہو گئے دستِ دعا سے ہم

شرما کے تم نے حشر میں کیوں سر جھکالیا
کیا جانے کس کو مانگ رہے تھے خدا سے ہم

مہجور مرکے ہوتے ہیں احباب سے جدا
مُنہ پھیرتے ہیں آج طریقِ وفا سے ہم

سراج الدین مہجور
(نبیرۂ صہبائی مرحوم دہلوی)

صبح عید کے دو ترانے

دیکھ تو ادھر کیا سہانی ہے فضائے صبحِ عید
کم نہیں حوروں سے حسنِ دلکشائے صبحِ عید

غنچۂ دل روزہ داروں کے کھلے جاتے ہیں کیوں
کیا چلی آتی ہے جنت سے ہوائے صبحِ عید

کاش لا دیتی مدینے سے صبا چن چن کے پھول
اور انھیں پھولوں میں سجاتی قبائے صبحِ عید

شام سے جسکی خوشی میں جاگتے ہیں رات بھر
صبح ایسی دوسری کب ہے سوائے صبحِ عید

ساقیا کھلنے کو ہے قفلِ درِ پیرِ مغاں
ہے کلیدِ او نو عقدہ کشائے صبحِ عید

کہہ دو رضواں لیکے آئے گلشنِ فردوس سے
نذر کو گلدستۂ تازہ برائے صبحِ عید

آرزوئے وصل میں ہو جاتی ہیں عمریں تمام
ہے غنیمت سال بھر پہ یہ لقائے صبحِ عید

حوریں جامِ شیر لے کر آئی ہیں فردوس سے
مرحبا! تیری حلاوت اے دعائے صبحِ عید

شامِ غربت سے گلے ملتی ہو جن کی بیکسی
ان غریبوں سے نہ پوچھو ماجرائے صبحِ عید

اب شفق وہ کملا و ہندی قافیوں کی بھی بہار
تا کجا قیدِ اضافت میں ثنائے صبحِ عید

پھر تمنا ہے ہم آغوشی پہ آئے صبحِ عید
پھر انھیں کوئی گلے مل کر منائے صبحِ عید

طالبِ دیدار کی قسمت جگائے صبحِ عید
سال بھر پہ پھر پیامِ دید لائے صبحِ عید

ہے کہاں ساقی مدینہ بھر کے پیاسوں کے لیے
چشمۂ کوثر سے خم بھر بھر کے لائے صبحِ عید

سال بھر بچھڑے ہوئے احباب لو لا کر کوئی
صورتِ شیر و شکر باہم ملائے صبحِ عید

جس سے ہو تقلیف ایسے ملنے جلنے کو سلام
بے تکلف آئے جو ملنے کو آئے صبحِ عید

جن کی راتیں کیا کہ دن تک خوابِ غفلت میں کٹیں
کون ایسے سونے والوں کو جگائے صبحِ عید

سال بھر پہ بھی کسی کا درد جو سنتے نہیں
کون انھیں روداد دل کوئی سنائے صبحِ عید

آنسوؤں سے آپ منہ دھو لیتے ہیں اپنا یتیم
اور انکو کون نہلائے دھلائے صبحِ عید

جن غریبوں کے ہو اشکوں کو نہ دامن تک نصیب
جامہ نو کون انھیں لاکر پہنائے صبحِ عید

نغمۂ رنگیں میں رنگِ ناموزوں بھی ہے
پھر شفق تیرا ترانہ کون گائے صبحِ عید

شفق عمادپوری

جے۔ ڈبلو۔ رینالڈس

ہماری اُردو دنیا رینالڈس کے نام سے تو بخوبی واقف ہے لیکن اسکے سوانحی حالات سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہوگی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انگریز مصنفوں نے رینالڈس کے ساتھ سخت تعصب سے کام لیا ہے۔ اس کا ثبوت انسائیکلوپیڈیا سے مل سکتا ہے۔ جس میں معمولی سے معمولی انگریزی ادیب کا تذکرہ ہے، لیکن رینالڈس کا کچھ حال نہیں لکھا۔ حالانکہ وہ دنیا بھر میں جانے مانے کا ایک مشہور اور زبردست ناول نویس تھا۔ مختلف کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی سے مجھے جو کچھ بھی رینالڈس کے متعلق معلوم ہو سکا ہے اُس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اعظم کریوی

جارج ولیم میک آرتھر رینالڈس ۲۳- جولائی ۱۸۱۴ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ جارج رینالڈس بحری فوج میں کپتان تھا۔ اس کی ماں "میری" ایک متوسط درجے کے آدمی کی بیٹی تھی اور بقول ایک مؤرخ کے "فرانسیسی عورتوں سے زیادہ فیشن پر جان دیتی تھی" چونکہ انگریزی علم و ادب کے علاوہ لاطینی، یونانی اور فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھی، وہ اکثر اپنے ننھے بچے کو نوٹنگھم اور وکلف کی سوانحعمریاں، کلمبس کے کارنامے، کُک اور دیگر بحری اور بری سیاحوں کے حالات، شیکسپیر، میسنجر وغیرہ کے ڈرامے سُنایا کرتی تھی۔ رینالڈس کو بھی خوب دلچسپی ہوتی تھی اور وہ اکثر اپنے دل میں سوچا کرتا "یا اللہ! کیا وہ بھی کوئی دن ہوگا جب میری بنائی ہوئی کہانیاں بھی لوگ پڑھیں گے اور اپنے بچوں کو سُنایا کریں گے"۔

میری بہت عقلمند اور دوراندیش عورت تھی۔ اس کا معمول تھا کہ جو کہانیاں وہ رینالڈس کو سُناتی، اُس سے سُن بھی لیا کرتی تھی، اور اسکے انعام میں خوبصورت مجلد کتابیں دیتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ بڑے دن کے موقعے پر میری نے رینالڈس کو شیکسپیر کے ڈراموں کا مجموعہ با تصویر اور ایک سُنہری انجیل انعام میں دی۔ دنیا کا دستور ہے کہ کھیل کود کے دنوں کے بعد بچّوں کو تعلیم دلاتے ہیں اسکے برخلاف "میری" نے پیدایش ہی سے رینالڈس کو تعلیم و تربیت دی۔ وہ اس سے بخوبی واقف تھی کہ یہ صرف ماں ہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ لارڈ میکالے نے ایک نظم سات برس کی عمر میں لکھی تھی۔ چنانچہ ماں ہی کی تعلیم نے بچپن ہی سے رینالڈس میں بھی علمی مذاق پیدا کر دیا تھا، اور ابھی وہ چھ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اُس نے "ملٹن" اور "کوپر" کی دو چار نظمیں اور اسکاٹ کے گیت حفظ کر لیے۔

جب رینالڈس نے اپنی عمر کی چھٹی منزل میں قدم رکھا تو وہ "ایش گر" کے ابتدائی مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں رینالڈس کا معمول تھا کہ جب اُسکو فرصت ملتی تو وہ اپنے ہم جماعتوں کو "پلگرم پراگرس" "رابن سن کروسو" اور "شیکسپیر" کی کہانیاں سُنایا کرتا، مختلف مضامین پر لکچر دیتا۔ ایک دن اسکول ماسٹر نے چھُپ کر رینالڈس کا لکچر سُنا تو وہ بہت خوش ہوا، اور بجائے ناراض ہونے کے اُسکو شاباشی دی۔ اُس دن سے ماسٹر صاحب نے سب لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ ہر سنیچر کو کوئی مضمون لکھ لایا کریں۔ اس کے لیے اسکول میں ایک علمی اور ادبی انجمن بنائی گئی جس کا سکرٹری سب نے بالاتفاق رینالڈس کو بنایا۔ دوسرے لڑکوں کے مضامین میں بچوں کے خیالات ہوتے تھے لیکن سکرٹری (رینالڈس) کے مضامین میں انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے ہوتے تھے۔

ماسٹر صاحب نے ایک مرتبہ اعلان کیا کہ مندرجۂ ذیل کسی ایک عنوان پر جس کا سب سے بہتر مضمون ہوگا اُسے عام جلسہ میں انعام دیا جائے گا

(۱) اہل سیف، اہل قلم اور مدبرانِ ملک میں سے ملک کے لیے سب سے زیادہ کون مفید ہے۔

(۲) شیکسپیر اچھا ہے یا ملٹن

(۳) ناول کے مطالعہ سے کوئی اخلاقی یا علمی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں

(۴) سولزیشن کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی ہوتی ہے یا نہیں

(۵) غریب اچھے ہیں یا امیر۔

رینالڈس نے مضمون نمبر (۴) پر طبع آزمائی کی اور اوّل درجے کا انعام حاصل کیا۔

جب رینالڈس ابتدائی مدرسہ کی تعلیم ختم کر چکا تو اُس کے باپ نے اسکو سینڈہرسٹ کے فوجی کالج میں داخل کرا دیا، لیکن وہاں رینالڈس کو کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ قواعد پریڈ سے وہ بہت جی چراتا تھا فرصت کے وقت بجائے سبق یاد کرنے کے وہ مشہور انگریزی ناولوں کا مطالعہ کرتا۔ سینڈہرسٹ کالج میں اُس زمانے میں کوئی ادبی انجمن نہ تھی لیکن رینالڈس کی علم دوست طبیعت نے وہاں بھی علم وادب کا چرچا کر دیا۔ ایک رئیس زادہ مسٹر سنگ سے رینالڈس کی گہری دوستی ہوگئی جس سے وہ آزادی کے ساتھ علمی و ادبی گفتگو کیا کرتا۔ رینالڈس کی خوش قسمتی سے کالج میں ایک علم دوست پروفیسر آگئے اور اُنھوں نے اعلان کیا کہ "مناظرۂ شمشیر و قلم" پر جس کا مضمون سب سے اچھا ہوگا اُسکو انعام دیا جائے گا۔ بھلا رینالڈس کا قلم ایسے موقع پر جولانیاں کیوں نہ دکھاتا، اس نے بڑا زبردست مضمون لکھا اور اسی کو انعام ملا۔

فوجی کالج میں گانا بجانا، تیرنا اور تقریر کرنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ رینالڈس نے دو مرتبہ تیرنے میں انعام پایا اور وہ بہت جلد کالج کا مشہور پیراک ہو گیا۔ وہ بانسری بجانے میں بھی بڑا اشتاق تھا۔

سالانہ امتحان قریب تھا اچانک رینالڈس کا دوست ٹیگ بہت بیمار ہو گیا۔ رینالڈس نے اسکی تیمارداری میں اپنے پڑھنے لکھنے کا بھی کچھ خیال نہ کیا اور رات دن اُسی کے پاس رہا۔ جب ٹیگ اچھا ہو گیا تو اُس نے اپنے باپ کو جو خط لکھا اُس میں رینالڈس کی بہت تعریف کی۔ ٹیگ کے باپ نے رینالڈس کا بہت شکریہ ادا کیا اور بڑے دن کے موقع پر جس طرح کے تحفے ٹیگ کے لیے بھیجے ویسے ہی رینالڈس کو بھی بھیجے لیکن "ابراہام کولی" کی تصانیف کا مجموعہ رینالڈس کو خاص کر بھیجا۔ رینالڈس نے اس مجموعہ کا حد سے زیادہ شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ جب رینالڈس دُنیا کی اسٹیج پر ناولسٹ کے لباس میں نمودار ہوا تو اُس نے اپنے مشہور ناولوں میں اُس مجموعہ کے بھی کچھ اقتباسات دیے۔

ایک مرتبہ ٹیگ کے والد نے رینالڈس کو اپنے یہاں مدعو کیا اور بڑی قدر کی۔ رخصتی کے وقت ٹیگ کی ماں نے ایک موتیوں کی مالا اور شیکسپیر کے کُل ڈراموں کا مجموعہ رینالڈس کو تحفہ میں دیا۔ اُس وقت سے ٹیگ اور رینالڈس یک جان دو قالب بن گئے۔

لطیفہ

قواعد کی مشق کے لیے فوجی کالج سے دو میل کے فاصلے پر ایک چوڑی خندق بنوائی گئی تھی حکم تھا کہ جب ڈرل ماسٹر کسی لڑکے کو قواعد کرانے کے لیے کہے تو وہ اپنی جماعت کو "مارچ" کراتا ہوا اس خندق تک لیجائے اور "ہالٹ" (رُک جاؤ) کا حکم دے کر چُپ چاپ ۵ منٹ تک صف بستہ کھڑا رکھے اور پھر کالج کو واپس لائے۔ ڈرل ماسٹر لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن رینالڈس کو قواعد کرانے کا حکم ملا۔ رینالڈس لڑکوں کو کالج سے "مارچ" کراتا ہوا لے چلا۔ راہ میں شاید آپ علمی دنیا کی سیر میں محو ہو گئے۔ جب خندق کے سامنے رینالڈس پہونچا، تو خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گھبراہٹ میں بجائے "ہالٹ" کے "مارچ" (بڑھے چلو) کا حکم دیدیا۔ جو لوگ کبھی فوج میں رہ چکے ہوں گے وہ فوجی قواعد اور قانون کی سختی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رینالڈس کے حکم کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو لڑکے سب سے آگے تھے وہ تو اوندھے ہو گئے اور دوسری صف والے اُن پر گر پڑے۔ رینالڈس کو اپنی اس حماقت کا کافی خمیازہ اُٹھانا پڑا۔ ڈرل ماسٹر نے اُنکی خوب مرمت کی۔ رینالڈس نے اسکے جواب میں کہا "میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا یہ فوج "ہالٹ" اور "مارچ" کے معنی سمجھنے پر بھی افسر کے حکم کی تعمیل کر سکتی ہے یا نہیں"۔ ڈرل ماسٹر نے دو سید ا بر رسید کیے، اور کہا "عذرِ گناہ بد تر از گناہ"۔

اُس دن سے رینالڈس کے دل میں کالج کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ باپ کے ڈر یا لحاظ سے پڑھتا تو رہا لیکن اس موقع کی تلاش میں رہا کہ کالج کو چھوڑ دے۔ کورٹ مارشل کا طریقہ سکھانے کے لیے ایک دن کالج میں "جھوٹا کورٹ مارشل" کیا گیا۔ اس کورٹ مارشل کا رینالڈس کے دل پر خاص اثر ہوا۔ اُس نے سوچا کہ "اگر خدانخواستہ میں بھی کسی قصور پر قید ہوا اور مجھے گولی سے اڑا دینے کی سزا ملی تو بہت برا ہوگا ــــ ایسی سپاہ گری پر لعنت ہے" اُسی دن اُس نے کالج کو چھوڑنے کا قطعی ارادہ کرلیا۔ باپ نے پہلے تو بہت سمجھایا، لیکن مجبوراً اجازت دیدی۔ چنانچہ رینالڈس نے ۱۳۔ ستمبر ۱۸۳۰ء کو کالج چھوڑ دیا اور اپنے دوست ینگ کے ساتھ ۲۶۔ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو انگلینڈ کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ دو مہینے تک پہاڑی مناظر اور تاریخی مقامات کی سیر کرتا رہا یکم جنوری ۱۸۳۱ء کو لندن پہونچا اور وہاں کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کرکے اپنے گھر واپس ہوا۔ کچھ دن ٹھہر کر پھر اپنے دوست ینگ کی ہمراہی میں اسپین کی سیاحت کی۔ اسی سفر میں رینالڈس نے اپنے ایک ناول کے لیے کافی مضمون حاصل کرلیا، جو بعد میں "پوپ جون" (شام غربت وغیرہ) کے نام سے شایع ہوا۔ اسپین اور جبل طارق کی سیر کے بعد اس کا ارادہ کوہ الپس سے گزر کر روم جانے کا تھا کہ اچانک اس کو ماں کی سخت بیماری کی خبر ملی اور رینالڈس گھر واپس ہوا اور اس کے پہونچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اسکی ماں "میری" نے انتقال کیا۔ اپنی پیاری ماں کی موت پر رینالڈس نے اتنا زبردست مرثیہ لکھا کہ سننے والے اور پڑھنے والے رو دیے۔

"میری" کی وفات کے کچھ عرصہ بعد رینالڈس نے سر والٹر اسکاٹ کے "لیڈی آف دی لیک" "لارڈ آف دی آئل" وغیرہ کتابوں کے تاریخی مقامات دیکھنے کے واسطے اسکاٹ لینڈ کا سفر کیا اور وہاں سے فرانس پہونچا۔ پیرس پہونچ کر وہ اپنے دوست ینگ کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرا وہاں ینگ کے باپ کے ایک دوست فرانسیسی سوداگر مسٹر جیک سیورے سے ملاقات ہوئی۔ فرانسیسی سوداگر نے دونوں کی بہت قدر کی۔ رینالڈس نے ینگ کے ساتھ ایک دن پیرس کے مشہور تھیٹر میں ایک فرانسیسی مصنف کا نیا ڈرامہ دیکھا۔ اسی ڈرامہ سے رینالڈس نے اپنے سب سے پہلے ناول "پیری سائڈ" کے لیے پلاٹ تیار کیا۔

فرانس کے تاریخی مقامات کی سیر سے فراغت پر دونوں دوست اٹلی پہونچے۔ گریگوری شانزدہم اُس وقت پوپ تھے۔ انکے دربار میں پہونچکر انکی زیارت کی۔ مشہور آدمیوں کی قبریں دیکھیں، چند خانقاہوں [illegible] عبادت کا جائزہ لیا۔ بعض ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے والے پادریوں کے کارنامے سنے

مِن کا آگے چل کر رینالڈس نے اپنے ناولوں میں خوب مضحکہ اُڑایا ہے۔ اٹلی کے شہر سے واپس ہو کر دونوں دوستوں نے اپنے گھر پر کچھ دنوں آرام کیا اور پھر روس کی سیاحت پر روانہ ہوئے اور پیٹرس برگ پہونچے۔ اسوقت نکولس جو ایک بڑا ظالم اور جابر بادشاہ تھا تخت سلطنت پر متمکن تھا۔ سنہ ۱۸۵۲ء تک تاتاریوں نے اتنی لوٹ مار کی کہ روسی انکے ہاتھوں سے تنگ آگئے اور انھوں نے اپنے ایک مقدس پادری سے دعا کراکر آس پاس کے غریب مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ کلمہ گو زندہ جلائے گئے۔ اس مسجد کو جسکے قریب اگلے فرماں رواؤں کے مزار تھے منہدم کراکر گرجا کی بنیاد ڈالی گئی۔ شیر خوار بچوں کو تہِ تیغ کیا، عورتوں کی بے عزتی کی اور اس مونسٹری (عبادت گاہ) کو جہاں کے پادری کی دعا سے انکے حسب اعتقاد مسلمانوں پر فتح حاصل ہوئی تھی اس قدر عزت دی کہ عرصے تک شاہی خاندان والے اس عبادت گاہ کی زیارت کو پیدل جاتے تھے۔ اس مقام پر جب رینالڈس پہونچا تو روسیوں کا ”ظالمانہ“ برتاؤ، اور مسلمانوں کے ساتھ خوں ریزی کی داستانیں سُن کر اُس کا دل بھر آیا اور اپنے دوست نیگ سے کہنے لگا۔

”نیگ! مسیحیوں کے ساتھ مسلمانوں نے ہمیشہ اچھے سلوک کیے ہیں، پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ انھیں مسلمانوں کے ساتھ مسیحیوں نے کیوں ظلم روا رکھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علم وعقل حتیٰ کہ وحدت کا سبق بھی ہم نے مسلمانوں ہی سے پڑھا ہے۔ ورنہ ہم تو وہی ہیں جن کے آباؤ اجداد بندروں کی طرح درختوں پر رہا کرتے تھے۔“

روس سے براہ فرانس وڈنمارک دونوں دوست سویڈن پہونچے اور علم نباتات کے مشہور پروفیسر ”چارلس سن فی“ سے ملاقات کرکے انگلینڈ واپس ہوئے۔ وہاں پہونچکر رینالڈس نے مضمون نگاری شروع کی۔ سب سے پہلے اس نے ڈاکٹر جانسن کے ایک ڈرامہ ”شی اسٹوپس ٹو کنکر“ She Stoops to Conquer پر نکتہ چینیاں کیں۔

رینالڈس کے نکتہ چیں قلم سے مشہور شاعر لارڈ بیرن بھی نہ بچ سکا۔ اس نے ایک مقام پر لکھا کہ ”مجھے تسلیم ہے کہ بیرن نے اپنے قلم کے زور سے سر والٹر اسکاٹ کو میدانِ نظم میں شکست دی ہے لیکن ڈرامے میں وہ شیکسپیر کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ اسکے ثبوت میں رینالڈس نے اتنا زبردست مضمون لکھا کہ اُسوقت کے بڑے بڑے نقاد دنگ رہ گئے۔

سنہ ۱۸۳۲ء میں رینالڈس نے اپنے مضامین کا رنگ بدل دیا اور چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ انکو پڑھ کر اُس زمانے کے مشہور نقاد لارڈ فرانس جیفری کو سخت مغالطہ ہوا۔ اور

انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ" ہو نہ ہو ان کہانیوں کا مصنف یا تو خود اسکاٹ ہے یا" رابرٹ سوتھی" Robert Southey۔ دھوکے میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ رینالڈس کی تصنیف کردہ کہانیوں میں اسکا پورا نام نہ ہوتا تھا بلکہ "گمنام" "ایکس وائی زیڈ" وغیرہ لکھا ہوتا تھا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ "گمنام" کی کہانیاں سروالٹر اسکاٹ کی کہانیوں سے بھی زیادہ سبق آموز اور دلچسپ ہوتی ہیں"۔ جب رینالڈس کو خاص وعام کی باتوں کا پتہ چلا تو اُس نے ناول لکھنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اُس نے اپنا پہلا ناول "جے، ایے، سائڈ" (باپ کا قاتل یا ناخلف) ۱۸۳۵ء میں شایع کرایا۔ اُسوقت اسکی عمر اکیس برس کی تھی۔ معترضین نے اسکے ناول پر خوب اعتراضات کیے۔ کسی نے لکھا "صرف ونحو کی بہت غلطیاں ہیں" کسی نے رائے ظاہر کی "زبان کی بہت غلطیاں ہیں۔ انشا پردازی کا طریقہ اچھا نہیں ہے"۔ اسکے برخلاف بہت سے سنجیدہ مضمون نگاروں نے دل کھول کر تعریف کی۔

پہلے ناول کے شایع ہونے کے بعد کچھ عرصے تک رینالڈس خاموش رہا اور اُن نقائص کی اصلاح میں کوشش کرتا رہا جن کی طرف لوگوں نے توجہ دلائی تھی۔ اور پھر یورپ کے اُن ملکوں کی سیر کو نکلا جنکو اسنے پیشتر نہیں دیکھا تھا۔ واپسی پر اس نے "ڈکنس" کی مشہور تصنیف "پک وک پیپر" کے طرز پر لیکن ایک نئے پیرایہ میں "پکوک ابراڈ" ۱۸۳۹ء میں لکھی، جو بہت مقبول ہوئی۔ پھر تو اُسکا رنگ جم گیا اور اس نے یکے بعد دیگرے ایسے ایسے ناول تصنیف کیے کہ ان لوگوں نے بھی جنھوں نے کبھی اسکی بُرائی کی تھی تعریف کرنے لگے۔

جب یورپ کی سیر سے رینالڈس کا دل بھر گیا تو اُس نے ترکی کا سفر کیا، جہاں سے وہ اپنے ناولوں کے لیے کافی مواد جمع کر لایا۔

۱۸۴۴ء میں رینالڈس نے پالٹیکس کی طرف توجہ کی اور ملکی انتظام پر ایسے زوردار مضامین لکھے کہ وہ پالٹیکس میں بھی مشہور ہو گیا۔

اخبار "لندن ڈیسپیچ" کی ممالک غیر کی خبروں کا وہ عرصے تک ایڈیٹر رہا۔ اسکا قول تھا کہ "وہ اخبار نویس بے ایمان ہے جو اپنے مخالف کی رائے کو اخبار میں جگہ نہیں دیتا"۔ چنانچہ ایڈیٹری کے زمانہ میں رینالڈس نے اپنے اس قول کو ہر طرح سے نباہا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کے مالک سے رینالڈس سے نہ بنی اور اُس نے ۱۸۴۶ء میں اخبار سے قطع تعلق کر لیا۔ اور پھر تحریر وتقریر سے اپنے ملک کی خدمت کرنے لگا۔ انگلستان کے سرمایہ دار اپنے یہاں کے غریب مزدوروں سے جبر اور سختی سے کام لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ رینالڈس کو جب اسکی خبر ملی تو اُس نے مزدوروں کی حمایت میں "سمبرمن" (سوزن عشق)

کے نام سے ایک ناول شایع کیا جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔

پولٹیکل مذاق کے لحاظ سے رینالڈس لبرل تھا۔ بقول بعض "برڈلا اور گلیڈ اسٹون کا ہمخیال تھا"۔ انھیں خیالات کی اشاعت کے لیے رینالڈس نے ایک ہفتہ وار اخبار "ملکی معلم" نکالا۔ پہلا ہی نمبر تین ہزار شائع ہوا۔ ملک نے اُسکی خاص قدر کی۔ لیکن بوجوہات چند، کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد رینالڈس نے پھر ایک ہفتہ وار اخبار "رینالڈس ویکلی" نکالا۔ ۵۔ مئی ۱۸۵۰ء کو اس کا پہلا نمبر نکلا۔ اس میں پولٹیکل معاملات پر بڑے زبردست مضامین تھے۔ وزیر اعظم پر بھی چند اعتراض تھے۔ یہ پرچہ اس قدر مقبول ہوا کہ مینجر کے پاس فائل کی کاپی کے علاوہ اور کوئی پرچہ باقی نہ رہا۔ دو چار نمبروں کو دیکھکر "کارلائل" پکار اُٹھے کہ "اگر رینالڈس کا یہی حال رہا تو وہ کسی دن بڑا زبردست اہل قلم ہوگا"۔ گلیڈ اسٹون بھی اکثر رینالڈس سے ملکی معاملات میں مشورہ لینے لگے۔

انگلستان میں سب سے بڑی معراج پارلیمنٹ کی ممبری ہے۔ رینالڈس کے دوستوں نے اسکو اسکی ترغیب دی۔ لیکن رینالڈس نے پسند نہ کیا۔ ایک مرتبہ خود گلیڈ اسٹون نے رینالڈس سے ممبری کا ذکر کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا "اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں، مگر میرا خیال ہے کہ جو ملکی خدمت پارلیمنٹ کے باہر رہ کر ہو سکتی ہے وہ اندر بیٹھ کر نہیں ہو سکتی"۔

پیرس کے زمانۂ قیام میں ینگ اور رینالڈس کو دو قبول صورت معزز فرانسیسی لیڈیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ بڑی کا نام "میری" اور چھوٹی کا "ورجینیا" تھا۔ رینالڈس کی چرب زبانی اور خوش مزاجی مشہور تھی۔ باتوں ہی باتوں میں پری کو شیشے میں اُتار لیا۔ "میری" نے ینگ کو اور "ورجینیا" نے رینالڈس کو منتخب کیا۔ عرصہ تک جانبین میں خط وکتابت ہوتی رہی لیکن آگے چل کر "میری" نے وعدہ خلافی کی اور ایک دوسرے فرانسیسی رئیس زادہ سے عقد کر لیا۔ ینگ کو سخت افسوس ہوا اور وہ رینالڈس کو لیکر فرانس پہونچا۔ لیکن "میری" کسی دوسری جگہ چلی گئی تھی۔ دونوں واپس ہوتے ہی تھے کہ "ورجینیا" نے رینالڈس کو ایک خط لکھا اور قرار پایا کہ اگلی اتوار کو رینالڈس سے ورجینیا کی شادی ہوگی۔ رینالڈس خوشی کے مارے جامے سے باہر ہوگئے۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا گرجا میں وقت مقررہ پر "ورجینیا" نے بجائے "رینالڈس" کے اپنے عقد کا اعلان "ینگ" کے ساتھ کیا۔ اس اعلان سے قدرتی طور پر رینالڈس کی بہت دلشکنی ہوئی۔ لیکن اس نے ظاہرا طور پر اسکا اظہار اپنے دوست پر نہ ہونے دیا، بلکہ بڑی خوشی سے شادی میں شرکت کی۔

اس واقعے کے دو سال بعد رینالڈس کی شادی ایک متوسط درجے کی لیڈی سے ہوگئی

ایک سال کے بعد یہ ایک لڑکا پیدا ہوا جو بڑا ہو کر باپ کی طرح ناول نویس ہو کر ینگ رینالڈس کے نام سے مشہور رہوا۔ لیکن جو بات باپ کے ناولوں میں تھی وہ بیٹے کو نصیب نہ ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ رینالڈس سے زیادہ ینگ رینالڈس کی شہرت نہ ہوئی۔

شادی سے دس سال کے بعد رینالڈس کو اپنی بیوی سے جدائی ہوئی۔ اور اسی غم نے اسکو بھی ۱۸۶۸ء میں راہی ملک بقا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکا پیدا ہونے کے بعد رینالڈس نے ڈاکخانہ میں ملازمت کرلی تھی اور ترقی کرکے پوسٹ ماسٹر ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں اس کا معمول تھا کہ وہ خفیہ طریقہ سے نوابوں اور رئیسوں وغیرہ کے خطوط بڑی صفائی سے کھول کر پڑھ لیتا تھا۔ اور پھر احتیاط سے بند کردیتا تھا۔ اور اس طرح سے اسکو شاہی محلوں کے "راز و نیاز" معلوم ہو گئے جنکا پردہ اس نے "اسرار دربار لندن" وغیرہ میں فاش کیا۔ لیکن مجھے اس بات کا ثبوت کسی سوانح نگار کی کتاب سے نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ جس طرح سے رینالڈس کی سوانحعمری کے ساتھ تعصب سے کام لیا گیا ہے اسی طرح اس معاملہ کا بھی کچھ ذکر نہیں کیا۔

رینالڈس کے مذہب کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ ایک امریکی سوانح نگار مشہور نقاد لکھتا ہے "میں اُسے عیسائی نہیں کہہ سکتا۔ موحد بھی اُسے نہیں کہہ سکتا۔ رینالڈس کی تصانیف سے تو مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ جس طرح الزبتھ کے زمانہ نے اہل آزاد منش اپنے زمانہ کے ڈرامہ نویسوں کی تصانیف سے لطف اُٹھاتے تھے، جارج رینالڈس کی زبردست خواہش تھی کہ اسی طرح اسکے ناول بھی چندروزہ نہوں بلکہ مشرقی بھی اس سے ویسا ہی لطف حاصل کرسکیں جو مغرب والوں کو ملتا ہے۔ اس لیے اُس نے ایسی شعبدہ بازی سے کام لیا ہے جس سے اسکے مذہب کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اسکی زندگی کا زیادہ حصہ خیالی دنیا میں بسر ہوا۔ "سندباد" کی سیاحت کا جواب "الہ دین" کی سی خیالی عمارتیں اسکی خیالی دنیا کے عجائب گھروں میں بکثرت موجود ہیں انشاپردازی کے ساتھ اس میں شاعرانہ مذاق بھی تھا۔ بذلہ سنجی، فصاحت، سلاست، استعارات و تشبیہات میں اسکا رنگ سب سے جدا ہے۔ اسکا روزانہ معمول تھا کہ وہ علی الصبح اُٹھتا۔ ہمیشہ وقت پر کھانا کھاتا اور مطالعہ کے وقت بالکل فنا فی الکتاب ہو جاتا تھا۔ وہ بڑا نڈر اور راست گو تھا۔ نفسانیت اور خود غرضی سے وہ مبرا تھا۔ اُسکا قول تھا کہ "ہر کام کا ثمرہ انسان کی خوشیوں کو بڑھاتا اور صدمات کو گھٹاتا ہے"۔ اردو میں رینالڈس کے قریبًا سب انگریزی ناولوں کا ترجمہ ہوچکا ہے جس سے ہندوستان میں اسکی ہردلعزیزی کا ثبوت ملتا ہے۔

اعظم کریوی (سابق ایڈیٹر اکبر)

سفرنامۂ اُندلس

(۲)

موجودہ اسپین

میں نے سفرنامۂ اندلس کے متعلق لکھتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا کہ جن باتوں کا مجھے علم ہے وہ میں عرض کروں گا۔ اُس وعدے کا ایفا کرتا ہوں۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اسپین کے متعلق یہ نہ فرض کر لینا چاہیے کہ چونکہ یہ ملک یورپ میں ہے اس لیے لازماً ترقی یافتہ ہوگا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ملک کا ملک مغلوب و مفلوک ہے۔ وہ نہ ترقی یافتہ ہے، نہ اُمید ہے کہ آیندہ ترقی کر سکے گا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ ہندوستان سے بدرجہا بہتر ہے، اور شاید بعض ممالکِ اسلامی سے بھی اچھا ہو۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ یورپ کے اور ممالک کے مقابلہ میں وہ ملک کیسا ہے۔ ایک یوروپین سیاح کا قول ہے کہ "باشندگانِ اسپانیہ کو میں قرونِ متوسطہ کی صحیح اور زندہ تصویر سمجھتا ہوں"۔ یہی چند الفاظ موجودہ اسپین کا نقشہ، اور اُس ملک کے تمام تر تمدن کا خلاصہ ہے۔ میں اس قول کی صرف تفصیل کروں گا۔ مگر اسکو یاد رکھنا چاہیے کہ میں اسپین کا مقابلہ ہندوستان سے نہیں کر رہا ہوں جسکا تمغائے امتیاز غلامی ہے، بلکہ اُس ملک کا ذکر کرتا ہوں جو آزاد ہے اور یورپ میں واقع ہے۔

اسپین میں یورپ کے کسی اور ملک سے جائیے تو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ یہ یورپ کا ایک حصہ ہے۔ اور تمام ممالک تہذیب و تمدن میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں یا اپنی فکرِ ترقی میں لگے ہوئے ہیں، مگر اسپین ہے کہ دنیا و مافیہا سے الگ ایک غرور و تمکنت کے ساتھ بیٹھا ہوا انتظار کر رہا ہے کہ تہذیب و تمدن خود آکر اُسکے پیر چومیں گے۔ مانا کہ بعض بعض شہروں میں زندگی کے کچھ آثار ملتے ہیں؛ کارخانے بھی چل رہے ہیں، تجارت کو بھی کچھ فروغ ہوا ہے، پولیٹیکل حقوق بھی مانگے جا رہے ہیں؛ مگر ذرا غور سے دیکھیے تو تمام ملک ہے کہ میٹھی نیند سو رہا ہے۔ یہ آثارِ زندگی بھی دوسرے ملکوں کا اثر ہے! دوسرے ملک والوں کی کوشش کا نتیجہ۔ پرانے زمانے کے اکثر و بیشتر تبرکات زمانۂ حال اپنے پیچھے اتنی دور چھوڑ آیا ہے کہ وہ نظر سے اوجھل ہوگئے ہیں؛ مگر اسپین انکو اب تک پکڑے بیٹھا ہے۔

[illegible]

Serenos (رات کے چوکیدار) آپ سوا اسپین کے یورپ میں کہیں نہیں دیکھیں گے - اُن کا وہی پُرانا لباس ہے، وہی پُرانی لالٹین - ذرا جنگل میں نکل جائیے تو چرواہا رنگین کمبل اوڑھے ایک لمبے عصا پر تکیہ کیے ہوئے اپنی بھیڑ بکریاں چَراتا ملے گا۔ کسی چھوٹے سے شہر یا قصبہ میں داخل ہوجیے تو سب سے پہلے آپ کو مسلمانوں کے بنائے ہوئے کسی مضبوط و مہیب پھاٹک میں سے گزرنا پڑے گا جو قرونِ متوسطہ کی جنگوں کی یاد دلاتا ہوگا - اور اُسکے فوراً بعد محصّل آکر دامن پکڑے گا - اگر کہیں اسکو شبہ ہو جائے کہ آپ اپنے اسباب کے متعلق غلط بیانی کر رہے ہیں تو بس "اللہ دے اور بندہ لے"۔ Posada (سرائے یا ہوٹل) پہونچیے تو عین آپ کے سامنے شراب والے کی چھوٹی سی دوکان نظر آئیگی کہ اگر ناک نہ بند کی تو دردِ سر موجود - اُس میں بہت سے سخت وحشت و وحشت ناک دیہاتی بیٹھے ہوئے اپنی چمڑے کی صراحی سے شراب پیتے نظر آئیں گے -

اسپین کی ایک خصوصیت "مساوات" ہے - ایک بھکاری بھی یہ چاہے گا کہ آپ اسکو اپنے برابر سمجھیں - اب خواہ اسکو اسلامی تبرّک سمجھیے یا اہلِ اسپین کا سپاہیانہ بانکپن یا محض گنوارپن - انتہا ہے، کہ ایک گنوار یہ اُمید رکھے گا کہ آپ اُسے Senor (جناب) کہکر مخاطب کریں - حالانکہ اگر یہی لفظ خدا کے نام کے ساتھ بولا جائے تو خدا کو پکارنے والا سخت بے ادب اور بد تہذیب سمجھا جائیگا - جس سے آپ کی ذرا سی واقفیت ہوگی وہ آپ کو سلام کے بعد کچھ نہ کچھ دعا ضرور دے گا - یہ لوگ بہت جلد گھُل مِل جاتے ہیں - جس طرح زمانۂ حال میں ہر شخص اپنے آپ کو دُور کھینچتا ہے وہ بات یہاں بالکل مفقود ہے -

تجارت اور اُس سے نفع اُٹھانا یہاں نال زندگی نہیں سمجھا جاتا - وہ سپاہی ہیں اور سپاہی ہی رہنا چاہتے ہیں - اُنکی بڑی دولت تلوار ہے اور بڑا شغل جنگ و جدل - بظاہر وہ سُست اور ننگے ہیں، مگر بانکپن اُن کی رگ و پے میں پیوست ہے - یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اُنھیں روپیہ دیں اور اُسکے بدلے میں وہ آپ کو کام کر کے دیں - باشندۂ اسپین اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے کام کرے گا، روپیہ کمانے کے لیے نہیں -

اسپین کو دیکھتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مُلک اُس زنجیر کی ایک کڑی ہے جو افریقیہ کو یورپ سے ملاتی ہے - طبعی شکل و شباہت اور اپنی خصوصیات میں ہر ایک باشندۂ اسپین شمالی افریقیہ کی خصوصیات رکھتا ہے - کسی نے بہت صحیح کہا ہے کہ "اسپین اصل میں یورپین باپ اور افریقی ماں کا فرزند ہے"۔ اُسکے ناک نقشے میں عربیت زیادہ ہے اور یورپ کا اثر کم - عورتوں کی شکل و صورت

تو صاف صاف عرب ہے۔ اکثر عورتیں ایسے سانولے رنگ کی ہیں کہ اگر کوئی مجنوں انکو لیلی کہدے تو بیجا نہ ہو گا۔ کپڑے پہنتی ہیں تو برخلاف تمام یورپ کے شوخ رنگوں کے۔ اس پر ایک قسم کا چھوٹا دوپٹہ سر پر ہوتا ہے یا شال اوڑھتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں فی الحقیقت نقاب و برقعے کا باقیات الصالحات ہیں۔ عورتوں میں اکثر خصوصیات عرب کی ہیں۔ بعض صوبوں میں مردوں کا لباس بھی ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے، خاص کر پاجامہ۔

مکانوں کی تعمیر میں اب تک مسلمانوں کی وضع و قطع قائم ہے۔ صحن ضرور ہوتا ہے اور اس کے اردگرد کمرے۔ بڑے مکانوں میں ایک حوض اور خانہ باغ کا ہونا ضروری ہے۔ طلیطلہ میں جتنے پائین باغ ہوتے ہیں، وہ اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ غیروں کی نگاہ سے محفوظ رہیں یعنی پردہ دار ہوتے ہیں۔

کچھ اسی پر منحصر نہیں، تمدن میں قدم قدم پر مسلمانوں کا اثر نمایاں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ آٹھ سو برس کی بہترین و مہذب ترین قوم کا اثر یہ پانچ سو برس زائل نہیں کر سکے۔ نہ باوجود کوشش کر سکتے ہیں۔ ایک انگریز کا قول ہے کہ "مسلمانوں کا قدم اسپین میں تہذیب و تمدن پھیلانے کے لیے آیا تھا۔ نہ کہ ایک وحشی سلطنت کو زیر کرنے کے لیے ...... فاتحین میں بڑا حصہ بربریوں کا تھا۔ یہ لوگ اپنے ملک میں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بالکل پیچھے تھے، مگر اسپین میں آکر انھوں نے حیرت انگیز طریق پر تھوڑے ہی سے زمانے میں وہ ترقی کی کہ اسپین کو اپنے ساتھ ہی مہذب و متمدن بنا دیا اور اس قوم کی زندگی میں بہترین جذبات داخل کر دیے جو دیرپا ہیں، اور ممکن ہے کہ کبھی نہ مٹیں۔ دو برس کے عرصے میں وہ تمام سرزمینِ اندلس کے مالک ہو گئے۔ .... وہ اپنے ساتھ مذہبی سماحت لیکر آئے تھے اور صحیح معنی میں مروّت کا جذبہ اُن ہی کا یورپ میں پیدا کیا ہوا ہے"۔ گیبنے وِٹے نے بہت صحیح کہا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ عرب مسلمانوں کا اثر اسپین سے مفقود ہو گیا ہے۔ وہ حقیقت میں اسپین کے جذبات و کردار کو نہیں سمجھتا۔ یہ صحیح کہ انکی سلطنت 'خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا' کے مصداق ہوئی کہ آئی اور نکل گئی؛ لیکن انکی بہترین تہذیب کی روح یہاں باقی رہ گئی ہے۔ انکی تہذیب وہ تہذیب ہے کہ جس کا ثانی اب تک دنیا نے نہیں دیکھا۔ مٹتے مٹتے یہ اپنے مٹانے والوں کو اپنے رنگ میں رنگ گئی۔ اہلِ اسپین کے گفتار و کردار اور روزانہ مشاغل میں یہ اپنا گھر کیے ہوئے ہے۔ یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہو گا کہ سرزمین اسپین کی نبض پر اگر ہاتھ رکھ کر دیکھیے تو یہ معلوم ہو گا کہ کسی مسلمان

سلطان ہارٹمے۔

کا خون اُس میں جاری ہے۔"

اسپین میں اب تک باغوں کا شوق چلا آتا ہے۔ مسلمانانِ اندلس کی ارواح چپتا کا اثر اگر سب سے زیادہ کہیں نظر آتا ہے تو باغوں کی وضع وقطع میں۔ مسلمانوں کے بنائے ہوئے باغ عیسائیوں کی آتشِ عناد کی نذر ہو چکے ہیں۔ اگر باقی ہیں تو مسجد قرطبہ کا صحن نارنج، قصر اشبیلیہ اور قصر الحمرا کے باغ۔ یہی ان مینوعش لوگوں کے لیے نمونہ ہیں۔ وہی روشیں ہیں، وہی خیاباں، وہی عربوں کے درخت اور پھول وغیرہ۔

میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ تمام اسپین گویا ایک ناچ گھر ہے۔ ہر شہر اور صوبے کے ناچ الگ الگ ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ناچ بادنیٰ تغیر عربوں ہی کے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کے زمانے میں ان کا وفور ہوا تھا، اور اس وقت تو تمام اندلس رقص سرود ہی کا ہو رہا ہے۔ انکے متعلق زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اسپین کی سب سے بڑی خصوصیت سانڈوں کی لڑائی ہے۔ مانا کہ جرأت وہمت و استقلال کا یہ بہترین تماشا ہے، مگر اس میں بے زبانوں کے ساتھ جو بے رحمی ہوتی ہے وہ ایسی ہے کہ ہر شخص اُس سے متأثر ہوتا ہے۔ اہالی اسپین مجموعۂ اضداد ہیں اور یہ تماشا اسی کا ایک جلوہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اسکے بانی بھی مسلمان ہی تھے۔ مگر مجھے اسکے ماننے میں تامل ہے۔ اسکی کسی قدر تفصیل سفرنامۂ اندلس میں موجود ہے۔ اب تو اس خونریز تماشے کے شوق میں کچھ کمی آ رہی ہے۔ ہمارے پرنس آف ویلز جو ابھی اسپین ہو کر آئے ہیں، اس تماشے میں شامل نہیں ہوئے۔ اسکا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ افسوس یہ ہو رہا ہے کہ شاید جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ بالکل ختم ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کرے کہ ہو جائے اور جلدی ہو جائے۔

میں نے یہ باتیں ذرا تفصیل سے اس لیے عرض کی ہیں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ چار سو تیس برس گزر جانے پر بھی مسلمانوں کے اثرات ہر ہر قدم پر اُس ملک میں معلوم ہوتے ہیں۔ زبان میں جو عربی الفاظ داخل وشامل ہیں اُن کا میں تفصیل سے ذکر نہیں کروں گا۔ مختصر یہ کہ اگر یہ الفاظ کسی طرح نکال دیے جائیں تو زبان بالکل تلاش رہ جائے گی۔ اسپین مسلمانوں کے احسان سے کسی طرح سر نہیں اٹھا سکتا جو لوگ کہ ہندوستان کو مسلمانوں کے لیے اندلس بنا دینے کے مدعی ہیں وہ اگر اسکو نہ بھولیں تو اُن کا احسان ہے۔

اسپین کے لوگ عجیب مجموعۂ اضداد ہیں۔ سست، اپنے نفع ونقصان کی پروا نہ کرنے والے، عیش دوست، بے رحم اور اُس پر ذی مروت، معاملاتِ مذہبی میں تعصب کا بدترین نمونہ، بُت پرست،

تو وہ رنج اُس پر خلیق۔ غرض عجیب خصوصیات کے لوگ ہیں۔ کسی مفید و مضر کام میں لگا رہنا وہ اپنا مآل زندگی نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کی اُنکے یہاں قدر نہیں۔ وہ اس مقولہ پر کاربند ہیں کہ "آج کا کام کل پر ضرور ڈالو"۔ جس کام کو کہیے اُس کا جواب ملے گا کہ "کل"۔ انتہا ہے کہ ریلیں بھی اپنے اوقات کی پابند نہیں۔ بسا اوقات وقت مقررہ سے گھنٹہ بھر پیشتر ریل پہونچ جاتی ہے۔ اور اکثر و بیشتر تین تین یا چار چار گھنٹے دیر میں پہونچتی ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ یورپ کے مہذب ممالک کا تو کیا کہنا ہے ہندوستان والے بھی اسکو گوارا نہ کریں گے۔ مگر اسپین والوں کے لیے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اگر ریل وقت سے پہلے اگر نکل گئی تو دو ۲۴ گھنٹے آیندہ تک اُس کے انتظار میں اسٹیشن پر پڑے رہیں گے۔ اور تین چار گھنٹے انتظار کر لینا اُنکے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

بے رحمی اُنکے خمیر میں ہے۔ کسانوں کا دار و مدار بیلوں پر ہے۔ خچر، گدھے، گھوڑے سے بھی وہاں بڑا کام نکلتا ہے۔ وہ اپنے جانوروں کو اتنا مارتے ہیں کہ دیکھنے والے کانپ اُٹھتے ہیں۔ اُن سے کہا جائے کہ بے ضرورت کیوں مارتے ہو تو وہ مذاق اُڑاتے ہیں۔

خود تکلیف اُٹھانے کے عادی ہیں۔ شاید اُنکے جسم کی جلد ہی ایسی ہے کہ وہ تکلیف اٹھا سکتے ہیں، مگر اس پر غضب تو یہ ہے کہ مذہبی ہدایات نے اُنکو اس قابل بنا دیا ہے کہ اگر وہ دوزخ کا ایندھن بنا دیے جائیں تو اُنکو تکلیف نہ ہوگی۔

خوں ریزی اُن کا ایسا مشغلہ ہے کہ جو جاذبِ نظر نہیں رہا۔ جو جتنا زیادہ بے رحم اور خوں ریز ہو وہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ایک انگریز[۱] جو بطور سیاحت اسپین گئی تھیں اور فی الحقیقت وہاں کے لوگوں کی مداح ہیں، لکھتی ہیں کہ "ایک روز میں نے دیکھا کہ چند لڑکوں نے ایک چڑیا پکڑ رکھی ہے اور اُسکے پاؤں میں دھاگا باندھ کر اُسکو بے طرح ستا رہے ہیں۔ میں نے چند پیسوں میں وہ چڑیا اُن سے لے کر اُڑا دی۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ وہی لڑکے پندرہ بیس چڑیوں کے پیروں میں دھاگے باندھے لیے چلے آ رہے ہیں۔ اُنھوں نے وہ سب چڑیاں میری نذر کر دیں۔ میں نے معاوضہ میں اُنکو پیسے دینے چاہے تو سب نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم تو اس لیے لے کر آئے ہیں کہ ان چڑیوں کو اُڑا کر آپ خوش ہوتی ہیں!" یہ ہیں اُن لوگوں کے جذبات بے رحمی اور نفع سے بیزاری۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ اتفاقی بات تھی، بلکہ یہی اُن کا قریباً روزمرہ ہے!

ایسے لوگوں کو کج خلق ہونا چاہیے۔ برعکس اسکے وہ خلیق اور مہمان نواز ہیں۔ حتٰی ہوں کی

---

[۱] کونسٹن

دستگیری کرتے ہیں (اسکا ثبوت یہ ہے کہ وہاں گداگروں کا گروہ کا گروہ خیرات کے ٹکڑوں پر پلتا ہے) شفاخانے متعدد ہیں۔ کسی غریب پر کوئی مقدمہ بن جائے تو وکلاء بغیر محنتانہ کے پیروی کر دیتے ہیں۔ دوستوں کے لیے وہ اپنی جان نذر دینے کو تیار رہو جاتے ہیں۔ مجھے شاید حسنِ عقیدت کا ملزم قرار دیا جائے مگر میں اسکو بھی مسلمانانِ اندلس کا اثر سمجھتا ہوں۔ جو لوگ وحشیانِ آسٹریا کے نصائص سے واقف ہونگے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے۔

خانگی جرائم انکے یہاں کم ہوتے ہیں۔ ولدالحرام اور اُس کی ماں سے سخت نفرت کیجاتی ہے۔ باوجود اس کے مسٹر ہوے لاک ایلس کا یہ فتویٰ ہے کہ "باشندگانِ اسپین ہمیشہ سے صحیح معنوں میں وحشی تھے اور اس وقت تک وحشی ہیں"۔

اہالی اسپین کو دیکھنا ہو تو شبیلیہ کے محفل رقص وسرود میں دیکھیے۔ مگر اس کا ذکر سفرنامۂ اندلس میں کافی آ گیا ہے، اس لیے میں قلم انداز کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ رقص وسرود بُت پرست قوم کے مذہب کا ایک جزو بن گیا ہے۔

انکے مذہبی جلوس کا حال بہت طویل ہے مگر تماشا قابلِ دید ہے۔ مختصر یہ ہے کہ بھینٹ، سجدے، بیگار، نذور، رقص وسرود، سب ہی کچھ ہے۔ عورت و مرد سب اس میں شامل ہوتے ہیں۔ مگر عورتوں کا حصہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بدبختیں گرجاؤں کے علاوہ جہاں کہیں کوئی صلیب گڑی دیکھتی ہیں وہیں سجدہ کر دیتی ہیں۔

پندرہ یا سولہ برس کی عمر ہی میں شادی بیاہ کے چرچے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر اس عمر میں کسی لڑکے کا تاتہ نہیں ہوتا تو وہ خاندان انگشت نما ہونے لگتا ہے۔ اگر شادی کے بعد کسی کا ذریعہ معاش نہیں ہوتا تو والدین دولہا دلہن دونوں کے کفیل ہوتے ہیں۔

کسی ملک کی اصل حالت شہر اور شہریوں کے دیکھ لینے سے نہیں معلوم ہوتی۔ اسکے لیے چھوٹے چھوٹے گانوؤں کو دیکھنا چاہیے۔ اسپین کے گانوؤں میں جائیے تو معلوم ہوگا کہ ملک میں کہیں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مضافات کے باشندے بہت ہی مفلس ہیں۔ اور جتنے مفلس ہیں اُتنے ہی گندے۔ (میں یہ بات یورپ کے مقابلے میں کہہ رہا ہوں نہ کہ ہندوستان کے مقابلے میں) وہاں اکثر گانوؤں میں سرائیں (Posadas) ہوتی ہیں۔ اوپر کی منزل مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ نیچے کی منزل میں اصطبل ہوتا ہے اور شراب کی دوکانیں۔ لید، گوبر، پیشاب کی بُو بے طرح پریشان کرتی ہے۔ شراب کی دوکان میں گانوؤں کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ شراب تلخ وسیاہ و بدبو۔

دور اُڑتے ہیں اور وہ شور ہوتا ہے کہ معاذاللہ۔ مرغیاں الگ چیختی ہیں، بچے الگ شور مچاتے ہیں۔ نیند کی صورت دُور ہی سے نظر آتی ہے۔ یوں ہونے کو مسافروں کی کوٹھریاں صاف ہوتی ہیں مگر آرام کہاں۔ کھانا بہت اچھا نہیں ملتا، مگر با فراط ہوتا ہے۔

حسب معمول ہر اتوار کا دن گویا گانوٗں والوں کی عید ہوتی ہے۔ اسی دن انکی شانِ بُت پرستی اچھی طرح معلوم ہوتی ہے۔ رقص و سرود دیوانگی کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔

قریبًا ہر گانوٗں میں ایک مقررہ دن مینپیو (بازار) لگتا ہے۔ آج یہاں ہے تو کل دوسرے قصبے میں۔ جہاں سایہ دار درخت دیکھے وہیں دوکاندار بیٹھ گئے۔ قرب و جوار کے مواضع کے گنوار خرید و فروخت کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ بہیں ویسی لباس کی گویا نمائش ہو جاتی ہے۔ مرد گہرے نیلے رنگ کی لمبی سی ٹوپیاں، چھوٹے چھوٹے کوٹ، اُس پر سرخ صدریاں، اور چکدار نیلے رنگ کے پاجامے یا پتلون پہنے ہوتے ہیں۔ عورتیں، مختلف رنگوں کے ریشمیں رومال سر پر باندھے ہوتی ہیں۔ بھڑکیلے لہنگے (جو اونچے ہوتے ہیں مگر گھیردار) اور بہت چمکیلے کپڑے کی کُرتیاں پہنتی ہیں۔ خریدار اور دوکاندار آٹھ آٹھ دس دس، اور بعض وقت زیادہ، ایک جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہیں باتیں بھی ہوتی جاتی ہیں اور سودے بھی؛ اور وہ بھی اس طرح کہ دوکاندار زیادہ دام کہتا ہے خریدار کم کراتا ہے اور ایک شور ہوتا ہے۔ لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے، کہ لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہر شخص تہذیب سے بولتا ہے اور بہت خوشی سے سوال جواب کرتا ہے۔ پنجاب کے دوکاندار رائین کی کیفیت نہیں ہوتی کہ اول تو جواب ہی اُن سے بمشکل ملے گا؛ ملا تو سخت و کرخت، دام ذرا کم کیے اور "مہر (رائن) صاحب نے جھٹک کر ترکاری چھین لی اور اگر سودا طے ہوا اور گاہک بغیر لیے چلا گیا تو جناب رائین نے دو چار مغلظات نذر کیں۔

ہر بازار کے ایک کونے میں ایک محراب کے نیچے ایک سنگین اَن گھڑ بُت نصب ہوتا ہے، جسکی نہ کوئی صورت ہوتی ہے نہ شکل۔ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یہ مسیح یا مریم عذرا کا بُت ہے۔ اس بت کے پیروں کے نیچے ایک چراغ جلتا رہتا ہے۔ مرد ہو یا عورت اُسکے سامنے سے گزرتے ہیں تو پہلے سینے پر اُنگلی کے اشارے سے صلیب بناتے ہیں اور پھر سجدے میں گر پڑتے ہیں (سجدے سے میرا مطلب Kneel down ہے) بت پرستی بھی گویا خرید و فروخت کا ایک جزو ہے۔

خچر بیل گاڑیاں ایک طرف کھڑی رہتی ہیں۔ خچروں کی صورت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو دانہ پانی بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہوگا۔ لیکن اُن کا یہ عیب ساز و یراق سے چھپا لیا جاتا ہے۔

بیل گاڑیاں قریباً ہندوستان کے چھکڑے ہوتے ہیں۔ انکے پہیوں میں تیل نہیں دیا جاتا اور جب یہ چلتی ہیں تو ان کی "چرخ چوں" سے کان بہرے ہوئے جاتے ہیں۔ گنواروں کا اعتقاد ہے کہ اس آواز سے جنگل کے بھوت بھاگ جاتے ہیں۔ کوئی شخص ایسی گاڑی نہیں لیتا جو آواز نہ دے۔

کھیتی باڑی کا کام عورت مرد دونوں مل کر کرتے ہیں۔ آلات زراعت قرون متوسطہ یا اُس سے بھی پہلے کے استعمال ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے یہ لوگ اتنے مشاق ہوتے ہیں کہ کام بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ نہ صرف اسی موقع پر بلکہ عام طور پر جوتے پہننے کا رواج کم ہے۔ بھیڑیں بہت پالی جاتی ہیں۔ ایک ایک آدمی کے پاس پچاس پچاس ہزار بھیڑوں کا گلہ ہوتا ہے اور گلہ بانیا (Cabana) کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر سال ایک ایک آدمی کے یہاں دس لاکھ عسرا بہ (Arrobe) تک اُون ہو جاتا ہے (۱ عرابہ = ۲۵ پونڈ) اسپین کا اون یورپ بھر میں زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ اس ملک میں اونی کپڑا بہت کم بنتا ہے؛ تمام ہی اُون یورپ میں چلا جاتا ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ ہر عرابہ میں سے کچھ اُون مُردوں کو ثواب پہونچانے کی غرض سے الگ کر لیا جاتا ہے۔ بھیڑوں کا پالنا نئی بات نہیں ہے، مرحوم مسلمانوں کے زمانے میں بھی تھیں۔ انکے لیے خاص قانون تھا، اور چراگاہیں چھوڑی جاتی تھیں۔ اب تو سارا اسپین ہی افتادہ زمین ہے، اُس قانون کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

مزدوری پیشہ لوگ عموماً بہت ہی غریب ہوتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ جتنی مزدوری انھیں ملتی ہے اُس سے وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کیونکر پال لیتے ہیں۔ اپنے حال میں خوش ہیں اور اپنی کھال میں مست۔ اکثر کام جو انھوں نے اپنے ذمے لیے ہوئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اُنکے لیے کسی مکان میں بیٹھنے یا چھت کے نیچے کام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مثلاً سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے وہ سینے کی مشین چلاتے نظر آتے ہیں، یا جوتے گانٹھتے، لوہار کا کام کرتے ہیں تو وہیں ایک بھٹی ہوتی ہے۔ مٹی کے برتن بناتے ہیں تو وہیں چاک لگا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو چھوٹے موٹے دوکاندار ہیں؛ اور گانوں کی دوکانداری ہی کیا۔ رسّے، برش، آلات کشاورزی، گھوڑے کے زین وغیرہ۔ بس یہی اُنکی کائنات ہے۔

شاید دنیا بھر میں، ورنہ کم از کم یقیناً ہندوستان بھر میں پنجاب ہی ایسا خوش نصیب ملک ہے، کہ جہاں عورتیں مردوں کے برابر مزدوری نہیں کرتیں[1]۔ اسپین اس معاملے میں ہندوستان کے ساتھ ہے

---

[1] چونکہ راقم کو سرزمین پنجاب سے انتساب تبنیت ہے اسلیے اپنے تجربہ سے کہہ سکتا ہے صرف یہی ایک خصوصیت پنجاب کو حاصل نہیں ہے بلکہ اس ملک کے لوگ اگر اسپر فخر کرتے ہیں تو بجا ہے کہ ہمارے غریب نہ ایک گاؤں کا تے ہیں جوتے پہننے اور چارپائی پر سوتے ہیں۔

کہ وہاں عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ ہر محنت و مزدوری میں برابر کی شریک ہیں - یہ سب بہت چست و چالاک ہوتی ہیں، اور بوڑھی ہوکر بھی مردوں کے برابر محنت کرتی ہیں۔ کھیتی باڑی میں بڑا حصہ انکا ہوتا ہے ہل چلاتی ہیں، بوتی ہیں، زمین کو الٹتی پلٹتی ہیں، انگوروں کے باغوں میں مالی کا پورا کام کرتی ہیں، بڑے بڑے بوجھ اُٹھاتی ہیں، کشتیوں پر سے مال و اسباب اُتارتی چڑھاتی ہیں۔ بوڑھی بوڑھی عورتیں بھی بھاری بھاری الماریاں اور چارپائیاں اپنے سروں پر آسانی سے اُٹھا کر لے جاتی ہیں۔ عموماً ننگے پیر رہتی ہیں۔ ایک تعجب خیز امر یہ ہے کہ باوجود اس محنت و مشقت کے اُنکے حُسن پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا - ہر حال میں خوش و خرم نظر آتی ہیں اور ایک قسم کی مسکراہٹ، جو اسپین کا خاصہ ہے، اُنکے چہروں پر رہتی ہے -

میں شاید ابھی کچھ اور عرض کرتا، مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہ تمہید بہت طویل ہوگئی۔ میں معاف رکھا جاؤں کہ میرے لیے یہ حکایت لذیذ تھی - مولانا الحاج ظفر الملک صاحب کے حکم کی تعمیل ہے، ورنہ مجھے تو یہ بھی توقع نہیں کہ یہ دفتر لاطائل توجہ سے پڑھا بھی جائیگا - یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں اپنے سالہا سال کے تجربہ کی بنا پر عرض کر رہا ہوں کہ اندلس اور اُسکے ارواح طیبات سے لوگوں کے دل اگر سخت نہیں تو سرد تو ضرور ہوگئے ہیں - میرے پیر قاضی ولی محمد صاحب کے جیسے دُکھے ہوے دل شاید ہندوستان تو کیا غیر ملکوں میں بھی کم ہی ہونگے - یہ واقعہ اسکا شاہد ہے کہ ایک "ملاں خیر" ناک کا بادشاہ (خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ) یورپ جاتا ہے، وہاں کا ہر ملک اُسکو آنکھوں پر بٹھاتا ہے، اور نہیں جاتا تو باوجود میرے توجہ دلانے کے اسپین! میں نے عرض کیا تھا کہ نئی روشنی سے یقیناً آنکھیں چوندھیا جائینگی، پرانی تہذیب کے مزار کو دیکھنے سے آنکھوں کو کچھ تو ٹھنڈک پہونچیگی۔ مانا کہ مسلمانوں کی قبریں تک وہاں نہ ملیں گی مگر انکی ارواح طیبات ایک ایک کلمہ گو کی دعاے مغفرت کی امیدوار ہیں - یہ صحیح ہے کہ ساڑھے چار سو برس ہوے کہ چراغ تہذیب بجھ چکا، مگر وہ ارواح ہیں کہ بندگان تثلیث کے کثیف جسم میں سانس بنکر موجود و نمودار ہیں۔

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں — رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا سب شنیدہ ہے، صحیح وہی ہے جو مخدومی قاضی ولی محمد صاحب نے لکھا ہے - شنیدہ کے بود مانند دیدہ - اگلی قسط میں یہ دکھلانے کی کوشش کرونگا کہ اگر اسپین عیسائی ملک اور جناب کا سایۂ عاطفت اُسکے سر پر نہ ہوتا تو اسکا انجام وہی ہوگیا ہوتا جو لکھنؤ یا کرناٹک وغیرہ کا ہوا - گو اس میں مجھے تو ذرا سا بھی شک نہیں کہ یہ سب کچھ کس بشنود یا نشنود من گفتگوے میکنم

پھول بے پروا ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

"کل کیا ہوگا"

جانبِ گور رواں کس کا جنازہ ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کیا ہوگا

صبح کو پھول مقدر کے کھلیں گے کس کے
اور بچھڑے ہوئے احباب ملیں گے کس کے
کون خنداں نظر آئے گا یہاں گُل کی مثال
کون سبزے کی طرح ہوگا چمن میں پامال
ہوگا تاراج خزاں بخت کا گلشن کس کا
گُلِ مقصود سے بھر جائے گا دامن کس کا
حج ادا کر کے فرائض سے ادا ہوگا کون
ظلمتِ کفر میں پابندِ بلا ہوگا کون
کون رو جائے گا تربت پہ کسی کی آکر
کون سو جائے گا آغوشِ لحد میں جاکر
تاجِ شاہی پہ کسے ناز زیادہ ہوگا
کجکلاہی پہ کسے ناز زیادہ ہوگا
نہیں معلوم کہ نظروں سے گرائیں گے کسے
لوگ آنکھوں پہ بہ تعظیم بٹھائیں گے کسے
راستہ جادۂ قسمت کا یہاں بھولے کون
اس چمن میں نہیں معلوم پھلے پھولے کون
گلشنِ صنعت و حرفت سے ملیں پھل کس کو
شاخِ سرسبزِ تجارت سے ملیں پھل کس کو
دورِ کل کس کا ہو کل کس کا زمانہ ہو جائے
کس کا دل تیرِ حوادث کا نشانہ ہو جائے
کہہ سکے کون کہ اقبال بڑھے گا کس کا
دولت و عمر و زر و مال بڑھے گا کس کا
کس کو خوشحال کریں گے کسے ناتا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

آج سب جمع ہیں شادی کے ہیں ساماں کیا کیا
محفلِ عیش میں ہے رنگ نمایاں کیا کیا
سازِ عشرت ہے کہیں تو ہے کہیں رنگِ طرب
کہیں نغمہ ہے خوشی کا کہیں آہنگِ طرب
خوش جمالوں کے کہیں ہوش رُبا نغمے ہیں
حُسن والوں کے کہیں روح فزا جلسے ہیں
کہیں نوشاہ کے سہرے کے شگفتہ ہیں پھول
کہیں کھیل مراسم کی منڈیں ہیں معقول
کہیں کھانے ہیں چُنے اور ہے دعوت کی دھوم
جمگھٹے اہلِ نظر کے کہیں خوباں کا ہجوم
پھر مغنی بھی کہیں دون میں گاتا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

جو ہے حاضر در دولت پہ دل و جاں سے ہے
آج دربار بڑی دھوم بڑی شان سے ہے
بینوایانِ جگر ریش اڑے ہیں در پر
ہمہ ارانِ وفا کیش کھڑے ہیں در پر

کل کیا ہوگا

ملتی ہے کوئی کرتا ہے خوشامد کوئی
ساز و سامانِ تکلف کی نہیں حد کوئی
کہہ رہا ہے کوئی دربار سے پائیں انعام
نذر دیتا ہے کوئی تو کوئی کرتا ہے سلام
مرتبہ جس کا ہے جیسا وہیں پایا ہے مقام
دست بستہ صفِ آخر میں کھڑے ہیں خدام
اک صدا آئے گی تو اور ہی نقشا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

اپنی تقدیر پہ نازاں ہے بہت آج کسان
کھیت گندم کے دکھاتے ہیں قیامت کی شان
بالیاں خوب نوپر ہیں کہ اصل اچھی ہے
لہلہاتے ہیں سبھی کھیت جو فصل اچھی ہے
چہچہے چڑیوں کے ہیں آج ہم آہنگ بہار
پھول سرسوں کے دکھاتے ہیں عجب رنگ بہار
دل میں دہقان کے ہے فصل تو اچھی ہوگی
ہاں اگر آفتِ ارضی و سماوی سے بچی
فائدہ ہوگا اگر فضل خدا کا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

کچھ خواتین مسلمان جو کہلاتی ہیں
بے تکلف ہمیں بے پردہ نظر آتی ہیں
نہ تو برقع ہے نہ چادر ہے نہ گھونگھٹ کا خیال
دھیان فیشن کا ہے تہذیب کی ہیں زندہ مثال
چشمِ مخمور میں شوخی کی جھلک غیرت سوز
سر پہ ہے شال تو ہے پاؤں میں دامن کا شوز
خوش کلامی بھی تبسم بھی اشارا بھی ہے
داغ اسلام کے دامن پہ گوارا بھی ہے
حسن کی جلوہ فروشی کا عجب عالم ہے
پاؤں پردے سے جو نکلے ہیں تو پھر کیا غم ہے
حوصلہ روز بروز اور زیادہ ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

سامنے دیکھیے ویرانہ میں دم بھر آ کر
خشت کہنہ ہیں کسی جا کہیں کنکر پتھر
اس کی جو اینٹ ہے بنیاد ہے کاشانے کی
درس عبرت ہمیں ہر چیز ہے ویرانے کی
دور گردوں سے مٹا گلشن شداد کی طرح
کبھی آباد یہی تھا دل برباد کی طرح
لوگ پھولوں پہ بصد عیش و طرب سوتے تھے
لطف آتے تھے یہاں جشن یہاں ہوتے تھے
گھر کے مالک نہ رہے اور نہ ہیں گھر باقی
ہڈیاں بھی تو نہیں خاک کے اندر باقی
کچھ نشانات رہے اُنکے گزرنے کے بعد
دہنِ گور کا لقمہ ہوے مرنے کے بعد
پوچھتے کیا ہو جگر حال جو اپنا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

حکیم جگر صدیقی بسوانی

فہرست کتبخانۂ انڈیا آفس

مرتبۂ پروفیسر ہرمان ایتھے ایم اے پی ایچ ڈی سنہ ۱۹۰۳ء

یورپ کے کتبخانوں میں مغربی علوم والسنہ کے علاوہ مشرقی زبانوں کی کثرت نایاب اور قیمتی کتابیں ہیں جن میں سے بعض اہل یورپ کی علم دوستی کی بدولت شایع بھی ہوگئی ہیں۔ عرصہ سے خیال تھا کہ اُردو کی بابت اُسکے متعلق جو کتابیں یورپ کے کتبخانوں میں ہوں اُن کا پتہ چلے تو شاید اُن میں سے بعض کی اشاعت کا سامان ہوجائے۔ لاہور کے ایک علم دوست کرم فرما سے جو دس بارہ سال ہوے ولایت گئے اور بعض دیگر اصحاب سے جو وقتاً فوقتاً یورپ تشریف لیگئے یا وہاں کسی سلسلہ سے مقیم ہیں، اس بارہ میں تحریک کی گئی، مگر افسوس ہے کہ کسی صاحب نے توجہ نہ فرمائی۔ انڈیا آفس کے کتبخانہ کی فہرست ہماری نظر سے گزری تھی مگر اسکا موقع نہ تھا کہ کہ ساری فہرست پڑھ کر اُردو کتابوں کے نام علیحدہ کرلیے جاتے۔ مسٹر سید حسن نے یہ خدمت انجام دیدی ہے اور ناظرین اسکی اشاعت کی صرف یہ غرض ہے کہ یورپ میں جو بہی خواہان اُردو اسوقت موجود ہیں وہ توجہ فرماکر دوسرے کتبخانوں کی فہرستوں سے اسی قسم کی فہرستیں مرتب کرکے ارسال فرمائیں، تاکہ یہ فہرست مکمل ہوجائے۔ اُمید ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے لائق نمائندہ مولوی غلام محی الدین زور جو اسی قسم کے کاموں کے لیے لندن گئے ہوے ہیں، اس طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔ ایڈیٹر

شمار	نمبر فہرست	نام کتاب	مصنف	مضمون		کیفیت
۱	۳۲۰	تذکرۂ علی حسینی (ذاہد تا گرد)	علی حسین	تذکرۂ شعراے اردو	سنہ ۱۱۹۵ء	فارسی میں تھا
۲	۲۹۹	ایضاً	"	"	سنہ ۱۲۱۶ھ	ٹیپو سلطان کے کتبخانہ میں تھی۔ فارسی میں۔
۳	۵۰۳	ایضاً	"	"	سنہ ۱۲۰۳ بنگالی	فارسی میں۔ ۱۰۸ شعراء کے حالات درج ہیں
	۷۰۱	مخزن نکات (سعدی تا قائم)	محمد قیام الدین قائم چاندپوری	"	سنہ ۱۱۶۸ھ	فارسی میں

۵	۷۰۲	عیار الشعراء	خوب چند ذکاء	״	۱۲۰۹ھ	حسب فرمائش استاد میرزا ناصر الدین ناصر۔ فارسی یا
۶	۷۰۳	تذکرۂ گلشن ہند	مرزا لطف علی	״	۱۲۱۵ھ	اردو میں حسب فرمائش مسٹر گلکرسٹ۔
۷	۱۷۵۸	انتخاب اشعار ریختہ و فارسی	؟	نظم	؟	
۸	۱۷۵۹	مثنوی احوال صادق و وفات نامۂ پیغمبر۔	؟	״	؟	
۹	۱۷۶۰	قصائد بوشحمہ بقصائد مدح سید الانام و رسول اللہ	؟	״	؟	
۱۰	۱۷۶۸	ایک ریختہ مثنوی	؟	״	؟	
۱۱	۲۰۱۹	ہندوستانی راگوں کا ایک مجموعہ	؟	״	؟	
۱۲		ہندوستانی راگوں کا ایک مترجمہ	؟	״	؟	
۱۳	۲۰۳۲	ریختہ نظموں کا ایک مجموعہ	؟	״	؟	سلطان ٹیپو کی فوج کے لئے مرتب ہوا
۱۴	۲۴۴۲	لغت تحفۃ الہند	؟	لغت	؟	ہندوستانی۔ فارسی
۱۵	۲۴۴۳	لغت	؟	״	؟	فارسی۔ ہندوستانی
۱۶	۲۴۴۴	ایضاً	؟	״	؟	ہندوستانی۔ فارسی
۱۷	۲۴۴۵	آمدنامہ	؟	״	؟	فارسی۔ ہندوستانی
۱۸	۲۴۴۶	کتاب آموختن	؟	״	؟	
۱۹	۲۴۴۷	مطبوع الصبیان (خالق باری)	امیر خسروؒ ؟	״	؟	
۲۰	۲۴۴۸	ایضاً	״	״	۱۱۲۴ھ	مع دیباچہ
۲۱	۲۴۴۹	ایضاً	״	״	؟	
۲۲	۲۵۲۸	تحفۂ پنجاب	پنڈت اجودھیا پرشاد	״	؟	حسب فرمائش جارج پیرکر
۲۳	۲۵۳۷	ایک ہندستانی قواعد	بنجامن شولتس	قواعد	۱۷۴۵ء	لیٹن میں مقدمہ میں زبان اردو کی تاریخ ہے

۲۴	[illegible]	فارسی، ہندوستانی، عربی اور سنسکرت عہدنامے	؟	تاریخ	؟	
۲۵	۲۷۹۹	ایک مختصر صوفیانہ ہندوستانی مثنوی	؟	نظم	۱۱۳۶ھ	
۲۶	۲۸۰۳	قصہ نا نداٰئی قصہ بندگان علی وغیرہ	سید محمد شریب قادری	"	۱۲۰۶ھ	
۲۷	۲۸۴۹	مجموعہ نغز	میر قدرت اللہ قادری	تذکرہ شعرای اردو	۱۲۳۱ھ	فارسی میں
۲۸	۲۸۵۰	تذکرہ سرور	میر محمد خاں	"	۱۲۲۲ھ	فارسی میں

سید حسن - بی اے (لک)

"جامِ سفال"

(ندرت) آہ سے کیا فائدہ نالہ سے کیا حاصل ہمیں — اُنکے لانے کے لیے کافی ہے جذبِ دل ہمیں
(") پھر تمہیں دیں عمر بھر کی بیوفائی کا جواب — چاہیے دن کو خدا دیدے تمہارا دل ہمیں
(") پھر کلیجہ ہم نے تھاما پھر اُٹھا پہلو میں درد — پھر غشی طاری ہوئی، پھر یاد آیا دل ہمیں
(نکہت) غم رسیدہ، خوں شدہ، حسرت نصیب، آفت زدہ — واہ ری تقدیر کیا اچھا ملا ہے دل ہمیں
(اعجاز) اب بہت آکر ستاتا ہے ہمیں اُن کا خیال — اب بہت کرتی ہے مضطر آرزوِ دل ہمیں
(نشتر) غیر سے ایفائے وعدہ ہم سے باتیں پیار کی — وہ دلی نے تیری ظالم کر دیا بد دل ہمیں
(وحید) چپکے چپکے مطلب اپنا کہتے ہیں اُن سے مجاب — دل ہی دل میں کہہ رہے ہیں آپ دیں اپنا دل ہمیں
(وحید) کیا کہیں دل ہی نہیں ورنہ دعا یہ مانگتے — دے ہمارا دل خدا اُنکو اور اُن کا دل ہمیں
(نامعلوم) نازکی اتنی کہ خنجر ہاتھ سے اُٹھتا محال — شوق اُنکو یہ کہ اک عالم کے قاتل ہمیں
(") ہم نہ ہوں تو آپ کس کی خستہ حالی پر ہنسیں — اپنی محفل میں سمجھیے رونقِ محفل ہمیں
(حمید) آج تو یہ ہے کہ ہے قاتل کو حمید — آج تو شاید لگادے گا ٹھکانے دل ہمیں

مشیر احمد علوی قادری کاکوروی (بی اے علیگ)

نظرے خوش گزرے

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ چانسلر نے جو تحقیقاتی مجلس گذشتہ سال مقرر فرمائی تھی اُسکے نتائج کار منظر عام پر آگئے ہیں۔ اور ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یونیورسٹی کی تمام ابتریوں کی تہ میں جو اصلی بنا د فساد تھی یعنی فرقہ بندی، اُس کا اعلان نہایت صاف اور واضح الفاظ میں کر دیا گیا ہے۔ تحقیقاتی مجلس نے تقریباً اُن تمام شکایتوں کو تسلیم کیا ہے جنکا ذکر اجمالاً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی اس یادداشت میں کیا گیا تھا جس پر النا ظر میں تفصیلی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اور اُنکے ہم نواؤں نے صاحبزادہ صاحب کے خلاف جو غبار پھیلانے کی کوشش کی تھی الحمد للہ کہ وہ بیکار ثابت ہوئیں اور صداقت و اخلاص کو بالآخر فتح حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو مسلم یونیورسٹی سے علیٰحدہ ہو جانے کا مشورہ دیکر اراکین مجلس نے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ یونیورسٹی کی اصلاح کے لیے بہت بڑے جراحی عمل کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ دوسرے اصحاب کی نشاندہی نام لیکر نہیں کی گئی تاہم تحقیقات کنندگان کا منشا صاف ظاہر ہے کہ وہ یونیورسٹی سے ایسے تمام افراد کو الگ کر دینا چاہتے ہیں جو یونیورسٹی کے تنخواہ دار ملازم ہونیکے باوجود اپنے فرائض منصبی کی ادائی اور یونیورسٹی کی خدمت کے بجائے تمامتر فرقہ بندی میں مصروف رہتے ہیں

بے شبہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے سامنے یہ نہایت اہم و دشوار کام ہے۔ کیونکہ بدنصیبی سے خود اس جماعت کے اندر فرقہ بندی کی روح سرایت کیے ہوئے ہے تاہم اگر یونیورسٹی کو اُس مطمح نظر کے مطابق چلانا ہے جسکا گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں بار بار اعلان کیا جا رہا ہے اور واقعۃً اُسے ایک ایسا ادارہ بنانا ہے جسکا وجود مسلمانوں کے لیے مفید و کارآمد ہونے کے ساتھ انکی دیرینہ علمی روایات کو برقرار رکھنے میں معین ہو تو اس اہم اور نازک موقع پر پورے تدبر و خلوص سے کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ حالات اتنے ابتر ہو چکے ہیں اور مزاج قومی اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ دفع فساد کی کوششوں سے نئی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ بھی لگا ہوا ہے۔

یہ نہایت درجہ افسوس کی بات ہے کہ ایسے اہم موقع پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب فالج جیسی شدید بیماری میں مبتلا ہو کر یونیورسٹی کے لیے ایک مدت تک بیکار ہو گئے ہیں اور یا دش بخیر ہمارے

محترم عالیجناب سرراجہ صاحب محمود آباد اپنی تمام مقناطیسی وکہربائی قوتوں کے ساتھ یونیورسٹی کے معاملات میں مصروف نہیں ہو گئے ہیں۔ نفی واثبات کے یہ دونوں پہلو بہت کچھ تشویش کا باعث ہیں، اور خدا سے دعا ہے کہ مسلمانوں کی پنجاہ سالہ جدوجہد کے ثمرات برباد ہونے سے محفوظ رہیں

مسلم یونیورسٹی ہی کی طرح ہماری دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بھی فرقہ بندیوں کی بدولت خطرناک دشواریوں میں گھرا ہوا ہے۔ اور اگرچہ اسکی امید نہیں کہ اصلاح طلب فرقہ اور جماعت منتظمین کے درمیان زمانۂ قریب میں کوئی مفاہمت ہوسکے اور یہ آپس کی توتو میں میں ختم ہو تاہم یقینی ہے کہ اس کشمکش کی بدولت دینی تعلیم اور طبقۂ علماء دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچکر رہے گا۔

دینی تعلیم کے لیے زمانہ کی مقتضیات اور ملکی فضا دونوں پہلے سے ناسازوار ہیں اور روز بروز نت نئے فتنے اور مفسدات اسکے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے نمودار ہورہے اور بیدینیوں کی طرف سے پیدا کیے جارہے ہیں مگر اساتذہ وطلبائے دیوبند کی باہمی آویزش اور مہاجر وانصار کی تبلیغ و اشاعت کے بعد اب کسی نئے مفسدہ یا فتنہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔

سنتے ہیں کبھی ندوۃ العلماء کے قیام کی بنیادی غرض یہ تھی کہ علماء کی باہمی آویزشوں کا سدباب کیا جائے۔ کیا اساتذۂ دیوبند کے اختلافات ابھی اس حد تک نہیں پہونچے کہ علماء ندوہ اصلاح حال کیلیے سعی وجہد کی ضرورت محسوس فرمائیں۔

اخبار نویسوں اور اسمبلی یا کونسل کے ممبروں کے مقابلہ میں کیا یہ زیادہ قرین مصلحت نہ ہوگا کہ علماء کی کوئی جماعت اصلاحِ حال کے لیے ساعی ہو، اور کچھ نہ بن پڑے تو کم سے کم ایک معینہ مدت تک التوائے جنگ پر دونوں فریق کو آمادہ کرکے اُنکے نشر و اشاعت کے اداروں کو بند کرادے کہ اُنکی وجہ سے علمِ دین اور علماء ربانی دونوں کی ناقابلِ برداشت توہین ہورہی ہے۔

فروری نمبر میں جو معروضات ایڈیٹر صاحب کشانت کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے اُنکی بنا پر بعض احباب کی خواہش ہے، کہ مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک برطانوی حکومت اور انگریزی قوم نے کیا ہے اس پر تفصیل سے الناظر میں لکھا جائے۔ خدا کرے کہ اس فرمائیش کی تعمیل کے لیے وقت نکالا جا سکے۔ اسی سلسلے میں مولوی عبدالماجد صاحب نے ۲۰ مارچ کے سچ میں "بڑی غلطی" کے عنوان سے جو مقالہ لکھا ہے اُسکے ضروری اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

"ذرا اس قوم کی پچھلی اور موجودہ تاریخ پر ایک نظر ڈالا جائے، جسکی وفاداری اور بہی خواہی کا ڈھنڈورا آج کن کن ترکیبوں اور تدبیروں سے خدا معلوم کتنے مسلمانوں ہی کے زبان و قلم سے کرایا جا رہا ہے! خلافت اسلامیہ پر بار بار حملے کس نے کیے اور کرائے؟ خلیفۃ المسلمین کے مقابلہ میں فوج کشی کس نے کی؟ ترکوں کے سینے پر گولیاں خود مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے کس نے چلوائیں؟ ترکوں کے بدنام کرنے میں سب سے زیادہ حصہ کس قوم نے لیا؟ ترکوں کے یورپ سے بوریا بستر سمیٹ کر بھاگنے کے خواب کس سلطنت کے وزراء دیکھتے رہے؟ اتحاد اسلامی (پین اسلامزم) کو ہوا بنا کر کس نے دنیا کے سامنے پیش کیا؟ گلیڈ اسٹن اور لائڈ جارج کس قوم کے مشاہیر میں ہیں؟ ترکوں کی خلافتِ اسلامیہ کے خلاف ہندوستان اور ساری دنیائے اسلام میں زبردست پروپیگنڈا کس نے کرایا؟ عربوں کو ترکوں کے خلاف کس نے کھڑا کیا؟ شریف حسین کی بغاوت کس کے اشاروں پر ہوئی؟ ایران آج کس کی نوازشوں اور عنایتوں کا زیر بار منت ہے؟ افغانستان کو ۱۹۱۹ء میں مجبور ہو کر کس کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا؟ عراق، مصر، سوڈان، آج کس کے حق میں دعا گو ہیں؟ عقبہ و معان کو دیکھتے ہی دیکھتے کس نے اپنا لیا؟ ڈائر اور ڈائر کی عزت کرنے والی آج دنیا کے پردہ پر کون قوم ہے؟ مہدی سوڈانی کی لاش کو قبر سے کھود کر بے حرمت کرنے والے کچنر کا شمار آج کس قوم کے مشاہیر میں ہے؟ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالآخر کس نے بجھایا؟ سلطنت مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ ظفر کو اپنا باغی قرار دینے کی جسارت کس نے کی؟ رنگون کے زندان میں انھیں زندہ درگور رکھنے کا کارنامہ کس کے نامہ اعمال میں درج ہوگا؟ دہلی کے تخت و تاج کے جوان جوان وارثوں کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا؟ بنگالہ میں سراج الدولہ کی ہستی کو کس نے مٹایا؟ مرشد آباد کے نوابوں کے خاندان کو کس نے مٹایا؟ میر جعفر اور میر قاسم دونوں کو اپنی ساری چاپلوسی کے باوجود بالآخر کس کی "حکمت عملیوں" کا شکار ہو جانا پڑا؟ میسور کی اسلامی سلطنت کی کس نے اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھی؟ حیدر علی اور سلطان ٹیپو کا خونچکاں کفن آج کس کا فریادی ہے؟ روہیلکھنڈ کی اسلامی حکومت کا چراغ کس نے گل کیا؟ حافظ رحمت خاں اور نجیب الدولہ کے خاندانوں کا خون کس کی گردن پر ہے؟ اودھ کی اسلامی سلطنت سے معاہدے کر کر کے ہر بار کس نے توڑے؟ شجاع الدولہ و آصف الدولہ کی نسل کو تخت شاہی سے اتار کر در بدر کی ٹھوکریں آج کون

کھلا رہا ہے؟ نظام الملک آصف جاہ دکن کو اپنی ضرورت کے وقت آقا اور یار کا تسلیم کرنے کے بعد، آج کس حکومت کا کارندہ (لارڈ ریڈنگ) اپنا ایک ادنیٰ ماتحت بنائے ہوئے ہے؟ وہ کابل، وزیری، آفریدی، مہمند، مسعودی، سرحد کے تمام مسلمان جرگوں اور قبیلوں کی آزادی کا آج کون دشمن ہے؟ اور کون اپنے طیاروں اور بم کے گولوں سے، اور اپنے خزانے کی تھیلیوں اور اپنی تعلیم گاہوں کے دام و دانہ سے اُنھیں اپنی غلامی میں پھانس رہا ہے؟"

رسالہ زمانہ کانپور نے جو ۱۹۰۳ء سے مسلسل جاری ہے، ۱۹۲۸ء میں زندگی کے پچیس سال پورے کرلیے، اور اس تقریب مسرت کے موقع پر جوبلی نمبر شائع کیا ہے۔ اُردو رسائل کی زود میری کا یہ عالم ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں رسالے ضرور جاری ہوئے، مگر دلگداز کے سوا شاید اُنیسویں صدی کی کوئی دوسری یادگار اب موجود نہیں۔ اور دلگداز بھی ایک زائد مرتبہ چلتے چلتے بند ہوچکا ہے۔ زمانہ کی یہ کامیابی اُردو زبان کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ زمانہ کے لایق، مستعد، زمانہ شناس اور دُھن کے پکے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تمام ہی خواہان اُردو کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ صوبۂ متحدہ، اُردو کا گہوارہ ہے مگر یہاں کے باشندوں میں اہل پنجاب کی سی زندہ دلی اور اولوالعزمی نہیں جسکی بدولت اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی رفتار یہاں نسبتاً بہت سُست ہے۔ غنیمت ہے ابھی تک علمی و ادبی جد و جہد میں صرف کمیت و مقداری کے لحاظ سے پنجاب کو تفوق حاصل ہوسکا ہے، کیفیت اور خوبی کی بنا پر افضلیت کے استحقاق سے یہ صوبہ ابھی محروم نہیں ہوا ہے۔

لاہور کے اکثر رسائل ہر سال اور بعض اوقات سال میں متعدد خاص نمبر نکال کر اہل ملک سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ رسالہ زمانہ بھی ایسے نمبر ابتداء سے شائع کرتا رہا ہے، مگر اسکا جوبلی نمبر خاص امتیاز رکھتا ہے۔ الناظر مصوری کے محاسن و معائب کا نقاد نہیں، بلکہ اُسکا ایڈیٹر اتنا دقیانوسی واقع ہوا ہے، کہ اس بیسویں صدی میں بھی اُسے آرٹ کی یہ صنف خصوصاً پیکر انسانی کے مرقعے پسند نہیں آتے، بلکہ مسلمانوں کے لیے تو وہ اسے معصیت کبیرہ تصور کرتا ہے، لیکن تصاویر سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی زمانہ کے جوبلی نمبر میں کافی سامان دلکشی موجود ہے۔ الّا یہ کہ ایڈیٹر کی لاعلمی یا ناواقفیت کی بنا پر اسمیں ایک مضمون ایسے صاحب کے نام سے شائع ہوگیا ہے جو اسکاٹ، تھیکرے، وکٹر ہیوگو، ڈیوما، جارج الیٹ، ٹالسٹائے، مارک ٹوئن، اسٹیونسن اور انگریزی کے دوسرے مشہور افسانہ نویسوں سے بیگانہ ہونے کے باوجود حیرت انگیز دلیری و جسارت سے زمانہ کے اوراق میں اُنکے کارناموں کا ذکر اس انداز میں فرماتے ہیں کہ گویا آپ انگریزی ادب کے ماہر خصوصی ہیں۔ دوسروں سے لکھوا کر نظم و نثر مضامین اپنے نام سے شائع کرنے کی بد اخلاقی کبھی اہل ثروت کے لیے مخصوص تھی، لیکن اب یہ بات عام ہوتی جاتی ہے۔ غالب نے اسی دن کیلیے کہا تھا ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروے شیوۂ اہل نظر گئی۔

جنرل پالک لکھنو کی رزیڈنسی سے گورنر جنرل کی کونسل مین بھرتی ہو گئے اور وہان کپتان شکسپیر
قایم مقام رزیڈنٹ مقرر ہوے۔ ایسے وقت مین سرہربرٹ ماڈک کچھ عارضہ جسمانی کے سبب سے رخصت
لیکے چلے گئے کوئی شخص میرا مربی نہ کونسل مین رہا نہ دفتر مین بلکہ دفتر مین مسٹر اڈورڈ نام ایک صاحب
نائب سکرٹر تھے اونکو بھی بعضے ایسے امور سے جن کا ذکر مصلحت نہین ہے میری طرف سے دل مین کینہ
تھا ایسی حالت مین جو کچھ مجھکو ضرر نہ پہونچتا وہی تعجب تھا مگر محض عنایت الٰہی سے راقم او رمضرات محتملہ سے محفوظ
رہا صرف اتنا ضرر پہونچا کہ عہدہ سے علیحدگی ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ بقا اور قیام اوس عہدہ کا اون
اختیارات کے ساتھ جو راقم کو حاصل تھے بدون با اقتدار مربیون کے محالات سے تھا جہان بڑے
بڑے رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے ایجنٹ اور گورنر جنرل کی کونسل کا ایک آدہ ممبر کسی شخص ہندوستانی
کے حاسد ہون اوس کی عزت اور آبرو کا باقی رہنا بھی موجب تعجب ہے نوکری کی کیا حقیقت ہے اون
سب محاسدات کا نتیجہ ہوا کہ بمجرد راقم کی برخاست کے میرمنشی کے عہدہ کو بالکل خراب کردیا درماہہ
بھی گھٹ گیا اور مطلق اختیارات اوس عہدہ کے جو قدیم سے تھے وہ باقی نہ رکھے اور اصل یہ ہے کہ
اہل قلم کے عہدون پر دیانت اور امانت اور لیاقت و متانت اور وضعداری کو کسی سلطنت مین
کوئی نہین پوچھتا تعلق اور ترقی اہل قلم کی ہرجگہ رسائی پر اور توجہ خاص ارباب اقتدار پر جن سے وہ متعلق
ہین موقوف اور منحصر ہے قدیم سے یہی دستور چلا آیا ہے کچھ نئی بات نہین ہے یہ سلطنت حکیمانہ برطانیہ
اعظم کے جہان سیکڑون قاعدے امتحان لیاقت کے جاری ہین اور جاری ہوتے جاتے ہین اور خاص
اپنی قوم مین استحقاق کی بھی رعایت مختص ہندوستان مین ہوا کرتی ہے اسی کے ساتھ سیکڑون مثالین راقم
کو یاد ہین کہ انگلستان مین بہ کثرت اور ہندوستان مین اوس کی نسبت سے بقلت صرف رسائی سے اور
توجہ خاص ارباب اقتدار سے محض نالایق اور خاین بددیانت نہایت لایق اور دیانتدار مشہور
ہوتے ہین اور روز بروز اون کی ترقی ہوتی ہے اور رسائی اور توجہ نہ ہونے سے بڑے عالی خاندان
اور بالیاقت و دیانت دارون کو کوئی نہین پوچھتا یا وہ محض بددیانت اور نالایق ٹھہر جاتے ہین راقم کے
گمان مین یہ امور محض تقدیری ہین کسی کو کسی سے شکایت نہین چاہیے مگر اسی کے ساتھ جبلت سے

محسن اور مسیئی کا شکر اور شکایت انسان کی عادت مین ہے الغرض راقم جب تلک اوس منصب پر رہا نہایت آسایش اور ناموری سے بسر ہوئی لیکن جس طرح سے پچھلے میر منشیون کو تمول حاصل ہوا اور اتنا اندوختہ اونھون نے جمع کیا کہ پھر مدت العمر اون کو نوکری کی حاجت نہ ہوئی راقم اس نعمت سے محروم رہا اور اس قدر بے بضاعتی کی نوبت پہونچی کہ برس چھ مہینے بھی خانہ نشینی دشوار تھی جس طرح سے ہوا اثاث البیت کو بیچ پانچ کے تین چار برس بسر ہوئے علاوہ بسبب اوس کا یہ تھا کہ بڑا بیٹا میرا مولوی فرید الدین خان سلمہ اللہ تعالی کم سنی سے بسبب استحقاق آبائی کے بادشاہ کی سرکار مین متعلق تھا اوس کے سبب سے ایک گونہ گھر کے مصارف کی فکر سے مین فارغ تھا اور اون دنون مین یہ تصور ہوا کہ نوکری کرنا غلامی سے بدتر ہے معیشت اپنی تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیے چنانچہ اس فکر مین تین چار ہزار روپیہ چھاپہ خانہ مین اور کاغذ کی تیاری مین لگائے لیکن اوس مین کچھ انتفاع نہ ہوا اور ساری رقم ضائع ہوئی اور چونکہ اوس وقت تک تدابیر تجارت کے خوب ذہن مین نہ تھے اور سررشتہ بسر دشوار ہوئی مجبوری سے پھر تلاش روزگار کی ہمت ہوئی تین جگہہ پر درخواست کی۔ ایک جنرل فریزر حیدرآباد دکن کے رزیڈنٹ کی معرفت اوس ریاست مین درخواست بھیجی۔ ایک اپنے قدیم مربی مسٹر ہنری طامس جو گورنر جنرل کے ایجنٹ مرشدآباد مین تھے اون سے درخواست کی کہ نظامت مین کوئی شغل میرے واسطے پیدا کرین اور جنرل فریزر سے اور مجھ سے ملاقات نہ تھی اون کے پاس بھی درخواست اونھین مسٹر ہنری طامس کے ذریعہ سے بھیجی تھی اور چونکہ اوس عرصہ مین سر ہربرٹ مادک بنگالہ کے ڈپٹی گورنر تھے اون سے بھی مستدعی ہوا کہ کوئی عہدہ عدالت یا مال کا مجھے عنایت فرمائیے چونکہ اللہ تعالے کی عنایت اور شفقت ہمیشہ سے اس سیہ کار کے اوپر رہی ہے ایک مہینا بھی ان امیدواریون مین نہین گذرا تھا کہ پہلے جنرل فریزر حیدرآباد دکن کے رزیڈنٹ کا خط مسٹر ہنری طامس کے نام پر آیا اس مضمون کا کہ اونھون نے میری درخواست نواب سراج الملک مرحوم کو دی نواب صاحب ممدوح نے نہایت خوشی خاطر سے قبول فرمایا کہ اگر مین وہان جاؤن تو کوئی عہدہ معزز موافق میری زی اور لیاقت کے عطا فرمائین گے اور قبل اون کے خط کے پہونچنے کے مسٹر ہنری طامس اور سر ہربرٹ مادک نے باہم یہ بندوبست

گیا تھا کہ نواب ناظم مرشدآباد کی طرف سے ایک خط بدرخواست میرے تقرر کے نواب امیر النسا بیگم عرف
دولھن بیگم کی ڈیوڑھی کی دیوانی پر منگوا کے بنگالے کی گورنمنٹ مین بھجوایا اور وہان سے منظوری منگوا
کے مجھے مقرر کیا اور قبل ظہور اس بند و بست کے سر ہنری ٹارنس نے مجھ سے کہا یہ منصب بھی موجود ہے
اور حیدرآباد دکن سے بھی تمھاری طلبی ہے جو امر مرجح سمجھو اوس کو اختیار کرو اوس وقت بنظر قرب اپنے
مربی قدیم کے اور حیدرآباد دکن کا سفر دور و دراز سمجھ کے اور وہان کے کوائف مفصلہ نہ معلوم ہونے سے
مرشدآباد کے تعلق کی راقم نے تقدیم کی اور اوس کو قبول کیا اور نواب ناظم نے خلعت فاخرہ عطا
فرما کے مجھکو اوس ڈیوڑھی پر مامور کیا یہ نواب امیر النسا بیگم نواب عالی جاہ نواب مبارک الدولہ
کے بیٹے کی بی بی تھین جو اپنے وقت مین نواب ناظم تھے اور بعد اوس کے وہ گدی نشین نواب منی بیگم
کی مقرر ہوئین جو کمپنی انگریزی کی مان کہلاتی تھین اون کی کہانی ارباب تواریخ کو معلوم ہوگی بیان ذکر
اوس کا فضول ہے اس سبب سے یہ عہدہ نہایت معزز تھا اوس کا اعزاز و امتیاز گورنر جنرل کے دفتر کے
میر منشی سے بمراتب زائد تھا ایک لاکھ روپیہ سال اوس ڈیوڑھی کے واسطے نظامت فنڈ سے نقد مقرر تھا
اور بہت سی ریاست زمینداری وغیرہ کی تھی لیکن اون کی ڈیوڑھی مین چند بدمعاش ایسے گھسے تھے
کہ وہان سخت ابتری اور بدنظمی تھی بے انتہا قرضداری تھی بر سون کی تنخواہ نوکرون کی چڑھی ہوئی
تھی اوسی کے ساتھ جعل اور تلبیس اور بعضے حرکات ناگفتہ بہ کی نسبت اوس ڈیوڑھی مین ہوتی تھی
اجنٹ گورنر جنرل نے باتفاق نواب ناظم کے کچھ بدمعاشون کو نکالا تھا اور مجھے حکم اوس ڈیوڑھی کے
انتظام کا اس طرح سے ہوا تھا کہ مطلق بیگم صاحبہ کی راے مصارف کے باب مین نہ سنون اور اوس پر
عمل نہ کرون اور جیسا مناسب سمجھون اپنی راے اور تجویز سے انتظام کرون اور وہ راہ نکالون کہ خبرین
جو اوس ڈیوڑھی کی مشہور ہوتی ہین وہ نہ ہونے پاوین اور اگرچہ وقوع بعضے مفاسدین وہان کچھ شبہ
نہ تھا لیکن ایک امر بھی باعث زیادہ تر رسوائی اور بدنامی اوس ڈیوڑھی کا تھا وہ یہ تھا چونکہ نواب امیر النسا بیگم
نواب منی بیگم کی گدی نشین تھین اس سبب سے نواب ناظم کو حکم اون کی تبعیت کا تھا اور یہ حکم تھا کہ
تقریبات عیدین وغیرہ مین وہ بیگم صاحبہ کو نذر دیا کرین اس سبب سے تین پشت سے برابر نواب ناظم کو

بیگم صاحبہ پر بہت حسد رہا کرتا تھا اور چونکہ نواب والاجاہ اور نواب ہمایون جاہ بعضے مظالم بیگم صاحبہ پر اور اون کی ڈیوڑھی پر کیا کرتے تھے اس سبب سے اجنٹ گورنر جنرل بیگم صاحبہ کے معین رہتے تھے اور اون کے مظالم سے بچایا کرتے تھے اور بہت سے امور مین اوس ڈیوڑھی کو ایک ریاست مستقلہ نظامت سے جداگانہ بہ لحاظ عظمت شان نواب منی بیگم کے کر دی تھی۔ انھین وجوہ سے نواب ناظم کو اور ساری نظامت کے اہلکارون کو شدت سے اوس ڈیوڑھی کے اہلکارون سے بغض اور حسد رہا کرتا تھا ساری نظامت کے لوگ اون کے عیب جو تھے اور ڈیوڑھی مین معاملہ عورات کا اور مداخلت جہال خواجہ سرا ان کی اوتھون نے جو شہ پائی یعنی گورنر جنرل کے اجنٹ اور اون کے ذریعہ سے ارباب گورنمنٹ اوس ڈیوڑھی کے معین اور حافظ ہوگئے بوم اور کھل کھیلے اس عرصہ مین جب نواب ہمایون جاہ قضا کر گئے اور نواب فریدون جاہ کم سنی مین مسند نشین نظامت کے ہوے اور بند و بست نظامت کا گورنر جنرل کے اجنٹ کے ہاتھ مین آیا بہ تدریج اوس ڈیوڑھی کی بہت سی سبکیان ہوئین نواب ناظم نے نذر دینا موقوف کر دیا خواجہ سرا اپنی طرف سے مقرر کیے اونھون نے گویا بیگم صاحبہ کو بطور مقید کے کیا۔ اس حالت مین وہان کا انتظام راقم کو سپرد ہوا جہان تک کوشش ممکن تھی راقم نے درستی کی تنخواہین برسون کی لوگونکی پچھلی چڑھی ہوئی بیباق کی بند مہینے مہینے تقسیم ہونے لگی قرضہ ادا ہوگیا اجنٹ گورنر جنرل کی طرف سے تاکید کروا کے نواب ناظم کو لیجا کے بیگم صاحبہ کو نذر دلوائی بیگم صاحبہ کو بھی اپنی طرف سے راضی رکھا غرض ڈیوڑھی سے باہر دیوانخانہ سے جو متعلق تھا اوس کا انتظام بخوبی ہوگیا محل کے انتظام کے واسطے بھی خود منتخب کر کے ایک حبشی خواجہ سرا کو نواب ناظر مقرر کروایا ان سب امور سے نظامت کے اہلکارون نے نواب ناظم کو میری طرف سے برہم کر دیا مگر مشہور ہے لَا يُصْلِحُ الْعَطَّارُ مَا أَفْسَدَهُ الدَّهْرُ - غلام کی ذات بے وفا
خوشبو ساز درست نہین کرسکتا جس چیز کو زمانہ نے بگاڑ ڈالا
ہوتی ہے جس خواجہ سرا کو مین نے مقرر کروایا تو وہ میرے قدمون پر سر رکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ مین حقیقت مین آپ کا نوکر ہون نہ مین نواب ناظم کو جانتا ہون نہ بیگم صاحبہ کو۔ دو ایک مہینے کے بعد ڈیوڑھی مین پہونچ کے وہ آسمان پر چڑھ گیا اور جو انتظام محل کا مین سوچا تھا وہ اوس نے نہ ہونے دیا ہر امر مین میری مخالفت کرتا رہا اور نظامت کے لوگ میرے حسد سے اوس کے معین ہوگئے اسی کے ساتھ

جس طرح سے ہو سکا چار برس تک برابرین سب کو دبائے رہا صرف اتنا فتور رہا کہ محل کے اندر کا انتظام جیسا مین چاہتا تھا سب بدمعاشون نے نہ ہونے دیا۔ الغرض سیکڑون میری شکایتین روز نظامت کی طرف سے اجنٹ گورنر جنرل کے پاس پہونچا کین مگر جب تک مسٹر ہنری طارنس وہان رہے کچھ اونھون نے نہ سنا اس عرصہ مین اونھون نے چھ مہینے کی رخصت لیکے سفر دریا شور کا اختیار کیا مصر کے ممالک تک گئے اور جو صاحب اون کے قائم مقام اجنٹ گورنر جنرل مقرر ہوے اون سے خاص میرے باب مین بہت سمجھا گئے کہ ساری نظامت کے لوگ ان کے دشمن ہین جب تلک مین پھر کے آؤن ان کی حفاظت بخوبی کرنا اس نظر سے اون کی غیبت مین بہت سے فتورات مجھپر اوٹھے مگر قایم مقام اجنٹ گورنر جنرل برابر میرا معین رہا شرح اور تفصیل اوس کی محض بے سود ہے جب نظامت کے حمقا نے جو نواب ناظم کے پاس پیش تھے اون مین سرنکالے ہوے دو حبشی خواجہ سرا تھے یہ دیکھا کہ اون کی کوئی تدبیر میرے گرانے کی پیش رفت نہوئی اب قائم مقام اجنٹ گورنر جنرل سے مسٹر ہنری طارنس کی شکایت شروع کی یعنی ظاہر کیا کہ بہت سا روپیہ نظامت کا اونھون نے ضایع کر دیا اور کئی لاکھ روپیہ پر وہ خود متصرف ہوگئے قائم مقام اجنٹ نے اوس کی اطلاع گورنمنٹ مین بھی ظاہر کی اور جب مسٹر ہنری طارنس پھر کے اپنے عہدہ پر آئے اون سے یہ تفصیل وہ داستان نقل کر دی مسٹر ہنری طارنس اون دونون خواجہ سراؤن کے دشمن ہو گئے اور تدبیر اون کے قلع اور قمع کی شروع کی وہ دونون خواجہ سرا جس مین ایک کا نام امان علی اور ایک کا نام نذیر علی تھا یہی دونون بڑے کارپرداز نظامت کے تھے اون دونون کو کارپردازی سے موقوف کروا کے اون کی ساری جایداد لاکھون روپیہ کی قرق اور ضبط کی اور نظامت کے انتظام کے واسطے ایک مجلس بطور پنچایت کے پانچ آدمیون کی مقرر کروائی اون پانچون مین ایک راقم کو بھی داخل کیا اور اوس مجلس انتظام کی تجویز سے راقم کو عہدہ عرض بیگی یعنی داروغۂ دیوان خانہ نواب ناظم کا بھی مقرر کروایا جو حقیقت مین مدار المہامی نظامت کی تھی اور پچھلا عہدہ بھی میرا بدستور قایم رکھوایا۔ اب چونکہ مجھکو حضوری دایمی نواب ناظم کی

ہوگئی وہ نہایت میرے حال پر شفیق ہوگئے اور جو لوگوں نے اون کو میری طرف سے متنفر کر دیا تھا وہ تنفر اونکا بالکل جاتا رہا۔ اب ایک معاملہ عجیب پیش آیا کہ بموجب نظامت کے قوانین اور دستورات کے نواب ناظم کو قلعہ کے اندر اختیار دار و گیر کا جو تھا وہی حاصل تھا قلعہ سے باہر انگریزی عدالت کے تحت ہے۔ اور اون دونوں خواجہ سراؤن مین جن کا اسباب قرق اور ضبط ہوا ایک خواجہ سرا نذیر علی جس کا نام تھا وہ قلعہ سے باہر رہتا تھا اوس کو واقعہ طلب لوگوں نے بہکا کے عدالت فوجداری مین قرقی بیجا کی درخواست دلوائی اور مسٹر ہنری طارنس کو اور راقم کو اور جو لوگ قرقی اور ضبطی مین دخیل تھے سب کو مدعا علیہ مقرر کیا مختارون کے ذریعہ سے جوابدہی ہونے لگی۔ مسٹر ہنری طارنس چونکہ اہل یورپ سے تھے بموجب قانون کے مجسٹریٹ اون کو تو ماخوذ نہ کر سکا مگر ہم لوگون پر فی الجملہ تشدد کیا اور مقدمہ طول ہوا مگر بعد اپیل کے صاحب مجسٹریٹ کے حکم سے مواخذہ جو راقم سے اور نظامت کے لوگون سے اوس نے قرقی بیجا کا تجویز کیا تھا وہ منسوخ ہوگیا مگر قرقی سب واگذاشت ہوگئی۔ اور اس حکم سے مسٹر ہنری طارنس کی اور نظامت کی بہت سبکی ہوئی۔ غرض جو امور شفقت اور عنایت نواب ناظم کے اوس تھوڑے سے عرصہ مین میری نسبت پیش آئے اور بعد اوس کے دفعتہ معاملہ پلٹ گیا ساری شرح اوس کی بہت طولانی ہے اور ایسے امور خلاف طبیعت کے پیش آئے کہ اب بھی اوس کے یاد کرنے سے ملال خاطر ہوتا ہے حالانکہ اب کسی تیج کا نہ وہان سے تعلق ہے اور نہ آیندہ امید تعلق کی ہے اس نظر سے جی نہین چاہتا کہ اون وقایع کی مفصل شرح کیجیے اسی کے ساتھ بنظر انتظام وقائع نگاری کے جہان تک ممکن ہے باجمال ساری کہانی وہان کی لکھی جاتی ہے۔ غرض عجیب اتفاق ہوا کہ دفعتہ نواب ناظم کا مزاج میری طرف سے برہم ہوگیا اور فی الجملہ مسٹر ہنری طارنس میرے مربی قدیم بھی مجھ سے ناراض ہوگئے۔ اگرچہ یہ دونون امر سحر سے میرے عقیدہ مین واقع ہوے جس کی شرح بین آیندہ کرونگا مگر مگر اس عالم اسباب مین کیونکر اثر سحر کا ہوا پہلے اوس کا نقل کرنا ضرور ہے بعد اوس کے کوایف مفصل اوس سحر کے ہم لکھینگے۔ مسٹر ہنری طارنس نے یہ تجویز کی کہ نظامت کا ایک دیوان مقرر کرانا چاہیے

اس امر کو نواب ناظم سے بیان کیا اور اوسپر اصرار کیا نواب ناظم نے تقرر دیوان کا قبول نہ کیا اسمین
کچھ شبہہ نہین ہے کہ اونھون نے جو نہ قبول کیا تو ساری پنچایت کی صلاح سے نہ قبول کیا جسمین
راقم بھی داخل تھا لیکن راقم نے نواب ناظم سے یہ عرض کیا تھا کہ میری دانست مین آپ ہرگز صاحب
اجنٹ کی صلاح سے انکار نہ کرین جیسا وہ کہتے ہین دیوان مقرر کر دیجیے اس واسطے کہ آپ متحمل
مخالفت کے اون کی صلاح سے نہین ہو سکتے آخرش حضور کو ماننا پڑیگا پھر کیا ضرور ہے اب
انکار کرنا پہلے ہی سے قبول کر لیجیے۔ اسپر نواب ناظم نے مجھ سے پوچھا کہ اگر مین نہ قبول کرون تو
خلاف میری رائے کے سررشتہ کے بموجب صاحب اجنٹ میرے اوپر جبر کر سکتے ہین اس امر مین یا
نہین۔ اوسکے جواب مین راقم نے عرض کیا کہ سررشتہ کے بموجب تو وہ جبر نہین کر سکتے لیکن نظامت
مین کون سے پچھلے سررشتہ کی رعایت ہوتی ہے آخرش آپ کو قبول ہی کرنا پڑیگا۔ جس شخص کو
صاحب اجنٹ دیوان مقرر کرایا چاہتے تھے اوس نے اور جو لوگ اوس کے معین اور مددگار تھے
سبھون نے مسٹر ہنری طارنس پر یہ امر ثابت کیا کہ نواب ناظم نے صرف راقم کی صلاح سے اوس
امر کو نہ قبول کیا اور قرینہ قوی اس امر پر یہ تھا کہ عرض بیگی کا کچھ اختیار مدار المہامی مین نظامت کے
دیوان کے مقرر ہونے سے گھٹ جاتا اس نظر سے مسٹر ہنری طارنس میری طرف سے کچھ برہم ہو رہے اور
جس شخص کو عہدۂ دیوانی کے واسطے مسٹر ہنری طارنس نے طلب کیا تھا اوس نے معزول خواجہ سرا اون
سے ساز و آمیز کر کے یہ وعدہ کیا کہ اگر نواب اوس کو دیوان مقرر کر دین تو اون کو وہ بحال کر دیگا۔
نواب ناظم نے شیر کے شکار کے واسطے سفر کیا تھا راقم بھی اون کے ہمراہ تھا دفعتہً اون کے انقلاب
مزاج سے چند اسباب لغو سے جن کا ذکر فضول و طول ہے راقم بیماری کا عذر کر کے مرشداباد مین
چلا آیا۔ یہان مسٹر ہنری طارنس نے اپنی بدمزگی طبیعت کا عذر کر کے مجھ سے ملاقات نہ کی اور نواب
ناظم نے اون کو ایک خط لکھ بھیجا کہ عرض بیگی بدون ہماری اجازت کے یہان سے اوٹھ گیا۔ اس
واسطے مین نے اوس کو معزول کر کے دوسرے شخص کو اوس کی جگہ پر مقرر کیا۔ مسٹر ہنری طارنس نے
اس خط کا جواب لا و نعم کا کچھ نہ لکھا بعضے کہتے ہین کہ عرض بیگی کے عہدہ سے صاحب اجنٹ کی

ایسا کہ بموجب نواب ناظم نے مجھکو معزول کیا مگر بہر صورت وہ ہرگز راضی نہ تھے کہ مین اپنے قدیم عہدہ سے معزول ہون۔ اگرچہ اب اس واقعہ سے مین خود وہان نہ رہا لیکن اس مین بھی کچھ شبہہ نہین ہے کہ مسٹر ہنری طارنس سے جب مجھ سے ملاقات ہوتی تو مین اپنی طرف سے اونکا مزاج بہت صاف کردیتا اور وہ ہرگز مجھکو مرشدآباد سے اوٹھنے نہ دیتے لیکن بہ نظر اون بدخیرون کے جن سے میرے مخالف لوگون نے اون کے کان بھر رکھے تھے وہ چاہتے تھے کہ چند روز اظہار اون کی بدمزگی مزاج کا میری طرف سے رہے چنانچہ اپنی کچہری کے سررشتہ دار سے جب اوس نے میری معزولی کے خطوط جو نواب ناظم نے پہلے عرض بیگی کے عہدہ سے اور بعد اوس کے ڈیوڑھی کی دیوانی سے بھیجے تھے پیش کیے اور جواب پوچھا کہ کیا لکھا جائے اونھون نے کہا اگرچہ فلانے شخص سے خلاف توقع کے نواب ناظم کو مشورہ دینا میرے مشورہ کے خلاف ظہور مین آیا لیکن مین ہرگز راضی اونکی معزولی سے خصوص اون کے قدیم عہدہ سے نہین ہون۔ خیر ان خطون کو رکھو سمجھ کے جواب لکھا جائے گا۔

کوائف سحر کے جو اوپر مرشدآباد میں میرے اور مسٹر ہنری طارنس کے کیے گئے

اب کوائف سحر کے جو میرے اوپر اور مسٹر ہنری طارنس پر ہوے مین نقل کرتا ہون حقیقت یہ ہے کہ قبل مرشدآباد مین جانے کے سحر کی طرف سے میرے دل مین یہ عقیدہ تھا کہ اس زمانہ مین چونکہ جمیع علوم ظاہری اور باطنی مین کمی ہے کہین اس کا وجود نہین ہے جو کچھ اس زمانہ مین لوگ کہتے ہین اور کرتے ہین بر اٹھکوسلہ ہے اور شعبدے مین کچھ اثر اوس مین نہین ہے۔ یہ امر مرشدآباد مین میرے دل سے نکل گیا اور اب مجھے یقین کلی ہے کہ سحر مین اب بھی اوسی طرح کا اثر ہے جیسا پچھلے زمانہ مین سنتے تھے۔ کوائف توجہ اور عنایت اور شفقت مسٹر ہنری طارنس کے میرے اوپر جو تھے پچھلے حکایات جو مین ذکر کرچکا ہون اوس سے ہر ایک کو معلوم ہوگا کہ کس قدر شفقت اور عنایت تھی اور تھوڑی ہی سی صحبت مین جو نواب ناظم کو عنایت و شفقت شروع ہوئی اوس کی شرح کرنا فضول ہے۔ مجھے خوب عقیدہ واثق ہے کہ دونون کی طبیعت دفعۃً میری طرف سے صرف جادو کے زور سے پھر گئی۔ پہلے مدت تک مجھکو اس کا تصور نہ تھا حالانکہ یہ چار برس برابر ایام قیام مرشدآباد مین انواع اقسام طرح سے میرے اوپر جادو ہوئے مگر میرے پلنگ کے نیچے کبھی تکیون مین کبھی مسند کے نیچے کبھی

آمد و رفت کے راستہ مین عجیب عجیب چیزین پائی گئین۔ لونگین اور سیندور اور الائچی و سوئیان
اور کالی مرچین اور نئی نئی چیزین بنی ہوئین لوہے وغیرہ کی نکلین اور پھینک دی گئین۔ ایک دفعہ
پاخانہ مین جس زینہ پر مین اکثر بیٹھتا تھا دیکھا کہ ایک مٹی کا برتن ہے اوسپر دوسرا مٹی کا برتن
بند ہے یہ دیکھ کے مین نے رفع حاجت نہ کی اوٹھ کھڑا ہوا اوس کو اوٹھوا کے جو دیکھا تو اوس مین
ایک چراغ کسی چیز کے برادہ کا بنایا ہے اور اوس مین کسی جانور کی چربی بھر کے چراغ جلایا ہے
اوس کے گرد سیندور اور کچھ اور چیزین ہین اور جس مٹی کے برتن مین وہ رکھا تھا اوس مین اور
جو برتن بند تھا دونون مین کسی قسم کے حروف غیر متعارف لکھے ہوے تھے اوس کو اوٹھا کے
پھنکوا دیا چونکہ بہت سے لوگ شاگرد پیشہ کے قریب تیس چالیس آدمی بلکہ کچھ زائد نظامت کی
طرف سے میری ڈیوڑھی پر متعین رہتے تھے اور پچھلے عہدہ مین بھی چوبدار اور ہرکارے اور پہرہ
تلنگون کا متعین تھا اور صبح اور شام ہر کارخانہ سے وردی پہونچانے کو بہت سے لوگ آیا کرتے
تھے۔ سیکڑون آدمی سلام کرنے کو اور ملاقات کے واسطے آتے تھے کچھ اس کا بند و بست نہ ہوسکا
اور یہ بھی نہ کھلا کہ کون شخص ایسی حرکت کیا کرتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اسما اور اوراد اور تلاوت
کلام اللہ کی اور حزب البحر وغیرہ جو مین پڑھتا تھا اوس سے میری حفاظت تھی کسی طرح کا ضرر نہ
پہونچ سکا چنانچہ ایک شخص نے میرے ہوا خواہون مین مجھکو یہ بھی خبر پہونچائی کہ ایک بہت بڑا جادوگر مشہور
یہ کہتا تھا کہ اگر کوئی [1] .... تھا خدا جانے کیا سبب ہے کہ جو جادو اوپر
ہوتا ہے وہ [2] اور جب دفعۃً جناب عالی نواب ناظم اور صاحب اجنٹ کے مزاج میری جانب سے
بدل گئے خوب یقین ہوا کہ سحر نے اثر کیا اس کے ساتھ یہ بھی خوب یقین تھا کہ صاحب اجنٹ ہرگز
میری برخاست جایز نہین رکھین گے۔ اب ایک طرفہ معاملہ پیش آیا جس سے اثر سحر کا آفتاب
نیمروز کی طرح سے ظاہر ہوگیا۔ مسٹر ہنری طارنس ہفتہ عشرہ کے واسطے کلکتہ کے عازم ہوے ایک
دھنوے کا جہاز نظامت کا تھا وہ آمادہ اون کے لیجانے کے واسطے ہوا جس دن صبح کو وہ سوار
ہونگے اُس کے قبل شام کو ایک شخص نے مجھکو آکے خبر دی کہ آپ اسی وقت جا کے صاحب اجنٹ کو

[1] یہان کاغذ پھٹا ہے اس لیے کچھ عبارت رہ گئی۔ [2] ایضاً۔

ذکر تاثیر عمل علوی کا جو راقم نے کیا

منع کیجیے کہ اس جہاز پر نہ سوا ہون دو آدمی ساحر اوس جہاز پر بٹھلائے گئے ہین اور اونھون نے وعدہ مصمم کیا ہے کہ صاحب اجنٹ کلکتہ مین پہونچ نہین سکین گے راستہ مین ہم اون کو تمام کر دینگے۔ اگرچہ اب سحر کی تاثیر کا یعنی زمانہ مین اون کے عامل موجود ہونے کا مجھکو یقین ہوگیا تھا لیکن اسکے ساتھ اتنی تاثیر سریع کا مجھے مبالغہ معلوم ہوا اور اوس وقت کبھی عادت صاحب جنٹ کے پاس جانے کی نہ تھی اور وہ میری ملاقات سے انکار بھی کر چکے تھے کچھ وہان جانا اور اون سے اسکی اطلاع کرنا بیہودہ معلوم ہوئی مین نہ گیا صبح کو وہ سوار ہوے جہاز اوسی دن شام کو یا دوسرے دن کلکتہ مین پہونچا جو نہین مسٹر طارنس نے ارادہ جہاز پر سے اوترنے کا کیا دفعتہً مصروع ہو کے گر پڑے اور مجنون ہو گئے دو تین دن کے عرصہ مین قضا کر گئے کسی دوسرے شخص کو یقین ہو یا نہ ہو مجھکو اوس وقت سے عقیدہ واثق ہوگیا کہ زمانہ مین ساحر کامل اب تک موجود ہین۔ اسی مقام کے مناسب ذکر تاثیر اعمال علوی کا ہے چونکہ راقم کو مرشدآباد مین ایسے امور پیش آنے سے نہایت رنج تھا اوسی حالت مین مین نے ایک عمل نہایت تضرع اور زاری کے ساتھ پڑھا اور یہ دعا کی کہ اسد تعالی سب میرے دشمنون کو جو باعث میرے ایذا کے ہوے ہین ہلاک اور خراب کرے عجیب اتفاق ہوا کہ جناب عالی نواب ناظم ہنوز سفر مین تھے کہ وہان ایک شخص متہم چوری کا کیا گیا یا حقیقت مین کسی خواجہ سرا کی کوئی چیز اوس نے چرائی تھی اوس شخص پر ناظم اور ستم ہوا کہ وہ شخص مرگیا۔ ہر روز ظاہرا بھی کے پاون مین باندھ کے سفر مین اوس کو لیجاتے تھے جب لشکر فرودگاہ پر پہونچتا تھا تو اوس پر ضرب اور شلاق ہوتی تھی آخرش وہ شخص متحمل نہ ہوا مرگیا۔ صاحب مجسٹریٹ نے مرشدآباد کے سارے رفقا اور مصاحبین نواب ناظم کی دار و گیر کی۔ خود نواب ناظم چونکہ محکوم عدالت نہین ہین محفوظ رہے اور سب خواجہ سرا اور رفقا ماخوذ ہوے سب پر جرم اوس شخص کے ہلاک کا ثابت ہوا خصوص وہ ذات شریف جو میری جگہ پر عرض بیگی مقرر ہوے تھے سشن کی عدالت سے سب کے واسطے چودہ چودہ برس کی قید ہوئی عرض بیگی جو ظاہر امر د شریف تھا کہ اپنے تئین

سید کہتا تھا وہ کسی قسم کا زہر اپنے پاس رکھتا تھا۔ جب حکم اوس کے محبس مین لیجانے کا ہوا وہ تو
زہر کھا کے مرگیا اور سب دس بارہ آدمی خواجہ سرا وغیرہ پابجولانہ اور مشقت کے ساتھ مقید ہوے
بعد مرافعہ کے صدر عدالت مین صرف دو خواجہ سراؤن کی رہائی ہوئی کہتے ہین کہ گواہون کی
ہمرسانی مین اور تدابیر مین قریب ایک لاکھ روپیہ کے اونھون نے خرچ کیا اس سبب سے اون کی
رہائی ہوئی مگر جب تک صدر عدالت سے حکم اون کی رہائی کا ہو وہ دونون بھی پابجولانہ اور
بامشقت مقید رہے اور جب اون کی رہائی ہوئی تب گورنر جنرل کے حکم سے اون کا جناب عالی
کی رفاقت سے بلکہ مرشداباد سے اخراج ہوا اور خود جناب عالی اس امر مین نہایت بدنام
ہوے چنانچہ اب پندرہ برس کے بعد جب جناب عالی کچھ اپنے طلب مقاصد کے واسطے ولایت
مین گئے ہین وزیر ہندوستان نے بعضے اون کے مطالب کی نامنظوری کے واسطے وہی بدنامی
جناب عالی کی پیش کی غرض مجھکو خوب عقیدہ واثق ہے کہ وہ سب کچھ جو واقع ہوا صرف میرے
عمل کی تاثیر سے ہوا اس واسطے کہ اوس عمل کی تاثیر مین لکھتے ہین کہ وہ کبریت احمر ہے نالائقون
کو اوسے مت سکھاؤ۔ اب یہان ایک اور عنایت اور شفقت ایزدی کو جو ہمیشہ اس نالایق پر
مصروف رہی ہے بیان کرنا ضرور ہوا یعنی وہ میری علیحدگی جناب عالی کے پاس سے
پھر باقتضاے عَسٰی اَنْ تَکْرَہُوا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ہوئی اگرچہ مجھکو یقین ہے
کہ اگر مین بدستور اپنے عہدے پر جناب عالی کے ہمراہ ہوتا تو ایسی سخافت واقع نہ ہونے
پاتی باایں ہمہ اگر سب حمقا اور نالایق لوگ میری ممانعت نہ مانتے اوس صورت مین
خدانخواستہ راقم بھی اوس بلا مین مبتلا ہو جاتا۔ اس واسطے جناب اقدس الٰہی نے مجھکو
اوس سے نجات دی الغرض بعد ان حوادث اور سوانح کے خصوص مسٹر ہنری طارنس کی وفات کے بعد
اگر مین ہنوز اپنے عہدون پر بحال ہوتا تب بھی بالضرور استعفا دیتا لیکن مجھے ایک بڑا کھٹکا تھا
کہ چار برس تک مین نواب امیر النسا بیگم کی ڈیوڑھی پر رہا لاکھون روپیہ میرے ہاتھ سے خرچ ہوا اور
عرض بیگی کے اور مدار المہامی نظامت کے عہدے پر اگرچہ تھوڑے دن قیام ہوا وہان بھی بہت

بڑی بدرفاقت رفقا سے عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم

روپیہ میرے ہاتھ سے اوٹھا ہے واصلات کے بکھیڑے مین سب حمقا مدت تک مجھے جھلاوینگے
اگرچہ مین اس قدر بے لوث تھا کہ اگر عاقلانہ مجھ سے حساب سمجھتے تو دس بیس دن مین فراغت
ہوجاتی لیکن اس کا ہرگز گمان نہ تھا خصوص بعد مسٹر ہنری طامس کے قضا کرنے کے ایک
صاحب مرشد اباد کے جج تھے وہ قائم مقام اجنٹ گورنر جنرل ہو گئے اور بعضے وجوہ سے جس کی
شرح یہان عبث اور طول ہے وہ مجھ سے کچھ ناراض تھے اونھون نے بجرو احلا اس کے جو خطوط
میری معزولی کے باب مین دونون عہدون سے نظامت سے آئے تھے اور مسٹر ہنری طامس نے جواب
اوس کا نہین لکھا تھا منظوری کا جواب لکھ کے بھیجدیا اس سبب سے مجھکو نہایت دغدغہ پیدا
ہوا کہ واصلات کے بکھیڑے مین مجھکو لوگ بہت زحمت دینگے اس عرصہ مین کپتان مگر گیر نام
ایک صاحب مستقل گورنر جنرل کے اجنٹ مقرر ہوے یہ صاحب پچھلے دنون مین لارڈ اکلنڈ کے
مصاحب تھے جب راقم فارسی دفتر کا میر منشی تھا مجھکو خوب جانتے تھے راقم چھ مہینے سے زیادہ
واصلات سمجھانے کے انتظار مین وہان مقیم رہا اور باوصف دن کی تاکید کے کسی نے واصلات
نہ سمجھی اور اونھون نے اہالی دفتر سے بالا بالا تحقیقات کر کے میری بے لوثی پر یقین کیا اور مجھے اجازت
دی کہ تم جہان جی چاہے چلے جاؤ ساری کیفیت اس کی بھی بہت طول ہے کچھ اوس کے ذکر کرنے
سے فائدہ نہین ہے۔ اسی عرصہ مین لکھنؤ سے میری بتاکید طلب ہوئی اور درصورت
تاخیر کے احتمال ضرر کا تھا چنانچہ بنظر نہایت تاکید کے ایک ہزار روپیہ میرے مصارف
راہ کے واسطے گیا مگر اوسی واصلات سمجھانے مین مجھکو اس قدر تاخیر ہوئی کہ موجب
ناراضمندی وہان کے ارباب اقتدار کا ہوا اور وہ ہزار روپیہ پھیر دینا پڑا اور اگر مین
فوراً طلب کے وقت یہان پہونچ جاتا تو ظن غالب بہت ترقی کا تھا بسبب تاخیر
کے کچھ ظہور مین نہ آیا۔ قریب دو برس کے مین خانہ نشین رہا کہ اتنے مین اودھ کی
سلطنت سرکار انگریزیہ نے ضبط کرلی جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر مین بیٹھا
.... بتاکید میری طلب ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلا کے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن

راقم کی لکھنؤ سے طلب ہوئی اور ایک ہزار روپیہ راہ کے مصارف کا ... وہان ... سے مین طلب ہو گیا

ضبطی کے مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہانتک تاکید تھی کہ اوسی طرف سے مین روانہ ہوجاؤن اور پھر گھر مین نہ جاؤن ایسے اضطراب مین مجھکو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منتشر ہوئی مین مخفی ایک شب کے واسطے اپنے عزیزون سے رخصت ہونے کے لیے گھر مین آیا اوس کی صبح کو کلکتہ کی طرف روانہ ہوا اور بادشاہ کو اون کے خیر طلبون نے صلاح دی تھی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہون اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکۂ معظمہ کے حضور مین اور پارلیمنٹ مین بذات خود اصالتاً پیش کرین حقیقت مین یہ راے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے دو برس جو اونھون نے قلعہ مین رہنے سے مصیبت جھیلی اوس سے محفوظ رہتے اور غالب گمان قریب بیقین کے ہے کہ جو مآل اب بادشاہ کے واسطے ہوا اوس سے براتب بہتر ہوتا۔ الغرض پہلے تو بادشاہ نے اسی عزیمت پر کلکتہ کی روانگی کا قصد کیا چنانچہ اسی کے بند وبست کے واسطے پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنون کے بعد خود بھی روانہ ہوے مگر چونکہ جبلت سے ضعیف القلب ہین اور دریا کے سفر سے اون کو نہایت خوف وخطر تھا کلکتہ مین پہونچ کے راے بدل گئی اپنی عزیمت موقوف کی ملکہ کشور اپنی والدہ ماجدہ کو اور مرزا حامد علی بہادر ولیعہد کو اور مرزا جواد علی سکندر حشمت اپنے بھائی کو جو اپنے باپ کے وقت مین جنرل کہلاتے تھے ولایت کی روانگی کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر کیا اور حضرت ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے نام پر جو عریضہ لکھا تھا اوس مین یہ لکھا کہ مین نے اپنی والدہ اور اپنے بیٹے اور اپنے بھائی کو صرف حضور کی دربار داری کے واسطے روانہ کیا ہے اور مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر کو جو اس سیہ کار کا نام ہے اپنا مختار اور وکیل استغاثہ پیش کرنے کے واسطے مقرر کیا ہے اون تینون آدمیون کو مطلق کچھ میرے مقدمہ سے اور دعوے سے علاقہ نہین ہے اوس کا انجام اور انفصال صرف میرا وکیل بذات خود کریگا فقط۔ اور قبیل روانگی کے راقم نے بادشاہ کے حضور مین عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلۂ عالم فدوی کو اور اپنے عزیزون اس سفر دور دراز مین بھیجتے ہین بہت صعب امر ہے اور انجام اوس کا

سلطنت اودھ کی ضبطی کے بعد راقم کو بادشاہ نے سفارت پر مقرر کر کے پہلے کلکتہ کی طرف روانہ کیا

ملکہ اور ولیعہد اور جنرل سکندر حشمت ولایت جانے کے واسطے تجویز ہوے اور راقم سفیر مقرر کیا اور ملکۂ معظمہ کے حضور مین بادشاہ نے لکھوایا کہ اون تینون کو مقدمہ سے کچھ علاقہ نہین وہ صرف [illegible]

موقوف نہایت صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ پر ہے اگر پیچھے سے گھبرا کے نقدی قبول کرلینا منظور رہے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ہین مجھے حکم ہو راقم یہین بہت اچھا بندوبست سلطان عالم کے واسطے کروا دیوے - اسپر ارشاد ہوا کہ مین بھیک مانگون گا اور دریوزہ گری کرون گا مگر زنہار ایک حبہ نقدی مین نہین قبول کرون گا - زنہار تم اس طرح کی گفتگو کبھی نہ کیجیو - غرض راقم معہ سارے قافلے کے اٹھارویں جون ۱۸۵۶ء کو بنگال نام جہاز پر سوار ہوا اور جہاز نے کلکتہ سے لنگر اوٹھایا - اب چونکہ وہی سب نالایق لوگ جو سلطنت کی ضبطی کے باعث ہوئے تھے سب بادشاہ کے ہمراہ تھے اور وہی دراندازیان اور سازشین اور جوڑ بندیان بدستور تھین ملکہ کشور کے ساتھ بعضے مفسد جن کی کرنیل سلیمن نے شکایتین لکھی تھین اور وہ چھپ کے بلو بک مین ارباب پارلیمنٹ کے پاس پیش تھین کہ وجوہ ضبطی سلطنت مین ایک وجہ مفسدہ پردازی اون لوگون کی لکھی گئی تھی اون ایک سو چالیس آدمی کے زمرہ مین جو ہمارے ساتھ روانہ ہوئے شریک ہو گئے - بعضے لوگ جو لکھنؤ مین قدیم سے جعل ساز مشہور تھے اون کو اون مفسدون نے پیچھے بلا لیا کہ دوسرے جہاز پر سوار ہو کے اسکندریہ مین شامل ہو گئے اور بعضے خواجہ سرا جہلا او بعضے دو دو پیسے کے آدمی تینون صاحبون کے ہمراہ گئے کہ وہی سب ون تینون سرکارون مین بیش بیش اور با اقتدار تھے چنانچہ بعد لندن مین پہونچنے کے کرنیل سیکس جو اوس عرصہ مین ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیرمین تھے ایک دن وہ راقم سے کہنے لگے کہ مولوی صاحب ہم آپ کے بڑے شکر گزار ہین کہ آپ ہمارے دعوون کے سب گواہ ہمراہ لیکے آئے ہین پہلا فساد جو مرزا ولیعہد بہادر کے ہمراہیون سے ہوا وہ یہ تھا کہ بعضے رقوم جواہرات گران بہا کہ جو بادشاہ نے حضرت ملکہ معظمہ کی نذر کے واسطے ہمراہ کیے تھے وہ مرزا ولیعہد بہادر کے مفوض ہوئے تھے اور ایک خواجہ سرا حبشی اون کی طرف سے خزینہ دار تھا جب بندر سویس مین جہاز کا لنگان ہوا چونکہ وہ بڑا بھاری جہاز گھاٹ تک نہین جا سکتا تھا اس واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب اوتار کے گھاٹ پر لیجاتے تھے رستہ مین اون خواجہ سرا صاحب نے جو خزینہ دار تھے ظاہر کیا کہ وہ

[illegible]

رقوم جواہرات گران بہا جس کی قیمت واقعی مجھے نہین معلوم تھی مگر میری تخمین مین دو تین لاکھ روپیہ سے زیادہ کے نہ تھے کم کا احتمال ہے اونھون نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت اون کو ایک خاصدان مین رکھ کے اپنے ایک خدمتگار کی تحویل مین سپرد کیا تھا جو ڈیڑھ دو روپیہ مہینے کا اون کے پاس نوکر تھا اوس کے ہاتھ سے وہ خاصدان بحر زخار مین گر پڑا۔ اب اس قضیہ مین غوض کرنا چاہیے اول تو وہ رقوم گران بہا صندوق سے نکال کے خاصدان مین بدون کسی صلاح مشورہ پوچھنے کے رکھ لینا۔ بعد اوس کے خزانہ دار صاحب خود اس چھوٹے سے خاصدان کے بوجھ کے کاہے کو متحمل ہوتے اپنے دو پیسے کے خدمتگار کو سپرد کر دیا اور اوس کو بھی اپنی آنکھ کے سامنے نہ رکھا اجازت دی جہاز پر جہان چاہے بیٹھے۔ غرض واقعی حقیقت اس معاملہ کی خدا کو معلوم ہے بعضے کہتے ہین کہ وہ امر ابتدا سے بادشاہ کے ایک محل کے بندوبست کے بموجب ظہور مین آیا اور وہ خاصدان بجنس اوس محل کے پاس داخل ہو گیا۔ یا کلکتہ سے وہ مال گیا ہی نہ تھا العلم عند اللہ

لندن مین آٹھوین دن ملکہ کشور کا دربار ہوا تھا سکرمون بیان بادشاہ کی مستورات ملاقات کے واسطے آئی تھین

غرض لندن مین پہونچ کے بادشاہ کے مقدمہ کا بہت عمدہ بندوبست ہوا۔ اول ملکہ کشور کا آٹھوین دن دربار مقرر کیا کہ پنجشنبہ کو سیکرمون بیان تشریف لاتی تھین اور شرف اون کی ملاقات سے ہوتی تھین متوسطین سے لیکے اونچے طبقہ تک کتر انگلستان وغیرہ کی عورتون مین کوئی باقی ہوگی جو اون کی ملاقات کے واسطے نہین آئی۔ ملکہ معظمہ کی مصاحبین بھی تشریف لائین یہان تک خود ملکہ معظمہ دام اقبالہا و دولتہا کی خواہش ملاقات کی ہوئی اور ایک خوبصورتی سے ملکہ معظمہ سے ملاقات ہوئی کہ جب سے انگلستان کی سلطنت قائم ہوئی ہے کبھی وہان ایسا امر ظہور مین نہین آیا تھا یعنی زنانہ دربار ہوا کہ کوئی مرد وہان نہ تھا اور دربار خاص مین صرف ملکہ کشور اور دونون شہزادے اور راقم گئے ملکہ کشور سے تو ملکہ معظمہ نے ہاتھ ملایا اور خود بیٹھین اور محاذات مین ایک اوسی نہج کی کرسی پر ملکہ کشور بیٹھین اور مرزا ولیعہد بہادر ایک پہلو مین ملکہ کشور کے اور ایک پہلو مین مرزا اسکندر حشمت کھڑے ہوئے اور پشت پر ملکہ کشور کے راقم کھڑا ہوا اوس وقت ملکہ کشور نے اپنے چہرہ سے

برقع اوٹھایا اور میری پشت پر سرجارج کلارک کھڑے ہوے اس واسطے کہ اوس
وقت تک مین بخوبی انگریزی مین گفتگو نہین کرسکتا تھا تاکہ میرے ذریعہ سے
ترجمہ ملکۂ کشور کی اور ملکۂ معظمہ کی گفتگو کا کرین اور جب گاڑی سواری ملکۂ کشور
کی قصر سلطانی کے برامدے مین پہونچی مجھے حکم ہوا کہ تم اپنے طور پر بند وبست
زنانہ کا کرکے ملکۂ کشور کو اوتار کے لیجاؤ اس مین ملکۂ معظمہ نے تین چار بڑی بڑی
لیڈیون کو بھیجا وہ ملکۂ کشور کو اوتار کے لے گئین اور جب دونون ملکہ آمنے سامنے
بیٹھین اوس وقت راقم نے خریطہ بادشاہ کا گذرانا۔ اوس کو ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھ مین لے لیا اور
جب تک بیٹھی رہین وہ ہاتھ مین رہا۔ قریب پچیس تیس بڑی بڑی لیڈیان اور سب شاہزادیان
اور چھوٹے چھوٹے شاہزادے ملکۂ معظمہ کے بائین پہلو پر کھڑے رہے۔ اس مین ملکۂ معظمہ نے بعد
گفتگو ذوق شوق ارشاد کیا کہ میرا بڑا بیٹا یعنی پرنس آف ویلیز جو ولیعہد سلطنت برطانیہ اعظم ہین چونکہ
پندرہ سولہ برس عمر کے ہین اس واسطے اون کو اجازت یہان آنے کی نہین ہوئی اگر آپ اجازت
دیوین تو وہ بھی آوین۔ ملکۂ کشور نے فرمایا آپ کا بیٹا میرا بیٹا ہے آپ بے تکلف اون کو بلا دین
بعد اوس کے ملکۂ معظمہ نے دونون شاہزادون کو اور راقم کو حکم دیا کہ اوس کے تیسرے دن ہم تینون
آدمی کھانے کی میز پر حاضر ہون اور یہ ایما کی گئی کہ ہر تقریب مین جو ملکۂ معظمہ کے یہان ہوگی ہم
تینون شخصون کی طلب ہوا کریگی لیکن تقدیر نے مجاز نہ کیا یعنی دوسرے دن کلکتہ
سے تار برقی پر خبر آئی کہ بادشاہ کو قلعہ مین مقید کیا ہے وہ سارا بند وبست جو
وہان ہوا تھا سب ملتوی ہوگیا اور قبل حضوری کے ملکۂ معظمہ کے دربار مین ایک
اور فتور پیدا ہوا کہ کلکتہ مین مفسدون نے بادشاہ کو ورغلایا کہ راقم کو عہدۂ سفارت
سے معزول کرین اور کپتان اوزلی نام ایک شخص جو کسی سخت قصور کے سبب
سے ہندوستان مین معزول ہوگیا تھا اوس کو سفیر مقرر کرین بادشاہ نے میری
معزولی تو قبول نہ کی مگر کپتان اوزلی کو لقب ایجنٹ ان چیف اور خطاب کرنیل کا عطا کرکے

رجسٹرڈ نمبر ہندوستان ل ۴۷۰۱

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ　　　　قیمت فی پرچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
عہ کی روانگی پر آدھا
اور
عہ کی روانگی پر پورا

ہدیۂ ہی لیجیے
عہ کی روانگی پر الناظر ایک سال
اور
تمام کی روانگی پر عہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اُردوئے معلی
- عودِ ہندی
- دیوانِ غالب
- اکمل دیوانِ غالب

سر سید مرحوم

- خطباتِ احمدیہ
- اکمل مجموعہ لکچر
- اسبابِ بغاوتِ ہند
- سیرتِ فریدیہ
- خطوطِ سید

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- اکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب الحب فی اللہ و البغض فی اللہ
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم

- امجاد المنزل
- سفرنامہ بر نیپو جلد

مولانا آزاد مرحوم

- آبِ حیات
- دربارِ اکبری
- سخندانِ فارس
- نگارستانِ فارس
- نیرنگِ خیال
- سیرِ ایران
- ڈرامہ اکبر
- مجموعہ مکتوباتِ آزاد
- مجموعہ نظمِ آزاد
- قصصِ ہند کا کرنیول
- جانورستان
- بیاضِ آزاد
- تذکرۂ علماء
- لغتِ آزاد
- دیوانِ ذوق مرتبۂ آزاد

میرزا حیرت شہباز مرحوم

- زندگانیٔ بے نظیر
- خیالاتِ شہباز

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم

- حمائل شریف مترجم
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش
- مراۃ العروس
- توبۃ النصوح
- موعظۂ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائبِ غدر
- مجموعہ نظمِ بے نظیر
- اکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا راشد الخیری مرحوم

- حیاتِ انیس
- الیشیائی شاعری
- نور جہاں بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم

- یادگارِ غالب
- حیاتِ سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- حیاتِ جاوید
- دیوانِ حالی
- مسدسِ حالی
- مجموعہ نظمِ حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوۂ ہند

مولوی بشیر الدین احمد

- واقعاتِ دار الحکومت دہلی
- تاریخِ بیجاپور
- حرزِ طفلان
- انشائے عمر
- عصائے پیری
- لختِ جگر
- حسنِ معاشرت
- اصلاحِ معیشت
- اقبالِ دلہن
- نصیحت ایست
- انشائے بشیر
- دیوانِ بشیر

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول
- جلد دوم
- جلد سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائلِ شبلی
- مقالاتِ شبلی
- شعر العجم جلد اول
- ” ” دوم
- ” ” سوم
- ” ” چہارم
- ” ” پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامینِ عالمگیر
- آغازِ اسلام
- مجموعہ کلامِ شبلی اردو
- کلیاتِ شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخِ ہندوستان
- تاریخِ عہدِ سلطنت
- فرزن نامہ
- آئینِ قیصری
- صحیفۂ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم
- جغرافیہ ریاضیہ
- جغرافیہ طبعی
- اہلِ عرب کا علم و فنون
- رسالہ علم تناسب
- معاون الحساب
- مساحت ماخذ

سید محمود مرحوم

- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانونِ شہادت

مولوی رشید احمد انصاری

- المدنیۃ والاسلام
- تحریر المراۃ

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

جلد ۳۴

ظ

نئی کتابیں

ترجمۂ تاریخ ابن خلدون کی گیارہ جلدیں عرصہ ہوا مکمل ہو گئی تھیں اور سالہا سال سے فراہم کی جارہی ہیں۔ حال میں دو جلدیں اور شایع ہوئی ہیں۔ بارہویں جلد میں علاوہ دیگر حکمرانان اسلام کے یمین الدولہ سلطان محمود بن امیر سبکتگین کے حالات، جے پال، انند پال، بجے راؤ، رکالی چند، برم دیو، اور چند پال جیسے سورما راجاؤں کی جان توڑ کوشش مقاومت اور بھٹنیر، ملتان، گوالیار، کالنجر، نگر کوٹ، تھانیسر، کشمیر، قنوج، متھرا، مہابن، نہر والہ اور سومنات کی لڑائیوں کا تذکرہ ہے۔ قیمت سے ر

تیرہویں جلد میں سلاطین غوریہ کے انساب و حالات، دہلی، اجمیر، بنارس، گوالیار، میرٹھ، علیگڈھ، کالپی اور بدایوں وغیرہ کی فتوحات، کھانڈے راو، پتھورا، بھیم دیو، جے چند، اور ہیمراج جیسے سورما راجاؤں کی جان توڑ کوششیں، سلطان شہاب الدین غوری کے مجاہدات، اور سپہ سالاران دیلم، آل بویہ، حکمرانان آذربائیجان، فرمانروایان بطیحا اور شاہان دینور و سامانیان کے سچے واقعات ہیں قیمت سے ر ذکر ہے۔ خواجہ محمد عبد الحی فاروقی اُستاذِ تفسیر جامعہ ملیہ کی مشہور تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کی تازہ ترین جلد جس میں پارۂ عم کی تفسیر ہے۔ قیمت سے ر

عربوں کا تمدن۔ ڈاکٹر جوزف ہیل، ایک قابل جرمن مستشرق نے عربوں کے تمدنی حالات کے متعلق جسقدر معلومات مغربی زبانوں میں مہیا ہے، سب کو اس رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ جسکا ترجمہ سید نذیر نیازی بی اے (جامعی) نے کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

صلاح کار۔ چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار ردولوی نے، جسکا انداز تحریر بالکل مخصوص ہے، یہ کتاب اس غرض سے لکھی ہے کہ زن و شو کے تعلقات پر اب سنجیدگی کے ساتھ نئی روشنی کے ماتحت غور و خوض ہونے لگا ہے اور لوگ اس بارے میں نیک مشورہ کے محتاج ہیں۔ صلاح کار کے مشورے ممکن ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کے لیے لایق پذیرائی نہ ہوں، لیکن اگر اس مسئلہ پر کسی قسم کی رائے قائم کرنا منظور ہے، تو اس کتاب سے ہر شخص کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ جن لوگوں کو اس کی فکر نہیں کہ بی بی کیسی ہو، کب ملے، اور اُسکے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا یا اُس سے کیا توقعات رکھنا چاہیے۔ وہ اس کتاب کے مطالعہ کی زحمت نہ گوارا فرمائیں۔ قیمت ۱۲ر

منیجر الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۴ جلد ۳۴ اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

مستشرقین انگلستان کی سب سے پہلی انجمن

(از مولوی حامد حسن قادری لکچرار فارسی سینٹ جانس کالج - آگرہ)

انگلستان کا تعلق ممالک مشرقی سے بہت قدیم ہے۔ لیکن حکومتِ ہندوستان نے اس تعلق کو جتنا قریب و وسیع کر دیا وہ پہلے میسر نہ تھا۔ ہندوستان نے نہ صرف انگریزوں کے جیبوں کے لیے اپنے خزانے کھول دیے بلکہ اُنکے تشنہ دلوں کی بھی اپنے علوم و فنون کے چشموں کی طرف رہنمائی کی۔ البتہ جس ذوق و شوق اور ہمت و مردانگی سے اُن تشنگان علم و ادب نے آبحیات تک راستہ پایا اور ظلمات سے نکال کر پیاس بجھائی وہ لائقِ صد آفریں ہے۔

انھیں کوششوں کا ایک قدم یہ تھا جو غالباً اپنی نوع کا قدم اولیں بھی تھا کہ انگلستان میں سنہ ۱۸۲۸ء میں ایک سوسائٹی بنام "اورنیٹل ٹرانسلیشن فنڈ" قائم کی گئی۔ جس کا مقصد تمام ممالک مشرقی کے علم و حکمت کے موتی رول لینا تھا۔ اسکے مربی و سرپرست انگلستان کے بادشاہ ولیم چہارم تھے۔ نائبان مربی میں بائیس علما و امرا کے نام ہیں جن میں چند یہ ہیں:-

هز مجسٹی بادشاہ بلجیم
هز رائل ہائنس ڈیوک آف سسکس
هز رائل ہائنس ڈیوک آف کیمبرج

ہز رائل ہائینس ڈیوک آف گلاسسٹر
ہز گریس لارڈ آرچ بشپ آف کینٹر بری
ہز گریس ڈیوک آف ولینگٹن
لارڈ ولیم بنٹینک گورنر جنرل ہندوستان
سر رابرٹ پیل ممبر پارلیمنٹ
سر جان مالکم گورنر بمبئی۔

اس انجمن کے صدر مشہور مستشرق سر گور اوزلے تھے۔ نائبان صدر پانچ اشخاص تھے جن میں پہلا نام ارل آف منسٹر کا ہے۔ آنریری سکرٹری جے۔ سی۔ ہائٹن اسکوائر ایم اے تھے۔
اس "فنڈ" کے ممبر بنانے اور چندہ وصول کرنے کے لیے کلکتہ، مدراس، اور روم (اٹلی) میں شاخیں قائم کی گئیں۔

ہمارے سامنے اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی جو فہرست مطبوعات ہے وہ صرف چار سال ۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۲ء) کا کارنامہ ہے۔ اس میں ۳۰ کتابیں طبع ہو کر شایع ہو چکی ہیں۔ سات کتابیں زیر طبع ہیں، اور ۲۷ کتابیں زیر ترجمہ و تدوین ہیں۔ چار سالہ کارروائی کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، چینی، سنگالی (سیلونی)، جاپانی، تامل، بنگالی، اتھیوپین، سیریک (شامی) زبانوں سے ترجمے کیے گئے۔

۲۔ اصلی کتابوں اور نایاب قلمی نسخوں کی تدوین و تصحیح کر کے شایع کیا گیا۔

۳۔ علم ادب، تاریخ، فلسفہ، ریاضی، سیرت، سفرنامہ، جغرافیہ، شاعری، فسانہ وغیرہ سب قسم کے مضامین کی کتابیں ترجمہ و تالیف کے لیے انتخاب کی گئیں۔

۴۔ بلحاظ السنہ منتخب کتابوں کی تعداد یہ ہے

(۱)	عربی	۱۴
(۲)	فارسی	۲۱
(۳)	ترکی	۷
(۴)	سنسکرت	۴
(۵)	چینی و جاپانی	۱۰

(۶) باقی سب زبانیں ۱۰

۶۴

۶- بعض نادر مطبوعات مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) سفرنامۂ ابن بطوطہ - عربی مسودہ سے ترجمہ کیا گیا جو کیمبرج پبلک لائبریری میں موجود ہے اور جس پر تاریخ، جغرافیہ، نباتات، اثریات کے متعلق تشریحی حواشی درج ہیں - مترجمہ ریورنڈ ایس لی بی - ڈی پروفیسر زبان عبرانی کیمبرج یونیورسٹی -

(۲) سفرنامۂ میکریس پادری انطاکیہ جو اس کے رفیق سفر آرچ ڈیکن پال حلبی نے عربی میں لکھا حصہ اول سفرنامہ اناطولیہ، رومیلیا، والدیویا - حصہ دوم سفر ویلیشیا، والدیویا - و ممالک کاسک - مترجمۂ ایس - سی - بیلفور -

(۳) ہن کو تگ سو - ایک چینی افسانۂ غم - اصلی زبان سے ترجمہ کیا گیا - مع حواشی و نمونۂ اصل کتاب مترجمہ جان فرانسس ڈیوس، ایف آر ایس -

(۴) ملفوظات تیموری - یعنی تیمور بادشاہ کے خود نوشت حالات - جو اصل چغتائی ترکی زبان سے ابو طالب حسینی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیے - مترجمۂ میجر چارلس اسٹیوارٹ سابق پروفیسر السنۂ مشرقیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کالج

(۵) سیرت حافظ الملک حافظ رحمت خاں موسوم بہ "گلستان رحمت" نوشتۂ نواب مستجاب خان بہادر ابن حافظ رحمت خاں - مترجمۂ چارلس الیمیٹ -

(۶) جبر و مقابلۂ محمد بن موسیٰ - مرتبۂ و مترجمۂ فریڈرک روزن -

(۷) تذکرۃ الواقعات - یعنی حالات شہنشاہ ہمایوں - نوشتۂ جوہر آفتابچی خادم شاہی - مترجمۂ چارلس اسٹیوارٹ موصوف الصدر -

(۸) جغرافیۂ ادریسی - مترجمۂ ریورنڈ جی - سی - رینوارڈ - یہ کتاب عربی میں ۱۱۵۳ء میں لکھی گئی تھی - جس میں ایک نقرئی کرۂ ارض (جو روجر شاہ صقلیہ کے لیے بنایا گیا تھا) کی جغرافیائی تشریح کی گئی ہے، اور یونانی جغرافیہ دانوں کی مجوزہ ہفت اقلیم بیاں کی گئی ہیں -

(۹) سانکھیا کاریکا - سنسکرت نظم کے ۷۰ بند جن میں سانکھیا فلسفہ ما بعد الطبیعات کے اصول نظم کیے گئے ہیں - مترجمۂ ہنری طامس کول بروک -

(۱۰) لی کی - ایک قدیم چینی تصنیف جو کنفوشس کی طرف منسوب ہے، اور ملک چین کے اخلاقی

و رسوم کی بنیاد ہے اور اب تک اس ملک میں سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے۔
(۱۱) تاریخ ابو الفتح ابن ابو الحسن السامری۔ یہ نادر عربی تصنیف جس کا واحد مکمل نسخہ یورپ میں موجود ہے۔ سامریہ فلسطین کی ابتدائے آفرینش سے وسط صدی چہاردہم تک کی تاریخ ہے
(۱۲) تاریخ بربری۔ مصنفۂ ابن خلدون۔ مترجمۂ ریورنڈ پروفیسرلی۔ یہ نہایت نادر و قیمتی کتاب ہے۔ جس میں ان شاہی خاندانوں کے حالات عروج و زوال درج ہیں جنھوں نے افریقہ کے مشرقی ساحل پر حکومت کی۔

اورنیٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی ترجمات مطبوعہ میں سے ایک کتاب "تذکرۃ الواقعات (۲ مندرجۂ فہرست بالا) اسوقت میرے سامنے ہے۔ اسکا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتا ہوں۔ اسکے متعلق مترجم انگریزی میجر چارلس اسٹیوارٹ نے لکھا ہے کہ اسکا صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے اور وہ انگلستان میں موجود ہے۔ لیکن میری خوش قسمتی سے اس کا دوسرا نسخہ ہندوستان کے ایک قدیم کتب خانہ میں مل گیا۔ میں اُس زمانہ میں علامہ شبلی کے مشورہ سے تذکرۃ الوقعات کے انگریزی ترجمہ کا اُردو میں ترجمہ کر رہا تھا۔ اصل قلمی فارسی نسخہ کو دیکھا۔ اُس سے مقابلہ کیا۔ ضروری نوٹ لیے۔
ٹرانسلیشن فنڈ کے مطبوعہ ترجمۂ تذکرۃ الواقعات میں ٹائٹل پیج سے پہلے ایک اور سرورق لگایا گیا ہے۔ جس پر فنڈ کا نام، سنہ تاسیس، نام سرپرست درج ہے۔ اور لکھا ہے کہ "یہ کاپی مارکوس کو لمنڈی ممبر اورنیٹل ٹرانسلیشن فنڈ کے لیے طبع کی گئی"۔ اس سرورق پر نہایت خوبصورت مشرقی وضع کی چوڑی بیل چھاپی گئی ہے۔ سرورق کے بعد شہنشاہ ہمایوں کی تصویر ہے جو معمولی مطبوعہ تصویروں سے کسی قدر غیر ہے۔ اگرچہ مشابہت وہی ہے۔ پورے قد کی تصویر ہے۔ تصویر کے مقابل دوسرا صفحہ ٹائیٹل پیج ہے۔ جس پر نام کتاب و مصنف کے علاوہ سنہ طباعت ۱۸۳۲ء درج ہے۔ اسکے بعد پہلے صفحہ پر انتساب ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

بجناب
رائٹ آنریبل ارل آف منٹو

مائی لارڈ
میں نہایت فخر و اعزاز کے ساتھ ہمایوں شہنشاہ ہندوستان کے حالات جسکے انقلابات سلطنت ہمارے شاہی اسٹوارٹ خاندان اور سابق بوربن خاندان

کے انقلابات سے مشابہت تام رکھتے ہیں، جناب والا کے نام پر معنون کرتا ہوں۔
مجھے نہایت مسرت ہے کہ ان اوراق کا ایسی مقتدر ہستی سے انتساب کرنے کا موقع حاصل ہوا ہے جو السنۂ مشرقیہ سے واقف ہونے کی وجہ سے ان دشواریوں کا صحیح اندازہ کرسکتی ہے جو ایران وہندوستان کے خیالات و محاورات کو یورپین زبانوں کا جامہ پہنانے میں پیش آتی ہیں۔

میں خلوص قلب کے ساتھ دست بدعا ہوں کہ جناب والا اس قابل قدر محکمۂ تراجم (جسکے حضور والا بانی ہیں) کی سرپرستی ہمیشہ فرماتے ہیں۔

رائل کرسینٹ باتھ جناب والا کا نہایت مطیع وادنی خادم
یکم مارچ ۱۸۳۲ء چارلس اسٹوارٹ

ڈیڈیکیشن کے بعد مترجم کا دیباچہ درج ہے۔ جسکا ترجمہ یہ ہے۔

دیباچہ مترجم انگریزی

میں جس زمانہ میں شہنشاہ تیمور کے حالات کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھا میرے دوست میجر ولیم پرائس نے مجھے ایک فارسی قلمی کتاب بھیجی جس میں شہنشاہ ہمایوں کے حالات درج تھے۔ ہمایوں مشہور بادشاہ بابر کا بیٹا اور اس سے زیادہ مشہور شہنشاہ اکبر کا باپ تھا۔ میرے دوست نے اس کتاب کے ترجمہ کی فرمایش کی۔ چنانچہ اپنے دوست کی فرمایش اور اورنٹیل ٹرنسلیشن فنڈ کمیٹی کی درخواست پر میں نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔

چونکہ اس کتاب کا مصنف کوئی عالم آدمی نہیں ہے اس لیے یہ عالمانہ رنگ کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے میں نے اصل فارسی کتاب کا نمونہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مصنف نے اپنے زمانہ کے دستور کے موافق کتاب کو جابجا آیات قرآنی، اشعار فارسی اور تمثیلات تاریخی سے آراستہ کیا ہے۔ لیکن میں نے ترجمہ میں ان طویل اضافات کے اتباع کی تکلیف گوارا کرنا غیرضروری سمجھا۔

یہ کتاب اس قدر خلوص وصداقت اور فطری سادگی و بے تکلفی سے لکھی گئی ہے کہ بعض ایسے واقعات بھی درج کردیے ہیں جس سے بادشاہ کی کسرشان ہوتی ہے۔ اسلیے مجھے اس کتاب کے مستند وصحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کتاب کا قلمی نسخہ لکھنؤ دارالسلطنت اودھ میں خریدا گیا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی یہی ایک کاپی دنیا میں ہے، جو اسوقت انگلستان میں ... موجود ہے۔ بڑی تقطیع کی کتاب ہے۔ خط معمولی ہے۔ اور تقریباً ایک صدی قبل کی لکھی ہوئی ہے۔

اس موقع پر میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی یورپین شاعر کا کوئی خیال اور کسی مورخ کا کوئی مضمون ایسا نہیں ملا جسکا متقابل و مترادف مشرقی مصنفوں کے ہاں نہ ملا ہو - میں اُن ناظرین سے جو اس کتاب یا میرے دوسرے تراجم پر جرح و قدح کرنا چاہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اول اُن تراجم کا اُسی زمانی انگریزی تصنیفات سے مقابلہ کرلیں - زمانہ حال کی مصنفات سے مقابلہ نہ کریں"۔

اسکے بعد مترجم نے مختصر مقدمہ لکھا ہے - جسکا ترجمہ پیش کرتا ہوں ؛-

مقدمہ مترجم انگریزی

" ہمایوں شہنشاہ ہندوستان کا سلسلۂ نسب تیمور تک یہ ہے - ہمایوں بن بابر بن عمر شیخ بن ابو سعید بن محمد مرزا بن میران حسین بن تیمور -

ہمایوں کی اولاد اور جانشین یہ تھے - اکبر - جہانگیر - شاہجہان - عالمگیر اورنگ زیب - بہادر شاہ فرخ سیر - محمد - احمد - عالمگیر ثانی - شاہ عالم - اکبر ثانی -

ہمایوں کابل میں ۹۱۳ھ ۱۵۰۸ء میں پیدا ہوا - اسی سال اسکے باپ بابر نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا - ہمایوں کا دوسرا بھائی کامران تھا تیسرا ہندال چوتھا عسکری - ان سب کے ساتھ میرزا کا لقب ہے -

جس وقت بابر نے ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء میں ہندوستان پر حملہ کیا ، تو اپنی فوج کے میمنہ کا افسر ہمایوں کو بنایا - افغانوں کے مقابلہ میں بھی پہلا جنرل ہمایوں ہی بنایا گیا تھا - جنگ پانی پت کے بعد ہمایوں شہر آگرہ اور خزائن سلطان ابراہیم پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا گیا - جو فوج ممالک مشرقی دریائے گنگ کے امرا کی متحدہ فوج کے مقابلہ کے لیے بھیجی گئی اُس کا سپہ سالار بھی ہمایوں ہی تھا - ان تمام معرکوں میں ہمایوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی ، اور باپ نے صلہ میں ایک کرور ستر لاکھ دام[۱] اور آگرہ میں ایک محل مع ساز و سامان عنایت کیا - اس کے بعد ہمایوں نے شہر جون پور فتح کیا - اور وہاں سے واپس ہوکر قبل اسکے کہ بیانہ کے قریب ہندو راجاؤں کے ساتھ جنگ شروع ہو ، شاہی فوج سے آکر مل گیا - اور اس میدان میں بھی بڑی شہرت و کامیابی حاصل کی -

ان واقعات کا بیان کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس کتاب (تذکرۃ الواقعات) میں ہمایوں کو تخت نشینی کے بعد کے حالات درج ہیں - اور اُس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بحیثیت بادشاہ کے

---

[۱] چالیس دام کا ایک روپیہ -

نہایت سست و جاہ طلبیت کا انسان واقع ہوا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر وہ بحیثیت انسان کے بدتر ہوتا، تو بہتر بادشاہ ثابت ہوتا۔

چونکہ مصنف تذکرۃ الواقعات (جوہر آفتابچی) نے کتاب میں واقعات کے سنہ درج نہیں کیے ہیں اس لیے میں نے مختلف کتابوں سے تلاش کرکے اس کمی کو پورا کیا ہے

ہندوستان میں خاندان تیموریہ "مغل" کہلاتا ہے۔ لیکن یہ خاندان خود اپنے آپ کو مغل نہیں کہتا۔ یہ لوگ غالباً چغتائی ترک تھے جو مغلوں یا تاتاریوں سے زیادہ معزز قبیلہ ہے۔ لیکن ترکانِ قسطنطنیہ سے تمائز کرنے کے خیال سے اس کتاب میں اور "حالات تیمور" میں خاندان تیمور کے لیے مغل کا لقب قائم رکھا گیا ہے۔"

اسکے بعد کتاب کا ترجمہ شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلے مصنف کا یہ مختصر دیباچہ ہے:-

دیباچہ مصنف

"بعد حمد و نعت وجہ انتساب کتاب بنام شہنشاہ ہمایوں خادم شاہی جوہر عرض کرتا ہے کہ مجھے خوش قسمتی سے آغاز شباب ہی میں خدمت شاہی کا فخر حاصل ہوا۔ بادشاہ کی وفات تک خدمت کی سعادت نصیب رہی۔ اور ہر وقت و ہر حالت میں بادشاہ کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا۔ اسلیے مجھے خیال آیا کہ اُن تمام واقعات کو ضبط تحریر میں لے آؤں جن کا میں عینی شاہد ہوں۔ تاکہ ان دلچسپ کوائف کی یادباقی رہ جائے۔ میں نے اپنی لیاقت کے موافق انکو لکھنے کی کوشش کی ہے اگرچہ میری تحریر ان حالات کی عظمت و شان سے فروتر ہے۔ میں نے یہ کتاب ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں شروع کی اور تذکرۃ الواقعات نام رکھا۔

میرا یہ مدعا نہیں کہ میں ہمایوں کے تمام حالات لکھوں بلکہ صرف وہی واقعات لکھوں گا جنکا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہے۔ اس لیے بادشاہ کی تخت نشینی کے زمانہ سے شروع کروں گا اور بادشاہ کی ایران سے مراجعت اور دوبارہ حصول سلطنت ہند پر ختم کردوں گا۔ میں اس تحریر میں دکھاؤں گا کہ بادشاہ نے کس ہمت و استقلال سے گوناگوں شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا۔ اور خدائے عزوجل کے

۱؎ اگرچہ اس جگہ مصنف اپنے عہدہ کا نام نہیں لکھتا، لیکن آگے چل کر اس نے بتایا ہے کہ وہ شاہی آفتابچی تھا۔ یہ آفتابہ برداری کا عہدہ قدیم زمانہ میں تمام یورپ میں رائج و متعارف تھا۔ اور اب بھی ہمارے بادشاہ کے محکمہ خانگی میں قائم ہے۔ (مترجم انگریزی)

فضل وکرم سے دوبارہ سلطنت حاصل کی۔ امید ہے کہ یہ کتاب خاکسار مصنف کا نام زندہ اور ان عجیب واقعات کی یاد کو تازہ رکھے گی۔"

میجر اسٹیوارٹ مترجم انگریزی نے کاتب نسخۂ فارسی کا نام نذیر بن طالب حسینی اور تاریخ کتابت ۱۹ جمادی الاول ۸ سنہ جلوس لکھی ہے۔ اس سنہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا جبکہ میجر نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ ایک صدی پرانا ہے۔ یہ نسخہ مصنف کتاب جوہر کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہو سکتا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں کسی نے نقل کیا ہوگا اور وہ زمانہ اورنگ زیب کے بعد کا ہونا چاہیے میں نے جو فارسی نسخہ دیکھا ہے اُس میں کاتب کا نام نہیں ہے۔ لیکن آخر میں لکھا ہے:

" در سلخ شہر رجب المرجب ۱۱۸۲ھ از مقابلۂ ایں کتاب کہ آن ہم غلط بود فراغ حاصل شد"

یہ نسخہ میجر کے نسخہ سے بہت بعد کا اور اب سے صرف ستر سال قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کے دیباچہ میں جوہر نے سنہ تصنیف وہی بتایا ہے جو میجر نے لکھا ہے۔ جوہر کا فقرہ یہ ہے:

" شروع ایں قصہ در ابتدائے سنہ خمس وتسعین وتسعمائۃ افتاد"

جوہر نے ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء (سال تخت نشینی ہمایوں) سے ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء (سال وفات ہمایوں) تک کے واقعات لکھے ہیں، اور تذکرہ کے آخری واقعہ سے ۳۲ برس بعد ۹۹۵ھ تصنیف شروع کی ہے۔

میجر نے ترجمہ کتاب کے دو حصے کر دیے ہیں۔ ہمایوں کے ایران پہونچنے پر ایک حصہ ختم کر دیا ہے اور قیام ایران و مابعد کے حالات دوسرے حصہ میں رکھے ہیں۔ حصہ اول کے آخر میں تاریخ عالم آرائے عباسی کے اس حصہ کا ترجمہ شامل کر دیا ہے جس میں شاہ طہماسپ (جسکے عہد میں ہمایوں ایران پہونچا تھا) کے حالات درج ہیں۔

تذکرۃ الواقعات کی فارسی زبان نہایت معمولی لیکن صاف اور مطلب خیز ہے۔ ملکہ گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کی عبارت اسکے مقابلہ میں کہیں کہیں پیچیدہ و کاواک ہو جاتی ہے تاہم تذکرۃ الواقعات اغلاط سے پاک نہیں۔ ایک جگہ عنوان فصل یوں درج ہے:

" فصل پانزدہم در مذمت کردن ہمایوں بادشاہ را ملازمان میرزا کامران نزد شاہ عالم پناہ "

یہ عبارت اس طرح ہونا چاہیے تھی " در مذمت کردن ملازمانِ میرزا کامراں ہمایوں بادشاہ را" لیکن چونکہ کتاب غلط در غلط نقل ہوتی چلی آئی ہے، اس لیے اس طرح کی اغلاط کا ذمہ دار ناقل کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب میں جو آیاتِ قرآنی اور اشعار فارسی درج کیے ہیں وہ سب کے سب مترجم انگریزی نے چھوڑ دیے ہیں، اُن میں سے عام تمثیلی اشعار کے ترک کا تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن بعض موقعوں پر جوہر نے ہمایوں کے اشعار بھی درج کیے ہیں، ان کا لکھنا یا کم سے کم انکا ترجمہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس کمی کو اپنے دریافت کردہ نسخہ سے پورا کر دیا ہے۔

مثلاً جب ہمایوں بادشاہ سیستان علاقۂ ایران میں پہونچا تو خدام شاہی نے عرض کیا کہ چونکہ ہم اس ملک میں حکمراں کی بغیر اجازت آئے ہیں، ممکن ہے شاہِ ایران کو یہ امر ناگوار ہو، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے اجازت منگا لی جائے۔ چنانچہ ہمایوں نے شاہ طہماسپ کو خط لکھا اور اُس میں یہ قطعہ بھی لکھ کر شامل کیا

خسروا عمریست تا عنقائے عالی ہمتم | قُلّۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است
روزگار سفلۂ گندم نمائے جو فروش | طوطیِ طبعِ مرا قانع بہ ارزن کردہ است
دشمنم شیر است و عمرے پشت بامن کردہ بود | ایں دم از روئے عداوت رو بامن کردہ است
التماسِ ایں زشہ دارم کہ بامن آں کند | آنچہ با سلماں علیؑ در دشت ارزن کردہ است

جب ہمایوں شاہِ ایران کا مہمان ہو گیا تو میرزا کامراں برادر ہمایوں نے شاہ ایران کے پاس اپنے آدمی بھیجے اور یہ کہہ کر کہ ہمایوں آپ کے مذہب (تشیع) کا مخالف ہے، شاہ ایران کے دل کو ہمایوں کی طرف سے مکدر کرنا چاہا۔ بادشاہ کی بہن ہمایوں کی طرفدار تھی، اُس نے ہمایوں کی طرف سے شاہ کا دل صاف کرنے کی غرض سے ایک موقع پر ہمایوں کی یہ رباعی سنائی

مائیم ز جاں بندۂ اولادِ علی | ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علی
چوں سرِّ ولایت ز علی ظاہر شد | کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علی

میجر اسٹیوارٹ نے ہمایوں کی وفات کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ واقعہ دہلی میں ۱۱- ماہ ربیع الاول ۹۶۳ھ مطابق ۲۱ر جنوری ۱۵۵۶ء کو پیش آیا" اور فٹ نوٹ میں تاریخ ہندوستان مصنفہ ڈوے سے مفصل واقعہ لکھا ہے۔ جوہر نے تاریخ نہیں بتائی بلکہ کاہی کا قطعہ تاریخ لکھ دیا ہے جس سے ۹۶۲ھ نکلتا ہے۔ اور یہی صحیح ہونا چاہیے۔

لکھتا ہے "تاریخ وفاتِ ہمایوں بادشاہ کاہی گفتہ :-

ہمایوں بادشاہ آں آفتابے | کہ فیضِ شاملِ او عام افتاد
بنائے دولتش چوں یافت رفعت | اساسِ عمرش از انجام افتاد

چو خورشید جہانتاب بلندی — بپایاں در نماز شام افتاد
جہاں تاریک شد در چشم مردم — خلل در کار خاص و عام افتاد
پے تاریخ او کاہی رقم زد
ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

۹۶۲ھ

انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں تذکرۃ الواقعات کی تاریخی خصوصیتیں اور دلچسپیاں اور ایک دو باب کا ترجمہ پیش کروں گا -

زاہدہ

(اپنی ہفت سالہ بھتیجی کی نذر)

زاہدہ! تو سراسر اک پیکر اخلاص ہے — گود میں آ بیٹھنا تیری ادا سے خاص ہے
تو ہنساتی ہے مجھے مغموم و تنہا دیکھ کر — بھول جاتا ہوں غم دل تجھ کو ہنستا دیکھ کر
وہ ترا رہ رہ کے مجھ سے پوچھنا ہر بات کا — اور بتانے میں وہ اسرار دلی جذبات کا
چپکے چپکے مجھ سے کچھ کہکر وہ زیر لب ہنسی — سچ بتا، سیکھی ہے کس سے یہ ادائے دلبری؟
کس چمن کا روپ ہے کس دیس کا یہ آب رنگ؟ — دیکھ کر صورت کو تیری عقل انسانی ہے دنگ!
سادگی ہے تیری نظروں میں مروت دل میں ہے — اس دل مایوس کی تسکیں اسی منزل میں ہے

اشک غم سے دور، درد ہجر کے نالوں سے دور — اپنے پیاروں، اپنے سارے چاہنے والوں سے دور
دور سب احباب سے اس شہر غم آباد میں — ایک گوشہ میں پڑا ہوں، محو تیری یاد میں
تو کلی ہے گر تو میں اک بلبل مہجور ہوں — جس چمن میں کھل رہی ہے تو میں اس سے دور ہوں
دور رہ کر مجھ سے کتنا مجھکو تڑپاتی ہے تو — تجھکو مدت سے نہیں دیکھا ہے یاد آتی ہے تو
خوب ہیں یہ بھی ادائیں دل لبھانے کے لیے — مضطرب ہوں تجھکو سینے سے لگانے کے لیے
نو شگفتہ پھول! آ، آنکھوں میں میری کھب کے بیٹھ — پردۂ دل میں نہاں ہو، درد دل میں چھپ کے بیٹھ

ہاں، مری تخئیل تیری یاد سے معمور ہے
میرے دل سے تو بہت نزدیک ہے، گو دور ہے!

جلیل قدوائی بی اے
(علیگ)

تنظیم الحیوٰۃ

ترجمۂ اکانومی آف ہیومن لائف

اس نام سے ایک مثنوی میری نظر سے گزری، جو جناب صفیؔ لکھنوی رکن رکین شیعہ کانفرنس کی نتیجۂ فکر ہے - اس مثنوی کے اکثر مقامات پڑھے - مضامین کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ وہ حرف بحرف ترجمہ ہیں - جیسا کہ مترجم صاحب خود فرماتے ہیں :-

اس ترجمہ کو بطرز نیکو — شائع کرنے لکھا بطرز اردو
بتا رہا تھا صاحب سلیقہ — ترتیب دیا نیا حدیقہ

اسکے بعد فرماتے ہیں

میں نے وہ گلِ فرنگ چن کے — بہرِ احباب ہار گوندھے

پھر یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں

یہ نظم نہیں ہے شاعرانہ — دلکش ہو جس کا ہر ترانہ
تھا اصل کتاب کا جو مطلب — چھوٹا نہیں نظم ہو گیا سب

مثنوی میں پہلے مخاطبہ و مناجات ہے، اسکے بعد حمد و منقبت اُسی فرسودہ رنگ پر جیسے قدما کا دستور تھا - مگر ایک پختہ کار شاعر سے جس قدر توقع ہو سکتی تھی وہ ان مضامین کے بیشتر اشعار میں ہے - اسکے بعد اتحادِ مذہب و اخلاق اور موجودہ زمانہ کی حالت کا اظہار ہے، جس میں اس ترجمہ کا سبب اور ارکینِ اکاڈمی کی مدح سرائی ہے جو صفیؔ صاحب کا خاص رنگ ہے - اسکے بعد یہ کتاب صفحہ ۴۹ پر ختم ہوئی ہے - اور اس میں فقط ترجمہ ہے - کہیں کہیں مصنف صاحب نے بھی ضرورتِ شعری کی وجہ سے کچھ اضافہ فرمادیا ہے - اس مثنوی کے جا بجا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ ایک قابل شاعر سے جس قدر توقعات تھے اُسکے خلاف بعض سی باتیں مجھکو نظر آئیں - چونکہ میں جناب صفیؔ کی شاعری کا پایہ بلند سمجھتا ہوں، اس لیے اکثر وہ مقامات جو اس نظم میں کھٹکتے ہیں بطور استفسار دریافت کرتا ہوں -

جناب صفیؔ فرماتے ہیں

له نثر میں جو ترجمہ ہوا ہے اُس کا نام حدیقۃ الاخلاق ہے -

گو نظم میں کی ہے ترجمانی   کچھ نثر سے کم نہیں روانی

(۱) اشعار ذیل کی سلاست و روانی کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے

اک جذبہ بہیمیت سے ملحق   اک جذبہ فرشتگی سے ملصق
اقرار کو زعم کبریائی   انکار کو دعوے خدائی
یونہیں تن تیرہ بخت میں روح   رہتی ہے ہمیشہ غیر مقبوح
آساں اسکی تلاش اسکو   اور اس میں اک انتعاش اسکو
ضائع جو کرے نقود موجود   کرتا ہے وہ راہ خیر مسدود
ہے وجہ مسرت اسکو تدقیق   یہ تشنۂ علم ہے بہ تحقیق
ہے جسکے مزاج میں تلوّن   گہ اسکو خوشی گہے تحزّن
ڈال اس پہ کاوش پژوہ میں   بیٹھا نہ کھینچ کر دوہ دو نمیں
خوف و شرم و حجاب یہ سب   گویا کہ میں اسکی شہ کے ادب
پیمانہ انتقاد اعمال   اندازۂ حسن و قبح اعمال

اسی طرح سے بہت سے اشعار ہیں۔ ممکن ہے سلاست و روانی کی تعریف اُن اشعار پر صادق آتی ہو۔

(۲) افریقہ و ایشیا و یورپ   ہر خطہ سیاہ و کفر سے گھپ

گھپ۔ نہایت تاریکی کی تعریف میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ مگر اہل زبان تنہا اس لفظ کا استعمال نہیں کرتے۔ ہمیشہ اندھیرا گھُپ کہتے ہیں۔

(۳) صفحہ ۴۲ پر نہایت جلی عنوان سے "چھٹواں باب" لکھا ہوا ہے۔ واں۔ ہندی کلمہ نسبت ہے۔ پانچواں، ساتواں، آٹھواں، نواں وغیرہ یہ سب تو درست ہیں مگر یہ "چھٹواں" کہاں کی زبان ہے؟ اور اگر انھیں الفاظ پر قیاس کیا جائے تو لغت میں قیاس درست نہیں۔ کیا چوتھے کو چوتھواں اور تیسرے کو تینواں کہہ سکتے ہیں۔

(۴) مکھی کو شہد گدھ کو مردار   جس طرح سے ہے پسند لے یار

ہندی میں گِدھ۔ ھ۔ کے ساتھ بولتے ہوں مگر اُردو میں تو صرف گِد کہتے ہیں۔ جلال لکھنوی نے اپنے لغت میں اسی طرح لکھا ہے۔ "جس طرح سے" میں "سے" حشو ہے اور "لے یار" بھی آپ کی زبان نہ ہونا چاہیے۔

(۵) مچھلی کھاتی کبھی نہ آٹا   گر جانتی چارے میں ہے کانٹا

اہل زباں کا اتفاق ہے کہ آشنا نون کے ساتھ نہیں۔ لغاتِ اُردو میں بھی دیکھا گیا۔ ممکن ہے جناب مصنف لسان القوم کے نزدیک صحیح ہو۔ مگر چونکہ زبان پر جمہور کا اتفاق ضروری ہے، اسلیے محتاج سند ہے۔

(۶) کیوں اپنے عدو پہ خندہ زن ہو — خود اپنے ہی حق میں زہر کیوں ہو

لکھنؤ کے حضرات تو ایسے موقع پر کانٹے بونا بولتے ہیں۔

(۷) ثابت قدم اس طرح کا انسان — بحر قلزم میں جیسے چٹان

چٹان مشدد نہیں۔ جناب لسان القوم اُردو لغات کی طرف توجہ کریں۔

(۸) اُگتی نہیں جب چری چریں کیا — رہتا ہے مواشیوں کو فاقہ

چری لکھنؤ کی زبان میں چرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ جیسے آتش نے کہا

سبزہ مری تربت کا ہرا خوب ہوا ہے — ایسے میں ہرن آئیں تو موقع ہے چری کا

گنوارا البتہ جوار یا جرے یا مکئی کے ہرے درخت کو کہتے ہیں۔ جناب لسان القوم دہقانیوں کی زبان کبھی نہ نظم فرمائیں گے۔ بلکہ اس میں کوئی خاص رمز ہوگا۔

(۹) وہ خواہشِ انتقام سے دُور — نقصان رساں ہو تیرا شکور

کیا شکور اس معنی میں صحیح ہے؟

(۱۰) اس میں نہیں دوسرے کا کچھ بس — ناکس اُنھیں خواہ تو بنا کس

کیا "کس" بنانا اُردو کا کوئی محاورہ ہے؟ علاوہ اسکے ایک خواہ کی اس مصرعہ میں ضرورت ہے یا نہیں؟

(۱۱) ہوگا وہ اسی قدر کا شایق — جس طرح وہ تنا کے خود ہے لائق

کیا شایق فاعل کے معنی میں آیا ہے۔ صاحب صراح و قاموس لکھتے ہیں الشائق ھو المشوق یعنے یہ فاعل مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ عوام میں بمعنی مشتاق مشہور ہے۔ ثقات شعرا کا عوام کی پیروی کرنا کیا ہے۔ اسکے علاوہ "ہوگا وہ اسی قدر کا شایق" یہ مصرعہ بھی مجھے آپ کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

(۱۲) بدیاں تیری عیوب تیرے — مرجائیں تمام تجھ سے پہلے

بدیاں مرنا عیوب مرنا کیا زبانِ اُردو میں مستعمل ہے۔

(۱۳) صنعتِ تالیف و ایطا بھی اکثر اشعار میں ہے۔ مثلاً

اُس دوست کو جسمیں راستی ہو — فوق اُسپہ ہے جو خوشامدی ہو

پیشانے جلی ہے۔ مگر اسکی نسبت استفسار مطلوب نہیں۔ اسلیے کہ اس خامی اور عاجزی کا خود مترجم صاحب نے اظہار فرما دیا ہے:۔

لفظاً ہو چکا ہے ضعفِ تالیف　　معناً نہیں اک ذرا بھی تحریف
کچھ لفظ برائے بیت بھی ہیں　　کیا کیجیے بر محل وہی ہیں

کیا برائے بیت الفاظ بھی برمحل ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت جناب صفی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام اساتذہ کے واسطے ہے۔ عیب ہر حالت میں عیب ہے۔ یہ لازم نہیں کہ بغیر غلطی کے کوئی اشعار کہہ ہی نہ سکے۔ خیر ایسے تمام اشعار سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

(۱۴) ہیم بشریت آب و گل میں　　مانند ملک رجائیں دل میں

" رجائیں" کیا۔ یہ جمع اردو میں صحیح ہے؟ اسی طرح ہمیں بھی کہیے۔

(۱۵) ہر نوش کے ساتھ ہے بیانِ نیش　　قہر درویش و جانِ درویش

ارسال المثل میں ادنیٰ تصرف بھی جائز نہیں۔ مثل تو یوں ہے "قہر درویش بجانِ درویش"۔ خیر جب وقتِ نظم مسلّم ہے تو یہ اعتراض بھی بیکار ہے۔

(۱۶) بہت سے متروکات استعمال کیے ہیں جو اتفاقِ جمہور کے خلاف ہیں۔ "اے کاشکہ دس ہزار مجرم" صرف اے کاش مستعمل ہے۔

سچائی سے جب... واقفیت　　تب عدل کی ہوگی قابلیت

تب متروک۔

لیکن پاؤ گے سب سے بڑھکر　　اس کو بے رحم اپنے اوپر

اوپر متروک۔

(۱۷) حشو و زوائد کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

میں طرح سے بال تیرے سر کے　　یا چرخ زمرد میں پہ تارے
ہر شخص کو خلق میں سراسر　　اک روح ملی ہے اور اک چشم
باتیں ایسی جو ہوں ضروری　　پھر کون سکھائے تجھکو پوری
پھر اس نے خود لے بے تماشا　　سامان آرائشِ مکاں کا

(۱۸) تعقید لفظی:—

پا تجربہ کاریوں میں کامل　　جنکو۔ کر پند اُن سے حاصل

تجربہ کاریوں میں جنکو کامل پا اُن سے پند حاصل کر۔

ہے باپ کا نام خوف اسکے　　وحشت ماں اسکی خوب سُن لے

اس کے باپ کا نام خوف ہے۔

جو شخص اپنے سکون دل کو　　دیتا ہے تلاش مال میں کھو

(۱۹) قافیہ :-

کم ہے اعلیٰ صفات میں یوں　　در پردہ ہے ورنہ کمالات میں کیوں

کیا تلفظ کے اعتبار سے دونوں قافیے صحیح ہیں

جس سے پہلے ہے گڑگڑانا　　ہے بعد میں اُس پہ بڑبڑانا

(۲۰) زبان کے پہلوؤں پر نظر کرتے ہوئے اشعار ملاحظہ ہوں :-

دے اُسکے خلاف کیوں گواہی　　لا اُسکے چلن پہ کیوں تباہی

رنجِ خلق و نیتِ تیرا　　عشرت کا کبھی کبھار پھیرا

کیا کبھی کبھار ثقات اور فصحا کی زبان ہے ؟

جس کے اعزاز سے کہ ہر دم　　اُمڈے ترے دل پہ غصہ و غم

یہاں کاف بیانیہ کا کیا محل ہے ؟

دنیا کی لبا کے ستیوں کو　　کرنے لگے..... پرستیوں کو

واجب باتوں میں کر نہ اہمال　　ہو موت کا خوف بھی تو کر ڈال

(۲۱) خوش طعم بُھنا ہوا وہ قیمہ　　کھالے تو ہو حاملہ عقیمہ

بُھنا ہوا قیمہ کھا لینے سے عقیمہ حاملہ بھی ہو سکتی ہے ؟

(۲۲) پیاری دلکش وہ مسکراہٹ　　شرمائے لجائے پاکے آہٹ

شیریں وہ اُن لبوں کے بوسے　　زنبور عسل بھی دل مسوسے

سینے پہ ادبھا ہلکے ہلکے　　دو پھول دھرے ہوئے کنول کے

حسینہ کے صفات حسن بیان فرماتے ہوئے یہ شعر بھی ارشاد ہوئے ہیں۔ کسی عشقیہ مثنوی میں یہ اشعار شاید بے محل نہ ہوتے، مگر ایک اخلاقی کتاب میں جسکی نسبت ارکان اکیڈمی سے یہ خواہش بھی کی گئی ہے کہ

بن کر جزوِ نصابِ تعلیم　　کار آمد خلق ہوں مفاہیم

بیشک سب بچے پڑھیں گے اور لطف اندوز ہونگے - اور مدرسین بھی نہایت بیباکی اور وضاحت سے سمجھائیں گے - کاش عفت و حیا کی تعریف پہ اکتفا کی گئی ہوتی -

(۲۳) اُردو کے حروف تقطیع سے گرنا جائز ہیں، مگر ایک کہنہ مشق شاعر ہمیشہ اپنی نظم کو سلاست کا

کا لباس پہنانے کے لیے اس سے پرہیز کرتا ہے۔ مگر اس مثنوی میں بکثرت یہ خامی پائی جاتی ہے۔ بیشتر اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بتکلف ترجمہ کیا گیا ہے۔ تعقید، ایطا، حشو، ضعف تالیف، استعمال متروکات، یہ سب اس میں کثرت سے موجود ہیں۔

جناب صفی کا کلام اسوقت تک نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر نہیں کسا گیا، دیوان وغیرہ شایع ہو تو حقیقت کا انکشاف ہو۔ اسوقت تک کانفرنس کے پنڈال کی آواز مع صوت کے دل و دماغ میں گونج رہی ہیں۔

یہ مثنوی ایک دوست سے عاریۃً لی تھی۔ چنانچہ اُنکی طلب پر اُنھیں واپس کردی۔ اب پھر مل جائے تو اول سے آخر تک پڑھ کر اپنی ناچیز رائے ہدیۂ ناظرین کروں۔

سید مجتبیٰ حسن موسوی فاضل غازیپوری

غزل حکیم جگر صدیقی بسوانی

روکے ہم گورِ غریباں کا سماں دیکھا کیے
دیدۂ تک یارانِ رفتہ کے مکاں دیکھا کیے

دُور سے اے قاتلِ نامہرباں دیکھا کیے
قتل سب ہوتے رہے ہم ناتواں دیکھا کیے

باغباں تونے جلایا آشیاں جلتا رہا
اور ہم حسرت سے سوئے آشیاں دیکھا کیے

دم نکلنے کا تماشا دیکھنا منظور تھا
دم نکلتا تھا ہمارے مہرباں دیکھا کیے

قیدیِ کنجِ قفس ہیں کیا رہائی کی اُمید
حسرتِ گلشن میں خوابِ آشیاں دیکھا کیے

حشر میں پھر کچھ اشارہ اپنی رحمت سے کیا
پہلے وہ فردِ گناہ عاصیاں دیکھا کیے

لاکھ پردوں میں چھپایا تونے اپنے حسن کو
دیکھنے والے تجھے لے جانِ جاں دیکھا کیے

دل نہیں زخمی ہوا ناوک کلیجے پر پڑا
دیکھنا لازم کدھر تھا ہم کہاں دیکھا کیے

نزع کا عالم رہا ہم کروٹیں لیتے رہے
اور بالیں پر مسیح مہربان دیکھا کیے

رفتہ رفتہ ہو چلا پیدا نشیمن کا خیال
پہلے کچھ دن ہم نگاہِ باغباں دیکھا کیے

شمعِ جاں افروز ہوکر چارہ سازی کیوں نہ کی
آپ گل ہوتے چراغِ بزمِ جاں دیکھا کیے

دل کے ٹکڑے ہم تو رو رو کر جگر چنتے رہے
اور ہنس ہنس کر ہمارے مہرباں دیکھا کیے

سفرنامۂ اندلس

نمبر (۳)

اصل مضمون کو ہاتھ لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر چند ابتدائی باتیں ایسی بیان کر دی جائیں کہ وہ اُس کو سمجھنے میں کچھ مؤید ہوں۔

مالک الملک حقیقی نے اسپین کو کچھ ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں کہ اور ملک اُس سے محروم ہیں۔ الّا ماشاء اللہ۔ قرنہا قرن گزر گئے کہ اس مُلک کے حدود اربعہ وہی ہیں جو شاید ازل سے مقرر ہو چکے ہیں۔ اسکو قدرت کاملہ نے وہ فوائد عطا فرمائے ہیں جنکی شمال اور ملکوں میں کم ملتی ہے۔ ایشیا اور یورپ کے تمام مال تجارت کو اس ملک سے ہوکر جانا ناگزیر ہے۔ چونکہ اسکو تین طرف سے سمندر نے گھیر رکھا ہے اس لیے یہاں کے باشندوں کو صرف ملاح بننا بلکہ سپاہی رہنا پڑتا ہے۔ اراضی سیر حاصل ہیں اور آب و ہوا بمقابلہ یورپ کے گرم۔

سنہ ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار نہیں ملے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں یہاں کی آبادی ایک کروڑ ننانوے لاکھ پچاس ہزار (یا دو کروڑ) تھی۔

پنجاب کے مقابلہ میں کم اور اور ممالکِ ارض کے مقابلہ میں یہاں دریا زیادہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اور ممالک کی تعداد پر بھی اپنے دریاؤں سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اہل اسپین بہت ہی کم کام لیتے ہیں۔ یہی حالت یہاں کے بنادرگی ہے کہ باوجود ضرورت انکو تجارت بحری کے کام کا نہیں بنا سکے ہیں۔

پہاڑ بھی بہت ہیں اور بڑے کام کے۔ اُن سے فینیقیہ والوں اور مسلمانوں نے جو کچھ کام لیا وہ لیا۔ آج کل تو وہ بیکار پڑے ہیں۔ یہی حال سطح زمین کا ہے کہ بقول مولوی حالی مرحوم کے

"خدا کی زمیں بن جُتی سر بسر ہے"

وحشی اقوام کا تو حال معلوم نہیں کہ اُنکی کیا حالت تھی؛ گر مہذب اقوام میں سے سب پہلے حضرت مسیحؑ سے ایک ہزار برس پیشتر فینیقیہ والوں نے اس سرزمین پر قبضہ کیا اور یہاں کی قدرتی دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔ ایک وقت آیا کہ انکو یونانیوں سے لڑنا پڑا۔ گریہ ہو ہی رہا تھا، کہ رومیوں کی بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں "نہ نادر بجا ماندنے نادری" نہ فینیقی رہے نہ یونانی، رومی

اس ملک پر مسلط ہو گئے۔ لیکن حقیقی معنوں میں وہ پوری طور سے اس ملک سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے تھے کہ شمال کی طرف سے وحشی گاتھوں نے آکر انکو نکال باہر کیا۔ گاتھوں کو بہت کچھ لڑنا بھڑنا پڑا۔ اور اس میں اب تک جتنی صنعت و حرفت ملک میں پیدا ہو گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تین سو برس تک گاتھ سپین کے لیے بلائے بے درماں بنے رہے۔ اس طویل عرصے میں ملک نے صرف کچھ اُٹھا رہی لیا۔ گاتھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف اتنا تھا کہ اسپین کی عورتوں سے شادیاں کر لیں جس سے ملک کا کچھ کایا پلٹ ہو گیا

ایک مثل مشہور ہے کہ بارہ برس کے بعد گھورے کے بھی نصیب کھُلتے ہیں، یکا یک غیرت حق کو جوش آیا اور اس سرزمین پر وہ رحمتِ الٰہی نازل ہوئی کہ جس کے نشان نہ صرف اس زمین سے بلکہ تمام یورپ بلکہ تمام دنیا سے نہ مٹنے والے ہیں نہ مٹیں گے۔ یعنی ۷۱۱ء میں مسلمان یہاں پہونچے اور انھوں نے جو کچھ کیا، یہ مجھ سے نہ پوچھیے مبصرین سے دریافت کیجیے۔ نہ معلوم وہ کیا گناہ تھے کہ آخر ۱۴۹۲ء میں اُنھوں نے کوس رحلت بجایا۔ عیسائی قوم کو پھر عنانِ حکومت عطا فرما دی گئی۔ یہ بدبخت آئے تو اذا بطشتم بطشتم جبارین کے پورے مصداق بنے ہوئے۔ انھوں نے اپنی مفتوح قوم کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ آج وہی لوگ کہہ رہے ہیں کہ انچہ اکردیم برخود بیچ نابینا نہ کرد۔ اس کا شمہ اگر معلوم ہو سکتا ہے تو میری کتاب "مولدین" سے۔

جس سلطنت کی بنیاد ظلم وستم پر رکھی گئی ہو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتی ہے! جبار و قہار احکم الحاکمین نے انکو ڈھیل دی، علم الٰہی نے عجیب وغریب اسباب تباہی پیدا کیے۔ ایک منسوخ و مسوخ دین کا غلو ہوا۔ امریکہ دریافت ہوا۔ صنعت و حرفت و تجارت سے غفلت اور محض سپاہیانہ شیخی پیدا ہوئی۔ بادشاہ کے دل میں اپنی عظمت کا غرور پیدا ہوا۔ اسکی کسی کو خبر نہ تھی کہ دیر گیر د سخت گیر د مر ترا۔ اسپین نے ملکہ ایلزبتھ کے زمانے میں ایک بیڑہ انگلستان کے خلاف روانہ کیا، جو ایسا تباہ ہوا کہ اسپین ہی کو لے ڈوبا۔ یہ تاریخ مورخ اسم ملک کیلیے خونیں حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ وہ دن اور آج کا دن کہ سلطنت نہ اُبھر سکی ہے نہ اُبھر سکے گی؛ اب چاہے اس میں پریمو ڈی ریویرا پیدا ہوں فرانس سے اتحاد ہو یا غازی عبدالکریم کو بے دست و پا کرکے بٹھا دیا جائے (انشاءالله تعالٰی) بندگان اسباب و سبب اور حلقہ بگوشان علت و معلول اس ادبار کی کچھ ہی توجیہ کریں؛ لیکن اصلیت سے تو صرف یہ کہ یہ سب کچھ ردعمل اور رجعت ہے۔ بیگناہوں کا خون رنگ لاکر رہتا ہے اور مظلوموں کی آہیں رد صدا کی طرح بطش الٰہی کو ساتھ لاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان بطش ربک لشدید۔

وَکَاَیِّن مِّن قَرْیَۃٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّہَا وَرُسُلِہٖ فَحَاسَبْنٰہَا حِسَابًا شَدِیْدًا وَّعَذَّبْنٰہَا عَذَابًا نُّکْرًا۔ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِہَا وَکَانَ عَاقِبَۃُ اَمْرِہَا خُسْرًا۔ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا

مختلف فاتحین نے ملک پر اپنا اثر چھوڑا۔ سب سے زیادہ مسلمانوں نے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہی کی تباہی نے اس ملک کو تباہ کر دیا۔ اس پر غضب ہوا تعصب و غلوءِ مذہبی کہ آدھی سے زیادہ خلقت اندھی ہو کر خانقاہوں میں پہونچ گئی۔ امریکہ دریافت ہوئی اور وہاں آبادی کا بڑا حصہ بھیجنا پڑا۔ اس سے انکار نہیں کہ وہاں سے دولت آئی۔ مگر اُس نے تعیش کو ترقی دی اور غفلت کو بڑھایا۔ اسکا نتیجہ افلاس ہوا، اور افلاس کا نتیجہ رشوت ستانی اور ملک کے فوائد سے چشم پوشی۔

سطور ذیل میں جو کچھ عرض کیا جائیگا وہ ۱۹۲۴ء کی سہ ماہی اول تک کی حالت کا صحیح نقشہ ہے اُسکے بعد سے اب تک کہ تقریباً چار برس گزر چکے ہیں" دامانِ خیالِ یار" کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ تاہم انشاء اللہ اس زمانے کے متعلق بھی جو کچھ آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ صحیح ہی ہوگا۔ اب میں سب سے پہلے ملک و قوم کی سب سے بڑی اور ضروری ضرورت تعلیم سے شروع کرتا ہوں۔

تعلیم

کسی ملک میں ان پڑھوں کی تعداد کی زیادتی کے یہ معنی ہیں کہ اُس ملک کی سوسائٹی، من حیث المجموع، ایک گناہ کبیرہ کی مرتکب ہو رہی ہے، اور اُسکی اُسے سزا ملنی چاہیے۔ اگر اسکو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کو اور حیوانات سے میز کرنے کے لیے اگر کوئی چیز ہے تو وہ نطق ہے، تو پھر یہ فتوے دینے میں کوئی بھی تامل نہ کرنا چاہیے کہ ملک کو جاہل رکھنا نافرمانیِ الہی ہے۔ کیونکہ ہم اُس میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہونے دیتے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پہچانے۔ پھر مخلوق الہی میں ذریعہ تبادلۂ خیالات، اتحاد نہ ہونے دینے سے سلطنت کا گناہ ہے اور اس سب کا بارِ جوابدہی سلطنت کے ذمہ آتا ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے، جلد یا دیر میں۔

اسپین میں ابتدائی تعلیم کی کمی کے متعلق جنوری ۱۹۲۱ء میں میڈرڈ کے ایک اخبار نے نہایت ماقل و دل طریقے سے لکھا تھا کہ

"سرکاری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مملکت اسپین میں اسوقت دس ہزار ایک سو اٹھارہ ابتدائی مدارس کی کمی ہے۔ ان میں سے ۱۰۷۵ برسلونہ میں، ۴۳۰ میڈرڈ میں اور ۱۰۶۱ مرسیہ میں کھلنے چاہییں۔ اور جلیقیہ میں تو ۲۲۸۰ مدارس کی کمی ہے۔"

یہ وہ کمی ہے جو گورنمنٹ کے ایکٹ متعلقہ تعلیم عامہ کے موافق ایک یا دو سال کے اندر اندر کھلنے

ضروری تھے، مگر سنہ ۱۹۲۴ء تک کبھی نہ اس پر کسی نے توجہ کی - مدارس کی یہ کمی ایسی نہیں ہے جو نظر انداز کی جا سکے، اسی سے تو ملک کی تعلیم کا اندازہ لگ سکتا ہے - بلا شبہ اسکے ذمہ دار سلطنت کے ارباب حل وعقد ہیں کہ اعداد وشمار کے چابک سے بھی انکی آنکھیں نہیں کھلتیں - اپنے فرائض سے غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ ان پڑھوں کی تعداد گھٹنا تو ایک طرف رہا، بڑھتی چلی جاتی ہے - چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء میں صوبہ وار تعداد ان پڑھوں کی حسب ذیل تھی :-

صوبہ	فی صد آبادی
سان طان ڈیر	۲۶،۱
بلباؤ	۲۷،۳
میڈرڈ	۲۸،۲
ولاڈولڈ	۳۲،۹
برشلونہ	۳۴،۹
سارا گوسا	۴۲،۸
سیویل	۴۸،۲
بلنسیہ	۵۲،۴
مرسیہ	۷۲،۰
لورکا	۸۲،۵

سنہ ۱۹۲۱ء میں جب اس کا اخباروں میں بہت شور مچا تو اسکا سوا اسکے کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ بجٹ سے یہ جدول ہی اڑا دی گئی اور اب جو کوئی اس مضمون پر اطلاع حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو سخت سرگردانی کرنا پڑتی ہے -

ابتدائی تعلیم کے متعلق ذیل کے اعداد بہت دلچسپ ہیں -

مقام	خرچ تعلیم فی باشندہ	ان پڑھوں کی اوسط
جزائر کناری	۶ آنہ	۵۴
سیوڈیڈ شہرا	۶،۸ آنہ	۲۵
قادیز	۱۳ آنہ	۴۲
جیان	۱۴،۵ آنہ	۲۰

مرسیہ	۱۵ر	۵
برشلونہ (شہر)	۱۹ء۶	۸
برگوس	۴۶ء۳	۳
الاوا	۴۹ء۲	۵
لیون	۵۷ء۴	۷
سوریا	۶۰ء۷	۱۰

اگرچہ دارالسلطنت (میڈرڈ) میں ان پڑھوں کی تعداد ۲۵ فی صدی ہونا خود شرم کی بات ہے، مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کمی گورنمنٹ کی سعی و کوشش کی وجہ سے ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ عوام الناس نے اپنی مدد خود کی۔ یہی حالت اور مقامات، مثلاً جیاں، برشلونہ، برگوس کی ہے، کہ لوگوں نے پرائیوٹ اسکول کھول رکھے ہیں اور ان کا خرچ خود برداشت کرتے ہیں۔

یہ تو ابتدائی تعلیم کی کیفیت تھی؛ ثانوی تعلیم کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۹۲۳ء میں ثانوی مدارس .... میں طلبہ کی تعداد ۵۲۱۶۹ تھی۔ ان میں سے ۳۱ فی صدی مدارس سرکاری میں پڑھتے تھے۔ اور ۶۹ فی صدی پرائیوٹ اسکولوں میں۔ خود میڈرڈ میں کُل ۱۵ فی صدی طالب علم گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اتنے بڑے دارالسلطنت میں صرف تین گورنمنٹ اسکول ہیں؛ حالانکہ ضابطہ کے موافق کم از کم دس اسکول ہونے چاہییں۔ اگرچہ اسپین اور انگلستان کا مقابلہ کرنا بیکار ہے، کیونکہ اگر ایک ذرہ ہے تو دوسرا آفتاب، لیکن صرف اندازہ لگانے کے لیے میں اتنا عرض کرتا ہوں، کہ انگلستان کی تعداد آبادی اسپین سے دوگنے کے قریب ہے۔ لیکن وہاں گورنمنٹ اسکولوں کی وہ کثرت ہے کہ کم از کم دس لاکھ طلبہ صرف گورنمنٹ اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ پرائیوٹ اسکول، یعنی وہ جو چندہ سے چل رہے ہیں اُن میں تعداد متعلمین بہت زیادہ ہے۔

بقول سینور لورنیزو کے یہ ظاہر ہے کہ صرف امراء کے لڑکے، یا وہ کمبختی کے مارے جو یونیورسٹیوں میں پڑھنا چاہتے ہیں وہ، تو ثانوی تعلیم حاصل کرتے ہیں باقی ابتدائی تعلیم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور اسکی حالت آپ کے سامنے موجود ہی ہے۔

اب اعلیٰ تعلیم کی کیفیت دیکھیے۔ ملک محروسہ اسپین میں بارہ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان سب یونیورسٹیوں کے طالبعلموں کی مجموعی تعداد ۲۲۳۳۳ ہے۔ میڈرڈ کی یونیورسٹی میں سب سے زیادہ تعداد طلبہ ہے، یعنی ۸۳۳۰۔ اور اُویڈو میں سب سے کم، یعنی کُل ۵۸۱۔

اساتذہ کی قابلیت کا بنا ہر کوئی معیار مقررہ نہیں ہے ۔ کچھ خوشامد، کچھ چرب زبانی اور بہت کچھ فرقہ بندی پر دار و مدار ہے ۔ بہت سے لوگ محض اس لیے پروفیسری تک ترقی یاب ہو گئے کہ وہ ایک خاص پولیٹکل خیالات کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اسوقت برسر عروج تھا ۔ یہ ظاہر ہے کہ جیسے ہی انکا زوال ہوا یہ پروفیسر بھی ختم ہو جائیں گے ۔ ۱۹۲۳ء میں وزیر تعلیم نے اساتذہ کے تقرر وغیرہ کے لئے کچھ قواعد جاری کیے اور ایک بورڈ بنایا ہے ۔ مگر جو لوگ کہ اسپین کے نظم و نسق کا تجربہ رکھتے ہیں وہ بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی بالکل بے نتیجہ رہے گا ۔

جن عمارات میں کہ اسکول ہیں اُنکے متعلق ایک اخبار نے بہت صحیح لکھا تھا کہ "یہ عمارت کیا ہیں خاصے اچھے مکروہ قید خانے ہیں، بہت تاریک، سخت گندے، یہیں طرح طرح کی وباؤں اور بیماریوں کے کیڑے پلتے ہیں اور ہماری تازہ نسلیں اُنکا شکار ہوتی ہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سرٹیفکیٹ وغیرہ یہ طالب علم ان مدارس سے محنت کے بعد حاصل کرتے ہیں وہ اُنکے کس کام کے ہیں ۔ کیونکہ ان عمارتوں سے نکل کر اُنکی عمر ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ اسکے علاوہ جو لوگ ان مدارس کو جانتے ہیں وہ اسکے طلبہ کو سخت ذلیل سمجھتے ہیں ۔ مجبوری تو صرف یہ ہے کہ ملک میں صرف یہی مدارس ہیں اور یہی طلبہ کہ انھیں کو ملازم رکھنا پڑتا ہے ....."

۱۹۲۱ء میں ملک محروسہ کے سرکاری اسکولوں کے ۱۹۰ انسپکٹر تھے ۔ اتفاق سے یہ لوگ بہت دیانتدار اور محنتی لوگ تھے ۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے میڈرڈ میں ایک کمیٹی کر کے بہت سی اصلاحات تجویز کیں ۔ عوام الناس سے بھی بہت سے اُنکے ساتھ شامل ہو گئے اور مختلف مقامات پر اس موضوع پر انھوں نے لکچر بھی دیئے ۔ لیکن شروع ۱۹۲۵ء تک تو یہ سب کچھ بے نتیجہ ہی رہا ۔

دوران بحث و تحقیق میں ان انسپکٹروں نے یہ امر ثابت کر دیا کہ ۱۹۲۱ء میں اسپین نے بمقابلہ ۱۸۵۰ء کے کوئی ترقی نہیں کی، بلکہ رجعت کی ہے ۔

۱۹۲۱ء کے آخر میں کل ۱۰۸ گورنمنٹ اسکول درج فہرست تھے ۔ اسی فہرست میں ہر ایک اسکول کے اساتذہ کے نام بھی تھے ۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے شاید ایک ہی دو کو عالم وجود میں آنے کا فخر حاصل ہوا ہو ۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ اُنکے لیے مکان ہی کوئی نہ تھا ۔ (صحیح یا غلط) اندازہ یہ ہے کہ اکیلے میڈرڈ میں بیس ہزار طالب علم ایسے ہیں کہ وہ اس وجہ سے اسکول نہیں جا سکتے کہ اُنکے بٹھانے اور پڑھانے کی جگہ نہیں ہے ۔

اب صنعتی تعلیم کو لیجیے۔ میڈرڈ کا ٹیکنیکل اسکول بہت اچھا ہے، اور اُسکا عملہ بھی لائق ہے اور سامان بھی بُرا نہیں۔ مگر اس میں صرف کتابی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک کتبخانہ میں، جو تنگ ہونے کے علاوہ اتنا پُرانا ہے کہ برسات میں یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں پروفیسر اور طالب علم اُسی کے نیچے دب کر نہ رہ جائیں۔ عملی تعلیم کے لیے ورکشاپ اسکول کے قریب ہی ہونا چاہیے اور یہاں شاید ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور وہ بھی اتنا تنگ ہے کہ اُس میں مکمل کلیں نہیں لگائی جاسکتیں۔

اسپین میں بڑی مصیبت فرقہ بندی کی چلی آتی ہے۔ ہر چیز اور ہر عمل اُسی سے وابستہ ہے۔ غریب اساتذہ کی حالت اس فرقہ بندی کی وجہ سے متزلزل رہتی ہے۔ اس پر غضب ہے تعصباتِ مذہبی، کہ جن کی وجہ سے اکثر مقامات پر اُستادوں کو اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اُستانی ہو یا اُستاد، تنخواہ اچھی نہیں پاتے، اور جس مقام میں اسکول ہے وہاں کے رہنے والے اُنکی کوئی قدر نہیں کرتے، بلکہ اُنکو نابُود کر دینا چاہتے ہیں۔ ان غریب اُستادوں کو بہت کچھ اپنی ہی جیب سے اسکول اور طالب علموں پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور وہ رقم اُنکو سرکار سے ملتی ہے نہ گاؤں والوں سے وصول ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اساتذہ اگر کچھ روپیہ اپنی گرہ سے خرچ کریں تو کس امید پر۔

یہ ساری خواریاں تو دورانِ ملازمت کی ہیں۔ آدمی انکو بھی اس امید پر برداشت کر لیتا ہے کہ بوڑھاپا ہی بے فکری سے گزریگا۔ اُسکی یہ گت ہوتی ہے کہ ایک اُستاد کو مرمینیہ واقع صوبۂ اشبیلیہ سے ۴۹ برس کی ملازمت کے بعد پنشن ملی۔ اُنکی بدقسمتی کہ اُن کے اور گورنر صوبہ کے پولیٹیکل خیالات نہیں ملتے تھے۔ یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ باوجود کوشش انکو پنشن وصول نہیں ہوا۔ اس سے زیادہ بدقسمتی یہ کہ یہ گورنر دس برس اُس صوبہ میں رہے۔ آخر جب بیچارے بڑھے کے بھلے دن آئے اور وہ گورنر تبدیل ہوے تو انکو پنشن ملنے لگی، مگر نصف، اور وہ بھی ایک شخص کی ذمہ داری، لے لینے پر، کیونکہ دفتر خزانہ کو باوجود تلاش انکے کاغذاتِ پنشن نہیں ملے۔

ایک اور بڑا جرم پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم ہے۔ انگریزوں، جرمنوں، فرانسیسیوں وغیرہ نے اسکول جاری کر رکھے ہیں۔ یہ سارے اسکول ملکی اسکولوں سے ہر طرح اچھے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ سارے پروٹسٹنٹوں کے ہیں۔ دو سال اسی شور و شغب میں بیکار صرف ہوگئے کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ ان تمام اسکولوں کو خود لے لے۔ اس میں ناکامی لازمی تھی اور ہوئی۔

تعلیم کی مصیبت تو الگ ہی اور اسکو غیر مذہب کے لوگوں سے حاصل کرنا کسی قدر خطرناک ہے، مگر لطف یہ ہے کہ اسپین والے اپنے ملک میں Y.M.C.A. کو محض اس بنا پر نہیں قائم

ہونے دیتے کہ وہ پروٹسٹنٹ لوگوں کی تحریک ہے۔ اس ایسوسی ایشن نے اسپین میں اپنے پاؤں پھیلانے شروع کیے تھے کہ جناب پوپ نے ایک فتوے صادر کرکے اسکے خطرات سے ملک کو آگاہ کردیا اور ایسی مفید ایسوسی ایشن کو وہاں نہیں چلنے دیا گیا۔ مذہبی خیالات کے متعلق شاید مجھے ابھی اور کچھ کہنے کی ضرورت پڑے۔

غرض تعلیم کی یہ صورت ہے اور یہ امیدیں ہیں۔ اس پر قتلونیہ میں سوراج کا شور مچا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسی لیاقت پر ملک اُنکے حوالہ کیا جا سکتا ہے؟ آہ! یہ وہی ملک ہے کہ جہاں علم کا دریا بہ رہا تھا، اور ہر کس و ناکس بلا لحاظ مذہب و قومیت و رنگ اُس سے مستفیض ہوتا تھا۔ اسی ملک کے سائینس و فلسفہ سے یورپ اب تک سیراب ہو رہا ہے۔ یہاں کے علماء کے قدموں میں آنکھیں بچھائی جاتی تھیں اور طالب علم آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔

حفظان صحت، مکانات اور صفائی

کسی قوم کی شائستگی کا اندازہ اُنکے مکانات، حفظ صحت اور صفائی دیکھ کر لگ سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اہالیِ اسپین اس معیار پر بھی پورے نہیں اُترتے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس سے رعایا اور راجا کی حالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ بہت دلچسپ مضمون ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ اسپین کا یورپ میں کیا درجہ ہونا چاہیے۔ میں ایک مرتبہ پھر یاد دلاتا ہوں کہ میں اسپین کا مقابلہ یورپ سے کر رہا ہوں، نہ کہ ہندوستان سے، جو غلاموں کا ملک ہے، اور یقیناً اکثر باتوں میں اسپین سے بھی بدتر ہے۔ میں ذیل میں صرف میڈرڈ کا ذکر کروں گا، اسی سے اور شہروں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پچھلی جنگ میں دو ہی ملکوں نے سب سے زیادہ نفع اُٹھایا: جاپان اور اسپین نے۔ غنیمت یہ ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کمایا اُسکو بیشتر اپنے قصبوں یا شہروں کی تزئین میں لگایا۔ چنانچہ قبل از جنگ کے میڈرڈ اور موجودہ میڈرڈ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسپین کے اچھے پر جو کلنک کا ٹیکہ اُسکے بدنما دار السلطنت کی وجہ سے لگا ہوا تھا وہ بہت کچھ دُھل گیا ہے۔ عالیشان خوبصورت مکانات بن گئے ہیں؛ کشادہ سڑکیں نکل آئی ہیں؛ پرانے مکانات کی مرمت اور تبدیلیاں ہو گئی ہیں؛ بجلی کی روشنی، بجلی کے لفٹ، ٹیلیفون وغیرہ لگ گئے ہیں؛ میونسپلٹی جیسی لکھنؤ کی ویسی ہی میڈرڈ کی۔ میڈرڈ اور لکھنؤ کی سڑکوں میں بہت کم فرق تھا۔ اب ان دونوں

میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ میڈرڈ کی میونسپلٹی بہت جلد جاگ اُٹھی کہ اُس نے میڈرڈ کو شہر بنا دیا اور لکھنؤ کی میونسپلٹی ابھی خراٹے ہی لے رہی ہے، اور شہر کو گانوں سے بدتر بنائے ہوئے ہے۔ میڈرڈ کے ہوٹل جنگ سے پہلے لکھنؤ کی سرائیں تھیں اور اب حقیقی معنوں میں ہوٹل ہیں۔ غرض ہر چند "بسا غنیمت" معلوم ہوتی ہے۔

لیکن یہ جو کچھ ہے بیرونی وسطحی نمائش اور فریب نظر بندی ہے۔ کوئی شخص اگر کوئی مکان کرایہ پر لینے کے لیے بہت سے مکانوں کو دیکھتا ہے تو ہر جگہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتا ہے کہ اس مکان میں وہ اور اُسکا خاندان تندرست بھی رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اسی سوال سے تمام ترقیات کی قلعی کھل جاتی ہے۔

۲۲۔ نومبر ۱۹۲۱ء کے ایک اخبار میں ایک مشہور شخص نے ایک مضمون لکھا تھا۔ میں اُس کا خلاصہ لکھتا ہوں۔ اس سے ان تمام ترقیات کی کیفیت معلوم ہوگی:۔

"جو مکانات کہ آج کل شہر (میڈرڈ) میں اتنی جلدی جلدی بن رہے ہیں، وہ فی الحقیقہ پنجرے ہیں۔ ان پنجروں کی اکثر چار چار منزلیں ہیں۔ ان میں ایسا ناقص مسالا لگایا گیا ہے کہ اکثر یہ خیال کرنا پڑتا ہے کہ یہ چار منزلیں کس چیز کے زور پر کھڑی ہیں۔ ان میں لفٹ، ٹیلیفون اور غسل خانہ سب کچھ ہیں لیکن بجائے آرام یہ چیزیں تکلیف اور مایوسی کا باعث ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لفٹ میں اُتر یا چڑھ رہا ہے کہ بجلی بند ہو گئی۔ اب یہ شخص ہوا میں معلق لٹک رہا ہے، کیونکہ کوئی اور ذریعہ بوقت ضرورت لفٹ سے کام لینے کا نہیں بنایا گیا ہے۔ ٹیلیفون پر باری آنی مشکل ہے، اسکے استعمال کے لیے وقت کی کوئی تحدید نہیں۔ اسپین کے لوگ ٹھیرے باتونی، اب جو انھوں نے باتیں شروع کیں تو کسی طرح ٹیلیفون چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ غسل خانہ یا حمام کی یہ کیفیت ہے کہ ایک پورا تھیلا کوئلوں کا خرچ کیجیے تو اُس سے فائدہ اُٹھائیے۔ ایک عورت دیوار میں کیل ٹھونک رہی تھی کہ دیوار میں آر پار سوراخ ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی سیروں مٹی فرش پر آ رہی۔ دیواریں اور چھتیں اتنی پتلی بنائی جا رہی ہیں کہ ایک گھر میں جو باتیں ہو رہی ہوں وہ دوسرے گھروں میں بے تکلف اور بخوبی سُنی جاتی ہیں۔ گانے بجانے کی آواز تو سرود خانہ ہمسایہ سمجھ کر قابل معافی ہو سکتا ہے، مگر بچوں کے کھیلنے کودنے، شور مچانے، ہر قسم کی شرارت کرنے کی آواز تو نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان نازک مکانات سے ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اب میاں بیویوں میں لڑائی ذرا سوچ سمجھ کر ہوتی ہے۔"

بعض محلہ کی آبادی کی یہ حالت ہے کہ ایک جگہ کے متعلق رپورٹ ہے کہ ۱۵ مکانوں میں ۴۲۲۵ آدمی رہتے ہیں! اس پر صفائی کی طرف سے بے اعتنائی جو نتیجہ پیدا کرے گی اُسکے قیاس سے بھی کمپن آتی ہے! نتیجہ کیا ہے؟ یہ کہ تپ محرقہ کے جراثیم میڈرڈ میں خوب پھلتے پھولتے ہیں - چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں تپ محرقہ سے جو اموات دار السلطنت میں ہوئیں وہ ماہ بماہ حسب ذیل ہے - یہ واضح رہے کہ یہ صحیح تعداد نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ وہاں اس مرض کو بہت کچھ چھپایا جاتا ہے :-

جنوری	۶۲	جولائی	۲۹
فروری	۲۹	اگست	۵۸
مارچ	۴۱	ستمبر	۴۲
اپریل	۶۵	اکتوبر	۴۱
مئی	۳۵	نومبر	۲۵
جون	۲۹	دسمبر	۳۹
میزان کل		۵۰۵	میزان کل ۵۰۵

میری رائے ناقص میں ایک ہزار آدمی سالانہ تپ محرقہ سے میڈرڈ میں ضرور مرتے ہیں - اور یہ سب نتیجہ ہے صفائی سے بے پروائی کا - لطف یہ ہے کہ اس پر بھی میڈرڈ بہت صحت افزا شہر سمجھا جاتا ہے! لاہور صاف شہروں میں نہیں سمجھا جاتا - میڈرڈ اور لاہور کی آبادی میں کچھ بہت فرق نہ ہوگا - لیکن مجھے امید نہیں پڑتی کہ وہاں اتنی اموات تپ محرقہ سے ہوتی ہوں - گو یہ شرف صرف میڈرڈ ہی کو حاصل نہیں ہے، تاہم اسپین میں تپ محرقہ کی یہی حالت ہے۔ اسی سال (علاوہ میڈرڈ کے) تمام اسپین میں تعداد اموات اس مرض سے ۴۳۹۰ تھی۔ اب اس صاف شہر کے پانی کا حال سنیئے - ۲۹ - دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو ایک اخبار نے لکھا کہ "پینے کا پانی ایسے مقام سے لیا جاتا ہے کہ جہاں تمام میڈرڈ کے گندے نالے آکر ملتے ہیں - اس پانی کو صاف بھی نہیں کیا جاتا، بلکہ شہر کی امانت سمجھ کر شہر ہی کو پہونچا دیا جاتا ہے" - یہ شکایت برسوں سے چلی آتی ہے اور کوئی توجہ نہیں کرتا - سنہ ۱۹۲۱ء میں اس پر توجہ دلائی گئی معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوا -

چہ بچہ اور کچے گھروندے کوڑے کرکٹ کے لیے اب تک اکثر و بیشتر مکانات میں موجود ہیں - انہیں میں پیشاب و پاخانہ جمع ہوتا ہے - سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک حکم جاری ہوا تھا کہ چھ مہینے کے اندر اندر انکو ہٹا دیا جائے - گر سنہ ۱۹۲۴ء تک اسکی تعمیل نہیں ہوئی اور یقیناً اب تک نہیں ہوئی ہوگی - صفائی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر روز گاڑیاں آتی ہیں اور وہی اُٹھا کر لے جاتی ہیں - گندگی اور بدبو پھیلتی ہے۔

تو مجبوری ہے اور بیماری بڑھتی ہے تو بڑھا کرے۔ جو لوگ کہ لاہور میں رہتے ہیں یا رہ آئے ہیں، وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ کیا مصیبت لاتا ہے۔ ہندوستان گندوں کا ملک ہے اور لاہور غلاموں کے ملک کا ایک حصہ۔ یہاں تو ہندوستانیوں کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے اگر یورپ کے ایک دارالسلطنت کے لیے تو یہ جتنا کچھ شرمناک ہے وہ قابل بیان نہیں۔

یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ اسپین میں مہترانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ غریب اپنے سروں پر کوڑا اٹھا کر لے جاتی ہیں، اور کوڑیوں پر پھینکنے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے ایسی چیزیں نکال کر الگ کر لیتی ہیں جو بازار میں بک سکیں۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ناظرین اسکو گوارا نہ کریں گے تو میں بتلاتا کہ کیا کیا چیزیں علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی ہیں لیکن سب صاحبوں سے معافی مانگ کر اتنا مجھے بتلانے دیجیے کہ وہاں یہ دستور ہے کہ باسی کھانا کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ مہتر کوڑے میں سے کھانا الگ کر لیتے ہیں، اور مزے سے وہیں بیٹھ کر اس کو کھاتے ہیں۔ مسٹر ڈیکن کہتے ہیں کہ یہ ملک اسپین کے افلاس کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسیحیت کے بھی تو بہت سے نام ہو سکتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہی مسیحی اتنے سخت مسیحی ہوتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ مذہب کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ تاہم اس پر بھی اس خصوص میں ایک یہ بات قابل تعریف ہے کہ ہندوستان کی طرح یہ لوگ اچھوت نہیں سمجھے جاتے! کوڑے کی گاڑیوں کے مالک اور اُن پر کام کرنے والے پنجاب میں رائیں ہوتے ہیں اور اسپین میں مالی۔ بات ایک ہی ہے، صرف نام کا فرق ہے۔ دونوں جگہ اس سے کھاد کا کام لیا جاتا ہے۔

۱۹۲۱ء میں سینور گارسیا کورٹیس نے اپنے ایک لکچر میں بتلایا تھا کہ "حدود شہر میڈرڈ کے باہر ایک لاکھ آدمی آباد ہیں، اور یہ آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ باوجود اسکے وہاں ایک بھی گندہ نالہ نہیں ہے۔ نہ گندگی جلانے کا کوئی انتظام"۔ وہ وہاں کے باشندوں، گورنمنٹ اور میونسپلٹی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور شرم دلاتے ہیں کہ تم لوگ ایک یوروپی سلطنت کے رہنے والے ہو مگر کون سنتا ہے کہانی میری۔

اس گھناؤنے مضمون کو ختم کرنے سے پہلے مجھے ڈون رابرٹو کاسٹرو ویڈو کے مضمون کا ایک فقرہ نقل کر لینے دیجیے۔ یہ مضمون لا ووز La Voz. اخبار میں چھپا تھا جو میڈرڈ سے نکلتا ہے:—

"باشندگان شہر (میڈرڈ) گندے اور گھناؤنے ہیں میں اپنے شہر کے رہنے والوں کو ناخوش نہیں کرنا چاہتا، ورنہ میں کہتا کہ انکی عادتیں سوروں کی ایسی ہیں۔ کھڑکیوں اور جھروکوں کے اوپر سے

چٹائیاں (دریاں) قالین، بستر جھاڑے جاتے ہیں۔ یہ بستر اور دریاں اکثر ان لوگوں کی ہوتی ہیں جو تپ محرقہ، سل، خسرہ[۱] یا لال بخار کے مریض ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف گندگی بلکہ جراثیم روٹیوں کے ٹکڑوں اور مٹھائیوں کی قابوں پر دانستہ ڈالتے ہیں، جو کھلے منہ رہتے ہیں۔ جو مکانات یا دوکانیں پہلی منزل پر ہوتی ہیں اور دوسری منزل کی کھڑکیوں وغیرہ سے گلیوں اور راستوں میں باسی کھانا، لیڈیوں اور بچوں کے بال، ہر قسم کے پھلوں کے چھلکے .... پھینکے جاتے ہیں۔ صفائی کی سخت ضرورت ہے؛ مگر جھاڑو سے نہیں، بلکہ لوگوں کو صفائی کی تعلیم دیکر۔ مدارس میں اسکے لیے خاص انتظام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور پھر نگرانی کی۔ جرمانے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ اکثر بااثر لوگ جرمانہ نہیں ادا کرتے اور سفارشوں کے ذریعہ سے دوسروں کو ادا نہیں کرنے دیتے"۔

شرح اموات اگر حکام دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں رکھتے۔ یہی شرح اُنکی ناقابلیت اور لاپروائی کا پورا ثبوت ہیں۔ اب خواہ اس میں گورنمنٹ کے حکام ہوں یا میونسپلٹی کے۔

میڈرڈ کی شرح اموات کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۹۱۱ء میں ۲۳،۴ فی ہزار تھی اور ۱۹۱۴ء میں ۲۶،۲۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک اوسط اموات ۲۴،۸ فی ہزار رہی ہے۔ اگلے پانچ برس میں ۱۹۱۷ء میں ۲۴،۲، اور ۱۹۱۸ء میں ۲۹،۲۔ اور اوسط اموات ۲۶،۱ فی ہزار رہی ہے؛ یعنی بقدر دو موتوں کے بڑھ گئی ہے۔ ان ہی سالوں میں یورپ کے اور تمام دارالسلطنتوں کی شرح اموات میں برابر کمی آتی رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں میڈرڈ کی شرح اموات ۲۲،۳۹ تھی اور لنڈن کی ۱۲،۶۔ اس سنہ میں کل تعداد اموات ۱۶۱۱۸ تھی۔ ان میں سے ۳۰۹۸ صرف ایک سال سے کم کے بچے تھے۔

میڈرڈ کی آبادی کم و بیش دس لاکھ کی ہے۔ اس میں ایک بھی حمام نہیں؛ اور ہو بھی کیونکر سکتے ہیں۔ یہ تو کفار (یعنی مسلمانوں) کی نشانیاں ہیں۔

ایک زمانہ میں، جو خواب و خیال ہوگیا ہے، قرطبہ بھی دارالسلطنت تھا۔ اُسکی صفائی وغیرہ کا حال دیکھنا ہو تو میری کتاب اخبارالاندلس ملاحظہ کیجیے۔ مختصر یہ ہے کہ یہی زمانہ تھا کہ جب اہل اندلس کہا کرتے تھے کہ "یہ مسلمان بھی عجب احمق لوگ ہیں کہ عاقبت[۲] میں جنت کے

---

[۱] میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ مجھے "خسرہ" کہنا چاہیے یا "کھسرہ"۔ کوئی صاحب اسکو صحیح کرلیں۔

[۲] شاید اصل لفظ "عقبیٰ" ہے۔

امیدوار ہیں۔ کیا قرطبہ اور اشبیلیہ میں انکے مکان ہیں زندگی ہی میں جنت اور انکی عورتیں حوریں نہیں ہیں؟ سچ ہے۔
ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم۔

سیاسیات اور رعایا

(۱)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی اپنی ایک عجیب و غریب مخلوق بنایا ہے۔ یہ کفور و ظلوم و جہول مخلوق کسی کے قابو میں نہیں آتی۔ دُور کیوں جائیے، جب خدا کی نہیں تو اور کس کی ہوگی۔ اگر اسکو ڈھیل دیجیے تو اسکو بغاوت کی سوجھتی ہے، اور اگر ذرا پیچ کس دیجیے تو شکایتوں کی بھرمار کرتی ہے، ان تحملہ یلہث او تترکہ یلہث۔ اتنے بڑے ہاتھی کے لیے بڑے آنکس کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کا رجحان وحشت کی طرف ہوتا ہے؛ گو یہ نہ سوچے کہ وہاں بھی آزادی نہیں ہے۔ (آزادگی حرفے است یہاں ہے نہ وہاں ہے) اس کی خیریت اسی میں ہے کہ یہ پابند ہوکر رہے۔ اور اسکے جکڑبند سخت رہیں۔

اسپین میں دو فورحالات کی کیفیت معلوم ہو ہی چکی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں "پیشہ ور سیاست داں" بہت زیادہ ہیں۔ اور وہ لوگ ضرورت وقت کا احساس نہیں رکھتے کنزرویٹو، لبرل، ری پبلکن تو ہیں ہی۔ کلیسیا کے اقتدار نے اور بھی کارفرما جزائی پیدا کر رکھی ہے۔ اول تو ہوشدار لیڈر۔ وہاں آنے میں تنگ ہیں، اور جو ہیں وہ سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بہرحال سیاسی معاملات میں کچھ نہ کچھ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ وہاں کا کانسٹی ٹیوشن ایسا عجیب غریب ہے کہ دنیا میں اپنی آپ مثال ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے دماغ پر سخت زور ڈالنا پڑتا ہے۔ میں اس سے قطع نظر کرکے موٹی موٹی باتیں اور اصلی حالت بیان کرتا ہوں۔

وہاں ایک گروہ نئے خیالات کو لے کر، بڑے بڑے دعووں اور اچھی اچھی امیدوں کا سبز باغ دکھلا کر پیدا ہوا اور اپنی عظمت کا مرثیہ پڑھ چکا۔ ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ دعویٰ یہ تھا کہ ہم غرباء کی مدد کریں گے اور لوگوں کی تکالیف و مصائب کم کریں گے۔ اتنا وعدہ بھی کافی تھا۔ غول کے غول اُنکے جھنڈے تلے آگئے۔ مگر چند ہی روز بعد اُنکا پول کھل گیا۔ اور لوگ اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہے۔ ردِ عمل پھر شروع ہوا۔ جو لوگ طاقتور تھے وہ پھر برسرِکار آگئے۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن لوگوں نے اس امید کو صبر نہیں کیا کہ ہمیں ظلموں سے نجات ملیگی اور

اٹھایا ان نصیب ہوگا۔ چنانچہ سوشلسٹ گروہ پیدا ہوا۔ انھوں نے ناکامیاب ری پبلکن سے بیزاری و بے تعلقی ظاہر کی۔ خصوصاً اس لیے کہ ان کا طرز عمل شاہی اقتدار قائم رکھنے کی طرف مائل تھا اور ان کے دعوے کا صریح منافی تھا۔ اس نئے گروہ میں وہ لوگ زیادہ تھے جو کمیونسٹ فرقہ کے خیالات رکھتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کا دور بھی بہت طویل تھا اور یہ اسپین جیسے ملک کے مناسب حال نہ تھا۔ آخر انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ امن و امان کے ساتھ اصلاحوں کا حاصل کرلینا ممکن نہیں ہے۔

ری پبلکن پارٹی ضعیف ہو چکی تھی گو انکا دعویٰ اور دم خم وہی تھا، مگر ان میں سے جو ہوشیار آدمی تھے انھوں نے اسی میں خیریت دیکھی کہ وہ "آزاد و شاہ پسند" ہو کر رہیں۔ اسکی وجہ بظاہر یہی تھی کہ انھوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ کنسرویٹو گروہ کے فولادی پنجہ سے وہ چھوٹ نہیں سکتے کیونکہ یہ گروہ جو کچھ کرتا تھا قانون کے اندر رہ کر۔ پچھلی لبرل گورنمنٹ کا ایک بار دورہ کار آگئی، انکے لیے کوئی امید تو تھی نہیں، مگر کنسرویٹو حکومت کی بے اعتدالیوں نے انکی یاس کو آس سے بدل دیا۔ یہ لبرل لوگ کلیسیا اور کلیسائیوں کے اقتدار کی تو چنداں پروا نہیں کرتے، مگر ایک مشکل یہ ہے کہ ان میں سے بعض اتنے متمول ہیں کہ وہ اصلاحات سے بھی بے اعتنائی کرتے ہیں۔ اور تاوقتیکہ اصلاح نہ ہوجائے غربا پر جو ٹیکسوں کا بار ہے وہ کم نہیں ہو سکتا۔ مزدور گروہ کو مطمئن کرنے کی امید ایسی ہے کہ نہ وہ لبرل گورنمنٹ کرے گی نہ کنسرویٹو، اشک شوئی کے لیے کسی قانون کا پیش کر دینا اور چیز ہے۔ مگر جب یہ ہوگا تب ہی ان دونوں (لبرل اور کنسرویٹو) کے درمیان میں پوری گھمسان شروع ہوجائیگی۔ اس لڑائی کا نتیجہ مزدور پارٹی کے حق میں اچھا ہوگا اور وہ فوراً برسر حکومت آجائے گی۔ مگر کب؟ اس کا جواب مشکل ہے۔

اگرچہ اسپین کے لبرل لیڈر کلیسا کے اثرات سے بہت کچھ اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں، لیکن اُن کی حالت یہ ہے کہ بعض اتنے متمول ہیں کہ وہ اصلاحوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، کیونکہ اس کا بڑا اثر یہ ہوگا کہ ٹیکس زیادہ بڑھے گا۔ اور یہ تو امید ہی نہیں ہونا چاہیے کہ مزدور پارٹی کی تسکین کے لیے کوئی قدم کسی کا بڑھے گا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مزدور پارٹی کو کوئی امید باقی ہی نہیں رہی۔

اسباب کچھ ایسے ہیں کہ کوئی شخص یا اشخاص اسپین کو ایک خاص وقت میں جو آنیوالا ہے، بدامنی اور بغاوت سے بچالے۔ اسکے بعد جو فرقے پیدا ہونے والے ہیں انکی نسبت

پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ انکا رجحان کیا ہوگا - اسوقت تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کے کمیونسٹ فرقہ کو بہت کچھ کامیابی ہو جائیگی - یہ امر آخر ہے کہ آیا وہ اسکو سنبھال سکیں گے یا نہیں۔

میں نے کہیں اوپر کہا ہے کہ اسپین کی سیاسیات میں کلیسیا اور کلیسائیوں کا دخل عجیب غریب چیز ہے - یہاں کا کلیسیا ہروقت جناب پوپ کا دست نگر رہتا ہے اور اپنے ملک کے حالات سے روزانہ پوپ کو خبر پہنچاتا اور اسکی ہدایت کا منتظر رہتا ہے - یہ لوگ، جیسا کہ انسے توقع کی جاتی ہے، اسی فکر میں رہتے ہیں کہ سیاسیات کو دین سے وابستہ، بلکہ اس کا تابع فرمان رکھیں - حالانکہ مسیحیت جو عاجز فقیروں کا دین ہے، اسکی متحمل نہیں ہو سکتا - لیکن چونکہ اس فرقہ میں بھی اکثر ہوشیار لوگ ہیں، اس واسطے کئی مرتبہ یہ ہوا ہے کہ انھوں نے قبل از وقت آئندہ خطرات کو محسوس کیا اور پوپ کے رعب و اقتدار کے ذریعہ سے اس کا ازالہ کر دیا - ایک بڑا کام ان لوگوں نے یہ کیا کہ اپنے اثر سے کام لے کر کیتھولک ٹریڈ یونین قائم کرا دیں اور اس سے دینداری کی طرف مائل مزدوروں، بالخصوص زراعت پیشہ مزدوروں کو اپنے ساتھ ملا لیا - یہ بہت بڑا کام ہے - کیونکہ یہ فرقہ جاہل مطلق ہے - اسکا نہ سیاسیات و تمدنی معاملات سے تعلق ہے نہ وہ ان چیزوں کو سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کی عقل و تمیز سے بہت بعید ہے - انکے نزدیک بہترین تدبیر یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کلیسائیوں کے ہاتھ میں دیدیں۔

پس دونوں کی طاقت بڑھ رہی ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت رنگ لائے؛ گو ہوشیار لوگ اب بھی اسی قول پر عامل ہیں کہ "اللہم انی اعوذ بک من السیاستہ"۔ بہرحال سیاسی اکھاڑے میں دو پہلوان خم ٹھونکتے نظر آتے ہیں - ایک کی وردی زرد ہے، یعنی کلیسائی فرقہ اور دوسرے کی سرخ، یعنی کمیونسٹ۔ اب تک تو زرد پہلوان نے صرف اتنا ہی کام کیا ہے کہ جہاں کہیں ہڑتال ہوتی ہے وہ اسکا خاتمہ کر دیتا ہے - یوں دونوں کی رقابت بڑھتی جاتی ہے - اسپین جیسے اجہل ملک میں بظاہر پوپ کی پارٹی کو زیادہ کامیابی ہوتی نظر آتی ہے - اس سے لبرل خائف ہیں اور کنسرویٹو مطمئن۔

شاہ پرستی کے جذبات بڑھتے چلے جاتے ہیں - اسکی وجہ خواہ کچھ ہو - بظاہر تو یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی جان لینے کے لیے بہت سے حملے ہوئے - گو وہ ایسا سخت جان بچا ہے ہر دفعہ بال بال بچ جاتا ہے - لیکن اگر قتلونیہ والے زندہ ہیں تو ہمیں میدان ہمیں چوگان ہمیں گو، تو جو رہیگا وہ ہر دفعہ مونچھوں پر تاؤ دیتے کرتے رہیں گے کہ یاراں صحبت باقی - بہرحال بادشاہ کی حالت ہر وقت اتنی مخدوش رہتی ہے کہ شبے از شب دیگر نمی ماند - انسان ہوشیار مظلوم

کا ہمدرد و حامی ہوتا ہے، اسی لیے جذبات شاہ پرستی کو تقویت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کنسرویٹو چونکہ غلام شاہ ہیں، اس لیے اُنکی حالت اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ امیر عبدالکریم جزاہ اللہ، کی جنگوں میں ناکامی کی وجہ سے اُنکو ناکامی ہوئی اور انکی وقعت گھٹ گئی تھی؛ لیکن انکے دم خم چند روز وہی رہے۔ آخر ایک بلا بے درماں ایسی آئی کہ جس نے بادشاہ کو شاہ شطرنج بنادیا اور کنسرویٹو کو غلام گردش میں بیٹھنے والے ادنیٰ غلام۔ وہ بلا ہے ڈکٹیٹر پریموڈی ریویرا، جسنے فرانس کی مدد سے امیر عبدالکریم پر فتح پائی۔ گو خزانہ خالی ہوچکا اور سلطنت پر وہ بار پڑا ہے کہ جسکا خمیازہ کم ازکم پچاس برس آیندہ تک اسپین اُٹھائے گا۔ تفلونیہ والے تاک میں ہیں، اور وہ انشاء اللہ بہت جلد ری پبلک کرا کے رہیں گے جسکا تجربہ پہلے ہوچکا ہے کہ اُسکی چند ساعت کی زندگی ہوئی اور اب بھی ہوگی انشاء اللہ۔

یوں ملک آناً فاناً بد امنی و بدنظمی کی طرف جا رہا ہے، اور یہ ہوکر رہیگی، خواہ پریمو کے بعد ہو یا اُس کی زندگی میں۔

موجودہ سیاسی حالت اسپین کی یہ ہے کہ تمام فرقے، کنسرویٹو، لبرل، کمیونسٹ، کلیسائی موجود ہیں، مگر معطل۔ ملک بھر میں پریموڈی ریویرا کی دوہائی ہے اور وہ اپنے دشمن بڑھا رہا ہے۔ بادشاہ ایک فرمان پر دستخط کرکے اطمینان سے پیرس کے ہوٹلوں میں شراب پیتا اور وہاں کے قمارخانوں میں جُوا کھیلتا ہے۔ تفلونیہ والے اپنی فکر میں بدستور لگے ہوئے ہیں۔ "زندہ باد امیر عبدالکریم"

انتخابِ ممبراں

(۲)

ہندوستان میں ہر تیسرے برس جو چہل پہل میونسپل کمیٹی اور لیجسلیٹو کونسلوں کے انتخابات کے زمانے میں ہوتی ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ مہینوں پہلے تیاریاں شروع ہوتی ہیں۔ کمیٹیاں کی جاتی ہیں، لکچر دیے جاتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، منتخب کرنے والوں کی خوشامدیں ہوتی ہیں، عین وقت پر تواضع و مدارات کا انتظام کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ اسپین میں ایسی کوئی "نوعیت" نہیں ہوتی۔ کیبنٹ وغیرہ کے انتخاب کے موقعوں پر بھی اتنی رونق اور اتنا جوش نہیں ہوتا جتنا ہندوستان میں میونسپل کمیٹی کے لیے ہوتا ہے۔ جو امیدوار ہوتے ہیں وہ نہیں بتلاتے کہ ہمارا پروگرام کیا ہوگا اور ہم کس مقصد کے لیے انتخاب ہونا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہاں

جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ کہ امیدوار یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں فلاں پولیٹیکل گروہ یا شخص یا فلاں نمود کے آدمی سے تعلق رکھتا ہوں۔ کمیٹیاں نہیں ہوتیں، تقریریں نہیں ہوتیں، کیونکہ اسکی ضرورت نہیں کیونکہ ان لوگوں کو کہنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں، اور اگر ہو بھی تو سننے والے کہاں سے آئیں۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دیانتدار اور ہوشیار پولیٹیکل آدمی وہاں بھی ہوتے ہیں؛ لیکن ایسے لوگ عوام الناس کے معاملات میں دخل ہی نہیں دیتے۔ انکو یہی پسند ہے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں۔ زمینداروں کا فرقہ ایسا ہے کہ اسے پولیٹکل معاملات میں زیادہ دخل دینا چاہیئے لیکن وہ ایسا جامد فرقہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس تکلیف و کشاکش میں پڑنا بھی بیکار ہے۔ حالانکہ ووٹ حاصل کرنے میں انکو زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ ایک دقت یہ ہے کہ آمد و رفت کی آسانیاں ملک میں بہت کم ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کی اراضی یا جاگیریں ایک دوسرے سے دور دور ہیں۔ غریب کاشتکاروں کو جو شکایات سفر میں پیش آتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ عدالتوں میں بہت دیر لگتی ہے اور کسانوں کو شکایات رفع کرانے میں سخت مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ وہ اسی مصیبت میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں؛ اور بجائے اسکے کہ وہ کسی امیدوار کا ساتھ دیں انکو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹ لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائیں اور وہی رویہ اختیار کریں جو چند سال ہوئے کسانوں نے ہندوستان میں اختیار کر لیا تھا۔ یہ کہہ دینا کہ کسانوں کو اگر کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ اپنی حالت پر قانع ہیں، بالکل غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انکی بےچینی اور آئے دن کے خلاف قانون مظاہرات کیوں ہوتے۔ اتنا ہے کہ اندیشہ یہ ہے کہ وہ کسی روز بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ کمیونسٹ اسی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ کرا کے رہیں۔

باستثنائے چند، عام طور پر زمینداروں، اور بالخصوص اُن زمینداروں کو جو پشتہا پشت سے جاگیردار چلے آتے ہیں اسلئے مزارعین سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ مزارعین اپنی حالت درست کریں یا آرام سے رہیں۔ بلکہ اُنکو اس طرف مائل کرتے ہیں کہ جو روپیہ اُنکے ہاتھ آئے اُسکو فضولیات میں اُڑا دیں۔ مختصر یہ ہے کہ زمیندار ہرگز اسکو گوارا نہیں کرتے کہ اُنکے کاشتکار منتخب ہو کر کینیٹ وغیرہ میں اُنکے برابر بیٹھیں۔

ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کے زمانہ سے ہزاروں میل پیچھے ہے۔ امرائے ملک کا اس میں ذرا سا بھی حصہ نہیں، بلکہ وہ ان کاموں میں پڑنے کو اپنا ہتک سمجھتے ہیں۔ وہ اسکو ہرگز گوارا نہیں کریں گے کہ کوئی کارخانہ دار یا کاریگر یا تاجر اُنکے برابر بیٹھے۔ چند عمائد ایسے ہیں کہ جنھوں نے صنعت و حرفت و تجارت کو اپنی دولت بڑھانے کا ذریعہ بنایا ہے؛

مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی برادری کی نظروں سے ایسے گر گئے ہیں کہ وہ برابری وہمسری کا دعوے نہیں کر سکتے - یہ صورت ایسی ہے کہ اوروں کو اُن ہی کی راہ پر چلنے سے مانع آتی ہے مگر یہ کوشش انکی طرف سے جاری ہے کہ وہ اثر و نفوذ پیدا کرلیں، اور اسکا اُنھوں نے یہ ذریعہ اختیار کیا ہے کہ ملک کی سیاست میں دخل دیکر اپنی وقعت بڑھائیں مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ کسی اور سے بھی ہمدردی کریں - وہ خود بُری نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس کا وہ انتقام یوں لیتے ہیں کہ وہ سب کے دشمن ہیں - اس کا آخری اثر پھر غربا اور بالخصوص مزارعین پر پڑتا ہے - یہ چیزیں اصلاح ملکی کے لیے سدِ راہ ہیں - ان لوگوں کی بےچینی بڑھتی جاتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ بہت جلد بغاوت ہو جائے امیر عبدالکریم (جزاہ اللہ) کی وجہ سے ملک میں ہمدردی کی رو پیدا ہو گئی تھی - اور اب ڈسکٹیٹر کی جیرہ دستیوں نے رعایا کو روک رکھا ہے ورنہ اس وقت مملکت اسپین بغاوت رفع کرنے کی فکر میں لگی ہوتی - اب بھی اگر خاص صورت بہتری کی نہ پیدا ہوئی تو بغاوت موجود ہے - نتیجہ جو کچھ ہو -

ایک اور خرابی یہ ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص منتخب ہونے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے وہ انتخاب ہو کر ذاتی نفع اُٹھانا چاہتا ہے - جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ شخص عوام کو یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ میں اُنکے فائدہ کی کیا کیا بات کروں گا - اسکے علاوہ لوگوں کا تجربہ بھی یہی ہے کہ یہ لوگ سوا اسکے کہ ذاتی نفع اُٹھائیں اُنکے کسی مصرف کے نہیں، اس لیے اُنکو امیدوار سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی - وہ ووٹ دیتے ہیں تو محض کسی دباؤ میں آکر - اسکے علاوہ ایک وجہ یہ ہے کہ اسپین میں رشوت کی وہ گرم بازاری ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس صوبہ متحدہ میں اُس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے حالانکہ پنجاب کے مقابلہ میں یہاں عمال کی رشوت ستانی بڑھی ہوئی ہے - اس صوبہ متحدہ میں ہر شخص کے حق بندھے ہوئے ہیں جو اُسکو گھر بیٹھے پہونچ جاتے ہیں - اسپین میں ہر چیز اور ہر بات کے لیے گویا قیمت مقرر ہے - اس میں وہاں کے حکام تک آلودہ ہیں چہ جائیکہ عمال - یہ کہنا بالکل بیجا نہ ہوگا کہ وہاں ایک بڑے وزیر سے لیکر ایک چپراسی تک اپنی قیمت مقرر کیے ہوئے ہیں اور اُن کو بےمنت (صوبہ متحدہ کے "حق" کی طرح) گھر بیٹھے مل جاتی ہے - نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ واقعی ملک کی خدمت کر سکتے ہیں وہ خرچ کی زیادتی کی وجہ سے میدان عمل میں نہیں نکلتے - دوسری طرف رعایا یہ سمجھتی ہے کہ امیدوار انتخاب خود رشوت ستانی کا مرتکب ہو جائیگا -

یہ تمام خرابیاں ایسی ہیں کہ کسی کے روکے نہیں رُک سکتیں، اب اس میں چاہے خود سرکار ہو یا کوئی پولیٹکل فرقہ - اگر اس کا علاج کوئی کر سکتا ہے تو وہ خود رعایا، اور وہ اس قدر غافل و جاہل ہے کہ

کچھ نہ کریگی -

پولیٹیکل خیالات و طریق کار

(۳)

جو کچھ کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، وہ اس امر کی کافی شہادت ہے کہ اسپین میں پولیٹیکل اصلاح ہونا بہت مشکل ہے - اسکے علاوہ اور باتیں بھی اسکی مؤید ہیں کہ نہ صرف اسپین میں، بلکہ اُن علاقوں میں بھی جو امرکیہ میں واقع ہیں اور اب تک بدقسمتی سے اسپین کے قبضے میں ہیں، اسی حال میں گرفتار رہیں - یا تو وہاں پولیٹیکل معاملات میں اتنی زیادتی ہوتی ہے کہ بدہضمی ہو جاتی ہے، یا اتنا پرہیز کیا جاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف لاحق ہو جاتی ہے - سیاسیات کی طرف توجہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر "پیشہ ور سیاسی پیشہ" کی کچھ کمی ہے - اُن لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ووٹ دے سکتے ہیں، مگر وہ بہت کم ووٹ دیتے ہیں، یا بالکل دیتے ہی نہیں - وہاں یہ سوال نہیں ہوتا کہ منتخب شدگاں اصولاً کیا کرینگے بلکہ پوچھا یہ جاتا ہے کہ اُنکی ذاتیات کی کیا کیفیت ہے - اسکی ضرورت نہیں ہے کہ اس شخص نے ملک کی کیا خدمت کی ہے یا اُسکے پولیٹیکل خیالات کیسے ہیں، وہی شخص کامیاب ہوگا جو روپیہ زیادہ خرچ کریگا، یا جسکے مزارعین زیادہ ہونگے - باقی رہا یہ امر کہ اُس کا کیا پروگرام ہے یا وہ کیا بات واضعان قانون یا محکمۂ سیاسی سے منظور کرانا چاہتا ہے، ایک فضول سا سوال ہے، کیونکہ فی الحقیقت وہ کوئی خاص غرض لیکر انتخاب کے لیے کھڑا ہی نہیں ہوتا - انکی کامیابی کا کوئی ذریعہ ہے تو خود اُن کا ذاتی دباؤ اور رعب، نہ کہ قابلیت ذاتی - مگر آخر منتخب شدگان کا مقصد اصلی کیا ہے؟ صرف اپنی ذاتی وجاہت کو بڑھاکر روپیہ کمانا! باقی رہا ملک کا نفع و نقصان، اس سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں! اسکا علاج ڈکٹیٹرشپ کے پاس نہیں -

ان حالات کا نتیجہ اسپین جیسے ملک میں (کہ جہاں سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ملک کی نصف آبادی بالکل جاہل ہے) یہ ہے کہ جال کا ہر تار یا زنجیر کی ہر کڑی اس امید میں رہتی ہے کہ اُس کا ہر کامیاب امیدوار یا ملک کا مربی اسکی خوراک کا حصہ گھر بیٹھے پہنچا دیگا - زنجیر کی ہر کڑی جو اصل زنجیر سے زیادہ ملحق ہے، اس قابل سمجھی جاتی ہے کہ اسکو اچھی طرح نچوڑ لیا جائے - اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کامیابی کے لیے قابلیت و ناقابلیت کا کوئی لحاظ نہیں رہتا، اور کامیاب آدمی اپنا اور اپنے بالادست مربیوں کا خرچ خود نکالتا ہے -

کامیاب امیدوار یہی نہیں کہ خود نفع اٹھاتا ہے، بلکہ اپنی کامیابی سے اپنے عزیزوں، دوستوں، ہموطنوں کو فائدہ پہونچاتا ہے۔ اُسکے وطن میں سڑکیں بنجاتی ہیں، لالٹین لگ جاتی ہیں، صفائی بڑھ جاتی ہیں اور بعض وقت کوئی نیا مدرسہ کھل جاتا ہے یا کسی مدرس کے نصیب کھل جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کیا یہ ملک اور اہل ملک کا فائدہ نہیں ہے؟ مگر اس سے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمت میں کتنے نالایقوں کا اضافہ ہوجاتا ہے، کتنی بیہودگیاں بڑھ جاتی ہیں اور اُسکے اعزا و اقارب اپنے داب ناجائز سے خود کتنا فائدہ اٹھاتے اور دوسروں کو نقصان پہونچاتے ہیں کیسی دوسرے مقامات کو، جہاں سڑکیں وغیرہ اشد ضروری ہیں محروم کرکے ایک خاص شہر یا قصبہ میں روپیہ کا ضایع کرنا، اگر ترقی کہلائے تو کہلائے، ورنہ نہ تجارت کو اُس سے نفع پہونچتا ہے نہ زراعت کو۔ باقی رہ گئے مدارس کا کھل جانا یا کسی مدرس کو فائدہ پہونچ جانا، یہ اس لیے بیکار ہے کہ طالب علم ہی اُس شہر میں نہیں ہوتے، اسکے مقابلہ میں وہ مقام محروم رہ جاتے ہیں جہاں طالبعلموں کی کثرت ہے اور تعلیم کا انتظام نہیں۔ غرض نہ کوئی پولٹیکل خیالات ہیں نہ کوئی طریق کار۔

اسپین کے ہوشیار لوگ اس اُمید پر جی رہے ہیں کہ شاید کبھی وہ وقت آجائے کہ ہمارا ملک بھی اور مہذب و متمدن ملکوں کے طریق کار اختیار کرلے۔ یہ وقت آہستہ آہستہ ضرور آئیگا آج آجائے یا دس برس کے بعد، بشرطیکہ کوئی اور امیر عبدالکریم نہ پیدا ہوجائے جس سے ہم نا واقف نہیں ہوسکتے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

قانون، تمدنی ترقی سے غفلت، دفتری حکومت اور اسپین

(۴)

جن حضرات نے کہ میری کتاب "سولدین" ملاحظہ فرمائی ہے انکو اندازہ ہوگا کہ ملک اسپین میں قانون بنا دینا یا احکام نافذ کردینا کتنا آسان ہے، مگر ان پر عمل ہونا اس قدر مشکل بلکہ ناممکن بات ہے۔ اہالی اسپین کی سستی اور بےحسی یورپ میں ضرب المثل ہے۔ اسکی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ ان میں مشرقی خون ملا ہوا ہے اور یہ اُس کا اثر ہے۔ "سولدین" کے ناظرین یقیناً اس توجیہ کی تردید میں میرا ساتھ دینگے۔ تشریح بہت طولانی ہے۔ بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ قانون و قواعد وہاں لاحاصل ہیں اور کاہلی انکا روزمرہ۔ قریباً ساڑھے چارسو برس کا تو تجربہ ہمارا ابھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسپین کے قوانین بہت سی صورتوں میں بہترین قوانین اور قابل قدر کے

ہندوستان تو کیا یورپ کے اکثر ممالک کو چاہیے کہ اُنکو اپنے لیے نمونہ بنائیں - افسوس تو یہ ہے کہ وہ ملک ہی ایسا ہے کہ جہاں ہر بات میں تضاد موجود ہے - قانون بنا دینا اور چیز ہے مگر اُس کا نفاذ یا اُس پر عمل کرنا شے دیگر ہے - یہ مسلم کہ وہاں تعلیم کی کمی ہے، مگر جتنی اور جیسی بھی ہے وہ بُری نہیں - ذہانت و دوراندیشی کی وہاں کمی نہیں - مگر اس کا کیا علاج کہ ملک کے قابل لوگ عضو معطل ہیں - یا اُن سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اُنکے لیے غیر موزوں ہے - جہاں حرفت و تجارت کی کمی ہو وہاں بہترین چیز قانونی تعلیم ہے - قانون وہ چیز ہے کہ اُسکے گریجوایٹ ہر عہدہ پر لگائے جا سکتے ہیں - اہالی اسپین اکثر و بیشتر قانون کی طرف مائل اور اُس کی ڈگریاں لیتے ہیں - لیکن اُنکو کسی طرح یہ امید نہیں ہے کہ وہ وکالت کرکے اپنا پیٹ پال سکیں گے - اسکی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہاں مقدمہ بازوں کی کمی ہے، بلکہ نہ فریقین مقدمہ وکیل سے مدد لیتے ہیں نہ عدالتیں اسکو پسند کرتی ہیں - نتیجہ یہ ہے کہ عدم مزاولت قانونی سے وکیل کچھ لائق نہیں ہونے پاتے - اصل میں عدم واقفیت قانون کوئی عذر نہیں بن سکتا - بلکہ خرابی یہ ہے کہ جو کچھ بھی علم ہے وہ محض نظری ہے، عملی نہیں - ان لوگوں سے گفتگو کی جائے تو یہ عالم متبحر معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذرا اُن سے کام لیکر دیکھیے تو نالائق محض ثابت ہوتے ہیں - اصول قانون کو سمجھتے ہیں، ملکی ضرورت کو جانتے ہیں، جو نقائص ہیں اُن کا احساس ہے، لیکن اُن سے ذرا قانون کا مسودہ کرکے تو دیکھیے؛ یقین جانیے کہ دو چار ابتدائی دفعات بھی نہیں لکھ سکیں گے - ہزار خرابی مسودہ بھی تیار ہو گیا؛ مجلس واضعان قوانین میں بھی پہونچا؛ وہاں جو اُس پر بحث و اعتراضات ہوے تو مسودہ کرنے والے حضرات گھونے گئے - جواب ہی نہیں بن پڑتا - بدقت تمام قانون بن بھی گیا، نافذ بھی ہو گیا تو انجام یہ ہوا کہ وہ بھول بسر گیا اور اُسکو اُن ہی حضرات نے دیدہ و دانستہ توڑا اور خلاف ورزی کی، جنھوں نے اسکو بنایا یا پاس کرایا - اس سے انکار نہیں کہ چند روز محض چند روز کے لیے اُس پر عمل ہوا، اُسکے بعد وہی دست تظلم ہے اور وہی فریاد اب کسی کو، یہاں تک کہ خود قانون بنانے والے کو یہ یاد نہیں آتا کہ اس خرابی کے انسداد کے لیے فلاں قانون بن چکا ہے -

ان خرابیوں کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں - مثلاً

(۱) گورنمنٹ سخت پست حالت میں ہے اور اُس پر بے حد کمزور

(۲) ملک میں کمی تعلیم

(۳) اُن کا جو کانسٹی ٹیوشن ہے وہ اتنا لغو اور پیچیدہ ہے کہ ناقابل عمل ہے - اُسکی بنیاد جمہوریت پر ہے مگر نہ کوئی اسکو سمجھتا ہے، نہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے - اس کانسٹی ٹیوشن میں

۱۸۶۷ء سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، نہ کسی نے اسکی پروا کی

(۴) ملک میں ذرائع آمدورفت اور تبادلۂ خیالات اتنے کم ہیں کہ ایک کو دوسرے کی تکلیف کی خبر نہیں ہوتی۔

(۵) خود اہلِ ملک سست اور غافل ہیں۔

(۶) فوجی طاقت اتنی اور ایسی نہیں کہ ملک پر اُس کا دباؤ پڑ سکے۔

(۷) یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے یہ ملک بہت کچھ محفوظ و مصئون ہے اور ہر شخص کو اطمینان ہے کہ ملک کو زوال نہیں آسکتا۔ پابندیِ قانون لا حاصل ہے

۱۸۹۸ء میں اسپین اور امریکہ کی لڑائی ہوئی تھی۔ اُسوقت اہالیِ اسپین کو اپنی حیثیت اور کمزوری پوری طرح پر واضح ہوگئی تھی۔ امید یہ تھی کہ وہ اصلاح حال کرلیں گے، کچھ حرکت مذبوحی ہوئی بھی تھی۔ مگر سستی اور غفلت کا بھلا ہو کہ سب کچھ طاقِ نسیاں کے سپرد ہوگیا۔ پھوس کی آگ تھی کہ بکا یک بھڑکی اور راکھ کا ڈھیر۔ جتنے پولٹیکل راہبر تھے اُن کا نفع ہی اس میں تھا کہ یہ آگ پھر نہ سلگنے پائے۔ رہ گئے مصلحین، یہی خواہانِ ملک، اُنھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ملک میں کچھ اصلاح کرنا یا کرانا ہے، تو اس کا علاج بذریعہ بغاوت انقلاب ہے۔ اسکے لیے وہ بوجوہ تیار نہ تھے۔ یوں فوجی حکومت کو پھر فتح ہوئی۔

بہر حال جو کچھ بھی ہوا نتیجہ بُرا نہ نکلا۔ تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کی آنکھیں کھُل گئیں، نوجوانانِ ملک کے دلوں میں آگ لگ گئی، اور وہ اپنے ملک کی بہبودی کی طرف مائل ہیں۔ اب کچھ امید ہے تو ان ہی سے۔ امیر عبد الکریم کے مقابلہ میں کچھ کیا تو ان ہی نے، ملک کو اگر کچھ امید رکھنا چاہیے تو ان ہی سے۔

یہ قصہ میری اُمید اور میرے ارادہ سے زیادہ لمبا ہوگیا۔ لیکن اس سے کم از کم یہ ضرور معلوم ہو جائیگا کہ اسپین کی سلطنت نقش بر آب ہے اور دُور کا ڈھول۔ اگر ایک عبد الکریم اور پیدا ہوگئے اور اُنھوں نے اس عمارت کو ذرا سا بھی دھکا دیدیا تو یہ سب زمین پر آرہیگی۔ گو یہ یقینی بات ہے کہ عیسائی سلطنتیں ہرگز اسکو گوارا نہ کرینگی کہ مسلمان اس سرزمین پر فاتحانہ قدم رکھکر یورپ پھر کو عبرت کردے۔ آپس کی رقابتیں بھی اُسوقت بھلا دی جائیں گی، جیسا کہ تجربہ ہو چکا ہے۔ اور جناب پوپ کی مشین اُسی طرح حرکت میں آجائے گی جیسی کہ کئی مرتبہ آچکی ہے۔ مگر خدا ے تعالیٰ کی حکمتوں اور قدرتوں کو کون جانتا ہے۔ وہو الذی یحیی الارض بعد موتہا۔ مسلمان تو خود اپنے مرثیہ خوان ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ

رب الافواج اسی مردہ قوم میں جان ڈال دے۔ اس میں کسی طرح کا کلام نہیں کہ وہاں اگر کسی کو امید فلاح ہو سکتی ہے تو مسلمانوں کو۔ وہاں کے درد کا علاج اگر کوئی ہے تو مسلمان۔ کامیاب ہو سکتے ہیں تو مسلمان۔

مجھ پر ایک بجا اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ میں نے ناظرین کا اتنا وقت ضایع کیا مگر اسپین کا کانسٹی ٹیوشن نہیں بتایا۔ مجھے اپنی نا قابلیت کا اعتراف ہے کہ میں اُسکو نہیں سمجھا۔ وہ ہے ہی اتنا لغو و بیہودہ کہ اسکو سمجھنا مشکل ہے اور اُس کے بوسیدہ و فرسودہ ہونے میں تو کوئی شبہہ ہی نہیں۔

محمد خلیل الرحمٰن

خواب طفلی

میں سوگوار غم ہوں اُس عہد کمسنی کا
جس میں کہ تھا مہیا سامان دل لگی کا
وہ جلوہ ریز راتیں وہ عشوہ بار راتیں
اے زندگی کہاں ہیں وہ خوشگوار راتیں

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

مٹی کی مورتوں سے دل بستگی مجھے تھی
دل جانتا ہے اُسکو جو کچھ خوشی مجھے تھی
بچپن کی زندگی کی راحت کہاں ملے گی
ایسی سجی سجائی جنت کہاں ملے گی

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

بچپن کے سیر گل کی پھر مجھ کو جستجو ہے
پھر باغ کی روش پر چلنے کی آرزو ہے
شبنم کی وہ طراوت سبزے کا لہلہانا
وہ اول سحر میں تاروں کا جھلملانا

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

مجھ سے بگڑ گیا ہے عشرت نواز بچپن
یاد آ رہا ہے مجھ کو راحت نواز بچپن

گلہائے عیش سے تھا پُر دامنِ تمنا کیسا ہرا بھرا تھا وہ گلشنِ تماشا
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگِ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

عیش و طرب کے ساماں کیا کیا تھے اُس فضا میں تھیں گلشنِ ارم کی رنگینیاں ہوا میں
وہ دید کا سماں تھا یا عید کا سماں تھا لبریز گل زمیں تھی پُر جلوہ آسماں تھا
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگِ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

اک پل میں ہو گئی وہ بزمِ نشاط برہم عیش و سرور کیسا ہے دل میں درد پیہم
اب اپنی زندگی کا جو گیت گا رہا ہوں یوں اہلِ درد کو میں دُکھڑا سنا رہا ہوں
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگِ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

اقدس حیدرآبادی
(مرحوم)

کلامِ اعظم

آنکھیں دِکھا کے وہ پسِ دیوار ہو گئے بیمارِ چشم اور بھی بیمار ہو گئے
کانٹے بھی راہِ شوق کے تھے ناوکِ نگاہ تلووں میں چبھ کے دل کے مرے پار ہو گئے
کیا جلے دل مرا چمنِ روزگار میں جو پھول تھے نظر میں وہ اب خار ہو گئے
کرتے علاجِ دردِ محبت محال تھا بیمار کو وہ دیکھ کے بیمار ہو گئے
آئینہ دیکھیے آرائشوں کے بعد اب تو کچھ اور ہی مرے سرکار ہو گئے
اب تاک جھانک کی بھی توقع نہ رہ گئی لو بند اُن کے روزنِ دیوار ہو گئے
کیا دل میں اب رہا نہیں اے چارہ گر لہو کیوں خشک میرے دیدۂ خونبار ہو گئے
اے ضعف تو نے جامہ دری سے خجل کیا یعنی ہمارے ہاتھ ہی بیکار ہو گئے
میں اس سے دیکھتا ہوں جھلک حسنِ یار کی ناسورِ دل بھی روزنِ دیوار ہو گئے
اِن میں کچھ اور سنگدلی کے سوا نہیں
اعظم بتوں سے اس لیے بیزار ہو گئے

اعظم کُریوی (سابق مدیر)

کرشن کنور

— ایک ماخوذ ڈراما —

(ایک ایکٹ میں)

اشخاص ڈراما

(عورتیں)

مہارانی اودیپور	کرشن کنور کی ماں
مہارانی جودھپور	مان سنگھ و بھیم سنگھ کی ماں
چاند کنور	مہارانا اودے پور کی بہن
کرشن کنور	"کشتۂ نظرت عشاق"
لیلاوتی	رانا جے پور کی بہن
چندر کنور	رانا جودھپور کی لڑکی
سیتا	کرشن کنور کی سہیلی
سہیلیاں	
خادمہ	

(مرد)

ہلکر جسونت راؤ	مہاراجہ اندور
سیندھیا	مہاراجہ گوالیار
مان سنگھ	مہاراجہ میواڑ
امیر خاں سنبھلی	نواب ٹونک

+ اس ڈرامہ میں تاریخ اردو مصنفہ خافی خاں مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ سے مدد لی گئی ہے۔ اس لیے اگر اس کتاب کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بہت بڑا اخلاقی جرم مقصور ہوگا۔ (مرتب)

بھیم سنگھ ... ... راجا جودھپور

مان سنگھ ... ... ولیعہد جودھپور

جگت سنگھ ... ... راجا جے پور

ایسٹ انڈیا کمپنی —

اجیت سنگھ ... ... سردار اودیپور

بہت سے سردار —

طبیب شاہی اور پروہت

وزیر یا منتری - نورتن —

ہرکارہ —

قاصد —

حاجب —

سپہ سالار —

دکھنی رسالہ —

وقت - ۱۸۰۵ء لغایت ۱۸۱۰ء عیسوی

مقام - راجپوتانہ

[اپنے والد ماجد ادیب شہیر منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے کے نام پر]

کمپنی بہادر کا آفتاب اقبال عروج پر ہے۔ بھرت پور کے تاریخی اور مشہور قلعہ پر کمپنی کے دندانِ آز تیز ہو رہے ہیں۔ جنگ میں مسیحی افواج کو شاندار پسپائی نصیب ہوتی ہے۔ راجہ بھرت پور کو صلح و آشتی کے پیام دیے جاتے ہیں۔ ہلکر بھرت پور سے رخصت ہو کر سندھیا کی طرف عنانِ خیال موڑتا ہے امید سے زیادہ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ ہلکر تازہ دم جرار فوج لیکر ٹانک کی قابل غرامت اور ہلالی پرچم کے ظل عاطفت میں دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے۔ پانسہ پلٹتا ہے۔ صلح نامہ لکھنے کی نوبت آتی ہے۔ مالوہ اور دکن کی سلطنتیں واپس کی جاتی ہیں۔ مسلسل لڑائیوں سے ہلکر کو نقصان عظیم ہوتا ہے اور وہ رہی سہی

عزت اسلاف پال پال بچا تا ہوا جے پور کی محلسرا میں قیام کرتا ہے - ہلکر قسمت کا دھنی ہے۔ اپنے میزبان سے بھی کافی رقم وصول کرتا ہے - اس عرصے میں اُسکے اہل و عیال بھی آکر جے پور کے محل شاہی میں اُس سے ملتے ہیں ـــ

ایک زرنگار آراستہ کمرہ - نیچے کے بڑے دروازہ سے سنگِ موسیٰ کے زینے کا کٹہرا اور پائیں باغ کا ایک گوشہ - شب کا وقت - چاندپوری آب و تاب سے چمک رہا ہے - ہلکر ہلکر اپنے اہل و عیال سے گفتگو میں مشغول ہے کہ یہ خبر آتی ہے کہ مانسنگھ والی میواڑ ملاقات کرنا چاہتا ہے -

منظر اول - مجلس اول

ہلکر - مان سنگھ - منتری - نورتن

[ہلکر دلچسپی میں مشغول ہے - ایک حاجب آتا ہے]

حاجب - اَن داتا ! مہاراجہ مان سنگھ والیِ میواڑ تشریف لائے ہیں

ہلکر - مہاراجہ مان سنگھ اسوقت شب میں آئے ہیں ؟

حاجب - ان داتا - مہاراجہ کو کوئی ضروری کام ہے -

ہلکر - اچھا جاؤ بُلا لاؤ - شب کے وقت کیا کام ہو سکتا ہے

[ہلکر تنہا رہ جاتا ہے، اُسکے اہل و عیال ہٹ جاتے ہیں - راجہ مان سنگھ ہلکر کے منتری و نورتن کے ساتھ شرف باریابی حاصل کرتا ہے اور ہلکر استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے]

ہلکر - مہاراجہ صاحب تشریف لائیے - مزاج تو اچھا ہے - کیسے شب میں کیسے تکلیف کی ـــ خیریت ؟ کوئی ضروری کام ؟

مان سنگھ - مہاراج - اسوقت ایک ضروری کام سے حاضر ہوا ہوں، اجازت ہو تو عرض کروں

ہلکر - مہاراج شرمندہ نہ کیجیے - میں خانہ بدوش ہوں آپ راج گدی کے مالک ہیں ـــ اسکے علاوہ بھی آپ میرے محسن ہیں - کیونکہ آپ میرے بال بچوں کو میرے پاس واپس لے آئے ـــ جلد فرمائیے میں کس طرح آپ کی خدمت کر سکتا ہوں ـــ آپ کا احسان بڑا ہے -

مان سنگھ —— مہاراج آپ تلک دھاری ہیں، شرمندہ نہ کیجیے۔ اس سے اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے سہائتہ کی پراتھنا کروں ——

ہلکر —— مہاراجہ بتلائیے کس کے خلاف فوج کشی کا ارادہ ہے؟ کیا کمپنی بہادر کے؟

مان سنگھ —— نہیں —— راجہ جے پور کے

ہلکر —— پرماتما —— کیا سن رہا ہوں —— مہاراج کس کے خلاف؟

مان سنگھ —— مہاراج، جگت سنگھ والیِ جے پور کے خلاف!

ہلکر —— کیا محسن کشی جائز ہے؟

مان سنگھ ۔ کیا وعدہ خلافی جائز ہے؟

ہلکر —— نہیں نہیں ہرگز نہیں ۔ تلک دھاری کی بات پلٹ نہیں سکتی ۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میری سہائتہ کی ضرورت کیوں پیش آئی —— ؟

مان سنگھ ۔ —— مہاراج آپ کو معلوم ہوگا کہ مہارانا اودے پور کی ایک لڑکی حسن میں لاثانی ہے۔ اُس سے مہاراجہ جودھپور کو عشق ہو گیا ہے اور مہاراج جے پور بھی اس فکر میں مبتلا ہیں —— بس اتنی حقیر شے آپ سے میں طلب کرتا ہوں —— کیا آپ اس میری پرارتھنا کو ٹھکرا دیں گے!!

ہلکر (قہقہہ لگا کر) جے پور کے خلاف امداد! لڑائی بھی کیسی ہو تر۔ محسن کشی و وعدہ خلافی ہلکر کے شایانِ شان نہیں —— میں مہاراج آپکے غیر متوقع "صلہ" کو سنکر ششدر ہوں

[دربار میں سناٹا چھا جاتا ہے ۔ یہ خبر لمحات میں حاشیہ نشینان سلطنت راجہ جے پور کو پہونچاتے ہیں جے پور کا راجہ ہلکر کو رقم مطلوبہ سے کہیں زیادہ رقم دے کر جان بچانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ۔ اللہ اکبر ۔ ہاتھی کتنے ہزار، پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا ۔ ہلکر کا اب بھی وہ دبدبہ ہے کہ اُسکی امداد پہ میواڑ کا رانا اصرار کر رہا ہے — ہلکر خود پس و پیش میں ہے کبھی محسن کشی کبھی وعدہ خلافی اور کبھی مطلوبہ رقم میں اضافۂ مزید کا فریب تخیل، اور کبھی رانا سے اژدہا جو دھپور اور مہاراجہ جے پور کی آرزوؤں کا خیال —— کچھ سوچ کر مان سنگھ سے کہتا ہے]

"...... رانا، آپ کا مطالبہ بہت ہی اہم ہے، آپ کی سرفروشانہ خدمات میرے سر آنکھوں پر ہیں۔ میں بات کا دھنی ہوں، آپ کا سوال یقیناً پورا ہوگا ۔ ہاں تو اس میں آپ کچھ تبدیلی

بھی پسند کریں گے ——؟

مان سنگھ ۔ راجپوتی خون میری رگ و پے میں دوڑ رہا ہے ۔ کیا ایک چھتری بلوان اپنی بات سے پلٹ جائے ۔ جان جائے لیکن آن نہ جائے

[پھر چند لمحات کے لیے سناٹا چھا جاتا ہے]

ہلکر —— شاباش مہاراجہ شاباش ۔ میں تمہاری ہمت کا امتحان لینا چاہتا تھا ۔ آپکا قول پورا ہوگا ۔ (تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر) میں قسم کھاتا ہوں آپ کی بات پوری ہو کر رہیگی ۔ پرنتو ایک بات مہاراج کی پراتھنا آپ بھی منظور کریں گے ——؟

مان سنگھ —— مہاراج ۔ شوق سے فرمایئے ——؟

ہلکر —— صرف یہی کہ کچھ مہلت دیجیے

مان سنگھ —— مہاراج منظور —— [مان سنگھ ، منتری وغیرہ چلے جاتے ہیں]

[اس مکالمہ کے بعد دربار برخاست ہوتا ہے اور ہلکر اپنے دربار میں تنہا متفکر رہ جاتا ہے]

منظرِ اول مجلس دوم

[فطرت مسکراتی ہے اور ہلکر متفکر خیمہ میں داخل ہوتا ہے ۔ پریشانیوں اور شکست کی وجہ سے کئی رسالہ کو برخاست کرنا چاہتا ہے ۔ اس خبر سے بغاوت کے اثرات رونما ہوتے ہیں ۔ باغی جماعت ہلکر کے برادرزادہ کو راجگدی کے سبز باغ دکھاتی ہے اور ہوشیاری سے انکار کر دیتا ہے ۔ ہلکر کو خبر لیتی ہے وہ اُس رقم سے جو جیپور سے ملی ہے بغاوت کو فرو کرتا ہے اور وقتی بغاوت سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہی سہی حالت درست کرنے کے بہانہ سے طرفین کی امداد سے انکار کر دیتا ہے ۔ جے پور سے روانہ ہو جاتا ہے ۔ اسوقت ایک شاداب دامن کوہ میں خیمہ زن ہے ۔ اس وقت راجستان کی سیاسی بساط پر ایک نیا مُہرہ امیر خاں سنبھلی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ امیر خاں کے ہلکر پر بہت کچھ حقوق ہیں ۔ اس بغاوت سے وہ بھی مستفید ہونا چاہتا ہے ۔ اس وقت وہی ہلکر سے ملنے آیا ہے ۔ اور ہلکر کو اُسکا دیرینہ وعدہ یاد دلاتا ہے ۔]

(ایک شخص امیر خاں کے آنے کی اطلاع کرتا ہے)

امیر خاں : ہلکر : سپہ سالار

ایک شخص ۔ مہاراج ! امیر خاں سنبھلی ملاقات کرنا چاہتے ہیں ۔

ہلکر —— ہاں ہاں ، فوراً بلا لو —— [نوکر جاتا ہے اور امیر خاں آتا ہے]

امیر خاں [illegible]

ہلکر دوست کیا بتائیں، آجکل پریشان ہیں —— تم نے بھی وقت پر ساتھ چھوڑ دیا۔

—— کاش ——

امیرخاں۔ خیریت ؟ کیا ہوا۔ کمپنی بہادر سے کیا پھر چھڑی! کیا ہوا ؟

ہلکر۔ دوست کیا بتائیں۔ دکنی رسالہ کو برطرف کرنا چاہا تھا، بدامنی پھیل گئی ہے —— پریشان ہوں —— لوگ دوسرا راجہ مقرر کرنا چاہتے ہیں —— سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ جس قدر رقمیں جے پور سے ملی تھیں سب اسی مد میں صرف ہوگئیں۔

[وہی شخص دوبارہ اندر آتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ سپہ سالار صاحب تشریف لائے ہیں۔ ایما پاکر سپہ سالار کو اندر لاتا ہے]

ہلکر۔ سپہ سالار صاحب کہیے کیا ہوا —— سب کو توپ دم کرا دیجیے۔

سپہ سالار۔ آن داتا کا بول بالا رہے۔ سرکار کے اقبال سے بدامنی دور کردی گئی ہے —— کچھ فکر کی بات نہیں ہے ——

ہلکر (خوش ہوکر) میں بہت خوش ہوں۔ جاؤ منتری سے ایک جاگیر لے لو

[سپہ سالار خوش ہوکر سلام کرتا ہوا خادم کے ساتھ باہر جاتا ہے]

امیرخاں۔ مبارک۔ مہاراجہ صاحب مبارک۔ فرمائیے، کچھ ہماری خدمات کا بھی صلہ دوائیے گا

ہلکر۔ دوست۔ میری حالت سے واقف ہو۔ پھر بھی جو کچھ میرے امکان میں ہوگا اس سے دریغ نہ کروں گا —— بولو ——

امیرخاں۔ حضور کی یہ (ایک تحریر پیش کرتے ہوئے) تحریر موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ہلکر (تحریر پڑھ کر) منظور ہے۔ امیرخاں تمہاری لازوال، بے ریا، مخلصانہ سرفروشیوں کے صلہ میں ٹونک کی جاگیر مع خراج کوٹہ تم کو عطا کی جاتی ہے۔ لیکن ——

امیرخاں۔ مہاراج، اگر آپ اپنے وعدہ کا ایفاء کرسکتے ہیں، تو پٹھان بھی اپنی بات سے نہ ٹلے گا۔ مہاراج کہیے —— تکلف نہ کیجیے

ہلکر (اٹک اٹک کر) لیکن —— شرم معلوم ہوتی ہے —— امیرخاں تم میرے دوست ہو تم میرے ہزاروں رازہائے پنہاں سے واقف ہو اس لیے تم سے یہ واقعہ بیان کرتا ہوں میں نے مان سنگھ راجہ میواڑ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں انکی امداد راجہ جے پور کے خلاف کروں گا —— لیکن تم جانتے ہو، جے پور کا میں مہمان رہا ہوں، اُس نے مجھے

بغاوت فرو کرنے کے لیے رقم دی تھی ——— کس طرح اُسکے خلاف ان سنگھ کی مدد کر سکتا ہوں۔
سُنا امیر سُنا ——— سمجھ گئے ———

امیر خاں - سمجھا ——— کیا میں ان سنگھ کی امداد سے اودیپور کی لڑکی جودھپور کے راجہ ان سنگھ کو دلواؤں ؟

واہ امیر خاں، خوب سمجھے ——— میں نے کہا بھی نہیں تم خود ہی سمجھے بس ہی لیکن ——— کے بعد میں کہنا چاہتا تھا لیکن شرم سے زبان سے یہ الفاظ ادا نہ ہوتے تھے۔ میں موقع و وقت کو تلاش کر رہا تھا میرے دل میں سچ مانو امیر خاں یہ خیال اُس ٹوٹے ہوئے تیر کی طرح کھٹک رہا تھا جو قلب کے اندر رہ گیا ہو ——— میں وعدہ کرکے کر رہا ہوں ——— امیر خاں واقعی تم میرے دوست ہو

امیر خاں ——— مہاراج ——— فکر نہ کیجیے دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔

[امیر خاں جاتا ہے]

منظر اول - مجلس سوم

[مہارانا اودیپور اپنے عالیشان محل میں موجود ہیں۔ کرشن کنور کی نسبت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے]

چاند کنور - مہارانا اودیپور - مہارانی اودیپور

مہارانی - مہاراج - آخر میں کہتی ہوں - کرشن کنور کا بیاہ کب رچے گا۔

چاند کنور - مہاراج - اب تو کرشن کنور سولہ برس کی ہوگئی ہے کیا عمر بھر بٹھا رکھیے گا - بھابی سچ تو کہتی ہیں۔ کنیا کا دھن ہی بُرا ہوتا ہے - آخر آپ نے بھی کچھ سوچا ؟ کہیں سے کوئی بات چیت ہوئی ؟

مہارانی - چاند کنور، بات چیت کا کیا کہنا - جس گھر میں بیری ہوتی ہے وہاں ڈھیلے آتے ہی ہیں - جودھپور سے پیام سلام ہوئے ہیں ...

مہارانا اودیپور - تم سچ کہتی ہو، میں بھی اکثر ہی سوچتا رہتا ہوں - کرشن کنور کا اب بیاہ رچانا چاہیے اب تم ہی بتلاؤ کہ کس کے ساتھ کرشن کنور بیاہی جائے۔

چاند کنور - میں نے مہاراج بھیم سنگھ جودھپور والے کی بڑی تعریف سُنی ہے ——— میرے خیال میں تو کرشن کنور کو جودھپور کے سنگھاسن پر بیٹھنا چاہیے، یوں جو مرضی بھابی کی ———

مہارانی ——— میری رائے کیا، تم لوگ سوچ بچار کر کے طے کر لو ویسا انتظام کیا جائے مہاراج بھی تو اپنی منشا بتلاتیں۔

مہاراج - میری منشا تو سچ پوچھو بھیم سنگھ ہی کی ہے ———

چاندکنور - مہاراج میرا دل تو یہی چاہتا ہے ———

مہارانی - پھر پروہت کو بلاکر جنم پترا وغیرہ دکھا لیجیے -

چاندکنور - مہاراج یہ سمے اُتم ہے - پروہت جی کو بلا لیجیے -

[چاند بائی خادمہ کو پکارتی ہے اور منتری کو بلانے کے لیے کہتی ہے]

مہاراج - چاندکنور تم کو بہت جلدی ہے - واقعی اس بیاہ کا سہرا چاندکنور ہی کے سر رہیگا - پرمیشور انجام اُتم کرے -

مہارانی - بھگوان چاہیں انجام اچھا ہی ہوگا ——— [منتری آتا ہے]

منتری - اَن داتا ، حکم ؟

مہاراج - منتری جی ، یہ طے پایا ہے کہ مہاراج بھیم سنگھ کے ساتھ ہماری راجکماری کرشن کنور کا سمبندھ کیا جائے - آپ پروہت کو بُلاکر جنم پترا ، کُنڈلی سب بچار لیجیے اور ایک خط مہاراجہ بھیم سنگھ جی اس کو لکھ دیجیے کہ اُنکی بات پکی ہوگئی ہے اور فلاں فلاں مہینے میں پرمیشور چاہیے یہ سمبندھ ہو جائے گا -

منتری - اَن داتا ایسا ہی ہوگا -

[منتری باہر جاتا ہے اور چاندکنور بھی چلی جاتی ہے مہاراجہ اور مہارانی میں انتظامات کے متعلق گفتگو ہوتی ہے]

منظر اول - مجلس سوم

اودے پور کی حورنژاد ، راجکماری کرشن کنور حسن و جمال کا مجسمہ تھی - اُسکو دیکھ کر زمانۂ ماضیہ کی ہونہار پدمنی ، شکنتلا اور چندر کنور کی یاد تازہ ہو جاتی تھی - اُس کا نازک بدن ، لانبے گیسو ، شہابی رنگ ، گھنی بھویں ، سیاہ آنکھیں ، رخساروں کی ارغوانی رنگت ، ارباب کیف کے لیے کافی دلچسپی کا سامان تھا - اُسکے حسن خداداد کے افسانے نسیم سحری کے دوش پر دُور دُور پہونچ چکے تھے ، اور شعراکے دواوین خیر خواہی کی وجہ سے کرشن کنور کے عالم سوز و محشر آفرین حسن سے مملو تھے ——— چنانچہ اسوقت مہاراجہ بھیم سنگھ خوش ہے کہ راجپوتانہ کی سب سے زیادہ حسین عورت انکی انیس عشرت بننے والی ہے -

بھیم سنگھ - مہارانی جودھپور

بھیم سنگھ - ماتا جی - آپ نے کس کام کے لیے آج بُلایا ہے - میں ابھی شکار میں جا رہا تھا -

مہارانی۔ مہاراج اودے پور سے پتر ہو گیا

بھیم سنگھ (بیتاب ہوکر) اودے پور سے! پتر آ گیا؟

مہارانی۔ ہاں مہاراج پتر آ گیا۔ میں تم کو آشیرباد دیتی ہوں۔

بھیم سنگھ۔ ماتا جی۔ مہاراج اودے پور نے کیا لکھا؟

مہارانی۔ مہاراج انکو منظور ہے

بھیم سنگھ (خوشی میں) منظور! منظور!! کب تک؟

مہارانی۔ یہ کچھ نہیں لکھا ہے۔ پروہت جی سے بچار کر وقت مقرر کرینگے ―― اسی لیے میں نے اس قدر سویرے تم کو تکلیف دی تھی ―― جاؤ پھولو پھلو ――

بھیم سنگھ (ماں کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے) ماتا جی، میں آپ کی ان کوششوں کا کیا بدلہ دے سکتا ہوں۔

مہارانی۔ "تم نے میرے دودھ کا کیا بدلہ دیا ہے۔ جاؤ بھیم جاؤ، ماتا کی محبت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا۔ جو کچھ کیا میں نے اپنا حق سمجھ کر کیا ―― جاؤ سر اٹھاؤ ―― میرے شیر (ہاتھوں سے سر اٹھا کر اپنے سینہ پر رکھ لیتی ہے) میں آشیرباد دیتی ہوں ہمیشہ خوش رہو، پھولو پھلو ――" [مہاراجہ بھیم سنگھ جاتا ہے]

منظر اول مجلس چہارم

کرشن کنور۔ سیتا۔ سہیلیاں

راجکماری اودے پور ایک آراستہ کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اسکے چاروں طرف سہیلیاں جمع ہیں۔ وہ سب راجکماری کو چھیڑتی ہیں ―― راجکماری شرمندہ ہوتی ہے ―― آخر میں گانا شروع ہوتا ہے۔

سیتا راجکماری صاحبہ مبارک۔

دوسری سہیلی۔ راجکماری صاحبہ مبارک۔

تیسری۔ جودھ پور کی رانی ہونا مبارک۔

چوتھی۔ ہاں میں تو بھول گئی تھی۔ مبارک۔ رانی ہونا مبارک۔

پانچویں۔ مبارک ہو مبارک بھیم سنگھ کی پدمنی مبارک۔

سب سہیلیاں ۔ ہاں ہاں مبارک مبارک ۔ راجکماری صاحبہ مبارک ۔
راجکماری ۔ کیا مبارک مبارک لگا رکھی ہے (شرمندہ ہوکر) کوئی اور کام نہیں ہے ۔ ہٹو جاؤ ۔ واہ ہر وقت دق کرنا ۔ میں ماتاجی سے کہہ دوں گی ۔ سیتا تم نے کہاں کی ڈائنوں کو بلا لیا ہے
(آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر جھینپتے ہوئے)
راجکماری صاحبہ ۔ خفا نہ ہوجیے ۔ مبارک باد ایسے ہی دی جاتی ہے —— پرمیشور کریں آپ جودھپور کی رانی ہوں —— ہم لوگوں کے بھی دن پھر یں ۔
سب سہیلیاں ۔ راجکماری صاحبہ مبارک ۔ مبارک ۔
[آہ ۔ قدرت کھڑی سرہانے مسکرا رہی ہے ۔ طرفین کی مہر جواز "محضر نسبت" پر ثبت ہو گئی ہے ۔ صرف وقت کی موزونیت کا انتظار ہے —— اور طرفین اس غمناک ماتم نغمہ کو کرشن کنور کے پردہ میں مضراب حیات پر سننے کے لیے ہمہ تن تیار ہیں جو فطرت اُلگوانے والی ہے] ۔
سیتا ۔ اچھا بہنو! ہم سب مل کر ایک مبارک باد گائیں ۔ راجکماری کو خوب دق کریں —— ابھی تو موقع ملا ہے ۔
سب ۔ مبارک ۔ راجکماری صاحبہ مبارک [گانا ہوتا ہے]

منظر اول مجلس پنجم

منتری ۔ رانا بھیم سنگھ ۔ مہارانی ۔ طبیب شاہی ۔ مان سنگھ
[رانا بھیم سنگھ بہت سخت علیل ہیں ۔ مہارانی سراسیمہ ہے ۔ طبیب شاہی موجود ہے]
مہارانی ۔ حکیم صاحب بتلائیے میں بہت پریشان ہوں ۔ میرے بھیم کا کیا حال ہے —— جلدی کیجیے کیا آپ ماں کی ممتا سے واقف نہیں ہیں —— بولیے جلدی بولیے
حکیم ۔ مہارانی صاحبہ ۔ آپ واقف ہیں کہ مرض خطرناک ہے لیکن انشاء اللہ مہاراجہ اچھے ہو جائیں گے —— فکر نہ کیجیے —— "
مہارانی ۔ کوئی ناامیدی کی بات تو نہیں ہے ؟
حکیم ۔ میرے خیال میں ذرا بھی نہیں —— [منتری طبیب سے علیحدہ دریافت کرتا ہے]
منتری ۔ حکیم صاحب بتلائیے کیا حال ہے ۔ زندگی کی آس ہے یا نہیں ؟
حکیم صاحب ۔ منتری صاحب سچ پوچھیے تو یہ مرض لاعلاج ہو گیا ہے زندگی کی امید کم ہے —— (دم بخود ہے)

منتری ۔ کیا واقعہ ہے؟
حکیم صاحب ۔ یہ مذاق کا کونسا موقعہ ہے؟
منتری ۔ کیا میں راجہ مان سنگھ ولی عہد کو اطلاع دیدوں؟
حکیم صاحب ۔ ــــ ضرور ــــ حالت کو آج دو را ہو گئے ــــ اب تو چند گھنٹوں کا معاملہ ہے ــــ خدا کرے بچ جائیں ۔ میں تو یہی دعا کرتا ہوں ــــ خدا میری سُن لے ۔ ایسا راجہ تو جودھپور میں اب نہ ہوگا ــــ
مہارانی ۔ حکیم صاحب ۔ میرا بھیم کیا ہو گیا؟ ــــ دوا دیجئے
بھیم سنگھ ۔ (رُک رُک کر) اب ۔ کیا ۔ کیا فائدہ ۔ وقت ۔ وقت پورا ہو گیا ۔
(مہارانی رونے لگتی ہے)
حکیم صاحب ۔ فکر نہ کیجئے ، انشاء اللہ اچھے ہو جائینگے ۔ ضعف بہت ہے ۔ کوئی خاص بات نہیں ہے ۔
[مان سنگھ ولیعہد جودھپور آتا ہے]
حکیم صاحب ۔ راجکمار صاحب ۔ مزاج اچھا ہے ۔
راجکمار ۔ ہاں ۔ یہ تو کہیے ، کیا حالت ہے؟ مہاراج کیسے ہیں؟
[اسی عرصہ میں بھیم سنگھ کو استفراغ ہوا]
مہارانی ۔ مان سنگھ! دیکھو مہاراجہ کو کیا ہوا ہے؟ (مہارانی رونے لگتی ہے)
مانسنگھ ۔ ماتا جی ، میں بھی تو یہی دیکھ رہا ہوں ــــ (وہ بھی روتا ہے)
بھیم سنگھ ۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) ماتا جی ، ماتا جی ــــ (کہتے ہوئے ہچکی آتی ہے ۔ ۔)
ماتا جی ، ماتا جی ــــ (دوبارہ ہچکی آئی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا)
[رونا مچ گیا ۔ خبر مشہور ہو گئی]
بھیم سنگھ مہارانہ جودھپور چل بسے ، ولیعہد مان سنگھ راجگدی پر بیٹھ گئے ۔ ۔ ۔

منظر اول مجلس ششم

کرشن کنور ، بینا ، سہیلیاں

شب کے تین پہر گذر چکے ہیں ۔ چاند اپنے انتہائی جاہ و کمال سے کائنات کو سیم و زر آبی سے جگمگا رہا ہے ۔ شکست حسن کی فرماں روا " کرشن کنور " پائیں باغ میں سخت متحیر و متفکر و سراسیمہ بیٹھی ہے

اسکے پریشان کھلے ہوے بالوں سے فرشتہ تجلی (قمر) کی زریں شعاعیں شوخیاں کر رہی ہیں اور نسیم سحری کے خوش آیند سرد و لطیف جھونکے ساری کے آنچلوں سے اٹکھیلیاں کر رہے ہیں —— کرشن کنور چاندنی میں سر جھکائے ستار پر نغمہ سنجی شروع کرتی ہے —— اسکی آواز میں بلا کی کشش ہے کہ جملہ حاضرات محو ہیں۔ ایک عجیب دلفریب سکون فضائے لطیف میں جاری و ساری ہے۔ گویا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ساحرہ سحر کر رہی ہے اور اُسکے اثر سے کائنات کی روحیں جامد و ساکت ہو گئی ہیں دفعتاً وہ بے اختیاری سے مسکراتی ہے —— اُسکے صاف موتی سے زیادہ آبدار دانت بہت شان و شوکت سے چمکتے ہیں —— حاضرات کی آنکھوں کے سامنے ایک لحظہ برقی لہر بجلی سی کوندجاتی ہے —— آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ العظمۃ للہ۔ کہیں حسن کے دیوتا نے تو اوتار نہیں لیا ہے!

کرشن کنور سیتا سے کہتی ہے]

"سیتا" "سیتا" —— کچھ سنا؟

سیتا: راجکماری، حکم؟

کرشن کنور: سنو —— (کہتے کہتے آنسو جاری ہو گئے)

سیتا: راجکماری، کچھ کہیے بھی کیا ہوا؟ خیر ہے؟

سہیلیاں۔ اسی لیے تو رانی جی آدھی رات کو باغ میں آنے سے منع کرتی ہیں۔ ہو گیا —— شاید کسی چھیچی کا سایہ ہو گیا

سیتا: —— خاموش رہو —— راجکماری بولیے کچھ —— تو میں جا کر رانی جی کو خبر کرتی ہوں —— [جانے لگتی ہے۔ راجکماری پکڑتی ہے]

کرشن کنور: (روتے ہوے سسکیاں لیکر) میں اسی لیے تم لوگوں کو منع کرتی تھی کہ زیادہ خوشی نہ کرو —— دیکھا —— (روکر) —— انجام —— مہاراج —— سُرگ باش ہوے [سب سہیلیاں مغموم ہو کر کرشن کنور کے ساتھ غم میں شریک ہوتی ہیں]

اب سنا ہے ان سنگھ —— کا پیغام آیا ہے —— کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ —— مہاراج بیکنٹھ باشی کے بعد —— جو دھپور کے سنگھاسن پر راج کروں؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا —— کبھی نہیں۔ میں جو دھپور کبھی بھی نہ جاؤنگی چاہے ادھر کی سنسار اُدھر ہو جائے —— کیا راجستان کی دیویاں میرا ٹھٹھا نہ کریں گی ——

سیتا ۔ مہارانا کے گزر جانے کا ہم سب ہی کو افسوس ہے ۔ اُنکے بعد ―― جودھپور بے راجا ہے بڑی بے غیرتی ہے ۔ ایسے جو راجا رانی چاہیں ―― ہوگا وہی جو ایشور چاہیں ۔

کرشن کنور ―― تم کل پتاجی کو میرا یہ سندیس ضرور پہونچا دینا ۔

سیتا ―― کل میں نے رانی چاند کنور سے سُنا ہے کہ مہاراج جگت سنگھ کا بھی کوئی پتر آیا ہے ۔ سنا ہے مہاراج بیکنٹھ باشی کے بعد اس راجستان میں مہاراج جگت سنگھ سا سندر سجیلا سوا دوسرا نہیں ہے ۔ ――

کرشن کنور ―― "میں اپنی جان سے عاجز آگئی ہوں ―― کچھ ہو میں جودھپور نہ جاؤنگی ―― چاہے پران جائے ۔ سیتا ۔ سیتا ، سنو ―― یہ کُتے اسوقت کیوں بھونک رہے ہیں ―― میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے ―― رام خیر کرے کچھ آثار اچھے نہیں ہیں ――"

سیتا ―― راجکماری آپ ان وسواسوں کا چنتا نہ کیجیے ―― اب آپ محل میں چلیں ―― صبح کا ستارہ وہ دیکھیے (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) نکل آیا ہے ―― چلیے محل میں چلیے ―― آپ فکر نہ کیجیے ۔ میں یہ سندیس مہاراجہ کو بھور ہوتے ہی پہنچا دونگی ۔

کرشن کنور ―― سیتا جاؤ ―― نہیں ، سہیلیو تم جاؤ ―― سیتا تم سے باتیں کرتی میں ساتھ چلونگی ――

[خوبصورت مجمع منتشر ہوگیا ۔ گویا ستاروں کا جمگھٹ غائب ہوگیا اور آفتاب چمکنا شروع ہوا]
[کرشن کنور اور سیتا ، دونوں پیدل ٹہل کر گفتگو کرتی ہوئی چور دروازہ سے محل میں داخل ہو جاتی ہیں]

(پردہ)

منظر دوم ۔ مجلس اول

[مہارانا جودھپور کے انتقال سے اودے پور میں تہلکہ پڑ گیا ―― مہاراجہ جے پور اور مہاراجہ جودھپور (جانشین) نے پیامات دیئے ۔ یہی نہیں بلکہ سندھیا کی امداد مان سنگھ مہاراجہ جودھپور نے حاصل کی ۔ اور جے پور نے امیر خان نواب ٹونک کی امداد سے ایک دوسرے پر چڑھائی کر دی ۔ مان سنگھ کو شکست ہوئی ۔ راج پاٹ چھن گیا ۔ دوبارہ امیر خاں نے ہلکر کے خیال سے مان سنگھ کا ساتھ دیا اور اسکو گدی دوبارہ ملی ―― اسوقت مہاراجہ اودے پور دربار میں جلوہ افروز ہیں ۔ اُنکے وزراء اور امراء دربار میں]

میں موجود ہیں۔ مہاراجہ جودھ پور کا خط قاصد لاتا ہے]

وزیر۔ مہارانا اودیپور۔ مان سنگھ مہاراجہ جودھ پور کا خط

مہارانا۔ مہاراجہ جودھ پور کی موت نے میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ مہاراجہ جے پور کا پیام آیا ہے۔ خیال ہوتا ہے منظور کر لیا جائے۔ راجپوتانہ میں بھیم سنگھ کے بعد مہاراجہ جگت سنگھ کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔

وزیر۔ بجا و درست۔ مہاراجہ جگت سنگھ کا کیا کہنا۔ چندرمان ہیں۔

[مہاراجہ جودھ پور کا خط لے کر قاصد آتا ہے]

وزیر۔ اَن داتا۔ بڑا غضب ہوا

مہارانا۔ —— کیا —— ؟

وزیر۔ مہاراجہ مان سنگھ کا یہ پتر آیا (دکھا کر پڑھتے ہوئے) ہے اس میں تو ایک عجیب بات لکھی ہے۔

مہارانا۔ پڑھو کیا بات ہے میں بھی تو سنوں —— کیا لکھا ہے۔

وزیر۔ (پڑھ کر) "اکماری کرشن کنور کی نسبت جودھپور کے سنگھاسن سے ...... ہوئی تھی بھیم سنگھ سے نہیں ہوئی تھی۔ اب میں سنگھاسن پر ہوں، اس لیے میرا سمبندھ کرشن کنور سے ہوگا"

مہاراجہ۔ بتلاؤ۔ میں کیا کروں۔ یہ معاملہ عجیب مشکل ہو گیا ہے

وزیر۔ کچھ اور بھی میں نے سنا ہے، رام کرے جھوٹ ہو!

مہاراج۔ کیا —— کہو ——

وزیر۔ میں نے سنا ہے کہ مان سنگھ نے مہاراجہ سندھیا سے سہایتہ مانگی ہے —— اور اَن داتا مہاراج جے پور نے نواب ٹونک امیر خاں سے مدد مانگی ہے اُنکی فوج تو جے پور سے چل چکی ہے۔

مہاراج۔ اس معاملہ میں کیا کروں —— جودھپور کو کیا جواب دوں —— مشکل یہ ہے کہ کرشن کنور بھی جودھپور جانے کے لیے اب تیار نہیں ہے —— اچھا انکار لکھدو —— دیکھا جائے گا جو کچھ ہو ——

وزیر —— جواب لکھ دوں —— سخت خونریزی ہوگی۔ ہزارہا راجپوت سورما قتل ہوں گے۔ ریاستیں برباد ہو جائیں گی۔ ہزارہا بچے یتیم ہونگے —— ہزارہا پتی برتا استریوں کے سُہاگ ٹوٹیں گے —— جواب لکھدوں۔ میرے ہاتھ میں قلم ہے جو حکم ہو لکھ دوں ——

[ایک ہرکارہ خبر لاتا ہے کہ جے پور اور جودھ پور کی فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی]

مہاراج ——— کہہ دو ——— انکار۔ [قاصد جاتا ہے]

منظر دوم مجلس دوم

امیر خاں - جگت سنگھ - مان سنگھ

[قاصد رانا ادیپور کا جواب لیجاتا ہے۔ مان سنگھ کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جے پور کے شبستان شہی تک اس "پیکر ادا" کی خبر فسانۂ حسن سے اُڑ کر پہونچی۔ راجہ جگت سنگھ اس پیکر حسن کا دیدہ عاشق، اس عشق و عاشقی کا نغمہ جے پور کے شبستان شہی سے باہر نکل کر ادیپور کی تنگ و تاریک گلیوں سے گونجتا ہوا مہارانا ادیپور کے کانوں تک پہونچا ——— کرشن کنور کو بھی علم ہوا جودھپور کے مقابلہ میں جے پور کو ترجیح دی گئی ——— تفوق رنگ لایا ——— رقابت کی خوفناک آگ مان سنگھ کے سینے میں بھڑکی ——— دونوں ملطنتیں حسن و عشق کی جنگ آرائی میں مصروف ہو گئیں۔ نواب امیر خاں سرپنچ مقرر ہوئے ———[امیر خاں نواب ٹونک کا دربار ہے جو بحیثیت حکم اپنا فیصلہ صادر کرنے والا ہے۔ تمام والیان ریاست یا اُنکے نمایندے دربار میں موجود ہیں]

امیر خاں - راجہ جگت سنگھ۔ کیا میں نے آپ کی مدد کی تھی؟

جگت سنگھ - ضرور۔

امیر خاں - راجہ مان سنگھ - کیا میں نے آپ کی مدد کی تھی؟

مان سنگھ - مہاراجگدی آپ ہی کی کرپا سے ملی۔

امیر خاں - آپ دونوں میری بات مانیں گے؟

جگت سنگھ - میں تو آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں

مان سنگھ - میں تو احسانمند ہوں

امیر خاں - بس میری خوشی یہی ہے کہ آج سے لڑائی ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے ——— کیا آپ لوگ منظور کریں گے؟

جگت سنگھ - منظور

مان سنگھ کوئی شرط؟

امیر خاں - راجہ مان سنگھ - آپ کی لڑکی کا کیا نام ہے ؟
مان سنگھ - (حیرت سے) چندر کنور
امیر خاں - راجہ جگت سنگھ، آپ کی بہن کا کیا نام ہے ؟
جگت سنگھ (متعجب ہوکر) لیلا وتی -
امیر خاں - ان لڑکیوں کے متعلق جو کچھ میں کہوں، آپ دونوں کو منظور ہوگا ؟ وہ یہ کہ جے پور کے راجہ کی شادی راجہ جودھپور کی لڑکی سے ہو ---- اور راجہ جودھپور کی شادی لیلا وتی سے . ---- کیا آپ کو منظور ہے ؟
جگت سنگھ - مجھ کو جودھپور سنگھاسن کو اپنی بہن دینا منظور ہے
مان سنگھ - مجھ کو بھی منظور ہے -
امیر خاں - میرا فیصلہ یہی ہے - اب آپ لوگ اسی پر قائم رہیے - یہ وہ رابطۂ اتحاد ہوگا کہ آپ کی نسلیں مجھ کو دعاؤں سے یاد کریں گی اور کبھی بھی ان دونوں سلطنتوں میں جنگ نہ ہوگی - میں دعا کرتا ہوں کہ آپ لوگ خوش و خرم رہیں ....
مان سنگھ - یہ تو سب ہوا، لیکن کرشن کنور کا کیا حشر ہوگا ؟
امیر خاں - راجہ صاحب آپ کو اس معاملہ میں بولنے کا حق نہیں ہے . لیکن یہ خیال رکھیے کہ اس ناٹک کا آخری عبرتناک انجام وہی ہوگی -
[دربار برخاست ہوتا ہے مان سنگھ اور جگت سنگھ معانقہ کرتے ہیں اور باہر چلے جاتے ہیں]

منظر دوم - مجلس سوم

مہاراجہ اودیپور کا دربار ہے - ایک وفد سردار اجیت سنگھ کی سرکردگی میں امیر خاں کے سمجھانے بجھانے سے مہاراجہ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کرشن کنور کو زہر دیدیا جائے، ورنہ ریاست میں بغاوت پھیل جائے گی ---- اودے پور پر سارا راجپوتانہ حملہ کریگا ---- مہاراجہ خوفزدہ ہوکر امیر خاں کے اس نسخے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہوگیا

مہاراجہ اودیپور - سردار اجیت سنگھ - دیگر سردار - چاند کنور - کرشن کنور

[ایک ہرکارہ وفد کی آمد کی اطلاع دیتا ہے]

ہرکارہ - ان داتا - سردار اجیت سنگھ کچھ سرداروں کو لیکر آپ سے ملنے آئے ہیں ---

مہاراجہ ——— بلاؤ ——— [ہرکارہ جاتا ہے ۔ اور وفد کو بلا کر لاتا ہے]
مہاراجہ ۔ سردار اجیت سنگھ ۔ آج کیسے آئے ؟
اجیت سنگھ ۔ بہت ضرورت تھی ۔ حکم ہو تو عرض کروں ؟
مہاراجہ ۔ ضرور ۔ شوق سے بیان کرو ———
اجیت سنگھ ۔ مہاراجہ ۔ راجپوتانہ تباہ ہو رہا ہے ——— جنگ کے شعلے اب بھی نہیں بجھتے ——— ریاستیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں ۔ جنگ کسی طرح موقوف ہونا چاہیے ———
دیگر سردار ۔ ہاں مہارانا ۔ جنگ ضرور موقوف ہونا چاہیے ۔
مہارانا ۔ (تعجب سے یہ گفتگو سن کر) میں کیا کر سکتا ہوں ؟
اجیت سنگھ ۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ جنگ آپ کی راجکماری کرشن کنور کی وجہ سے ہے ۔ اگر یہ گلاب کا پھول مسل کر پھینک دیا جائے تو جنگ آج بند ہو سکتی ہے ۔
مہاراجہ ——— کیا ؟ کرشن کنور کا کیا قصور ؟
سب سردار ۔ مہارانا ۔ اُس کا حُسن ان جنگوں کا موجب ہے ۔ اُس کا قتل ملک کے لیے مفید ہے
مہاراجہ ۔ اپنی بیٹی کو میں کس طرح قتل کر دوں ۔ کسی نے یہ کیا ہے ؟
سب سردار ۔ آپ کو کرنا ہوگا (غصے میں چیخ کر) ہزاروں گھر برباد ہو جائیں، ہزاروں کے سہاگ لٹیں، ہزار ہا گھر بے چراغ ہوں، لاکھوں بچوں کو ترسیں ——— یہ ممکن ہے اور کرشن کنور کا قتل ناممکن ———
مہاراجہ (غصے میں) یہ ناممکن ہے ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔
سب سردار ۔ نہیں ہو سکتا ——— آپ کو دھوکا ہے ۔ ہم کرشن کو آپ سے زبردستی چھین کر نواب امیر خاں کے سپرد کر دیں گے ، جبکہ یہ فیصلہ ہے کہ بغیر کرشن کنور کی موت کے جے پور اور جودھ پور میں فیصلہ نہیں ہو سکتا ———"
مہاراجہ ——— کیا کسی اور طرح فیصلہ ممکن نہیں ہے ؟
سب سردار ——— نہیں ۔ یا تو سلطنت سے ہاتھ دھوئیے یا لڑکی کی محبت سے باز آئیے
اجیت سنگھ ——— آپ کو نواب امیر خاں والیٔ ٹونک کی طاقت کا حال معلوم ہے ——— ؟
مہاراجہ ——— کیا طاقت ہے ! ایک لٹیرے کی طاقت ہی کیا ہو سکتی ہے ——— جگر سنگھ نے اپنی کمزوری سے ٹونک کا علاقہ بخش دیا ——— بڑے طرم خاں بنے ———

میں اسے اٹھائی گیروں ـــــ کی گیدڑبھبکیوں میں آکر اپنی آنکھ کی پتلی راج دُلاری کو موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکتا ـــــ کیا ـــــ میں اپنی جوان لڑکی کے معصوم خون سے اپنے ہاتھ رنگوں ـــــ کیا پرماتما ـــــ پاپ ـــــ ان (اپنے ہاتھوں پر ہاتھ) سے ـــــ کیا جس لڑکی کو ہزاروں آرزوؤں، ہزاروں منتوں سے پالا ہے اُسکو اپنی آنکھوں سے تڑپتا دیکھوں ـــــ نہیں ـــــ نہیں، جاؤ ـــــ امیر خاں سے کہ دو جو وہ کرسکتا ہے کرلے ـــــ کیا تم بھی اپنے جگر کے ٹکڑے کو الگ کرسکتے ہو ـــــ کیا تم بھی اپنی آنکھوں کو خود پھوڑ سکتے ہو ـــــ کیا اپنے پیروں میں تم بھی خود کلھاڑی مار سکتے ہو ـــــ جاؤ ـــــ میں کنیا کے خون سے ـــــ اپنی تلوار کو شرمندہ نہیں کروں گا ـــــ ایک راجپوت سے یہ نامردی ـــــ ناممکن

اجیت سنگھ ـــــ کیا راجپوتانہ کی محبت آپ کو نہیں ہے ؟

مہاراجہ ـ ضرور ـــــ نہ ہونے کی وجہ ؟

سب سردار ـــــ کیا اودیپور کی راجدھانی سے آپ کو محبت نہیں ہے ؟

مہاراجہ ـــــ ضرور ـــــ راجدھانی کی سیوا کرنا میرا دھرم ہے ۔

اجیت سنگھ ـــــ کیا یہ منظور ہے کہ راجگدھ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے، اسکی گلیوں میں خون کی ندیاں بہ جائیں ـــــ ہزاروں پتی برت استریاں چتا کے بلند اُٹھتے ہوئے شعلوں میں بھسم ہو جائیں، کروڑہا بچے ایک دن میں بے ماں باپ کے ہو جائیں، ہزاروں گھرانے بے دیا ہو جائیں ـــــ تمام راجگدھ (رام نگر) تہس نہس ہو جائے ـــــ کیا آپ کو یہ منظور ہے کہ مہاراجہ کا راج راجگدھ سے اُٹھ جائے ؟ کیا کیسی بہادر کا راج اس بیکنٹھ میں رہتا ہوا دیکھ کر آپ کا دل نہ دُکھے گا ـ کیا ان بے وارثوں کو روتا ہوا دیکھ کر آپ کانپ نہ اُٹھیں گے ؟ کیا بھوکے اور فاقوں کے ماروں کی بدنصیبی پر آپ آرام سے سنگھاسن پر بیٹھ کر ـــــ راج کرینگے ؟ کیا ان راج دولاریوں ـــــ کنواری کنیاؤں کا پاپ آپ پر نہ پڑیگا جنکا ـــــ اب سنسار میں کوئی وارث نہیں ہے ـــــ کیا ایک پھول کی خاطر سارا باغ ـــــ سارا بیکنٹھ ـــــ پامال ہوتا ہوا آپ دیکھنا پسند کریں گے ـــــ کیا ان بے باپوں کی آہوں کا دھواں ـــــ بیکار جائے گا ـــــ کیا آپ ملک کی خاطر ایسی معمولی قربانی بھی نہیں کرسکتے ـــــ کیا آپ

کرشن کنور کو بلدان نہیں دے سکتے ـــــ کیا دیوتاؤں کے غصہ سے آپ ڈرتے نہیں ہیں
ـــ اگر ایسا ہے تو کرشن کنور کی موت کے بغیر راجپوتانہ کی ان قدیم اور مشہور سلطنتوں یعنی
جے پور اور جودھ پور میں صلح و آشتی نہیں ہو سکتی۔ سارا راجپوتانہ آپ کا دشمن ہے۔
[اس تقریر سے دربار میں سناٹا چھا گیا]

مہا رانا (بہت دیر خاموش رہنے کے بعد) لیکن کسی نے اپنی جوان لڑکی کو اپنے ہاتھوں ذبح کیا ہے؟
سب سردار۔ لیکن آپ کو کرنا ہوگا ـــــ ملک کی خاطر ـــــ مہا راجگان جودھ پور و جے پور کی عزت
کی خاطر کرشن کنور کو موت کی بھینٹ چڑھنا ہوگا ـــــ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ آپ
مجبور ہوں گے ـــــ"

مہا رانا (بہت دیر غور و خوض کے بعد) ـــــ اچھا ایسا ہی ہوگا ـــــ جاؤ۔ کل تم کو
کرشن کنور کی موت کی خبر ملے گی۔ (منظر بدلتا ہے) [وقفہ جاتا ہے]

چاند کنور: کرشن کنور

مہا رانا اودے پور نے اپنی بہن چاند کنور کو بلا کر کل معاملہ بیان کیا۔ محل میں تہلکہ مچ گیا
لیکن مہا رانا طے کر چکے تھے وہ ہو کر رہنا چاہیے تھا ـــــ کرشن کنور کو زہر دینے کے لیے مہا رانا
نے چاند کنور کو تجویز کیا۔ [چاند کنور ایک جام بلوریں میں زہر لیے ہوئے کرشن کنور کے سامنے
موجود ہے]

چاند کنور۔ کرشن کنور، یہ زہر ہلاہل کا جام بلوریں تم کو رانا کی عزت کی خاطر پینا ہوگا ـــــ اپنے پتا
کی لاج رکھ لو۔ اودے پور کی لاج رکھ لو۔ جلدی کرو میں تمہاری موت کی خبر سنانے کے لیے مقرر
کی گئی ہوں ـــــ"

کرشن کنور (زہر کا پیالہ ہاتھ میں لے کر)
[کس قدر حسرتناک منظر ہے کہ کشتہ عظمت شان یہ کہکر]
یہی بابا میری تقدیر میں لکھا تھا
[جام زہر اپنے ہونٹوں سے لگا لیتی ہے]

(پردہ)

بجرم عشق توام میکشند غوغا نیست ... تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ئیست
(مشیر احمد علوی، بی اے دہلی)

نظرے خوش گزرے

لکھنؤ کے مشہور شاعر صفی صاحب کی ایک جدید الطبع مثنوی پر اس پرچہ میں ایک تنقید شایع کی جا رہی ہے - اصل کتاب کے مطالعہ کی عزت ہمیں حاصل نہیں، مگر اس تنقید میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، اگر طباعت کی غلطی یا صاحبِ تنقید کی غلط فہمی کو اس میں دخل نہیں تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس مثنوی کی اشاعت سے صفی صاحب کی شہرت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا -

لکھنؤ کے ایک دوسرے نامور شاعر سے جب اس مثنوی کا ذکر آیا تو اُنھوں نے بھی دلی افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ صفی صاحب کی مثنوی غلطیوں سے بھری ہے -

صفی صاحب بڑے مشاق شاعر ہیں - اس وجہ سے یہ باور کرنا دشوار ہے کہ وہ اس قسم کے اسقام کو رفع کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں - پھر حیرت ہے کہ یہ مثنوی موجودہ شکل میں کیوں شایع ہونے دی گئی -

اگر کوئی خاص سبب عجلت کا تھا، اور نظر ثانی کا موقع نہیں ملا، تو اُمید ہے کہ صفی صاحب جلد سے جلد توجہ فرما کر غلطیوں کی اصلاح کر دیں گے، اور اگر بعض دوسرے شعرا کی طرح درجۂ اجتہاد حاصل کرنے کی غرض سے دانستہ اس قسم کے اغلاط کو رواج دینے کی کوشش کی گئی ہے، تو ہم باَدب اُنکے اس رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں -

صفی صاحب، ہندوستانی اکیڈمی کے بھی رکن ہیں، اور غالباً اُنکا انتخاب شعرائے لکھنؤ کی نمایندگی کی غرض سے کیا گیا ہے، اس لیے اُن پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے - اہلِ لکھنؤ کی اُن سے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ وہ انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب سے متاثر و مرعوب ہو کر زبان و ادبِ اُردو کی تخریب گوارا نہ فرمائیں گے -

---

گذشتہ ماہ ہمیامر میں مولانا محمد علی صاحب نے "فسانۂ غم دل" کے عنوان سے ایک مضمون اپنے اخبار ہمدرد کے متعلق شایع فرمایا تھا، جس سے ظاہر ہوا کہ ہمدرد کی وجہ سے گذشتہ دو سال (۱۹۲۶ و ۱۹۲۷) میں تیس ہزار سے زائد کا خسارہ اُنھیں برداشت کرنا پڑا - اور ہمدردانِ ہمدرد سے درخواست کی گئی تھی کہ اس خسارہ کی ادائی کے لیے امدادی رقوم بھیجنے کے علاوہ دو ہزار

جدید خریدار بہم پہونچائیں، ورنہ اخبار کو بند کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد ایک دوسرے مضمون کے سلسلہ میں مولانا نے بعض جملے ایسے تحریر فرمائے تھے جنکی بنا پر اندیشہ ہوا کہ اب ہمدرد کے جاری رہنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔

مولانا محمد علی صاحب نے ملک و قوم کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور جس سرگرمی و انہماک سے وہ نہایت ناموافق حالات میں اسکی کوشش فرماتے رہے ہیں کہ حصول آزادی کی راہ میں، خانہ جنگی اور باہمی منافرت کی بدولت جو سنگ گراں حائل ہے اُسکو دفع کرکے ہندوستان کو اُس شاہراہ پر لگادیں جس پر چل کر دنیا کی دوسری قومیں عزت و آزادی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ اُسکے لحاظ سے اُنکے لیے قطعاً محال تھا، کہ وہ اپنے اخباری کاروبار کے نظم و نسق پر پوری توجہ کر سکیں۔ اور ضرورت اسکی تھی کہ کوئی منتظم اُنھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دے۔ مگر ایسے کارکن کی غیر موجودگی کے باعث افسوس ہے کہ اُنکا اخبار جو اُنکی رہنمائی و ادارت میں قیمتی خدمات انجام دے رہا تھا، معرض خطر میں پڑ گیا۔

دلی خواہش تھی کہ وقت نکال کر دفتر ہمدرد پر کچھ وقت صرف کیا جائے اور جو تھوڑا سا کاروباری تجربہ ہے اُسکی بنا پر ایسے مشورے دیے جائیں کہ ہمدرد کے نقصانات میں کمی ہو اور آمدنی کے نئے وسائل پیدا ہوں، تاکہ اخبار بند نہ ہونے پائے۔

جنوری میں جب مولانا محمد علی صاحب سائمن کمیشن کے معاملہ کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے تو اُسوقت بھی یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا اور اُنھوں نے　اسے پسند فرمایا تھا، مگر ہر کام کے لیے ایک وقت معین ہے۔ چنانچہ ایسٹر کی تعطیل میں ایک کاروباری ضرورت سے "مشرق" کے دارالصدر میں حاضری دینے کا تہیہ تھا، سفر کی تیاری ہو چکی تھی کہ ہمدرد کا یہ آخری مضمون کسی دوسرے اخبار میں پڑھا اور طبیعت بے چین ہو گئی۔ راہِ سفر فوراً تبدیل کرکے دہلی حاضر ہوا، اور دو تین روز تک ہمدرد کے حسابات آمد و صرف دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر مناسب انتظام ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمدرد کو بند کرنا پڑے۔

ہمدرد کی اشاعت بہت زیادہ نہیں، اور اس زمانہ میں تقریباً تمام اخبارات کی حالت یہی ہے۔ تحریک ترک موالات کے زمانہ میں اور اُس سے پہلے جو جوش اہل ملک میں پیدا ہوا تھا، اب اُسکے رد عمل کا دور دورہ ہے۔ فرقہ وارانہ منافرت بڑھانے والے اخبارات اور ایسے جرائد جو قومی ضرورتوں اور اخبار نویسی کے اصولوں سے زیادہ، اخبار کی آمدنی کو عزیز سمجھتے ہیں، ممکن ہے کہ اس

سرو مہری کے زمانہ میں بھی خاصی اشاعت رکھتے ہوں ورنہ ہماتما گاندھی کے اخبارات تک کی اشاعت زیادہ نہ رہی۔ بہرحال ہمدرد کی اشاعت اسوقت بھی اتنی ہے کہ اگر اس میں کوئی خاص کمی بیشی نہ ہو تو مناسب انتظام کی صورت میں اسکے آمد و صرف کو برابر رکھنا ممکن ہے۔

مولانا محمد علی صاحب ہمدرد کے متعلق آخری فیصلہ کے لیے مولانا شوکت علی صاحب کی تشریف آوری کے منتظر تھے اس لیے قرار پایا کہ اُس موقع پر میں دوبارہ حاضر ہوں تاکہ تمام امور پر اُن کی موجودگی میں غور کیا جا سکے۔

اس اثنا میں دفعۃً مولانا محمد علی صاحب کے لیے علاج کی غرض سے ولایت جانے کا سامان غیب سے ہو گیا اور جب عبد الماجد صاحب کی حیثیت میں دوبارہ دہلی حاضر ہونے کا موقع آیا تو اس نئی صورتِ حال کی وجہ سے مجبوراً اُن تمام تجاویز کو عمل میں لانے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی جن پر مولانا محمد علی صاحب کے زیرِ نگرانی عملدرآمد ہونا چاہیے تھا۔ ادارت کی نگرانی ہونی تھی عبد الماجد صاحب کے سپرد اور دفتر و مطبع کے انتظامات مجھ سے متعلق ہیں۔ اپنی نااہلیت اور مشاغل کی کثرت کے باوجود یہ خدمت محض خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ کر کے قبول کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ہندوستانی ایکاڈیمی

صوبہ متحدہ نے کچھ رقم اس غرض سے علٰحدہ کر دی ہے کہ اس سے اُن اردو اور ہندی کتابوں کی طبع و اشاعت کی جائے جن کو ایکاڈیمی منظور کر لیگی۔ کتابیں خواہ کسی فن کی ہوں۔ جو لوگ اپنی کتابیں چھپوانا چاہتے ہوں، اُنکو اپنے مسودے ایکاڈیمی میں بھیجنا چاہیے۔ اور طے کرنا چاہیے کہ کن شرطوں پر وہ اشاعت کے لیے دینا چاہتے ہیں۔

مسودہ بالکل مکمل صورت میں اس طرح ہو کہ ایک صفحہ پر لکھا ہوا اور دوسرا سادہ رہے۔

مسودہ دفتر میں ۳۱- اگست تک پہونچ جائے

جنرل سکرٹری
ہندوستانی ایکاڈیمی - الہ آباد

روانہ کیا اور مجھے لکھا کہ اوس کی نیابت مین کام انجام کرون یہ شخص کپتان اوزلی بعد معزولی کے ہندوستان مین مجنون بھی ہو گیا تھا اور مشہور ہے مَن جُنَّ ساعةً يُعتقد جُنَّ أبداً (جو شخص تھوڑی دیر سودائی ہو وہ ہمیشہ سودائی سمجھا جاتا ہے) حرکات اور سکنات اوس کے بالکل جنون کے تھے۔ لندن مین پہونچتے ہوئے وزراے سلطنت کے پاس جا کے اوس نے درخواست کی کہ راقم کو بادشاہ نے عہدۂ سفارت سے معزول کیا ہے اور اوس کو سفیر مقرر کیا ہے چونکہ دو تین دن اوس تاریخ مین باقی تھے جو ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے دربار خاص کے واسطے مقرر ہوئی تھی غرض اوس کی یہ تھی کہ ملکۂ کشور اور شاہزادون کے ساتھ وہی مجاز حضوری کا ہوا اور راقم ممنوع حضوری سے ہو لیکن اوس کی درخواست پر کچھ اعتنا نہ ہوئی اور جو بندوبست دربار کا قرار پا چکا تھا کہ سوا ملکۂ کشور کے اور دونون شاہزادون کے اور راقم کے کوئی پانچوان آدمی مجاز حضوری کا نہین ہوگا وہ بدستور قائم رہا اسی عرصہ مین وہ ذات شریف یعنی کپتان اوزلی مجنون سرشار ہو گئے اور ہسپتال مین مقید ہوے۔ الغرض جب بادشاہ کے مقید ہونے کی خبر وہان پہونچی اور معلوم ہوا کہ ہندوستان مین نہایت زور اور شور سے غدر شروع ہو گیا ہے جو تدبیرین مقدمہ کی درستی کی ہم نے کی تھین وہ سب برہم ہو گئین اور پارلیمنٹ مین جو درخواستین گذری تھین اپنے مشاورین کی صلاح سے اون کو ملتوی کروا یا یعنی پیروی اوسکی موقوف کی حقیقت مین مقدمہ بادشاہ کا بہت او براہ تعاہت قراین سے ہم کو نہایت امید ظفر کی تھی مگر ہندوستان کے غدر نے اوس کو بگاڑ دیا پارلیمنٹ کے دونون ہوس کے بہت بڑے بڑے عمدہ ممبر ہمارے معین اور مددگار تھے اگر کچھ نہ ہوتا تو اس مین شک نہ تھی کہ دو تین لاکھ روپیہ بادشاہ کا درماہہ ہو جاتا اور شہر لکھنؤ اور حوالی اوس کے بادشاہ کے قبضہ مین رہتے چنانچہ ابتدا مین جب ہم ولایت گئے تھے ایک صاحب بہت جلیل القدر جو بورڈ آف کنٹرول مین تھے کہ کمپنی کے اوپر وہ محکمہ حاکم تھا اونھون نے بطریق پرایوٹ یعنی خانگی طور پر مجھ سے کہا کہ تم نے ناحق اتنا سفر دور و دراز اختیار کیا اب جو یہان آئے ہو تو کمپنی کے ساتھ بندوبست کرلو کمپنی بہت دولتمند ہے

پہونچنا کپتان اوزلی کا لندن مین اور کوشش کرنا وزیرون سے راقم کے عہدۂ سفارت سے معزول کرنے کی

ہندوستان کے غدر کے سبب سے اور بادشاہ کے مقید ہونے کے سبب سے مقدمہ کی پیروی کا موقوف ہونا

دو تین لاکھ روپیہ بادشاہ کا درماہہ کردیگی تم کو بھی تیس چالیس ہزار روپیہ کی جاگیر دے سکتی ہے یہ خیال خام ہے کہ پارلیمنٹ سے ظفر حاصل ہوسا اور چونکہ اول سلطنت کی ضبطی کے وقت ایک عہدنامہ گورنر جنرل نے بھیجا تھا اوس مین لکھا تھا کہ بارہ لاکھ روپیہ نقد بادشاہ کو دین گے اور تین لاکھ روپیہ کچھ سوار اور پیادونکی فوج جلوسی کے واسطے اور کئی لاکھ روپیہ اقربا اور ملازمین کی پنشن کے لیے مقرر ہوگا اور عزت اور وقعت بادشاہ کی بدستور رہیگی اس کے ساتھ زبانی یہ بھی پیغام تھا کہ اگر بادشاہ اِس پر رضی نہ ہون تو اضافہ ہوجاے۔ اور جب ہم لوگ لندن مین پہنچے تو کمپنی کی طرف سے یہ بھی تحریر گئی تھی کہ اگر بادشاہ چاہین تو چھ لاکھ روپیہ کا ملک واگذاشت کردو کہ اون کے قبضہ مین رہے۔ غرض یہ تھی کہ لکھنؤ اور حوالی اوس کے بادشاہ کے قبضہ مین رہین مگر پہلے تو ہندوستان کے غدر نے معاملہ خراب کیا۔ پھر بادشاہ کی بے صبری نے بالکل سب ابتر کردیا کہ وہ عہدنامہ جو پہلے آیا تھا اوس کو قبول نہ کیا اور بغیر کسی عہدنامہ کے بارہ لاکھ روپیہ قبول کرلیے جو غالباً اونھین کی ذات تک باقی رہین گے۔ اب کیفیت وہان کے معاملات وقوعی کی مین نقل کرتا ہون۔ جن تدابیر سے کہ وہان مروج مین ایسا سامان ہوا کہ سیکڑون عرایض تمام ممالک سلطنت برطانیہ اعظم سے پارلیمنٹ مین اور ملکۂ معظمہ کے حضور مین گذرنا شروع ہوے جس مین بعضی عرضیون پر پانچ ہزار اور دس ہزار آدمی۔ کے دستخط تھے کسی عرضی مین یہ درخواست تھی کہ بادشاہ اودھ پر نرا ظلم ہوا ہے اون کا ملک چھوڑ دینا چاہیے اکثر یہ درخواست تھی کہ بادشاہ اودھ کے مقدمہ کی تحقیقات عدالت اور انصاف سے کرنی لازم ہے۔ جب لکھنؤ مین غدر بہت طول ہوا اور سیکڑون بڑے بڑے افسر یہان مارے گئے۔ اب آرا علی العموم لوگون کے بدل گئے اور وہی بڑے بڑے ممبر دونون ہوس کے پارلیمنٹ مین جو ہمارے معین تھے یہ تقریر کرنے لگے کہ اگر لکھنؤ فتح نہ کیا جائے تو ہماری قوم کی ناک کٹ گئی اور جب علی العموم ہندوستان کی خبرین متضمن قتل اور خون بڑے بڑے افسرون کے خصوص جو یہان کے حمقا اور جہلا نے عورتون اور لڑکون پر ظلم اور ستم کیے تھے پہونچنی شروع ہوئین

[illegible]

[illegible]

سب نیابت عدل اور انصاف کے جو لوگون کے تھے منقلب ہوگئے۔ اب تقدیر نے اس حالت مین ہمارے اس مجمع سفارت مین فتور برپا کردیا۔ وہ دربار ملکہ کشور کا جو بڑی دھوم دھام سے ہر جمعرات کو ہوتا تھا اوس مین کمی شروع ہوئی اور ملکہ کشور کا جو عارضہ دایمی استحاضہ کا تھا اوس مین کچھ زیادتی ہوئی وہ نہایت گھبرائین اور اونھون نے قصد مراجعت کا کیا لندن سے روانہ ہوئین پارس فرانس کے دارالسلطنت مین پہونچی تھین کہ وہ وہان قضا کر گئین۔ تار کے ذریعہ سے جب لندن مین خبر آئی یہان سے راقم اور دونون شاہزادے وہان پہونچے اور اون کو دفن کیا پارس مین وہان کے شہنشاہ نے ایک قطعہ زمین کا اون قطعات سے جو مقابر کے واسطے وہان موضوع ہین محاط کر کے اور اوس کے وسط مین ایک کمرہ بنام نہاد مسجد بنا دیا ہے اور وہ قطعہ محاط سلطان روم کے سفیر کے اختیار مین چھوڑا ہے کہ جو شخص اہل اسلام مین سے اون کے ہمراہیون مین قضا کر جاے وہ وہان دفن ہو۔ مگر دستور کے موافق قیمت زمین کی جو متعلق مینوسپل یعنی شہر کے منتظمین سے ہے داخل کرنا ضرور ہے اور زمین کی قیمت کا یہ حال ہے کہ اگر برس دو برس کے واسطے.... مول لیوے تو قیمت کم دینی پڑتی ہے بعد برس دو برس کے ہڈیان مردون کی نکال کے کسی غار مین ڈال دیتے ہین اور زمین خالی کر لیتے ہین اور اگر ہمیشہ کے واسطے زمین مول لیوے اور قبر پر حظیرہ وغیرہ بنا دے تو قیمت بہت دینی پڑتی ہے غرض پہلے تو استجازت روم کے سفیر سے کی گئی بعد اون کی اجازت کے وہان لیجا کے دفن کیا اوس وقت تک اوس احاطہ مین کوئی مسلمان مدفون نہین ہوا تھا۔ چار پانچ گز کا مربع ایک قطعہ زمین کا دس ہزار روپیہ کو خرید کیا ارادہ تھا کہ اوس پر کوئی حظیرہ بنوایا جائیگا۔ چنانچہ صرف ایک سنگ مرمر کا چبوترہ وہان بنوایا گیا تھا اوس مین تین ہزار روپیہ خرچ ہوے۔ لاش ملکہ کشور کی اس دھوم دھام سے اوٹھائی گئی کہ اگر لکھنؤ مین ہوتین تو اس عظمت اور شوکت سے گمان نہین ہے کہ اوٹھتی۔ سلطان روم کے سفیر اور بادشاہ ایران کے سفیر اور بعضے وزرا فرانس کی

کیفیت حضور کی [illegible] ملکہ کشور کا پیرس مین [illegible] کا قضا کرنا

پارس مین شہنشاہ فرانس نے ایک قطعہ زمین کا احاطہ کر کے اوس کے وسط مین ایک مکان بطور مسجد کے بنایا ہے سلطان روم کے سفیر کے ہمراہیون مین جو مرے وہ اوس مین دفن ہو۔ وہان ملکہ کشور دفن کی گئیں۔

[illegible]

سلطنت کے اور بہت سے امرا اور اجلہ وہان کے ہمراہ تھے سیکڑون گاڑیان سواری کے ساتھ تھین اور اوس مہمانسراے سے جہان اقامت تھی مقابر تک قریب چار یا پانچ میل کا فاصلہ تھا چنانچہ برابر اوس رستہ مین دو رویہ تماشائیون کی ایک ٹٹی تھی مثل مشہور ہے کہ اگر تھالی پھینکتے تو سرہی سر جاتی بعد فراغت کے دفن سے جب اقامت گاہ پر پھر کے آئے اوس وقت شہنشاہ نے ایک کسی کو اپنے وزراؤن مین سے تعزیت کے واسطے بھیجا اور پیغام دیا کہ شہنشاہ چاہتے ہین کہ دونون شہزادون کو لیکے اون کے دربار مین راقم حاضر ہو چونکہ بدون توسط اپنی سلطنت کے سفیر کے اور بدون اون کی اجازت کے راقم کی راے مین حضوری اون کی دربار مین مناسب نہ تھی جواب اوس کا دوسرے روز پر ملتوی رکھا اور دوسرے دن راقم قصر سلطنت مین حاضر ہوا ایک بڑے وزراؤن مین شہنشاہ کے تھے جن کو ہماری ہندوستان کی اصطلاح مین عرض بیگی کہنا چاہیے اون کے پاس مین گیا جہان وہ بیٹھے تھے وہ بہت بڑا دالان تھا بیچ مین ایک پردہ پڑا ہوا تھا پردہ کے اوس طرف خود شہنشاہ بیٹھے تھے ظاہرا اس واسطے کہ جو کچھ گفتگو ہو وہ خود سنین - راقم نے عرض کیا کہ ہمارے شاہزادون کو شہنشاہ کے حضور مین حاضر ہونا نہایت اون کا موجب فخر اور اعزاز کا ہے اور گویا وہ تقریب نہایت مسرت کی ہے ایسی مسرت کی تقریب مین اپنی اس حالت ماتم داری مین جس مین اللہ تعالے نے اون کو مبتلا کیا ہے شہنشاہ کے دربار مین حاضر ہونے کو خلاف ادب سمجھتے ہین امید یہ ہے کہ اس عدم حضوری کو شہنشاہ معاف کرین - بعد اوس کے راقم نے عرض کیا کہ ملکہ کشور کا اس سفر دور و دراز مین آ کے شہنشاہ کے دار السلطنت مین قضا کرنا یہ دلیل اسپر ہے کہ وہ مستغاثی اون مظالم کی جو اون پر واقع ہوے خدا کی درگاہ مین شہنشاہ کے ذریعہ سے ہوئی ہین اس واسطے ہم لوگ امیدوار ہین کہ شہنشاہ ہم لوگون کی حق رسی کی اعانت فرماوین - مگر اعانت دوستانہ سلطنت برطانیہ اعظم کے ساتھ ہمین مطلوب ہے معاندانہ اعانت کی ہمکو حاجت

شہنشاہ فرانس کی طرف سے ایک وزیر تعزیت کے واسطے آیا اور راقم کو اور دونون شہزادون کو اپنے دربار مین طلب کیا

راقم کا قصر سلطنت مین وزیر فرانس کے پاس جانا اور بسبب ماتمداری کے شاہزادون کی حضوری کا عذر کرنا اور درخواست شہنشاہ کی مدد و اعانت کی بمقدمہ ...

نہین ہے بعد اوس کے راقم نے اونھین وزیر سے کہا کہ مین امیدوار ہون کہ اس کا جواب جو شہنشاہ دیوین اوس سے مجھکو اطلاع ہو دوسرے یا تیسرے دن ایک خط حسب الحکم شہنشاہ کے اونھون نے مجھے لکھا اوسکا عجب گول گول مضمون تھا خلاصہ اوس کا یہ تھا کہ شہنشاہ کی دل سے خواہش ہے کہ سارے عالم کے اقوام اپنے حق کو پہونچین اور اگرچہ اعانت ہماری موقوف بہت بکھیڑون پر ہے مگر شہنشاہ کو یقین واثق ہے کہ سلطنت باشوکت برطانیہ اعظم کی خواہ مخواہ خود دادرسی کریگی۔ بعد اوس کے جب ہمارے مرزا ولی عہد بہادر مجھ سے مخالف ہو گئے اونھون نے پارس مین جا کے اقامت کی جس کی شرح مین آیندہ لکھونگا ظاہرا وہان اون کے ہمراہیون نے فکر کی کہ شہنشاہ کے دربار مین اون کو لیجاوین اور درخواست اون کی شہنشاہ کے پاس پہونچی۔ اون کی ملاقات تنہا شہنشاہ نے منظور نہ کی اور پھر اونھین وزیر کا خط حسب الحکم شہنشاہ کے میرے پاس لندن مین آیا اس مضمون کا کہ آج کل شہنشاہ کو فرصت ہے۔ تم اپنے شاہزادہ کو لیکے دربار مین حاضر ہو۔ مگر اوس عرصہ مین راقم ایسا حوادث غیر متوقعہ مین مبتلا ہو گیا کہ نوبت وہان جانے کی نہ آئی الغرض وہان سے معاودت کر کے پھر لندن مین آئے یہان مرزا جواد علی سکندر حشمت بہادر نہایت مریض ہوے اور پورے ایک مہینے کے بعد ملکۂ کشور کے قضا کرنے سے وہ بھی قضا کر گئے اون کا عارضہ عجیب اور غریب ہوا۔ ایک دنبل اون کے مبرز پر بہت پچھلے دنون مین نکلا تھا کہ وہ ناسور ہو گیا تھا کبھی اوس کا بہنا بند ہو جاتا تھا تو پھر دنبل ہو کے پکتا اور پھوٹتا تھا پھر جب بہنے لگا تو تسکین ہو جاتی تھی ایکدفعہ اوسی ناسور نے بڑا زور کیا کہ اوس کے سبب سے تپ محرقہ ہوئی آخرش اوسی عارضہ مین قضا کر گئے۔ اس عارضہ کی اون کے کیفیت نہایت موجب عبرت ہے مرزا سکندر حشمت مزاج کے نہایت خلیق اور بامروت تھے اور بہت سے صفات سخن کے متصف تھے لیکن مذہب تشیع مین اون کو نہایت تعصب اور غلو تھا چنانچہ کمال جہالت سے اونھون نے ایک طشت چاندی کا یا تانبے کا بنوایا تھا اوس پر خلفاے ثلثہ رضوان اللہ علیہم اور اور

پیرس مین جانا اون کا اور درخواست ... شہنشاہ کا ... نظر

مرزا سکندر حشمت کا قضا کرنا ... مہینے کے بعد ملکۂ کشور کے قضا کرنے کے

بزرگان دین کے نام کندہ کروائے تھے اور وہ طشت ہمیشہ پاخانہ کی چوکی مین لگا رہتا تھا
قطع نظر اوس بے ادبی کے بزرگان عظام کے اسماسے حروف وہ جن سے قرآن شریف لکھا جاے
میرے زعم مین شیعہ کے مذہب مین بھی یہ بے ادبی اون حروف سے جایز نہ ہوگی۔ بہرصورت
میرے عقیدہ مین اللہ تعالے نے اوسی بے ادبی کے انتقام کے واسطے اون کے [illegible] پیدا
کیا اور اوسی عارضہ مین قضا کر گئے تاکہ اوروں کو عبرت ہو واللہ علی کل شئی قدیر۔ الغرض اون کی
لاش کو راقم لندن سے پارس مین لے گیا اور اون کو بھی اوسی دھوم دھام سے جو ملکۂ کشور کی
لاش کے اوٹھانے مین ہوئی تھی اونھین کی ماں کے پہلو مین دفن کیا اور جب ہم لوگ سب
لندن مین پھر کے آئے۔ اب راقم عجب تشویش اور تردد مین مبتلا ہوا مفسدون نے ابتدا ہی مین
مرزا ولیعہد بہادر کو اور ملکۂ کشور کو میری طرف سے برہم کر رکھا تھا مگر صرف مرزا سکندر حشمت
البتہ مجھ سے موافق رہے اور وہ دونون بہت منحرف تھے اور انواع طرح کے وہان مفاسد برپا کیے
کہ شرح اون جزئیات کی بہت طول ہے لیکن بادشاہ کے احکام تاکیدی پہونچنے کے سبب سے کچھ
کسی کی چل نہ سکی تھی۔ اب ملکۂ کشور کے اور جنرل سکندر حشمت کے قضا کرنے سے ولیعہد جو
شروع شباب مین تھے یعنی سترہ یا اٹھارہ برس کی اون کی عمر تھی مفسدون نے اون کا
مزاج میری طرف سے برہم کرنا شروع کیا۔ ملکۂ کشور کا تو جو کچھ مال جواہرات اور نقدی تھا
وہ تو سب اون کے ہمراہی چکھ گئے تھے۔ اب درپے ہوے کہ جنرل سکندر حشمت کا مال اور
کچھ نقد روپیہ بادشاہی جو مقدمہ کے مصارف کے واسطے جنرل صاحب کی تحویل مین تھا
اوس کو بھی اوڑا دین۔ چونکہ مین نے خود کلکتہ سے روانگی کے وقت تحویل کا اپنے اختیار
مین لینا قبول نہین کیا تھا اس واسطے بادشاہ نے جنرل صاحب کو سب روپیہ سپرد کیا
تھا۔ اب مین یہ سمجھا کہ اگر مین اوس کی حفاظت نہ کرون تو بادشاہ مواخذہ کرینگے اس واسطے جو روپیہ
جنرل صاحب کی تحویل مین باقی تھا اوس کو اور کل اونکے اپنے اسباب کی فہرست لکھوا کے اپنے
قبضہ مین کیا اور ملکۂ کشور کے یہان کے لوگون نے بھی چاہا تھا کہ اُن کے متروکات کی بھی مین فہرست

مفسدوں نے مرزا ولیعہد کا مزاج میری طرف سے برہم کیا

لکھواؤن لیکن اوس مین مین نے مداخلت نہ کی اس واسطے کہ وہان تغلیات علانیہ تھے کہ سچے جواہرات کے عوض مین جھوٹے رکھے گئے تھے اور اون کی سرکار کے نقدی کے حساب مین جرنل صاحب کی زندگی مین ایک بزرگوار آٹھ ہزار روپیہ نقد داخل کرنے تھے اور ایک فرد حساب کی سائھ ستر ہزار روپیہ کی دیتے تھے اس شرط پر کہ اون کو فارغ خطی لکھدی جاے چونکہ مدات اوس حساب کے سب مہمل تھے میرے مشورے سے جرنیل صاحب نے فارغ خطی دینے سے انکار کیا اونھون نے جو روپیہ داخل کرنے تھے نہ دیا اب جرنل صاحب کے قضا کرنے کے بعد پھر مجھ سے اونھون نے درخواست کی کہ اگر فارغ خطی مین لکھدون تو وہ روپیہ داخل کرین۔ مین نے جواب دیا کہ رسید البتہ اوس روپیہ کی مین دونگا اور حساب اونکا داخل کیا ہوا بادشاہ کے پاس بھیجدونگا اگر وہان سے حکم فارغ خطی دینے کا آویگا اوس وقت مین فارغ خطی لکھدونگا۔ غرض اونھون نے وہ روپیہ بھی نہ دیا۔ اور چونکہ مرزا اسکندر حشمت کی سرکار مین چندان غبن اور تصرف نہ تھا اوس کو مین اپنے اختیار مین لایا۔ اب مفسدون نے مرزا ولیعہد بہادر کو سمجھایا کہ سب مال و اسباب مرزا سکندر حشمت کا وہ مجھ سے طلب کرین مین نے اون سے عرض کیا کہ اس قدر توقف فرماۓ کہ بادشاہ کے پاس سے جواب آوے سب مال و اسباب تو آپ ہی کا ہے آپ گھبراتے کیون ہین مفسد لوگ جانتے تھے اور اون کو خود بھی یقین تھا کہ بادشاہ اون کی بے اختیاری اور میرا اختیار رکھین گے اور سب لوگون سے محاسبہ سمجھنے کا مجھے حکم آویگا تو وہ سب چاہتے تھے کہ قبل حکم بادشاہ کے آنے کے جو کچھ ہے اوس کو اوڑا پوڑا دیجیے مجھ پر جبر کیا جب مین نے نہ قبول کیا تو جھٹ عدالت مین میرے نام پر نالش کروادی مین نے جواب دہی مین یہی لکھا کہ مین منتظر بادشاہ کے حکم کا ہون اور بدون بادشاہ کے حکم کے مجھے احتمال بادشاہ کی بازپرس کا ہے۔ لیکن ظاہر مین راقم شخص اجنبی تھا ولیعہد کے موجود ہوتے ہوے مجھے جرنل صاحب کے متروکات پر کچھ استحقاق نہ تھا اور ہندوستانی رئیسون کے دستورات سے وہان کے لوگون کو کچھ اطلاع نہ تھی صرف بقدر میرے درماہہ کے اور میرے ہمراہی عملہ کے بابت چھ مہینے آیندہ کے حاکم عدالت نے

[illegible]

میرے ہاتھ مین چھوڑ کے حکم کیا کہ سب نقد عدالت مین جمع کردو اور سب مال و اسباب ولیعہد کے سپرد کر دینے کا حکم کیا چونکہ سب جانتے تھے کہ عنقریب بادشاہ کا حکم میرے تفویض اور اختیار کا آویگا ولیعہد کو بہکا کے سارا مال و اسباب لیکے لندن سے روانہ ہوگئے اور پارس مین جا کے اقامت کی۔ بعد اون کی روانگی کے بادشاہ کا حکم میرے نام پر سب مال و اسباب ملکۂ کشور کا اور جرنیل سکندر حشمت کا اپنے اختیار مین لینے کا اور مواخذہ اور محاسبہ سب لوگون سے کرنے کا اور ولیعہد کی حفاظت کا اور مفسدون کو اون کے پاس سے اخراج کرنے کا پہونچا اور گورنر جنرل کو بادشاہ نے خط لکھا کہ ولایت کے حکام کو اطلاع کرین کہ وہ ہر طرح سے میری اعانت کرین مگر اب کیا فایدہ ولیعہد مع سب مفسدون کے وہان سے چلے گئے تھے اگرچہ ممکن تھا کہ مین پارس مین جا کے مفسدون کی دارو گیر کرتا مگر ایک تو آپس کے نزاع کو ایسی حالت نازک مین طول کرنا کہ دوسرے سلطنت تک نوبت پہونچے اور ولیعہد کے توجب بدنامی ہو مناسب نہ تھا دوسرا یہ امر کہ میرے پاس ایک حبہ باقی نہ رہا جو کچھ تھا ولیعہد لے کے چل دیے مین خود وہان مبتلاء عسرت مصارف مین ہوا پارس مین جا کے مقدمے لڑانے کی کس کو طاقت تھی مقدمہ کا صرف تو جدا رہا مین اپنے مصارف ذاتی مین تنگ ہوا اور نوبت قرض لینے کی پہونچی اور اسی مجبوری سے مین جعلسازون کے ہاتھ مین پھنس گیا اور چونکہ اوس ملک کے جعلسازون اور فریبیون مین ہمارے ملک کے جعلسازون سے زمین آسمان کا فرق ہے اور میرا گمان یہ ہے کہ فریبی اور جعلسازون کو وہی پہچانے گا جو خود بھی اوس کوچہ سے عاری نہ ہو اور ہمارے ملک کا کیا ہی کوئی تجربہ کار کیون نہو اون ممالک مین نئے تجربون کی حاجت ہے اس سبب سے میرا پھنس جانا اون کے ہاتھ مین محل تعجب نہ تھا الغرض جب مین ایسی تنگی اور عسرت مین مبتلا ہوا جس شوکت اور عظمت سے وہان قریب دو برس کے گذرے تھے دفعۃً مصارف اوس کے موقوف کر دینا عقل کے اور مصلحت کے خلاف معلوم ہوا اپنی جو کچھ جایداد ذاتی نقد کی جنس سے تھی

ولیعہد سب مال و اسباب لیکے لندن سے پارس گئے

بادشاہ کا حکم پہونچا سب مال لینے کا اور ولیعہد کی حفاظت اور مفسدون کے اخراج کا

راقم کا پھنسنا جعلسازون کے ہاتھ مین

وہ سب خرچ ہوگئی ایسے وقت مین بعضے ایسے خیر طلب محبت سے اور اعانت سے پیش آئے کہ
مجھکو نہایت ممنون کیا ایک صاحب ان مین سے ایسے تھے کہ ہندوستان مین وڑی ناموری کے عہدہ
پر تھے اور لاکھون روپیہ کما کے یہان سے لے گئے تھے اگرچہ ہندوستان مین مجھ سے اور اونسے ملاقات
نہین ہوئی تھی مگر اون کی ناموری کلکتہ مین راقم نے بہت سنی تھی اور لندن مین بہت بڑے بڑے
امور لوگون کی آمد و رفت اون کے یہان تھی وہ بھی لوگون کے یہان آتے جاتے اور نامور لوگ بھی اونکے یہان آتے جاتے تھے
بعض بعض پالیمنٹ کے سردارون سے وہ ذریعہ میری ملاقات کے ہوے خواہ اپنے یہان دعوت کر کے
اون کو بلایا اور مجھے بھی شریک کیا یا وہ خود اون کے یہان مدعو ہوے اور مجھکو مدعو کروایا اور
بہت سی تدبیرین ہمارے مقدمہ کی درستی کی اونھون نے کین ایسے وجوہ سے کسی طرح کا شبہہ
جعل سازی کا اون کی طرف سے میرے دل مین نہ آیا۔ اور جب میرا ارادہ ہوا کہ کچھ اپنا اسباب
منقولہ رہن یا بیع کر کے کچھ روپیہ بہم پہونچاؤن۔ اونھون نے کہا استغفراللہ اسباب کے رہن اور بیع
کی کیا حاجت ہے جس قدر روپیہ مطلوب ہے ہم بے تکلف لے آوین گے چونکہ اوس وقت
مجھے پانچ ہزار روپیہ مطلوب تھا پانچ قطعہ کاغذ اسٹام کے اونھون نے پیش کیے جس کو
وہان کی اصطلاح مین بل آف اکسچنج کہتے ہین اس غرض سے کہ سو سو پونڈ کے واسطے کہ ہزار ہزار
روپیہ [illegible] ے ایک ایک بل ہوگا اسکو دستخط کر دیجیے ہم روپیہ ابھی لے آتے ہین۔ میرا گمان ہو
کہ وہ روپیہ اپنے گھر سے دیتے ہین مطلق جعل سازی کے ارادہ کا وہم بھی نہ تھا۔ چونکہ وہان
کے دستورات سے بالکل ناواقفیت تھی اور بل آف اکسچنج کا حال بھی یہی سنا تھا کہ سادے کاغذ
پر لوگ دستخط کر دیا کرتے ہین اور قرض دینے والے اس نظر سے سادے کاغذ پر دستخط کرواتے ہین کہ
اگر قرضدار کچھ ادا ے قرض مین بد دیانتی کرے تو وہ بھی رقم قرض کی بڑھاوین خصوص جب اجنبی
آدمی قرض کا خواستگار ہو تو ظاہرا اکثر ایسا کیا کرتے ہین۔ اور اصل یہ ہے چونکہ اون لوگون پر نہایت اعتماد
ہوگیا تھا اور وہ دو آدمی سالے بہنوئی تھے اور اون کی بی بیان سب بہت بے تکلف راقم کے
ساتھ ہوگئین تھین وہ سب اور اون کے لڑکے بالے سب مجھ سے بہت محبت کرتے تھے کسی طرح کا کھٹکا

اور شبہ جعل اور فریب کا میرے دل مین نہ رہا اور اوس وقت یہ بھی مفصل مجھے معلوم نہ تھا کہ کس مقدار کا اشٹام کتنے قرض کے واسطے وہان درکار ہوتا ہے کچھ اس کا بھی تجسس نہ کیا بالکل اونھین لوگون کے اعتماد پر چھوڑ کے اون پانچون قطعہ اشٹام پر اپنے دستخط کر دیے اور اونھون نے فوراً پانچ ہزار روپیہ لادیے اوسکے بعد پھر مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ بتدریج چھ ہزار روپیہ اور اونھون نے لادیے اور ابکی دفعہ یہ بھی درخواست نہ کی کہ کسی کاغذ پر مین دستخط کرون اس عرصہ مین بادشاہ نے قریب ساٹھ ہزار روپیہ کے گورنر جنرل کی معرفت مجھے بھیجے۔ جب یہ روپیہ آیا تو راقم نے ایک چٹھی اون کے نام پر لکھی اور بہت شکریہ اون کی محبت اور اعانت کا لکھ کے لکھا کہ کل مع اون کاغذات کے جو مین نے دستخط کر دیے ہین آپ تشریف لائیے مین قرض کا روپیہ ادا کرون اونھون نے کہا کہ وہ کاغذات تو حسب الرسم ہم نے تم سے لکھوا لیے تھے کچھ فکر اس کی حفاظت کی نہین رہی وہ گم ہو گئے ملتے نہین ہین تب فی الجملہ میرے دل مین کھٹکا پیدا ہوا مین نے اصرار اون کی واپسی پر کیا۔ میرے بہت اصرار پر اونھون نے کہا کہ تم گھبراتے کیون ہو اگر کچھ تمھارے دل مین شبہ پیدا ہوا ہے تو ہم اوسی طرح کے سادے کاغذ تم کو دستخط کر کے دیدیوین اگر ہماری طرف سے کچھ بد دیانتی ہو تو تم بھی جو چاہو اون کاغذات پر جو ہم دستخط کر کے دیوین لکھ لیجیو راقم اس امر پر مطمئن ہو گیا۔ جب اونھون نے اوسی طرح سے سادے کاغذ مجھکو دستخط کر کے دیے مین نے وہ گیارہ ہزار روپیہ ادا کر دیا اور پھر بدستور وہی صحبت اور ملاقات باہم رہی۔ اب کچھ تھوڑی سی کیفیت بادشاہ کی طرف کی لکھنا واسطے انتظام سوانح نگاری کے ضرور ہے جب ٹیلیگراف کے ذریعہ سے خبر بادشاہ کے مقید ہونے کی پہونچی اور سب اخبارون مین چھپا کہ بادشاہ بلوائیون کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس سبب سے مقید ہوے راقم فوراً انڈیا ہوس جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی کچہری کا نام تھا وہان گیا۔ اوس عرصہ مین مسٹر منگل نام ایک صاحب چیرمین کورٹ آف ڈائرکٹرز کے تھے جو ہندوستان مین گورنر جنرل کے سکرٹری بھی رہے تھے اون سے جا کے پوچھا کہ بادشاہ ہمارے کیون قید ہوے آیا کچھ جرم اون سے واقع ہوا یا صرف احتیاطاً پہلے تو اونھون نے کہا اب تک کوئی خبر ہمارے پاس

[illegible]

نہین آئی بعد رد و کد کے کہا صرف احتیاطاً مقید کیا ہے۔ مین نے عرض کیا بہت مناسب ہوا
لیکن مکاتبات ہمارے ساتھ اون کے جاری رہین اور بادشاہ پر تکلیف کسی نہج کی قلعہ مین نہو
دونون امر کو قبول کیا مگر مکاتبات کے بارہ مین یہ شرط کی کہ کھلے ہوے خطوط ادہر سے بہی اور ادہر سے
بہی آوین جائیں راقم نے ایک عرضی اوسی وقت بادشاہ کے حضور مین اس مضمون کی لکھی کہ حضور بے تکلف
جو کچھ وہان واقع ہو لکھ سکے اوسی طرح سے کھلا ہوا خط گورنر جنرل کے پاس بھیجدیا کیجیے اور کسی امر
کے لکھنے مین خوف اور دریغ نہ کیجیے۔ اور قلعہ مین تشریف رکھنے سے کچھ گھبرائیے نہین جو کچھ ہوا
اوس وقت مین بہتر ہوا۔ غرض بادشاہ نے جب تلک قلعہ مین تشریف رکھی برابر میرے عرایض
اون کے پاس ہر میل مین یعنی جو ڈاک ہندوستان کی جاتی تھی پہونچا کیے۔ اور بادشاہ کے حکمنامہ
میرے پاس آتے رہے اس عرصہ مین کمپنی کی حکومت ہندوستان سے موقوف ہوئی جس کی
شرح چوتھے باب مین ہو چکی اور لارڈ اسٹانلے وزیر ہندوستان کے مقرر ہوے تھوڑے عرصہ کے
بعد جب لکھنؤ کے فتح ہونے کی خبر بلوائیون کے ہاتھ سے پہونچی تب راقم نے بادشاہ کی رہائی کی وزرا
سے درخواست شروع کی امروز فردا کا جواب ہوا کیا۔ اتنے مین وزرا کنسرویٹو پارٹی کے معزول اور
لبرل پارٹی کے وزرا مقرر ہوے اوس وقت لارڈ اسٹانلے جو وزیر ہندوستان کے
تھے اونھون نے سرفترا سے کیلے کے نام جنھون نے ہماری درخواست استغاثہ کی پالیمنٹ مین
پیش کی تھی اور وزراے معزول کے ساتھ اٹرنی جنرل تھے کہ وہ بھی ایک وزارت کا
منصب ہے ایک چٹھی لکھی اس مضمون کی کہ آپ کی ڈاک جو ہندوستان سے آئی ہے
اوس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کی رہائی زیر تجویز تھی یقین ہے کہ اگلی ڈاک مین خبر
اون کی رہائی کی آویگی اور جو وزیر میری جگہ پر مقرر ہوا ہے اوس کو بادشاہ کے واسطے معقول
بندوبست کرنے کا مین نے سمجھا دیا ہے اونھون نے وہ چٹھی اپنی چٹھی مین ملفوف کرکے میرے پاس
بھیجدی راقم نے فوراً نقل اوس کی اپنی عرضی مین بادشاہ کے پاس روانہ کی اور لکھا مجھے امید ہے
کہ یہ میری عرضی قصر سلطانی مین حضور کے پاس پہونچیگی مین امیدوار ہون کہ بمجرد قلعہ سے باہر

وزیر ہندوستان کی چٹھی کہ بادشاہ کی رہائی زیر تجویز تھی اگلی ڈاک مین خبر رہائی آویگی

تشریف لانے کے مجھے اطلاع ہو کہ مین مقدمہ کی پیروی پھر شروع کرون - پہلا حکمنامہ میرے پاس
پہونچا کہ بادولت قلعہ سے باہر آئے اب تم مقدمہ کی پیروی شروع کرو - اوس کے دو ہفتہ کے
بعد ایک حکمنامہ پہونچا کہ کچھ ضرورت تمھارے حاضر ہونے کی یہان واعی ہوئی فورًا اپنے
تئین یہان پہونچاؤ معلوم ہوا بادشاہ نے پنشن قبول کرنے کی گورنر جنرل کو درخواست
دیدی اور چونکہ اوس کا عطا وہان سے محول میری معزولی پر عہدۂ سفارت سے ہوا تیسرا
حکمنامہ میری معزولی کا جاری ہوا اور ظاہر اگورنر جنرل کی درخواست سے اخبارون مین
اشتہار دیا گیا کہ فلانا شخص عہدۂ سفارت سے معزول ہوا کوئی اوس کی درخواست اور
اُس کا دعوے بادشاہ کی طرف سے کسی محکمہ مین لایق پذیرائی کے نہین ہوگا اب راقم آمادہ مراجعت
کا ہوا تب معلوم ہوا کہ ہمارے احباب نے اون پانچون قطعۂ اسٹام مین جعل کیا ہے - ایک قطعہ
پر چھ ہزار پانسو پونڈ کا ایک بل آف اکسچنج کا بنا کے ایک شخص سے روپیہ لے لیا جسکا
پینسٹھ ہزار روپیہ ہوا اور اوس شخص نے فورًا عدالت مین استغاثہ اوس کا میرے
اوپر پیش کردیا اور چار قطعہ پر ہزار ہزار پونڈ یعنی دس دس ہزار روپیہ کا بل آف اکسچنج
بنایا مفصل ساری کہانی اس استغاثہ کی لکھنا ناحق ایک دردسر ہے - خلاصہ یہ ہے
کہ سب استغاثون کی جوابدہی کے سبب سے پانچ چھ برس مین گویا وہان مقید ہوگیا پہلا استغاثہ
جو پیش ہوا اوس مین جعل بخوبی ثابت ہوا اور چیف جسٹس عدالت کامن پلی نے باتفاق ارباب
اسپیشل جیوری کے تجویز کیا کہ اوس مقدمہ مین جعل بھی ہوا اور مدعی نے باوصف جعل سے
آگہی کے روپیہ دیا اس واسطے مقدمہ کو ڈسمس کیا مگر مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست
کی وہ اوسی عدالت کے اجلاس کامل مین پیش ہوئی - ایک دو اس عدالت کے حاکم
کی راے میرے مخالف تھی اس سبب تجویز ثانی منظور ہوگئی - اتنے مین ایک اور شخص
نے دس ہزار روپیہ کی نالش کی وہ بھی مقدمہ مدعی کی غیرحاضری عمدی سے نن سوٹ ہوا مگر
اوس کو اختیار پھر استغاثہ کا حاصل تھا اور اول مقدمہ مین جو حکم تجویز ثانی کا ہوا تو اوسی حاکم کے

بادشاہ نے پنشن قبول کر کے گورنر جنرل سے سفارت کی معزولی

بیس ہزار روپیہ کے ادا کرنے کا الزام بیجا اور پانچ استغاثہ جو عدالت مین دائر ہوئین

تجویز ثانی کی درخواست منظور ہوئی اور دعوی مدعی کا غیرحاضری سے خارج ہوا

سامنے جس کی راے کچھ میرے مخالف تھی اور ایک دوسری اسپیشل جیوری کے سامنے ایک برس کے بعد پہلے فیصلہ سے پیش ہوا اور پھر نئے سر سے تحقیقات شروع ہوئی ابکی دفعہ بارہ آدمیون نے ارباب جیوری مین سے یہ تجویز کیا کہ اس مقدمہ مین جعل ہوا ہے مگر گیارہ آدمی متفق تھے کہ مدعی مقدمہ کا جعل ہونے سے آگاہ تھا صرف ایک شخص اس امر مین مختلف الراے ہوا اور اوس کے ذہن مین یہ جما کہ مدعی کو جعل کی اطلاع نہ تھی اور غالب گمان ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص مدعی کا جانبدار ہو گیا۔ موافق دستور کے ارباب جیوری آدھی رات تک مقید رہے کہ ایک امر پر متفق الراے ہو جائین وہ ایک شخص ہرگز اس امر پر متفق نہ ہوا اوس جیوری کی برخاست ہو گئی اور حکم ہوا کہ پھر نئے سرے سے مقدمہ کی تحقیقات ایک اور نئی جیوری کے سامنے ہو۔ اس عرصہ مین میری طرف سے بڑی عدالت چنسری مین درخواست ہوئی تھی کہ تینا پانچون بل آف اکسچنج کے جو ایک شخص نے جعلی بنائے ہین وہ عدالت مین طلب ہو کے باطل کیے جاوین۔ یہ دعوے ایک حاکم ماسٹر آف رال کہلاتے ہین اون کے محکمہ مین پیش تھا پہلے اونھون نے صدور حکم کا اوس درخواست پر اوس پہلے دعوے کے ختم ہونے پر ملتوی کیا۔ جب اوس دعوے کی وہ نوبت پہونچی جس کا ذکر ہم نے کیا ہے تب اونھون نے وہ چار بل جو دس دس ہزار روپیہ کے تھے اون کو تو عدالت مین طلب کر کے منسوخ کیا اور وہ پہلا بل جو پینسٹھ ہزار روپیہ کا تھا اوس کو منسوخ نہ کیا اوس کے واسطے حکم دیا کہ بدستور نئے سرے سے کامن پلی کی عدالت مین فیصلہ ہو۔ اب اس مقام پر ذکر اپنے تعلقات کا لندن مین ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اور بعد معزولی کمپنی کے ہندوستان کی حکومت سے وزراے سلطنت کے ساتھ جو تھا ضرور ہوا اس واسطے کہ وہی تعلقات موجب میری بربادی اور تباہی کے ہوے جب ابتدا مین راقم لندن مین پہونچا تب کورٹ ڈایرکٹرز کے محکمہ مین اس امر پر گفتگو ہوئی کہ راقم فارسی دفتر گورنر جنرل کے میر منشی کے عہدہ سے برخاست ہوا ہے اس نظر سے سفارت بادشاہ کی منظوری کے لایق ہے یا نہین۔ اس مباحثہ مین باتفاق یہ تجویز ہوا کہ چونکہ گورنر جنرل نے

چار بل جعلی عدالت کے حکم سے باطل ہوئے مگر جسکی تجویز ثانی منظور ہوئی تھی اوسکے باطل کرنے کا حکم اوس کے ختم پر رہا

کوائف میرے تعلقات کے کمپنی اور وزراے سے جو باعث میری بربادی اور تباہی کے ہوئے

اس امر پر کچھ اعتراض نہین کیا ہے بلکہ سفارش کی ہے کہ سفرا کی تعظیم اور توقیر مین کوئی امر فروگذاشت نہو۔ اور منجملہ کورٹ ڈیرکٹرز کے ممبرون کے ایک سرفرڈرک کری بھی تھے جنھون نے گورنمنٹ کے سکریٹری ہونے کی حالت مین مجھے برخاست کیا تھا اونھون نے وہان ظاہر کیا کہ میری برخاست اوس عہدہ سے قصور کے ثبوت سے نہین ہوئی جونکہ فارسی دفتر مین ایک فتور واقع ہوا تھا اور مین اوس دفتر کا سردار تھا اس واسطے میری برخاست ہوئی تھی۔ اس نظر سے میری سفارت منظور ہوئی اور ہر طرح کے مراسلات اور مطارحات کمپنی کے قیام تک کورٹ آف ڈیرکٹرز کے ساتھ اور بعد برخاست کمپنی کے اور اون کے حالت قیام مین بھی سلطنت کے وزرا کے ساتھ جاری رہے اور راقم کو جب بادشاہ نے سفارت کے عہدہ سے معزول کیا تب بھی مین مورد مراحم او شفقت رہا چنانچہ انھین جبل کے مقدمہ مین جو راقم کے اوپر پیش تھے ہر طرح کی وزیر ہند کی طرف سے میری اعانت رہی پہلا مقدمہ جبل کا جب ڈسمس ہوگیا تو مین نے ارادہ کیا کہ فوراً لندن سے مین ہندوستان کی طرف معاودت کرون اس واسطے ہندوستان کے وزیر کے پاس مین نے ایک درخواست گذرانی کہ میرا ارادہ معاودت کا ہے لیکن مین یہان قرضدار ہوگیا ہون اگر پندرہ ہزار روپیہ نقد مجھے عطا ہون اور جہاز کی سواری کا اجازت نامہ ملے تو مین یہان سے روانہ ہو جاؤن۔ ہندوستان مین پہونچ کے یہ رقم مع جہاز کے کرایہ کے بادشاہ سے مین دلوا دونگا اگر بادشاہ نہ دینگے تو جس طرح سے ممکن ہوگا مین اپنے پاس سے ادا کرونگا۔ اوس کے جواب مین ایک خط حسب الحکم وزیر ہندوستان کے میرے نام پر آیا کہ پندرہ ہزار روپیہ تمھارے قرض کے ادا کے واسطے بھی دیا جائیگا اور جہاز کی سواری کا بھی اجازت نامہ ملے گا اور ہندوستان مین تم سے مؤاخذہ اوس کی ادا کا نہین ہوگا مگر اس شرط پر کہ جبل کے مقدمہ کی جو مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست کی ہے جب وہ مقدمہ بالکل ختم ہو جائے تب تم یہان سے روانہ ہو۔ اس کے جواب مین راقم نے لکھا کہ مجھکو یہان توقف کرنے مین کچھ عذر نہین ہے لیکن بادشاہ نے میری اعانت سے

مصنف کا ارادہ روانگی لندن سے ہندوستان کا اور درخواست وزیر ہند سے بطور قرض کے ادا کرانے روپیہ کا

ہاتھ کھینچا ہے میری بیان بسر کس طرح سے ہوگی۔ اوس کے جواب مین س پونڈنی ہفتہ میرے خرچ
کے واسطے معین ہوے جسکے چار سو روپیہ مہینہ سے کچھ زیادہ ہوا اور سارے میرے قرضخواہون کو
ایک اطلاع عام کی گئی کہ جو کچھ قرض فلانے شخص کے اوپر ہے وہ وزیر ہندوستان کے دفتر سے ادا
کیا جائیگا۔ بلکہ ایک مفسد نمک حرام نے جس کو مین نے نوکر رکھا تھا اوس نے ایک دعوے بیہودہ
میرے اوپر کیا تھا مسٹر ولیم کی جو ہندوستان کے وزیر کے دفتر مین دفتر پولیٹکل کے مہتمم اور سربراہ کار
ہین راقم کے وہ دوست بھی تھے اونھون نے ایک مجمع عظیم مین مجھ سے کہا کہ تم کو اپنے پاس سے تو
روپیہ دینا نہین پڑتا ناحق اس مقدمہ کی جواب دہی کرتے ہو مجھے اجازت دو مین روپیہ اوسکو دیدوان
اور سب حضار کی طرف متوجہ ہو کے اونھون نے کہا کہ اگر مسیح الدین خان یہان لاکھون روپیہ کے
قرضدار ہونگے۔ سب روپیہ یہان سے ادا کیا جائیگا۔ اسی طرح سب میرے قرضخواہون سے اور جو میرا
وکیل عدالت مین تھا اوس سے بھی کہا بلکہ تحریری اطلاع اون کو دی کہ تمھارا قرض ادا کیا جائیگا
جس کی طرف ابھی اوپر اشارہ ہوا ہے اور جب تجویز ثانی اوس مقدمہ کی منظوری ہوگئی اوس وقت
وزیر ہندوستان کے وکیل اور بیرسٹر کو حکم ہوا کہ میرے وکیل اور بیرسٹر کے ساتھ مشورہ کر کے کیفیت
مفصل اوس مقدمہ کی لکھے اوس نے ساری مقدمہ کی حقیقت دریافت کر کے وزیر ہندوستان
کے پاس ایک کیفیت بھیجی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اوس نے ابتدا سے انتہا تک سارے مقدمہ
کو دیکھا کسی طرح کا قصور اور فتور اوس مین مسیح الدین خان کی طرف بخشے نہین ہے نرا اون کے اوپر
جعل اور فریب ہے لیکن جمیع مقدمات مین جو عدالت مین رجوع کرین جب تلک حکم اخیر
حاکم کی طرف سے نہ ہو کوئی شخص حقیقت فیصلہ کی کہہ نہین سکتا۔ اگر خلاف اون کے حکم ہوجاے
چونکہ سرکار نے کل مسیح الدین خان کے قرض کے ادا کا ذمہ کیا ہے سرکار کا بہت نقصان ہوگا
اس واسطے اگر مدعی اوس مقدمہ کا دس ہزار روپیہ لیکے اپنے دعوے سے ہاتھ اوٹھا وے
تو سرکار پر لازم ہے کہ اوتنا روپیہ ادا کر کے اس مقدمہ سے اون کا پیچھا چھوڑوا دے۔ اور اگر اوتنے
روپیہ پر مدعی راضی نہ ہو تب مقدمہ کی جوابدہی کیجائے اوس سے زیادہ دینا مصلحت نہین ہے

بموجب اس کیفیت کے پہونچنے کے وزیر ہندوستان نے میرے وکیل کو حکم دیا کہ مدعی سے موافق
اوس کے تصفیہ کرنے کا بندوبست کرے اگر وہ راضی ہو تو دس ہزار روپیہ یہان سے ادا کیا جائیگا
مگر چونکہ مدعی راضی نہ ہوا وہ بندوبست ملتوی رہا۔ دوم مرتبہ تو جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے مقدمہ پیش
ہوا اور اوس کا نتیجہ لکھا گیا اور ایک دفعہ اور تیسرے مرتبہ پیش ہوا اوس دفعہ ارباب جیوری جو
مطلوب تھے اوس مین سے صرف گیارہ آدمی حاضر ہوے ایک نہین حاضر ہوا ایسی صورت مین
ایک دستور بندھا ہوا ہے کہ کوئی سررشتہ دار عدالت کا ایک لفظ پکار کے کہتا ہے ٹیلی یعنی تخاصمین
سے اجازت طلب کرتا ہے جو کوئی اجازت دیوے تو ایک کسی شخص کو جو محکمۂ عدالت مین حاضر ہین اوس
بارھوین آدمی کی جگہ پر بٹھلا دیتے ہین اس امر کو تخاصمین کے بیرسٹرون نے منظور نہ کیا اس سبب سے
اوس اجلاس مین بھی مقدمہ ملتوی رہا اور یہ دستور ہے کہ جب ایک اجلاس سے مقدمہ دوسرے
اجلاس پر گیا تو ایک سال کا بیچ مین وقفہ ہو جاتا ہے اس واسطے کہ صرف چھ مہینے ایام اجلاس
عدالت کے ہوتے ہین اور چھ مہینے تعطیل رہتی ہے اور ابتدا ہی مین قرار پاتا ہے کہ فلانا مقدمہ
بترتیب نمبر فلانے حاکم کے پاس پیش ہوگا جو رد گیا یا اوس کی تجویز ثانی ہوئی تو خواہمخواہ جب
دوسری دفعہ کچہریان کھلینگی جس کو ٹرم کہتے ہین تب فیصلہ ہوگا۔ راقم کی طبیعت ہر دفعہ مقدمہ کے
ناتمام رہنے کے سبب سے سخت گھبرائی۔ ایک بہت بڑی عدالت ہے جہان دو حاکم اجلاس کرتے
ہین اون کو لارڈس جسٹس کہتے ہین وہ عدالت چنسری کی ایک شاخ ہے اور وہی دونون حاکم
عدالت پریوی کونسل مین بھی اجلاس کرتے ہین اور تیسرے باب مین مذکور ہو چکا ہے کہ
چنسری عدالت کا ٹرم یعنی ایام اجلاس ایک مہینا زیادہ ہوتا ہے اور اوس عدالت مین
اوس ٹرم مین مقدمہ کم تھے اس واسطے وہان کے حاکمون نے حکم دیا تھا کہ جس عدالت
کے فریقین تخاصمین چاہین اوس عدالت مین مقدمے اوٹھوا لائین راقم چونکہ تاخیر
انفصال سے بہت گھبرایا تھا اپنے وکیلون کو حکم دیا کہ مدعی کے ساتھ بندوبست کرکے
مقدمہ اوس عدالت مین اوٹھوا لیجا لیکن اس خیال سے کہ اوسی ٹرم مین مقدمہ کو وہ حاکم فیصلہ کر دالین

میرے مقدمہ کا رجوع ہونا لارڈ جسٹسون کی عدالت مین

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

فسانہ عجائب
انشائے سرور

امیر مینائی مرحوم

امیر اللغات مکمل
صنم خانہ عشق
مراۃ الغیب
محامد خاتم النبیین
مینائے سخن
مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

سرمایہ زبان اردو
مضمونہائے دلکش
نظم نگارین
رسالہ تذکیر و تانیث
افادہ تاریخ
قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس حسین ہوش مرحوم

فسانہ نادر جہان
پیاری سیلی
دفتر سحر
لیمون

منشی افضل حسین ثابت

حیات دبیر
دربار حسینی

پنڈت رتن ناتھ سرشار

فسانہ آزاد ۴ جلد
سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلی کامل
کامنی
بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین
حاجی بغلول
پیاری دنیا
کایا پلٹ
میٹھی چھری
طرحدار لونڈی
طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

مرتالیعی
مار آستین
بنگالی دلہن
شوخ فرنگ
پرتاب
زہرہ

پریم چند

پریم پچیسی
پریم بتیسی

مولینا عبد الحلیم شرر

جنید بغدادی
خواجہ معین الدین چشتی
تذکرہ مشاہیر عالم
مضامین
تعمیر البنی
مقدس نازنین
ایام عرب
فتح اندلس
ملک العزیز
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور
الفانسو
مفتوح فاتح
فلپانا
زوال بغداد
لعبت چین
بیکی کا پھل
جویائے حق
بابک خرمی
طاہرہ
شوقین ملکہ
یوسف و نجمہ
گزشتہ لکھنؤ
شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
آغاز و ختم حال
سیر حال
تاریخی و جغرافی مضامین
شاہ زادہ

حکیم محمد علیخان مرحوم

ایام بیماری کامل
عبرت کامل
حسن سرور کامل
اختر حسینیہ
ڈیول دیوی
جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

ترانہ شوق
قاسم و زہرہ
نیرنگ جمال
گنجینہ
سیکنڈ ادرلوجی

خواجہ عبد الرؤف عشرت

زبان دانی
اصلاح زبان اردو
قواعد میر
اصول اردو
جان اردو
شاعری کی پہلی کتاب
دوسری کتاب
تیسری کتاب
نغمات اردو

منشی محمد احسن وحشی

محبوس گذشتہ
جواہر سیر

مولینا حکیم عبد الحئی مرحوم

یاد ایام
تذکرہ گل رعنا

مولوی احمد حسین آلہ آبادی

تاریخ اسپین عربوں کے زمانہ میں اول
دوم
سوم
چہارم
پنجم
ششم
ہفتم
ہشتم
نہم
دہم
یازدہم
سلطان صلاح الدین
نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

الاسلام والنصرانیہ
فتح اندلس
ابو مسلم خراسانی
تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

سیرۃ الصدیق
علمائے سلف
تذکرۃ الشعراء حسین اعظم

حافظ اسلم جیراجپوری

سیرۃ الرسول
خلافت راشدہ
خلافت بنو امیہ
خلافت بنو عباس
عباسیہ بغداد
علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

رحمۃ للعالمین
سفرنامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

اخبار الاندلس جلد
تاریخ مولدین
مختصر تاریخ اسلامی
عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

سیرۃ الرسول
تاریخ آل عثمان
حالات عراق عرب و ایران
حالات قسطنطنیہ
تاریخ مراکش و طرابلس

منشی سید احمد دہلوی

آثار اکبری
حیات خسرو
امرائے ہنود

گونہ جلد۔ سمایا بہ علی عضنفر سواء عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز سے لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۔۔ ۔۔ ۱۲

ملنے کا پتہ۔ الناظر کتب ایجنسی لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- دکن ہار دی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر
- حضرت زید
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- دمشق
- دیوان فضائح غنیمہ

منشی تواریخ الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- کاس الکلام
- لسان الغیب جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم

سید حسن بی اے
- انتخاب اردو
- جاپان کا تعلیمی نظم
- انتخاب غدین

مولنا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کمل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- حکایات و احساسات
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے
- حور ون کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفہ سائنس
- بادل کے بچے
- خوننابۂ عشق

حکیم محمد شجاع علی بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت

منشی عبد المجید سالک بی اے
- لاد ذہیم مسز لما
- چیا و دیگر افسانے
- مہر نیکو

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان

منشی محمد لطیف بی اے
- البیرونی
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلائیو

پروفیسر نور الٰہی ایم اے
- مبادی علم النسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی [illegible]
- تاریخ الدین
- تذکرۃ المصطفیٰ
- صحف سماوی
- شیخ سنوسی

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت حصہ چہارم
- معارف لت
- مسلمانوں کا تمدن
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- تعلیمات اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر الانصار دو جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- [illegible]

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- شکر نوش پاک
- کرشن جیون
- شاہی جہاد
- سیپارۂ دل
- اکر تو مت
- بیگمات کے آنسو
- آتا لیق خطوط نویسی
- روزنامچہ
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- غدر کی کہانیاں
- سیر دہلی
- سفر نامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اردو دعائیں
- تسکین احساس
- روزنامچہ ہند
- اسلام کا انجام
- تسخیر ہمزاد

مولوی عبد الراشد الخیری
- الزہرا
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی
- دنیا سر
- منازل السائرہ
- سراب مغرب
- سیدہ کا لال
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- محبوب خداوند
- سودرہ

نیاز فتح پوری
- گہوارۂ تمدن
- جذبات بھاشا
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

نیاز عظیم آبادی
- جراغ سخن
- نقش ثانی

تاریخ الدولۃ مرسیون سے مسلمانوں کی تجارت اور انگریزوں کی [illegible] خلافت

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ہو آسمان لے ۳۷۹

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک — علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

محصول معاف
۱۰ روپیہ کی روانگی پر آدھا
اور
۲۵ روپیہ کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

ہدیہ بھیجیے
۵ روپیہ کی روانگی پر الناظر ایک سال
اور
تار کی روانگی پر ۱۰ روپیہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

اردوئے معلی
عود ہندی
دیوان غالب جیبی
اکمل دیوان غالب

سر سید مرحوم

خطبات احمدیہ
اکمل مجموعہ لکچر
اسباب بغاوت ہند
سیرت فریدیہ
خطوط سرسید

نواب محسن الملک مرحوم

مضامین تہذیب الاخلاق
اکمل مجموعہ لکچر
تقلید و عمل بالحدیث
کتاب المحبۃ والشوق
مکاتیب
مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم

اعجاز التنزیل
سفرنامہ یورپ ۲ جلد

مولانا آزاد مرحوم

آب حیات
دربار اکبری
سخندان فارس
نگارستان فارس
نیرنگ خیال
سیر ایران
ڈرامہ اکبر
مجموعہ مکتوبات آزاد
مجموعہ نظم آزاد
نصیحت کا کرن پھول
جانورستان
بیاض آزاد
تذکرہ علماء
لغت آزاد
دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم

زندگانی بے نظیر
خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی

تذکرۃ الانبیا
شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم

ترجمہ شمائل شریف
الحقوق والفرائض
بنات النعش
مراۃ العروس
توبۃ النصوح
موعظۂ حسنہ
رویائے صادقہ
ایامیٰ
فسانۂ مبتلا
ابن الوقت
مصائب غدر
مجموعہ نظم بے نظیر
اکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
منتخب الحکایات
چند پند
مبادی الحکمۃ

مولانا شرر مرحوم

حیات انیس
ایشیائی شاعری
نورجہاں بیگم
ٹیپو سلطان
حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم

یادگار غالب
حیات سعدی
مقدمہ شعر و شاعری
حیات جاوید
دیوان حالی
مسدس حالی
مجموعہ نظم حالی
بیوہ کی مناجات
شکوۂ ہند

مولوی بشیر الدین احمد

واقعات دارالحکومت دہلی
تاریخ بیجاپور
حرز طفلان
نشاط عمر
عصائے پیری
لخت جگر
حسن معاشرت
اصلاح معیشت
اقبال دلہن
شمع ہدایت
انشائے بشیر
دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم

سیرۃ النبی جلد اول
جلد دوم
سوم
الفاروق
سیرۃ النعمان
الغزالی
المامون
سوانح مولانا روم
سفرنامہ مصر و روم و شام
علم الکلام
الکلام
رسائل شبلی
مقالات شبلی
شعر العجم جلد اول
دوم
سوم
چہارم
پنجم
موازنۂ انیس و دبیر
مضامین عالمگیر
آغاز اسلام
مجموعہ کلام شبلی اردو
کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

تاریخ ہندوستان
تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
کرزن نامہ
آئین قیصری
صحیفۂ زریں
تعلیم الانتظام
محاربات عظیم
جغرافیہ ریاضیہ
جغرافیہ طبعی
اہل عرب کا جبر و مقابلہ
رسالہ علم مناسب
معادن الانساب
مساحت ناہموار

سید محمود مرحوم

کتاب الطلاق
کتاب الشفعہ
لکچر
شرح قانون شہادت

مولوی رشید احمد انصاری

المدنیۃ والاسلام
تحریر المرأۃ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ مئی ۱۹۲۸ء

نمبر ۵ — جلد ۳۴

نئی کتابیں

تاج سخن۔ نواب فصاحت جنگ جلیل کا یہ دیوان حیدرآباد میں چھپکر نایاب ہوگیا تھا اب دوبارہ بحسن وخوبی تمام لکھنؤ میں چھپا ہے۔ شائقین فوراً طلب فرمائیں۔ قیمت عا،

حجۃ الاسلام۔ یعنی کتاب تحقیق المذاہب کا پہلا حصہ جسکے مطالعہ سے دوسرے ادیان وملل کے مقابلہ میں مذہب اسلام کے خصائص وامتیازات معلوم ہونگے۔ اسلامی تعلیم پر غیر مذاہب والوں کی جانب سے جو بے سروپا اعتراضات کیے جاتے ہیں اُن کے سنجیدہ اور مدلل جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب ایک بار چھپکر مقبول ہوچکی ہے اب دوبارہ شایع ہوئی ہے۔ جستجو وتلاش کامل اور حسن بیان کے لیے مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کا نام نامی کافی ہے۔ قیمت عہ،

دنیائے افسانہ۔ حیدرآباد کے لائق ادیب مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی نے فن افسانہ نویسی پر یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ جسکے مطالعہ سے لوگوں کو نہ صرف ناول لکھنے میں مدد ملیگی بلکہ ملک میں اچھے اور بُرے ہر قسم کے ناولوں کی اشاعت ہوتی رہتی ہے اُنکے حسن و قبح کو بلحاظ فن کے جانچنے میں مدد ملیگی۔ اُردو میں اپنی قسم کی یہ پہلی کتاب ہے۔ قیمت عہ،

دکن میں اُردو۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی کی اس قابل قدر کتاب پر الناظر میں عرصہ ہوا مفصل تبصرہ شایع ہوچکا ہے۔ مگر پہلی بار اسکے بہت کم نسخے چھپے تھے اس لیے شائقین محروم رہ گئے اب دوسرے ایڈیشن کے کافی نسخے آگئے ہیں۔ جنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی کے متعلق اس کتاب میں قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ قیمت عا،

اربابِ نثر اُردو۔ یعنی فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی وتنقیدی تذکرہ۔ از مولوی سید محمد قادری ایم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ قیمت عا،

مبادی فلسفہ۔ مولوی میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد نے ایک انگریزی کتاب کا ملخص ترجمہ پیش کیا ہے۔ جسکے مطالعہ سے جدید فلسفہ کے بنیادی اصول ذہن نشیں ہوں گے۔ قیمت ۱۲ا،

اسوۂ حسنہ۔ مولوی احمد عبداللہ المسدوسی متعلم بی اے جامعہ عثمانیہ کا دلچسپ مضمون حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حالات میں۔ قیمت ۸ر،

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۳۴ — مئی ۱۹۲۸ء

مہاراجہ صاحب محمود آباد کی غلط فہمی

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

ایک عزیز شفیق نے بمبئی سے واپس آکر یہ خبر سنائی کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے وہاں مولانا شوکت علی صاحب مدظلہٗ سے اس بات کی بڑی شکایت کی کہ آپ لوگوں نے اخبار ہمدرد کا انتظام ظفر الملک جیسے میرے سخت دشمن کے سپرد کر دیا۔

مہاراجہ صاحب سے مجھے جن امور میں اختلاف رہا ہے اُن کا ذکر بار بار الناظر میں آچکا ہے۔ لیکن اُن اختلافات کے باوجود میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ مہاراجہ صاحب کا یا جن دیگر حضرات کے طریق کار سے اختلاف ہوتا رہتا ہے اُن میں سے کسی کا بھی میں دشمن نہیں ہوں اور نہ مجھے کسی سے کوئی پرخاش ہے۔

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مہاراجہ صاحب کو بخوبی علم ہے کہ میرا اُن سے اختلاف کسی ذاتی معاملہ کی بناء پر نہیں۔ وہ جس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اُس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اُن سے اور بعض دیگر متعلقہ اراکین

اور رؤسا سے میرے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات ضرور ہیں، اور جہاں تک کہ حدود شریعت اور قوانین اخلاق اجازت دیتے ہیں میں اُن تعلقات و مراسم کو حتی الامکان نباہتا بھی ہوں لیکن میری زندگی کا سطح نظر اور میرا طرز ماند و بود دونوں، اُن سب سے اتنی منافرت رکھتے ہیں کہ ایسے اختلافی مسائل میں جنکا تعلق خانگی معاملات سے ہو، میرے لیے کوئی موقع ہی اس کا نہیں کہ میں ایک جانب یا دوسری جانب کھڑا ہو سکوں۔

مہاراجہ صاحب پر غالبًا یہ امر بھی اچھی طرح واضح ہوگا کہ زندگی کی کسی منزل میں میرے ذاتی نفع و نقصان کا اُنکی ذاتِ گرامی سے بعید سے بعید تعلق بھی نہیں رہا۔ ابتدا میں جب مجھے اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، تو اُسوقت ممکن ہے کہ میرے دل میں یہ اُمنگ موجود ہو کہ میں رسالۂ آلناظر کے لیے اُن سے کوئی اعانت حاصل کروں، لیکن جلد ہی مجھ پر یہ واضح ہوگیا کہ مہاراجہ صاحب یا دوسرے روساء کا ابر کرم جب کسی اخبار نویس یا قومی کارکن کے سر پر سایہ فگن ہوتا ہے تو اُسے اپنے ضمیر و ایمان کو سلامت رکھنا دشوار ہو جاتا ہے اور اس سارے طبقہ کی طرف سے میری توقعات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہوگیا اور غالبًا اُن تمام قومی کارکنوں میں جو مہاراجہ صاحب کے سیاسی عروج کے زمانے میں اُنکی بارگاہِ علی میں حاضری دیا کرتے تھے اس عاجز کے متعلق مہاراجہ صاحب کو خود بھی پورا اطمینان ہوگا کہ قومی اغراض کے سوا کبھی کسی خفیف سے خفیف ذاتی ضرورت کے لیے بھی مجھے آستانہ بوسی کا شرف حاصل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ میں نے یہاں تک احتیاط ملحوظ رکھی کہ ایک دفعہ اُردو کانفرنس کے سلسلے میں دوسرے رفقاء کار کے ساتھ مجھے مہاراجہ صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہونا پڑا۔ کھانے کا وقت آگیا۔ دسترخوان بچھا اور میرے اکثر ساتھیوں نے اُس میں شرکت کی مگر میں عذر کرکے اُٹھ آیا۔

ذاتی طور پر مہاراجہ صاحب سے اس قدر بیگانہ رہنے کے باوجود میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک زمانے میں مجھے جناب ممدوح سے بہت کچھ عقیدت و ارادت حاصل تھی۔ اور جب تک پے بہ پے ایسے واقعات نہیں پیش آئے کہ مہاراجہ صاحب کا اصلی رنگ رُخ ظاہر ہو، سالہا سال تک اُنکی جانب سے عظمت و احترام کے جذبات میرے نہاں خانۂ دل میں پرورش پاتے رہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مہاراجہ صاحب کے متعلق عقیدت و احترام کی بنیاد صرف اُنکی وہ خدمات گرامی تھیں جو بظاہر وہ قوم و ملک کی انجام دیتے رہے تھے یا محض راقم الحروف کی ناتجربہ کاری

وعدم واقفیت ۔ لیکن اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ جب مہاراجہ صاحب نے ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے چندہ میں ایک لاکھ کی رقم خطیر شامل کرنے کے علاوہ صوبۂ اودھ کی چندہ فراہم کرنے والی کمیٹی کی معتمدی کا بارگراں اپنے ذمہ لیا اور ملک کے دیگر حصص میں فراہمی چندہ کے لیے دورہ کرنے میں غایت درجہ کا جوش وانہماک ظاہر فرمایا، ایران میں روسی مظالم اور انگریزی ریشہ دوانیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں پیش پیش رہے، طرابلس اور بلقان کے مصیبت زدگان کے لیے گراں قدر عطیے مرحمت فرمائے اور مسلمانان ہند کے ساتھ ترکوں سے اظہار ہمدردی میں نمایاں طور پر حصہ لیتے رہے، مسجد کانپور کے تصفیہ میں مردانہ وار سر جمیس مسٹن کے مقابلہ میں مسلمانوں کے رہنما بنگئے، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے اور بالآخر دونوں کے درمیان سمجھوتہ کرادینے میں ستعدی، فیاضی اور اولوالعزمی ظاہر فرمائی، اور ترکی خلیفہ کے باغی شریف حسین کی غداری کے خلاف، فرنگی محل کے تذبذب اور شریف کی ہاشمیت وسیادت کے باوجود لکھنؤ کے پرزور مظاہرہ کی صدارت کرکے برطانوی دسیسہ کاری کو بے نقاب کرتے ہوئے احرار مسلمین کی ہم نوائی فرمائی، تو ہر موقع پر راقم الحروف اور مسلمان آزاد شہریوں کی ساری جماعت نے مہاراجہ صاحب کے ان عظیم الشان کارناموں کی دل سے داد دی ۔ اور ہم میں سے ہر شخص نے اپنی بساط کے بموجب مہاراجہ صاحب کی ان تمام مہموں میں شرکت کی اور مہاراجہ صاحب کی سالاری وسرداری میں ایک ادنیٰ رہنما کار کی طرح مصروف خدمت رہنا اپنا فرض جانا ۔

عین دسمبر ۱۹۱۶ء میں جبکہ ہندوستانی سیاست کے نقطہ نظر سے مہاراجہ صاحب کا نیر اقبال نصف النہار پہ تھا ایک عزیز محترم نے، جو اب افسوس کہ زندہ نہیں ہیں، پہلی بار مجھے اس حقیقت سے آشنا کیا کہ مہاراجہ صاحب کی فیاضیاں اور اولوالعزمیاں کسی اعلیٰ جذبۂ خدمت قوم وملک کے باعث نہیں بلکہ اُنکی رائے گرامی میں مہاراجہ صاحب کی حیثیت ایک ہوشمند سیٹھ، ساہوکار، یا سرمایہ دار کی تھی جو نفع ونقصان کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے اور پائی پائی سے فائدہ اُٹھانے کا اندازہ لگا لینے کے بعد بالکل ایک کاروباری آدمی کی طرح قومیات کی تجارت میں اپنا روپیہ لگائے ۔

مہاراجہ صاحب کے متعلق جو حسن عقیدت اُس زمانہ تک میرے دل میں جاگزیں تھا اُسکی بدولت مجھے اس رائے کے قبول کرنے میں کچھ عرصے تک بہت تذبذب رہا، باوجودیکہ وہ رائے ایک ایسے بزرگ کی تھی جو میرے بہ نسبت مہاراجہ صاحب کو زیادہ عرصے سے جانتے اور زیادہ قریب سے جانچتے رہے تھے، اور جنکی عالی دماغی واصابت رائے کا میں دل سے قائل تھا گر رفتہ رفتہ واقفیت کا

یا دل چھنتا گیا اور چند روز کے تجربہ کے بعد مہاراجہ صاحب کی حالت مجھ پر آئینہ ہوگئی۔
مہاراجہ صاحب کی زرفشانی، آزادمنشی اور حسنِ اخلاق نے تنہا اس عاجز ہی کو نہیں بلکہ مسلمان آزادخیالوں کی اکثریت کو اور دوسرے کثیر التعداد مسلمانوں کو بھی عرصے تک مہاراجہ صاحب کا گرویدہ بنائے رکھا۔ لیکن جیسے جیسے آزمایش و امتحان کے نازک مواقع آتے گئے، مہاراجہ صاحب کے جوہر نمایاں ہوتے رہے، اور اب مشکل ہی سے کوئی ایک متنفس ہماری قلندروں کی جماعت کا ایسا بتایا جاسکتا ہے جو مہاراجہ صاحب کی رہنمائی کو قبول کرتا یا اُنکے ساتھ سیاسیات ملکی و قومی میں اگلی سے ہم آہنگی رکھتا ہو۔
البتہ اپنے مصلحت پسند دوستوں کے مقابلہ میں، میری آنکھیں کسی قدر یا کہنا چاہیے کہ سب سے پہلے کھلیں۔ اور بسبب اسکے کہ ملکی و قومی امور کے متعلق اظہار رائے میں میرا قلم ہمیشہ بیباک رہا ہے، شاید مہاراجہ صاحب کے متعلق سب سے زیادہ مجھ ہی کو لکھنے کا موقع ملا۔ بایں ہمہ جو کچھ مہاراجہ صاحب کے متعلق میں نے لکھا ہے اُس میں سے سوا اُس حصہ کے جسکے بارے میں الناظر کے دَورِ جدید کے ابتدائی پرچہ میں اظہارِ معذرت کیا جاچکا ہے، ایک حرف کو بھی واپس لیے بغیر میں پورے وثوق و اطمینان کے ساتھ یہ عرض کرسکتا ہوں کہ میرے دل میں مہاراجہ صاحب کی طرف سے کبھی دشمنی کا کوئی جذبہ نہ تھا، اور سوائے مفادِ عامّہ سے تعلق رکھنے والے معاملات کے جن پر تنقید و تبصرہ کرنا ہر ضمیرِ انسانی کا مسلمہ فریضہ اور جنکے متعلق موافق و مخالف جد وجہد کرنا ہر انسان کا غیر مشتبہ حق ہے، کبھی کسی ایسے معاملے سے میرا تعلق نہیں رہا جو مہاراجہ صاحب کے ذاتی و خانگی امور میں داخل ہو یا جسکو کسی ذاتی یا شخصی عناد پر محمول کیا جاسکتا ہو۔
مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں مہاراجہ صاحب نے اپنے سابقہ مواعید کو بُھلا کر اور ہمارے ہی دوستوں میں سے بعض کو ملا کر حکومت کے مصالح و منشا کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا تو میری رائے ناقص میں مہاراجہ صاحب کی یہ کارروائی نہایت غلط اور مسلمانوں کے مفاد کے قطعی خلاف تھی۔
۱۹۱۷ء میں جب ہوم رول کی تحریک کو دبانے کے لیے مسز بسنٹ نظر بند کی گئیں تو ہندوستان کے کثیر التعداد باشندوں خصوصاً بنگال کے پُرجوش کارکنوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ کانگریس کی صدارت پر اُس خاتونِ محترم کو فائز کریں۔ مہاراجہ صاحب کے احباب وہوا خواہ اصرار کررہے تھے کہ دوسرے تمام لیڈروں کی طرح وہ بھی کانگریس کی صدارت سے مسز بسنٹ کے حق میں دست بردار ہوجائیں اور بنگال میں مسٹر بیندرناتھ بنرجی اور

سی آر داس کی جماعتوں میں جو نزاع برپا تھی اپنی دست برداری سے اُس کا خاتمہ کر دیں مگر مہاراجہ صاحب نے ایک نہ سنی، اور باعزت دست برداری پر ووٹوں سے شکست پانے کو ترجیح دی۔ میری ناچیز رائے میں مہاراجہ صاحب کا یہ طریقِ کار بھی کسیر غیر دانشمندانہ اور ہندوستان کے مفادِ عامہ کے لیے مضر تھا۔

۱۹۱۸ء میں سید وزیر حسن صاحب کی غفلت و بے توجہی سے مسلم لیگ کے حالات ابتر ہو رہے تھے اور انھوں نے بالآخر میرے مشورہ سے یا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میرے مطالبہ پر اخبارات میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ آیندہ سکرٹری نہیں رہنا چاہتے۔ قوم کو اس کا پورا موقع تھا کہ جدید انتخاب کرکے مسلم لیگ کی خراب و خستہ حالت کو سدھارنے پر توجہ کرے اور مسلم لیگ کی کونسل کے بہت سے پرجوش اراکین کی بھی یہی خواہش تھی مگر مہاراجہ صاحب کی اس ضد نے کہ اگر سید وزیر حسن صاحب سکرٹری منتخب نہ کیے جائیں گے تو میں بھی صدارت قبول نہ کروں گا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ کو مجبور بنا دیا اور انھیں اپنے بعض رفقا سے کار کی رائے کے خلاف پہلی بار کے انتخاب کو مسترد کرا کے دوبارہ کوشش کرکے سید وزیر حسن صاحب کو منتخب کرانا پڑا۔ مہاراجہ صاحب کی اس ضد کو میں نے یقیناً مفادِ اسلامی سے بے پروائی اور شخصی و ذاتی جذبات کی نگہداشت کا مرادف سمجھا۔

مسلم لیگ کے اسی دہلی والے اجلاس کے موقع پر ترکوں کے معاملات سے متعلق جو اہم ترین تجویز تھی، مہاراجہ صاحب نے کونسل کے جلسہ میں وعدہ فرمایا کہ اُسے وہ خود پیش کریں گے۔ جس روز وہ تجویز اجلاسِ عام میں پیش ہونے والی تھی مہاراجہ صاحب کا غیر حاضر ہو جانا اور آگرہ کی سیر کیلیے تشریف لیجانا کسی ایسے شخص کو پسندیدہ نہیں معلوم ہوا جو اُس جلسہ میں شریک اور ان حالات سے واقف تھا۔

مسلم لیگ کی صدارت قبول کرنے کے تین مہینے کے اندر مہاراجہ صاحب کا استعفا دیدینا اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے اُنکی صدارت کی خاطر سید وزیر حسن صاحب کو سکرٹری بنوا کر خود اپنے بعض رفقا کی ملامت مول لی تھی جس قدر شاق ہوا ہوگا اُسکا اندازہ کچھ دشوار نہیں ہے۔

۱۹۱۹ء میں مسئلۂ خلافت سے متعلق لکھنؤ میں ایک جلسہ تمام صوبوں کے مسلمان اہل حل و عقد کا منعقد کیا جانے لگا تو مہاراجہ صاحب نے جلسہ کے اعلان پر دستخط چھپ جانے کے بعد اُس جلسے سے بے تعلقی اختیار کی۔ اور یہی نہیں کہ اعلان سے دستخط واپس لے لیے بلکہ جلسہ کے مصارف و انتظامات تک میں شرکت گوارا نہیں کی اور اپنے اشتعال انگیز اور تحقیر آمیز رویہ سے مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ وغیرہ کو سخت ناگواری ظاہر کرنے کا موقع دیا۔

تحریک خلافت میں مہاراجہ صاحب نے کوئی حصہ نہ لیا تا آنکہ سنہ ۱۹۲۰ء کے آخر میں مہاراجہ صاحب نے گورنمنٹ کی ملازمت ترک کر کے اپنے تئیں سیاسیات ملکی سے بالکل منقطع کر لیا۔ اُنکی اس کارروائی کے متعلق دو رائیں ہونا ممکن ہے۔ جو لوگ گورنمنٹ سے اتحادِ عمل کرنا پسند کرتے ہیں جیسے لبرل یا معتدلین، اُنکے نزدیک تو یہ طرزِ عمل غلط نہیں ہو سکتا، لیکن مہاراجہ صاحب نے ہمیشہ اپنے تئیں نیشنلسٹ کہا اور اس جماعت کے لوگ اس قسم کی سرکاری ملازمتوں کو قطعاً ناپسند کرتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں مہاں سرائے شاہی میں مقیم تھا۔ ڈیڑھ سال بعد جب دوبارہ قومی و ملکی تحریکات میں حصہ لینے کا وقت آیا تو ممکن تھا کہ مہاراجہ صاحب کے اس عہد کے بعض کارناموں پر تبصرہ کیا جاتا۔ لیکن ایک تارکِ موالات کو اول تو حکومت کے معاملات سے چنداں سروکار نہیں دوسرے یہ خیال کر کے کہ مہاراجہ صاحب دانستہ یا نادانستہ تحریکاتِ عامہ سے الگ ہو گئے ہیں، اُنکے اعمال و کردار سے کسی قسم کا تعرض مناسب نہیں سمجھا گیا۔

ہوم ممبری سے واپسی کے بعد مہاراجہ صاحب نے ابن سعود کی مخالفت پر کمر باندھی اور اگرچہ پُرانے رفقائے کار میں سے ایک بھی اُنکا ساتھ نہ دے سکا تاہم اُنھوں نے اپنی سی تو کر ہی ڈالی۔ حجاز کانفرنس کے انعقاد سے لیکر وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے اور ملکِ معظم کے نام اپنی جانب سے ایک تار دینے اور اُسے مسلمانانِ لکھنؤ کے جلسہ کا پیام قرار دینے تک کی کُل کارروائی دنیا کے سامنے موجود ہے۔

بیشک اس تحریک میں بعض ایسے مسلمان بھی اُنکے شریک کار رہے ہیں جن سے زیادہ دانشمندانہ طرزِ عمل کی توقع کی جا سکتی تھی، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ بہت سے لوگوں نے اُنکی کارروائی کو سخت ناپسند کیا۔ اُنکے دوستوں علی برادران تک نے وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لے جانے یا ملک معظم کے پاس تار بھیجنے کو پسند نہیں کیا۔ اس عاجز کی رائے مسئلہ حجاز میں واضح طور پر نہ صرف مہاراجہ صاحب اور خدام الحرمین کے خلاف تھی، بلکہ ابتدائی مراحل کے بعد سے محترم علی برادران اور اُنکے رفقاء سے بھی مختلف رہی، اور اسی سبب سے اس باب میں میری جد و جہد دونوں کی بارگاہوں میں مردود قرار پائی۔

مہاراجہ صاحب نے نئے دورِ عمل میں قدم رکھتے ہی ایک روزانہ انگریزی اخبار نکالنے کی جد و جہد شروع کی۔ مہاراجہ صاحب کے پاس عرصہ تک I. D. T. (انڈین ڈیلی ٹیلیگراف) رہا ہے اور مجھے اس سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ اب بھی اگر مہاراجہ صاحب کا کوئی ذاتی

اخبار نکلتا تو کسی کو زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ گو اخبار شایع ہونے کے بعد اُسکی پالیسی وغیرہ کا معرض بحث میں آنا ناگزیر ہے۔ مگر راجہ صاحب کی کوشش چونکہ یہ رہی کہ پبلک کے روپیہ سے اخبار نکلے۔ اس لیے ہر قومی کارکن کو اخبار کے متعلق رائے زنی کا پورا حق حاصل ہے۔

انگریزی اخباروں کی ضرورت تقریبًا ہر پڑھا لکھا مسلمان محسوس کرتا ہے۔ لیکن جس طریقہ پر مہاراجہ صاحب اخبار نکالنا چاہتے ہیں اُس سے مجھے اور اکثر اصحاب کو اختلاف ہے، باینہم میں نے بالقصد اپنے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ مگر اتفاق سے ایک واقعہ ایسا پیش آگیا کہ بعض اصحاب کے طرز عمل نے مجھے اپنے اختلاف کے اظہار پر مجبور کردیا۔ اکتوبر ۲۳ء میں پراونشیل لیگ کا جلسہ میرٹھ میں تھا، میں بھی شریک ہوا۔ آخری اجلاس میں جبکہ پراونشیل لیگ کی کونسل کے اکثر ارکان اور صوبہ کے بیشتر معززین رخصت ہو چکے تھے اور جلسہ بالکل چراغ سحری ہو رہا تھا، دفعتًہ مولوی محمد یعقوب صاحب وکیل مرادآباد و ڈپٹی پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک تجویز مہاراجہ صاحب کے اخبار کی تائید میں پیش کردی۔ مجالس کے دستور کے مطابق، جلسۂ عام میں کوئی تجویز پیش نہیں ہو سکتی جب تک کہ مجلس مضامین نے اُسے منظور نہ کرلیا ہو یا کم سے کم اُکہیں مجلس مضامین کی اکثریت کی رائے کے خلاف بطور ترمیم کے اُسے جلسہ عام میں پیش کرنے کی پہلے سے اطلاع نہ دیدی گئی ہو۔

لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی پریسیڈنٹ صاحب اگر مجالس عامہ کے قوانین و دستور سے کسی مصلحت کی بنا پر تجاہل عارفانہ برت رہے تھے، تو صدر جلسہ کا فرض ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کھلی ہوئی بیضابطگی کو روک دیتے۔ لیکن لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی پریسیڈنٹ کی مرعوب کن شخصیت کا اثر تھا یا جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر صدر صاحب نے معذرتًا ظاہر فرمایا، اُنکو اندیشہ تھا کہ مہاراجہ صاحب اسے ذاتی رنجش کا نتیجہ نہ قرار دیں۔ انھوں نے باوجود کئی بار ضابطہ کے اعتراضات کیے جانے کے معزز محرک کو اپنی تجویز پیش کرنے کی اجازت دیدی۔ اور اس طرح مجھے مجبور ہونا پڑا کہ برسر عام تجویز سے اختلاف ظاہر کردوں۔

اُس جلسہ میں تو میری مخالفت کا صرف یہی سبب تھا۔ لیکن میں اس موقع پر مختصرًا وہ وجوہ بھی عرض کردینا چاہتا ہوں جن کی بنا پر مجھے اس اخبار سے اختلاف ہے۔

(۱) مسلمانوں میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد اگرچہ اب اتنی کافی ہوگئی ہے کہ انگریزی کے روزانہ اخبار ہر بڑے صوبہ سے نکلنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ اس جماعت میں خود غرضی اور بے حسی

اس درجہ کی ہے کہ غیر معمولی جدوجہد کے بغیر کسی روزانہ اخبار کو چلانا آسان نہیں ہے۔

(۲) مہاراجہ صاحب کے پاس عرصہ تک ایک انگریزی روزنامہ رہا جسکے خریداروں کی تعداد بہت محدود رہی اور جسے مالی حیثیت سے کبھی کامیابی نہ ہوئی۔ نئے اخبار کے لیے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہونے سے رہا۔

(۳) اخبار کے لیے سب سے اہم سوال پالیسی اصول و رائے کا ہوتا ہے۔ مہاراجہ صاحب اپنے تئیں نیشنلسٹ کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ نیشنلسٹ جو کبھی اُن کے دوش بدوش کام کرتے تھے اب اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ اُنکے سامنے مہاراجہ صاحب اور معتدلین ہم پلہ قرار دیے جاسکتے ہیں بلکہ شاید بعض امور میں معتدلین بھی مہاراجہ صاحب سے آگے نکل جائیں۔

مہاراجہ صاحب کے ساتھ جو حضرات اس اخبار کے انتظام میں شریک ہیں بعض اُن سے بھی کم درجے کے نیشنلسٹ ہیں اور بقیہ وہ ہیں جو نیشنلزم کو یا تو سمجھتے نہیں یا سمجھتے ہیں تو اُس سے دُور بھاگتے اور موقع ملے تو اُس کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ ہمارے دوست چودھری خلیق الزماں صاحب سوراجسٹ بھی محض اس غرض سے اخبار کے بورڈ میں رکھ لیے گئے ہیں کہ آزاد خیال طبقہ کی برائے نام نمایندگی بھی قائم رہے۔ اب ہر شخص خود سوچ اور سمجھ لے کہ جس اخبار کی انتظامی جماعت اس ملغوبہ سے تیار ہوئی ہو اُس کی پالیسی کیا ہو سکتی ہے۔

مسلمانوں کا موجودہ عام رجحان یہ ہے کہ ہندوؤں نے جو مخاصمانہ اور جنگجویانہ رویہ اختیار کیا ہے اس کا ترکی بترکی جواب دیا جائے۔ اور یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم مخالفت اور مخاصمت کے جذبات کو اشتعال ہی دیا جائے۔ اور آج وہی اخبار کامیابی سے چل رہے ہیں جو اس فرقہ وارانہ مخاصمت کے جذبہ کا اتباع کرتے ہیں۔ مہاراجہ صاحب کے اخبار سے اسکی توقع نہیں کیجاسکتی کہ انکا اخبار فرقہ وارانہ جذبات کی تابعیت کرے گا اور اسلیے یقینی ہے کہ اسکو مسلمانوں میں وہ ہردلعزیزی حاصل نہ ہوگی جو ایک کامیاب اخبار کے لیے ضروری ہے۔

(۴) مہاراجہ صاحب خود رئیس ہیں اور اُنکے شرکاء میں سے ایک کے سوا جو ایک کامیاب ملک التجار ہیں، کوئی صاحب انگریزی اخبار اور انگریزی پریس کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے۔

(۵) آئی ڈی ٹی تو انگریزی اخبار تھا، روزنامہ ہمدم کو بھی یہ لوگ کامیابی سے نہ چلا سکے۔ اور ہمیشہ نقصان اُٹھاتے رہے۔ البتہ جب سے خان بہادر سید احمد حسین رضوی مالک کارخانہ تباکو جیسے کامیاب و تجربہ کار تاجر کے ہاتھ میں اُسکا انتظام دیا گیا ہے اخبار کی مالی حالت کچھ سدھری

ہے۔ اور اگرچہ یہی خان بہادر صاحب اس انگریزی اخبار کے منتظم بھی قرار دیے گئے مگر شبہہ کے کافی وجوہ ہیں کہ وہ بھی اس کام کو بہ احسن وجوہ انجام نہیں دے سکتے۔ اور اب تو سنا جاتا ہے کہ وہ بھی اس درد سری سے دستکش ہو گئے ہیں۔

(۶) ہمارے صوبہ میں الہ آباد کے روزنامہ انڈپینڈنٹ سے زیادہ شاید ہی کسی کو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہو۔ لیکن اُس کا حشر کیا ہوا؟ اسکی داستان پنڈت موتی لال نہرو صاحب سے سُنیے یا عدالت کی مِسل ملاحظہ فرمائیے۔ جہاں تک مجھے علم ہے تین لاکھ روپئے کا سرمایہ اُس میں غرق ہو گیا۔

الہ آباد کا دوسرا روزنامہ لیڈر بھی سالہا سال تک نقصان سے چلا یا گیا ہے۔ اور اگر پنڈت مدن موہن مالوی، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر چنتامنی کے سے قومی لیڈر اُسکے معاون و کارکُن نہ ہوتے تو اس کا بقا و قیام بھی مشتبہ رہتا۔

مسلمانان بنگال کا دیرینہ خادم مسلمان آج تک انھیں اندیشوں سے روزانہ نہیں کیا جا سکا اور پنجاب کا مسلم آؤٹ لک، احمدی جماعت کی اولوالعزمیوں کے باوجود اسوقت تک خسارہ سے نکل رہا ہے۔ ان حالات میں مجوزہ انگریزی روزنامہ کا نکالنا بعض اشخاص کے لیے ممکن ہے کہ مفید مطلب ہو، مگر قومی اغراض کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اندیشہ ہے کہ نقصان پہونچا دے گا۔

سطور بالا میں اجمال کے ساتھ اُن تمام واقعات کا ذکر کر دیا گیا ہے، جن کی بنا پر مجھے مہاراجہ صاحب کے طریق کار پر نکتہ چینی کرنے یا اُنکی کوششوں کا توڑ کرنے کے لیے مخالفانہ جد و جہد کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اور باوجودیکہ مہاراجہ صاحب کی طرف سے کسی بلند و رفیع کارنامہ کی اب کوئی توقع باقی نہیں رہی تاہم میں اتنا حسن ظن ضرور رکھتا تھا کہ مہاراجہ صاحب اپنی مالی تفریق کی وجہ سے اس قسم کے اختلافات کو ذاتی و شخصی مخالفت کی بنیاد نہ قرار دیں گے اور سائمن کمیشن وغیرہ کے معاملات میں یا اور ایسے معاملات میں جن میں وہ اپنی محدود آزادی کے حدود میں رہ کر کچھ کام کرنا چاہیں گے ہم قلندروں کے ساتھ اشتراک عمل کر سکیں گے۔ لیکن جو اطلاع مجھے پہونچی ہے اُس کی بنا پر مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مہاراجہ صاحب اپنی اعلیٰ منزلت سے اتنے نیچے اُتر آئے ہیں کہ میری نکتہ چینی نگاہ بھی اب تک وہاں نہ پہونچ سکی تھی۔ اور میں بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میری توقعات کے خلاف اس بارے میں سید وزیر حسن صاحب کا طرز عمل

اُن سے بہت بہتر رہا۔ سنہ ۱۷ء میں رفاہ عام ہال کے ایک جلسہ میں جب عہدہ داران مسلم لیگ کے خلاف میں نے ملامت کا ووٹ پیش کیا تو اُس کا اثر براہ راست اور سب سے زیادہ اُنھیں پر پڑا۔ چنانچہ اُنھوں نے اُسی وقت استعفا دیدیا اور اُسوقت تک استعفا واپس نہ لیا جب تک مسلم لیگ کے بہت سے معزز ارکین اور صدر جلسہ مرحوم سید آل نبی کی درخواست پر میں نے وہ تجویز ملامت واپس نہیں لی۔ سنہ ۱۸ء میں بمقام دہلی دوبارہ صرف اُنھیں کے خلاف تجویز ملامت پیش کی گئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لیگ کے حسابات کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھادیا گیا۔ ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء کے الناظر میں جو کچھ میں نے اُنکے متعلق لکھا اُس کی بدولت بالآخر اُنھیں مسلم لیگ سے مستعفی ہوجانا پڑا۔ لیکن میں اُنکی شرافت طبع کا معترف ہوں کہ اسکے بعد اُنھوں نے کبھی میرے ساتھ بیگانوں کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ آج تک جب کبھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس طرح ملتے ہیں جیسے میرے اُنکے درمیان کوئی اختلاف کبھی رونما ہی نہیں ہوا تھا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اُنکے مسلم لیگ سے علیحدہ ہوجانے کے بعد میرے اُنکے درمیان کوئی اختلاف باقی بھی نہیں رہا۔ مہاراجہ صاحب جیسے بلند مرتبہ رئیس میں یقیناً اس سے بہت زیادہ رفیع الخیالی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن اگر وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تو انکو چاہیے کہ قومیات و سیاسیات کے اکھاڑے سے الگ رہیں۔ جب وہ یوم ممبری سے واپس آئے تھے تو سُنا گیا تھا کہ اب وہ خاموشی کے ساتھ اپنی ریاست میں رہ کر زمینداری کے کاموں میں مصروف رہیں گے۔ اگر ایسا وہ کرسکتے تو شاید اُنکے لیے اور قوم وملک کے لیے بہتر ہوتا۔ سیاسیات قومی وملکی میں اب اُنکو وہ جگہ حاصل نہیں ہوسکتی جو سنہ ۱۸ء تک حاصل رہی۔ مہاتما گاندھی کے میدانِ عمل میں آنے کے بعد سے ہندوستان کی سیاسیات اب ایمپول کا مشغلہ اور کرسی نشینوں کا کھلونا نہیں رہ گئی ہے۔ اور اگر کہیں اس کا سامان ہے تو شوق سے مہاراجہ صاحب وہیں اپنی لیڈری اور سرداری کا سکہ جمائیں۔

رہا ہمدرد کے انتظام کا معاملہ، تو یہ سب کو معلوم ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنا اخبار مجبور ہوکر بند کردینے کا ارادہ کیا تھا۔ حالانکہ اگر مہاراجہ صاحب کی فیاضانہ امداد انکو حاصل ہوتی رہتی، تو اسکی نوبت شاید نہ آتی۔ اور گو میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا محمد علی اب مہاراجہ صاحب کے کام کے نہیں رہے اور مہاراجہ صاحب جو روپیہ اُنکے اوپر یا اُنکے کاموں پر صرف کرینگے وہ تجارتی اصطلاح میں بٹے کھاتے میں جائے گا۔ لیکن پھر بھی اگر صرف اس لیے کہ مہاراجہ صاحب سے اختلاف رکھنے والا اور اُسکے اظہار کی جرأت کرنے والا یہ عاجز ہمدرد کا منتظم نہ رہے مہاراجہ صاحب

میرا ناچیز مشورہ قبول فرمالیں اور ایک ہزار روپیہ ماہوار ہمدرد کا مقرر کردیں تو ہمدرد بغیر کسی خسارہ کے چلایا جاسکے گا۔ اور ضرورت نہ رہے گی کہ میں لکھنؤ سے جاکر اس کے انتظامات کی نگرانی کروں۔

مہاراجہ صاحب سے جو اختلافات رہے۔ کم و بیش اسی قسم کے اختلافات سر محمد شفیع اور بہت دوسرے حضرات سے بھی رہے ہیں۔ خصوصاً مسلم یونیورسٹی کے معاملات کی وجہ سے بزرگانِ علیگڈھ کی رایوں اور طریق کار سے بار بار مجھے اختلاف کرنا پڑا ہے۔ سر شفیع پنجاب میں رہتے ہیں اور اس سبب سے انکی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کے موقع شاذ و نادر ہی نصیب ہوتے ہیں، لیکن دیگر حضرات سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ میری روش اور تحریروں سے سخت ناراض ہونے کے باوجود ان میں سے کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو مجھے اپنا دشمن تصور کرتے ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی صاحب کے دل میں یہ خیال ہو تو میں باادب عرض کرونگا کہ وہ بھی غلطی پر ہیں۔ ایمرسن کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ اختلاف رائے کے سوا انسان کا ہر گناہ معاف کیا جاسکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں کہ مہاراجہ صاحب اور دوسرے حضرات جن سے میں اختلاف کرتا رہا ہوں حق بجانب ہونگے اگر میرے اس گناہ کو ناقابل عفو تصور فرمائیں۔ مہاراجہ صاحب کے مقابلہ میں میرا یہ گناہ اور بھی زیادہ سنگین ہونا چاہیے کہ لکھنؤ انکے اثر و اقتدار کا مرکز ہے۔ جہاں ان کے ہر طبقہ کے اعوان و انصار موجود ہیں اور اس سبب سے شاید انکے لیے یہ امر بالکل خلافِ توقع وقوع پذیر ہوا کہ انکے کثیر التعداد دوستوں اور ہوا خواہوں کے علی الرغم ایک نہایت حقیر و ناچیز ہستی نے جلسۂ عام منعقد کرکے انکے خلاف ملامت کی تجویز پیش کی اور وہ انکے بعض نادان دوستوں کی مخالفت کے باوجود منظور ہوگئی۔

لیکن بجائے اسکے کہ وہ اس ملامت کرنے والی جماعت یا انکو دعوتِ اجتماع دینے والے کو اپنا دشمن قرار دیں انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ اس قسم کی تحریک کیوں پیدا ہوئی اور انکے وسیع ترین حلقۂ اثر کو نظرانداز کرکے کیسے کامیابی کی منزل سے گزر گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ صاحب کے طریق کار اور طرز عمل نے کثیر التعداد مسلمانوں کے قلوب انکی طرف سے پھیر دیے ہیں۔ لوگ اپنے ذاتی تعلقات، اپنے شخصی اغراض، یا اپنے فطری ضعف کی بدولت ممکن ہے کہ دلوں کی بات کو زبان پر لانے کی ہمت نہ رکھتے ہوں، یا نقصان کے خطرہ سے ایسی کسی تحریک میں عملی شرکت گوارا نہ کریں جس کا مقصود یہ ہو کہ مہاراجہ صاحب کی روش کے خلاف مظاہرہ کیا جائے لیکن گروہ دل سے

یقین رکھتے ہیں اور خانگی صحبتوں میں بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے ہیں کہ مہاراجہ صاحب غلطی پر ہیں، اور اس سبب سے مہاراجہ صاحب کے خلاف جو مظاہرے کیے جائیں وہ اُن سے ہمدردی رکھتے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اُنکی مخالفت پسند نہیں کرتے۔

بے شبہہ فرنگی محل کے اصحاب اور بہت سے دوسرے لوگ جو سلطان ابن سعود کی مفروضہ وہابیت سے سخت بیزار ہیں، دل سے مہاراجہ صاحب کے ساتھ تھے۔ لیکن فرنگی محل والے بھی اسکے لیے تیار نہیں کہ اس باہمی نزاع میں انگریزوں کو دعوتِ مداخلت دیں۔ اور لکھنؤ کے کثیر التعداد مسلمانوں کو تو خود فرنگی محل والوں سے شدید اختلاف ہے کہ اُنھوں نے اس معاملہ میں شیعہ مجتہدین اور شیعہ رؤساء کے ساتھ شرکت کرکے اہل سنت کی تذلیل و دلآزاری کا سامان فراہم کیا۔ میرے مصلحت پسند احباب، ایسے مواقع پر دیدہ و دانستہ خاموش رہتے ہیں اور بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ

"گفتن آئینِ ہوشیاری نیست
(گرچہ دانستن اختیاری نیست)"

لیکن میں نے قومی و ملکی معاملات میں، خصوصاً جب کبھی امرِ حق کے اظہار کی ضرورت ہو، ہمیشہ "ہوشیاری" پر بے ہوشی کو ترجیح دی ہے۔ اور خدا سے دعا ہے کہ اسی مشرب پر زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بایں ہمہ اُن اُمور میں اپنے احباب کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے میں کبھی مجھے عذر نہیں ہوتا جن میں اُنکی روش کو میں صحیح سمجھتا ہوں اور نہ وقتی و فروعی اختلافات کی بنا پر ایسے بزرگانِ قوم و ملک کی عظمت و عقیدت میں فرق آتا ہے جنکا اخلاص غیر مشتبہ اور جنکی خدمات مسلّم ہیں۔

مہاراجہ صاحب کو معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی مسلمان نہیں "وہابی" بھی نہیں، اس صوبہ کے رہنے والے بھی نہیں، زر و زمین کا زور بھی اُنکے پاس نہیں۔ اُن علوم کے عالم بھی نہیں، جن کی وجہ سے ایک مسلمان یا "وہابی" اُنکی عظمت کرسکے، لیکن باوجود اسکے نہ صرف یہ عقیر بلکہ اُس جماعت کے کثیر افراد جو کبھی مہاراجہ صاحب کے لوائے سرداری کے نیچے جمع رہتی تھی، اُنکی دل سے قدر کرتے اور اُنکی سرداری کو اپنے لیے باعثِ فخر جانتے ہیں۔ یہ کیوں؟ کیا صرف اسی لیے نہیں کہ اُنکی بے لوثی اور اخلاص مسلّم ہے۔ اور اُن کا ایثار اور جذبۂ حریت پسندی غیر مشتبہ۔ مہاراجہ صاحب کو اگر قومی و ملکی کارکنوں کی جماعت میں وہی عزت و منزلت حاصل کرنا

مقصود ہے جو سنہ ۱۹۱۸ء تک انھیں حاصل رہی تو وہ شوق سے آزمائش گاہِ سیاست میں تشریف لائیں اور آنکھوں کے آنسوؤں یا زبان کے لبوں سے نہیں بلکہ اعمال و کردار سے لوگوں کے دلوں میں اپنی بے نفسی و اخلاص مندی، قوم پروری و وطن دوستی، آزادی و حریت پسندی کا یقین و اعتماد پیدا کریں تو دوسرے احباب کے ساتھ بلکہ انشاءاللہ اُن سے کچھ آگے رہ کر میں بھی عظمت و احترام کی نذر بارگاہِ معلّٰی میں پیش کرنے کے لئے کمربستہ نظر آؤں گا۔

البتہ بے موقع نہ ہوگا اگر انھیں خواجہ حافظ کا وہ شعر اسوقت یاد دلا دیا جائے، جو ۱۹۱۶ء میں مسز سروجنی نائیڈو نے سر جیمس میسٹن کی موجودگی میں تقریر کرتے ہوئے قیصر باغ کی بارہ دری میں پڑھا اور پڑھ کر تمام سامعین کو مسحور کر لیا تھا، وھو ھذا

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اور اگر مہاراجہ صاحب کو صرف میرے زبان و قلم پر بندشیں عائد کرنا منظور ہیں، تو میں اسکے لیے بھی بخوشی حاضر ہوں، لیکن یہ نذرانہ بھی غیر مشروط نہیں۔

(لین دین) کا اصول اس دنیا میں عام طور پر رائج ہے۔ میں بھی اپنی خاموشی کی قیمت چاہتا ہوں۔ اور قیمت بھی ایسی نہیں کہ اُن کے امکان سے باہر ہو۔

یعنی صرف اسقدر کہ وہ قومی و ملکی معاملات میں اپنی سرمایہ دارانہ روش کو ترک فرما دیں۔

اُن کا تعلقہ، اُن کی خان بہادری، اُن کا کے سی ایس آئی، اُن کی ہوم ممبری اور اُن کی مہاراجگی سب اُن کو مبارک رہے، بلکہ اگر اُن کو حکومت کا خطاب عطا کر دے، یا کسی صوبہ کی گورنری دیدے، یا مہاراجہ بنارس کی طرح محمود آباد کا خود مختار والیِ ملک بنا دے جسکی تمنا سے دیرینہ سُنا ہے کہ اُن کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تب بھی چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ ہمیں تو صرف اپنی قوم و ملک کی فلاح و بہبود سے سروکار ہے۔ اور اُن کی روش نے چونکہ ثابت کر دیا ہے کہ اُن کے موجودہ مطامحِ نظر اور طریقِ کار سے قوم و ملک کو نقصان پہونچے گا، اس لیے اُن سے اختلاف کرنے کی جرأت کرنا پڑتی ہے۔ وہ ان چیزوں سے بے تعلق ہو جائیں، جو بظاہر ناممکن ہے، یا پھر اپنی روش بدل دیں (حالانکہ انگریزی مثل کے بموجب چیتے کی کھال کے نقش و نگار نہیں بدلتے) تو ہم بڑی خوشی سے اسکے لیے تیار ہونگے کہ اُن کے خلاف زبان و قلم سے ایک حرف بھی نہ نکلنے دیں

اگر یہ دونوں غیر ممکن یا ناقابل قبول ہیں تو ہمیں اختلاف کرنے پر بھی مجبور و معذور جانیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

لیکن خواہ موجودہ اختلافات قائم رہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وسعت حاصل کرلیں یا اُن کی روش میں تبدیلی پیدا ہونے کی وجہ سے بالکل رفع ہو جائیں - مہاراجہ صاحب کو اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اس نقیر کو خدانخواستہ اُن سے دشمنی و عداوت ہے

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر وہ بھی تو ابن سعود کے خلاف امکانی جد و جہد کرتے رہے ہیں - عقیدہ کا اختلاف اس کا باعث ہو یا حجاز کی سیاست - لیکن ابن سعود کا بڑے سے بڑا حامی یا کوئی کٹر سے کٹر "وہابی" بھی یہ تو نہیں کہتا کہ مہاراجہ صاحب کو ابن سعود سے عداوت و دشمنی ہے یا اُسکو تخت حجاز سے گرا کر وہ خود ارض حجاز کے والی و حکمراں بننا چاہتے ہیں - ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ چونکہ وہ یکا موحد ہے اور مقابر و آثار کی عظمت کرنے میں مہاراجہ صاحب اور اُنکے ہم خیالوں اور ہم مشربوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اس لیے وہ اُسے حکومت حجاز سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں - اور اگرچہ مغربی سیاسیین کی طرح ابن سعود کے مخالفین عموماً حرب عقائد کا سارا الزام اُسی غریب کے سر تھوپتے ہیں لیکن جن لوگوں کی بصیرت پر حماقت یا تعصب نے پردے نہیں ڈال دیے ہیں وہ تو اس قسم کی ابلہ فریبیوں میں مبتلا نہیں ہوسکتے کہ ابن سعود کے مخالفین کے دلوں میں محض اہل حجاز کی محبت کے جذبات ہیں، عقائد کو کچھ دخل نہیں -

پھر اگر مذہبی معتقدات یا سیاسی تخیلات کے اختلاف کی بنا پر مہاراجہ صاحب اور اُنکے شرکاءکار یا محترم علی برادران اور اُن کے متبعین حق بجانب ہوسکتے ہیں کہ ابن سعود کے خلاف ہر قسم کی مخالفت راؤں کا اظہار کریں، مظاہروں کا سامان کریں، حتیٰ کہ التواء حج تک کا اعلان کردیں، وائسرائے سے جاکر عرض معروض کریں، جارج پنجم کی دُہائی دیں، اور سارے ہندوستان بلکہ سارے عالم اسلامی تک میں اپنی مخالفت کا ڈھنڈورا پیٹیں تو اس نقیر بے نوا سے کیوں اسکی توقع کی جاتی ہے کہ وہ مہاراجہ صاحب کی غلطیوں اور کرشمہ سازیوں پر پردہ ڈالتا رہے اور اُنکی بےمہریوں اور بدعنوانیوں کو نظر انداز کرتا رہے -

ظفر الملک

۲۳ - اگست ۲۸ء

دائرۂ سیاسیہ

اُردو زبان میں یوں تو خدا کے فضل و کرم سے ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے، اور اس ذخیرے میں روز افزوں ترقی ہوتی جاتی ہے، لیکن ایسی کتابیں جن کے مطالعہ سے غیر انگریزی داں اصحاب کو سیاسی مسائل سے پوری آگاہی ہو، اُردو میں اتنی کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں - اور اب تک اس اہم ضرورت کی طرف ہمارے اہل قلم اور قومی کارکن دونوں میں سے کسی کی توجہ نہیں -

ہندوستان کو اگر آزاد کرانا ہے، یا سیاسی حیثیت سے ہندوستانیوں کو کسی قسم کی بھی ترقی کرنا ہے تو تھوڑے سے انگریزی داں اصحاب کی سیاسی واقفیت سے کام نہ چلے گا، بلکہ لازمی ہے کہ وہ کثیر التعداد طبقہ جو انگریزی نہیں جانتا اور جسکی اعانت و تائید کے بغیر اس ملک میں کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، سیاسی امور میں پوری دلچسپی لینے لگے - اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب وہ سیاسی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جائے -

اب تک عام باشندگان ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ اخبارات اور مجالس عامہ رہی ہیں - لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کافی نہیں - ضرورت اسکی ہے کہ عام طور پر لوگوں کو سیاست کے متعلق زیادہ ٹھوس واقفیت حاصل ہو اور مسائلِ سیاسی کی عملی و اصولی حیثیت اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ ملک میں جو تغیرات ہوئے، ہو رہے، یا ہونے والے ہیں، اُنکی حقیقت کو وہ پوری طرح سمجھ سکیں، اور اُنکی اہمیت کے لحاظ سے جہاں ضرورت ہو اپنی رائے کا استعمال کر سکیں -

ان حالات کو پیش نظر رکھ کر تہیہ کیا گیا ہے کہ سیاسی مسائل پر کتابیں اور رسائل شائع کرنے کی غرض سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی جائے جسکا طریق کار فی الحال حسب ذیل تجویز کیا گیا ہے:

(۱) جو صاحب اس مقصد سے اتفاق رکھتے ہوں وہ بلا لحاظ مذہب و ملت یا سیاسی فرقہ بندیوں کے اس دائرہ کے رکن بن سکتے ہیں - مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے -

(الف) جو صاحب کم از کم عہ سالانہ چندہ ادا کریں وہ دائرہ سیاسیہ کے رکن متصور ہونگے -

ب - جو صاحب کوئی مفید کتاب لکھیں اور اُسکے حقوق طبع و اشاعت بغیر کسی معاوضہ کے

دائرہ کو ہبہ کر دیں وہ دائرۂ سیاسیہ کے رفیق متصور ہونگے۔

(۲) دائرۂ سیاسیہ کی تمام مطبوعات جملہ اراکین ورفقاء کو سال بسال بغیر کسی قیمت کے بھیجی جائینگی۔ البتہ جن اصحاب کے ذمہ چندہ باقی رہیگا انکو تا ادائے رقم بقایا کتابیں نہ بھیجی جائینگی۔

(۳) کتب و رسائل کی فروخت سے جو آمدنی دائرۂ سیاسیہ کو ہوگی وہ مسلسل مزید کتابوں کی اشاعت پر صرف کی جائیگی اور موقع ہوگا تو دائرہ کی جانب سے ایک ماہوار سیاسی جریدہ جاری کیا جائیگا۔

(۴) سردست ادارہ کی جملہ خدمات دفتر اخبار ہمدرد دہلی سے متعلق رہیں گی، اور جس وقت اراکین ورفقاء کی تعداد سو سے زائد ہو جائیگی اُسوقت سب کے باہمی مشورہ سے دائرۂ سیاسیہ کا ایک مستقل دستور العمل مرتب کیا جائیگا۔ اور اُسکا سارا انتظام خود اراکینِ دائرہ کے سپرد کر دیا جائے گا۔

جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہوں اور اس ضروری کام میں اتحاد عمل کرنا چاہتے ہوں، اُن سے استدعا ہے کہ دس روپیہ ارسال فرماکر اپنا نام نامی اراکین دائرہ کی فہرست میں درج کرائیں، اور جو صاحب قلمی اعانت فرمانا چاہتے ہوں وہ بھی دفتر کو اپنے عندیہ سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ پیش نظر کاموں میں اُنکی اعانت حاصل کی جائے۔

دائرۂ سیاسیہ کے متعلق جملہ مراسلات و ترسیلِ زر کا پتہ یہ ہوگا:—

مہتمم دائرہ سیاسیہ" دفتر روزانہ ہمدرد۔ دہلی"

داعیان

(مولانا) حسین احمد غفرلہ (لاہور)	(ڈاکٹر) مختار احمد انصاری (دہلی)	(سر) عبدالقادر (دیوبند)
(ڈاکٹر) سیف الدین کچلو (لاہور)	(مولانا) حسرت موہانی (کانپور)	(مولانا) ابوالکلام (کلکتہ)
(پنڈت) جواہر لال نہرو (الہ آباد)	(نواب) اسمعیل خاں (میرٹھ)	(ڈاکٹر) سید محمود (چھپرا بہار)
ظفر الملک (لکھنؤ)	(مولانا) عبدالماجد (دریاباد۔ رودھ)	(پنڈت) کشن پرشاد کول (لکھنؤ)

سفرنامۂ اندلس

(۴)

عدالت، دادرسی و دادرسانی

وہ زمانہ تواب اہلِ اسپین کے خواب و خیال سے بھی بعید ہے کہ جب وہاں قاضی اجلاس کرتا تھا۔ مقدمات پیش ہوتے تھے۔ وکلائے فریقین شرع یا قانون کی ہندی کی چندی نکالتے تھے شہادتوں پر جرح و تعدیل ہوتی تھی۔ اور زیادہ سے زیادہ تین دن کے اندر مقدمہ کا فیصلہ اور فوراً ہی ڈگری یا حکمِ آخر کا نفاذ ہو جاتا تھا۔ اور ہر فریق اطمینان کے ساتھ اپنے گھر جا بیٹھتا تھا۔ عدالتہائے مرافعہ کھلی ہوئی تھیں اور ہر شخص کو بادشاہ تک پہونچنے کا حق و موقعہ تھا۔

یہ صورت تو زمانۂ وحشت یا کُفّار (مسلمانوں) کی علامت سمجھ کر مٹا دی گئی اور اب صرف زیب (یا بزیب) قرطاس رہ گئی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ وقت بھی اسپین پر نہیں آیا، کہ مثلاً فوجداری میں، پولیس کو سخت جوابدہی کرنا پڑتی ہے کہ مجرم ایک عرصۂ معینہ سے زائد کیوں زیر حراست رہا اور مجسٹریٹوں سے بازپرس ہوتی ہے کہ اتنا عرصہ مقدمات کیوں زیر تجویز اور ملزم کیوں زیر حوالات رہا ہے

اس وقت یہ حالت ہے کہ عدالتوں کا نظم و نسق و طریق کار زمانۂ حال سے اگر صدیوں نہیں تو بیسیوں برس پیچھے ہے۔ انصاف یا دادرسی صحیح معنوں میں وہاں مفقود ہے۔ اگر کوئی انصاف پسند اور رحمدل مجسٹریٹ صحیح و واجب فیصلہ بھی صادر کرے تب بھی یہ حالت ہے کہ غریب ملزم اپنے جرم کی انتہائی سزا سے زیادہ حوالات میں سزا بُھگت چکا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جرم کی انتہائی سزا ایک سال قید سخت ہے، تو ملزم دو سال زیر حوالات رہ چکا ہوتا ہے۔ یہ نہ کہیے کہ یہ صورت شاذ واقع ہوتی ہوگی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہزار ملزموں میں سے شاید ایک ہی ایسا خوش قسمت ہوتا ہو کہ جو جلدی چھٹکارا پا جاتا ہو۔

فوجداری مقدمات کے دیر میں فیصلہ پانے کے خلاف برسوں لوگوں نے شکایتیں کی ہیں، مگر بے نتیجہ۔ ۱۸۸۲ء میں کچھ اصلاحیں ہوئیں، مگر حسب معمول وہ عمل میں نہیں آئیں۔ باوجودیکہ وہ اب تک اوراقِ قواعد کی زیبائش ہیں۔ ان کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس پر زور کے ساتھ بار بار توجہ بھی دلائی جاتی ہے، مگر بے اثر۔

مگر زمانہ وہ چیز ہے کہ وہ سب کو اپنی راہ پر ڈال لیتا ہے۔ قریباً دس سال ہوئے کہ لوگوں نے حقیقی طور سے اس طریقِ کار کے خلاف بغاوت شروع کی ہے۔ اخبارات میں اس کے خلاف مضامین چھپتے ہیں۔ لیکن اگر مجسٹریٹ خود کسی طاقتور فریق متعلقہ وزارت کا فرد یا پٹھو ہوتا ہے تو وہ اخبار سنسر کیا جاتا ہے۔ بڑا اثر ٹریڈ یونین کا پڑ رہا ہے جو ایسے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ گو وہ اپنی برادری ہی کی حمایت کرتے ہیں، مگر ضمناً اس کا فائدہ اوروں کو بھی پہونچ جاتا ہے، شاید یہ صورت کسی وقت کارآمد ہو جائے۔ علامتیں تو یہی ہیں۔ گو دس برس کا تجربہ تو بہت اچھا نہیں۔ ہائیکورٹ بھی اس طرف متوجہ ہے۔ چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۲۲ء میں ہائی کورٹ نے ایک گشتی حکم سخت تہدید آمیز الفاظ میں جاری کیا تھا، اسکا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) بشرطیکہ محکمہ سیاسیات کی طرف سے مداخلت نہ ہو عام طور پر مقدمات (دیوانی یا فوجداری) اتنی مرتبہ ملتوی کیے جاتے ہیں کہ جو سخت شرمناک ہیں۔

(۲) اضلاع میں یہ حالت اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔

(۳) وہ لوگ جن کا تعلق سلطنت سے محض سیاسی ہے اپنے اثر و نفوذ سے اس طرح مقدمات فیصل کرا لیتے ہیں کہ کسی فریق کو حق اپیل باقی نہیں رہتا۔

(۴) عام عدالتیں بالکل عدالتِ کلیسائی بنی ہوئی ہیں کہ جن پر اب بھی بجا طور سے مذاق اُڑایا جاتا ہے اور شعراء اپنے قصائد ہجویہ میں اپنا زورِ کلام دکھلاتے ہیں۔

(۵) جن مقدمات میں جیوری سے مدد لی جاتی ہے یا سشن میں پیش ہوتے ہیں اُن میں بار بار التواء کیا جانا سخت شرم کی بات ہے۔ فریقِ مقدمہ کو تکالیف ہوتی ہیں۔ جیوری کو تکلیف ہوتی ہے بعض وقت اہالی جیوری مر جاتے ہیں یا کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے حاضر نہیں ہوتے۔ اس سے یا تو مقدمہ از سرِ نو شروع کرنا پڑتا ہے یا انصاف نہیں ہوتا۔ سشن روز روز اپنا اجلاس نہیں کرتا، اور مقدمات برسوں فیصل نہیں ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی گشتی حکم میں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا گیا ہے جو سرقہ کا تھا، اور جس میں تین آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ یہ مقدمہ پانچ برس کے بعد فیصل ہوا! کہا گیا ہے کہ "یہ مقدمہ اپنی آپ ہی مثال نہیں ہے بلکہ ہزاروں ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں"۔

کیبنیٹ کونسل کے ممبر تو بڑی بلا ہیں، معمولی ممبران لیجسلیٹو کونسل یا انکے دست پروردہ و حمایتی کے مقابلہ میں انصاف پانا ناممکن ہے۔ ان لوگوں کی سفارشیں الگ رہیں ان کا اثر و نفوذ

ہی کافی ہے۔ انکے علاوہ زمیندار اپنے اقتدار کی رو سے عدالتوں کو اپنا فٹ بال بنائے رہتے ہیں۔ میران کے احکام سے عدالتیں سرتابی کرسکتی ہیں مگر زمینداروں کی تعمیل اشارہ اگر نہ کی جائے تو مجسٹریٹ یا منصف کا برجا قائم رہنا ناممکن۔ بعض وقت تو ان کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گیا ہے۔

برسوں کی چیخ پکار اور محنتِ شاقہ کے بعد رعایا کو حق جیوری عطا کیا گیا۔ قطع نظر اسکے کہ عدالتوں نے اسکو پسند نہیں کیا، صوبہ برشلونہ و دیگر مقامات میں تو پہلے ہی سال یہ ثابت ہوگیا کہ اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں جیوری کے ممبروں کو اتنی تخویف کی گئی کہ وہ غریب کسی کو ملزم قرار دیتے ہوے اپنی جان سے ڈرتے تھے۔ اس کے ثبوت میں سارا گوسا کا ایک مقدمہ اس قابل ہے کہ اسکو کسیقدر تفصیل سے بیان کیا جائے:۔

سارا گوسا میں اسٹرائک ہوا۔ مزدوروں نے پولیس کے کئی سپاہیوں اور افسروں اور ایک مجسٹریٹ کو قتل کردیا۔ مقدمہ قائم ہوا جس میں ایک فریق سرکار اور زمیندار تھے اور دوسرا فریق یہ مزدور۔ جیوری مقرر ہوئی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اُن میں سے ہر ایک کے پاس کئی کئی خطوط اس دھمکی کے پہونچے کہ اگر اُنھوں نے ملزموں کے خلاف رائے دی تو وہ قتل کردیے جائینگے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اُنکی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ مقررہ پر اٹھارہ آدمیوں (جیورس) نے ڈاکٹری سرٹفکیٹ بھیجدیے۔ وکیل سرکار بھی عین وقت پر بیمار ہوگیا۔ مجبوراً مقدمہ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسری پیشی پر (جو پانچ روز بعد مقرر ہوئی) بیالیس گواہوں میں سے صرف اکیس حاضر ہوے اور جیوری کے پھر ڈاکٹری سرٹفکیٹ آگئے۔ اس واقعہ پر ایک اخبار نے جو نوٹ لکھا تھا وہ یہ ہے کہ "سارا گوسا میں جو وبا یکایک پھوٹ پڑی ہے نہ اُسکی تحقیقات کی ضرورت ہے نہ محکمۂ صفائی کے لیے فکر کی بات ہے۔ مگر اس واقعہ سے عوام الناس کو تشخیص مرض میں بڑی مدد ملی ہے"۔

بڑی مصیبت رشوت ہے۔ جو بنام نہاد "قیمت" اسپین بھر میں بلاے بے درماں بنی ہوئی ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمام حکام بد دیانت ہیں۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ دوسری آفت یہ ہے کہ اکثر حکام کسی نہ کسی سیاسی آدمی کے آوردہ ہیں۔ اُن سے یہ اُمید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ بے رو و رعایت کام کریں گے۔ محکمۂ دیوانی کی حالت اور بھی بدتر ہے؛ مگر محکمۂ جیل بدترین ہے۔ نہ صرف اُن مجرمین کے لیے جو زیر تجویز ہیں، بلکہ اُن ملزمین کے لیے بھی جو اپنی سزاے اعمال پا رہے ہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ غضب ہے کہ پولیس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ انکی داد و فریاد کہیں نہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں جیلخانوں کا خرچ بہ مقابلہ سنہ ۱۹۱۵ء کے قریباً ۱۳۰ فی صدی بڑھ گیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اصلی وجہ یہ ہے

کہ افسرانِ محکمہ پولیس کے حکم سے ہزاروں ایسے آدمی جیل میں بھیج دیے گئے جو عدالت میں محض اس لیے نہیں پیش کیے گئے تھے کہ اُن کے خلاف اثباتِ جرم کے ایسے کافی دلائل موجود نہیں ہیں کہ عدالتیں انکو سزائیں دے سکیں، مگر حکامِ پولیس کو اُنکے ملزم ہونے کا یقینِ کامل ہے! ایک سوشلسٹ ممبر کونسل نے اس واقعہ کی طرف میڈرڈ کے میئر کو توجہ دلاتے ہوئے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک تھیٹر میں تماشا دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اُن سے ٹکٹ مانگا گیا۔ یہ سخت توہین تھی۔ انھوں نے کہا کہ پولیس سے دریافت کرو کہ میں کون ہوں۔ وہ غریب دریافت کرنے گیا تو گرفتار کرلیا گیا اور پولیس کے افسرِ اعلیٰ نے اُس شخص پر تین سو روپیہ جرمانہ کردیا۔ چونکہ جرمانہ فوراً ادا نہ ہوسکا، اسلیے وہ جیل بھیج دیا گیا! میئر نے اس پر توجہ فرمانے کا وعدہ کیا، مگر نہ معلوم کیا انجام ہوا۔

کسی کنسٹبل پولیس سے بگاڑ لینا تو دوزخ کو مول لینا ہے۔ ایک حلال خور سے بھی چشمک ہوجانے کے یہ معنی ہیں کہ تمام میونسپلٹی کو اپنا دشمن بنا لیا گیا۔ جو فریق کہ برسرِ اقتدار ہو اُسکے خلاف ووٹ دینے یا اسکی تیاری کرنا بھی جُرم ہے۔ اسکی سزا کسی نہ کسی بہانے سے پانا پڑتی ہے۔

مفصلۂ بالا بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اُس مُلک میں زندگی وبالِ جان ہوگی اور ہر شخص کو ہر وقت جیل جانے کا اندیشہ رہتا ہوگا۔ حقیقت میں یہ بات نہیں ہے۔ نیک چلنی اور احتیاط اپنا پھل لاتی ہے۔ البتہ بعض موقعے ہوتے ہیں کہ ہر شخص کو خائف رہنا چاہیے۔ مثلاً سنہ ۱۹۲۱ء میں جب سینور ایڈوارڈو ڈاٹو وزیرِ اعظم مارا گیا تھا تو کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہ گیا تھا۔ ہزاروں بے گناہ گرفتار ہوے اور پولیس کی معمولی و مشہور تعزیریں اور عدالتوں کی سُستی و کاہلی کی سزائیں پائیں۔ اس موقعہ پر جس شخص پر ذرا سا بھی شبہہ پولیس کو ہوا، نہ صرف وہی بلکہ اُسکا اور اُسکی سسرال تک کا تمام خاندان گرفتار و پامال ہوا۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ اس پولیٹیکل قتل میں قصور خود پولیس کا تھا۔ کیونکہ اُسے پیشتر ہی سے ملزمین نے اطلاع دے دی تھی۔ پولیس کا یہ عذر ہے کہ وزیرِ اعظم بوقتِ قتل موٹر پر سوار تھے، اور پولیس کو کوئی ایسی سواری گورنمنٹ کی طرف سے مہیا نہیں کی گئی تھی۔ (مقابلہ کیجیے اس واقعہ کا دہلی کے اُس واقعہ سے جب لارڈ ہارڈنگ پر بم کا گولہ پھینکا گیا)

لہ کان فصاحت لکھنؤ کے ایک اخبار نے **Mayor** کا ترجمہ "ابو البلد" کیا ہے۔ میں بھی یہی لکھنا چاہتا تھا مگر شاید سمجھا نہ جاتا۔ اس لیے معافی مانگتا ہوں۔ ایک اور موقعہ پر اسی جانِ فصاحت لکھنؤ کے اخبار کی اتباع میں میں نے کابل کی ملکہ "سوریہ" کو "ملکہ ثوریہ" لکھا ہے۔ اس اصلاح کی بیں اس معزز دیوقرامِ اخبار سے معافی چاہتا ہوں میری رائے ناقص میں لفظ "ثوریہ" زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ ثور کے معنی ہیں بیل۔ اسکا مؤنث ثوریہ بمعنی گائے یقیناً صحیح ہوگا۔

یوں تو اپنے اپنے ملکوں کی رعایا کی ہر سفیر مفاظت کرتا ہے، مگر رعایائے گورنمنٹ برطانیہ (خواہ وہ ذلیل ملک ہندوستان کی ہو یا کناڈا اور آسٹریلیا کی) بہت کچھ معئون و محفوظ ہے۔ ہماری گورنمنٹ کو یہ بجا شکایت ہے کہ سفیر برطانیہ کا زیادہ وقت اسی میں خراب ہوتا ہے۔

جن دنوں کہ اسپین میں بوجہ حرفتی مقابلہ کے کشاکش ہوتی ہے وہ زمانہ بھی خطرناک ہوتا ہے۔ اُسوقت ہر شخص کو سخت احتیاط رکھنا چاہیے۔ بہتیرے بے گناہ تکلیف اٹھا چکے ہیں اور بعض بعض دو دو برس جیل میں پڑے سڑتے رہے ہیں، اور اسکے بعد بھی دور دراز مقامات کی جیلوں میں اپنی ہی سزا بھگتنے کے لیے بھیج دیے گئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اُن غریبوں پر ان چار برسوں میں کسی عدالت نے جرم قائم نہیں کیا!

جو حضرات ہندوستان کے جیلوں کے انتظامات پر نکتہ چینی کر رہے ہیں، مجھے اُن سے دلی ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اسپین کے جیلوں کے حالات بھی مختصر طور پر سُن لیں

سینور لوسی اوگل جیل کمیٹی کے ممبر نے ایک جیل کا ملاحظہ کرنے کے بعد لکھا ہے:-

عورتوں کے جیل میں بہت سی عورتیں تو وہ ہیں کہ جو حُسن فروش کہلاتی ہیں، اور اپنے فرقہ کی معمولی بیماریوں سے خوب اچھی طرح سرفراز ہیں۔ انکے سوا بہت سی بھکاری عورتیں ہیں، اور وہ گھرستنیں ہیں جو کسی قانونِ میونسپلٹی کی خلاف ورزی میں قید ہیں۔ ان سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جن پر ابھی کسی عدالت نے جرم بھی قائم نہیں کیا۔ ان سب کے لیے صرف ایک کوٹھری مہیا کی گئی ہے۔ اُن کو اپنا بستر لانے کی اجازت نہیں۔ ٹاٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے انکو دیے گئے ہیں، وہ اُنھیں کو بچھاتی ہیں۔ چونکہ جگہ کم ہے اس لیے ایکدوسری سے گویا ہم بغل ہو کر سوتی ہیں۔ محکمۂ صفائی کے انسپکٹر سے لے کر گورنر تک کو یہ حال معلوم ہے۔ اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا ابھی تپ محرقہ اور حسن فروشوں کی مشہور بیماریوں کی ملک میں کمی ہے کہ وہ اُن کا اور زیادہ شیوع چاہتے ہیں؟

مردانہ جیل میں ۱۵-۱۶ برس کے لڑکوں سے لیکر بوڑھے اور اندھے تک اپنے دن گن رہے ہیں۔ زیادہ تعداد اُن لڑکوں کی ہے جو قماربازی یا بھیک مانگنے کے جرم میں گرفتار ہیں۔ اور باقی قیدی چھوٹے جرموں سے قتل و غارت کے جرموں کے مجرم ہیں۔ یہ سب ایسی کوٹھریوں میں بند کیے جاتے ہیں جن میں صرف ایک روشندان گز بھر کا ہے۔ کوٹھری نہ صرف تاریک ہے بلکہ نم دار بھی ہے۔ فرش کچا ہے۔ سب کیلیے ایک ٹاٹ ہے۔ رہا شدہ قیدیوں کے کپڑے اُنھیں

پہننے کو ملتے ہیں۔ اُنکے دھونے یا دُس انفکٹ کرنے کا کوئی سامان نہیں، کوٹھریوں کے ڈس انفکٹ کا کیا مذکور ہے۔ ان میں سے جو بدبو نکلتی ہے وہ دُور دُور تک گوارا نہیں ہوتی۔ ہر قسم کے موذی کیڑوں کی بھرمار ہے۔ بدکاری کا سامان مہیا ہے۔ اب بھی اگر شہروں میں وبا نہیں پھیلتی تو حکام جیل کا قصور نہیں ہے۔ میں مجسٹریٹوں کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ان بدقسمتوں میں سے شاید ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس پر کوئی عدالت اثبات جرم کر چکی ہو یا سزا دے چکی ہو۔ ان میں سے بہت سے لیسے ہیں کہ تین تین برس سے یہاں پڑے سڑ رہے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ بیگناہ ہیں۔ اگر اسکو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ مجرم ہیں، تو کیا ابھی اُن کے جرموں کا کفارہ نہیں ہو چکا ہے؟ .... کیا کوئی ایسا ہے جو میرے اس بیان کی تردید و تکذیب کرے؟ کیا کوئی ایسا ہے جو اصلاحِ حال میں میرا ہم نوا ہو؟

لہٰذا اسپین میں سے شاید کوئی بھی ایسا آدمی نہ نکلے جو اس بات کو تسلیم نہ کرلے کہ اسپین کے جیل بالکل وہی ہیں جو قرون وسطے میں تھے۔ ڈکٹیٹر کا یہ دعوٰی ہے کہ وہ ہر چیز میں اسلوب پیدا کر دینگے۔ کوئی اور محکمہ تو شاید اُن کا شکرگزار ہو، مگر محکمہ جیل تو بد سے بدتر ہوتے چلا جاتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ بہت سے زیر تجویز قیدی رہا کر دیے گئے ہیں۔ مگر کیوں؟ محض اس لیے کہ پولٹیکل قیدیوں کے لیے جگہ خالی ہو۔

مزدُور

تمام دنیا میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نفرت و عداوت اس شدت کے ساتھ شروع ہوئی ہے کہ (العلم عند اللہ) انجام یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دار اُس سے زیادہ حقیر و ذلیل ہو جائیں گے جتنے کسی زمانہ میں مزدور تھے۔ مزدوروں کی طاقت روز افزوں ہے اور سرمایہ دار کی یہ کیفیت ہے کہ وہ حیران و پریشاں مُنہ تاک رہے ہیں۔ وہ وقت بہت قریب ہے کہ ایں کشند نازبوں بندہ۔ دُور کیوں جائیے اس تاریک و غلام مُلک ہندوستان میں ہوشمندوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ باورچی، خدمتگار، سائیس کہاں سے اور کس مشاہرہ پر ملیں گے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ماہ فروری گزشتہ کے اخیر میں بمقام الہ آباد ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ ایک حلال خور (مہتر) بڑے بڑے بازاروں میں اپنی صوتِ مہیب کے ساتھ پکارتا پھرتا تھا کہ "صدیاں ہوگئیں کہ ہندو اور مسلمان ہم سے غلیظ سے غلیظ کام لیتے رہے ہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ان سے یہی

کام لیں" وغیرہ وغیرہ۔ کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ اُس سے کچھ سوال کرلے، روکنا تو امرِ آخر ہے۔ یہ تو ہندوستان کا حال ہے؛ یورپ میں تو بڑے بڑے اہم اور اصولی سوال پیدا ہیں اور سرمایہ دار پریشان ہیں۔ لیکن اگر اسکا اثر نہیں ہے تو اسپین میں۔ وہاں اب بھی یہ کیفیت ہے کہ کارخانہ داروں کے وہی خیالات ہیں، جو صدیوں سے چلے آتے ہیں کہ ہمارے مزدور ہمارے زیردست ہیں۔ زمیندار اور امراُ اسی پرانی ہوا میں اُڑ رہے ہیں اور وہ اپنے زیردستوں پر پرانے ظلم روا رکھتے ہیں اور ویسے ہی غرور سے پیش آتے ہیں۔ یہ کیفیت نہ صرف اُن ہی مزدوروں کی ہے جو اپنے گاڑھے پسینے کی روٹی کھاتے ہیں، بلکہ اُن کی بھی جو سوداگروں کے نوکر ہیں یا کسی حرفتی کارخانہ میں کام کرتے ہیں۔ اسکو ذرا تفہیم کے ساتھ یوں کہنا چاہیے کہ اسپین کا ہر مرد و عورت اُس شخص کو حقیر سمجھتے ہیں جس سے وہ تنخواہ یا مزدوری دے کر کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے کردار و گفتار سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک مزدور یا تنخواہ دار کا کوئی حق، سوائے ہاتھ کی اُٹھائی چیز کے، اُن پر نہیں ہے۔ وہ اس امر کو کبھی خیال میں بھی نہیں لاتے کہ اُنکی آرام و آسایش، عزت و آبرو ان ہی مزدوروں یا نوکروں کے صدقہ میں ہے۔ اپنے فرائض کی ادائگی کا کوئی خاص صلہ یا اُنکی خدمت کا پورا معاوضہ ہرگز نہیں ملتا۔ ہر سرمایہ دار اپنا حق سمجھتا ہے کہ مزدور سے سب سے زیادہ کام لے اور سب سے کم مزدوری دے۔ وہ مزدور پر ظلم کرے اور وہ اُسے سہے اور اُف نہ کرے۔ ہر سرمایہ دار کی بیوی اپنی ماما یا نوکر کو یہ سمجھتی اور وہی سلوک کرتی ہے جو کوڑے کرکٹ سے ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین کے نوکر یا مزدور اپنے آقا کو پورا کام کرکے نہیں دیتے۔ اور نگرے، سست، بے پروا اور ناقابل ہوتے ہیں۔ ایک معمولی مزدور دس آنے مزدوری پاتا ہے۔ جوان، مضبوط، تندرست کاریگر کو دو شلنگ پانچ پنس سے لیکر ایک شلنگ ۸ پنس تک مزدوری ملتی ہے۔ ایک کلرک کو ۴ پونڈ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے، خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت قلیل مزدوری ہے۔ اور مزدور اس سے بھی کم کام کرکے دیتا ہے۔ جنگ کے بعد سے نہایت قدرے قلیل مزدوریاں اور تنخواہیں بڑھ گئی ہیں، وہ بھی اُسوقت کہ جب اسٹرایک ہوئیں اور یہ لوگ خم ٹھونک کر مرنے مارنے پر تیار ہوگئے۔

ملک اسپین کی ایک بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ وہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے پہلے ہی کم ہے اور بیواؤں اور یتیموں کی تعداد نہیں بڑھی کہ اُنکو مردوں کے مقابلہ کا حوصلہ نہیں ہوا۔ نہ وہاں فیشن کی انگلستان و فرانس جیسی بدہضمی ہے۔ عورتیں اب بھی بازار میں مردوں کی دست نگر ہیں اور گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔ ورنہ خدا جانے کیا آفت آتی۔

مزدوروں کی بڑی دشمن پولیس ہے (شاید اس میں وہ پولیس شامل نہیں ہے جن کو خود بہت ہی کم تنخواہ ملتی ہے - وہ قواعد داں بھی واجبی ہی ہے اور سخت بد تہذیب - اُنکی وردیاں بھی ایسی پھٹی ہوئی ہیں کہ وہ خود مزدور معلوم ہوتے ہیں - یہ پولیس ہی ہے جو مزدوروں کو آزاد نہیں ہونے دیتی - اور اُن سے ہر جگہ اس طرح سلوک کرتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ روز روز فساد کیوں نہیں ہوتے اہالی پولیس اَن پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں - انکی زبان ایسی سخت ہے کہ وہ مزدوروں سے بغیر گالی کے بات نہیں کرتے - ایک ذرا سے خیالی جُرم پر عورتوں، مَردوں اور بچوں کو ہتکڑی لگاکر بازاروں میں لیے پھرتے ہیں، جس سے مزدوروں کی آبرو میں فرق آتا ہے اور وہ اور بھی بے حیا ہو جاتے ہیں -

اسپین کے حکام کو اپنے اختیارات کی جا و بیجا نمائش کرنے کا بہت شوق ہے - مزدور اپنی تکلیف رفع کرنے کے لیے کوئی جلسہ کرتے ہیں تو مجسٹریٹ پولیس کی ایک فوج لیکر پہونچ جاتے ہیں؛ اُنکی حرف گیری کرتے ہیں؛ انکو غصہ آتا ہے اور پولیس کی ہتکڑیاں فوراً کام میں آنا شروع ہو جاتی ہیں - اس کا انجام بعض وقت فریقین کے قتل پر ہوتا ہے - اور انتقام کا سلسلہ اسی طرح شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ ہمارے یہاں کے سرحدی پٹھانوں میں - یہ دیکھ کر جو ہوشدار ہیں وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ ایسا ملک کبھی ترقی کر بھی سکتا ہے یا نہیں - خصوصاً ایسی حالت میں کہ متوسط الحال لوگ اپنی ہستی کا کوئی اثر گورنمنٹ پر پیدا نہیں کر سکتے - ٹریڈ یونین اور اسی قبیل کی اور انجمنیں اب بھی وہاں عملی طور پر خلافِ قانون ہی سمجھی جاتی ہیں -

پادری صدیوں سے اپنی تمام بلاغت اسپر صرف کرتے رہے ہیں کہ انسان کو خدا پر توکل کرنا اور اپنے حال میں خوش رہنا چاہیے - اسپین کے غربا نے اس پر بہت کچھ عمل اور اپنی حالت پر صبر کیا، مگر یکایک ملک روس کی طرف سے کچھ اُمید کی کرنیں اُنکو نظر آئیں - اس وقت کی حالت یہ ہے کہ بیشتر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو لینن کو اپنا معبود مانے ہوئے ہیں - انکی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے - اوجود اسکے سخت مشکل یہ ہے کہ ان مزدوروں میں بھی برادریاں قائم ہو گئی ہیں - ایک برادری کا آدمی دوسری برادری والے کو اپنے ساتھ شامل نہیں کرتا - ایک دوسرے کو ذلیل جانتا اور اپنا رقیب سمجھتا ہے - اتفاق و اتحاد نہیں تو نتیجہ معلوم -

گورنمنٹ کے ہاتھ میں ایک بڑا کاری ہتھیار رجبا ولینی ہے - جہاں کہیں سرمایہ دار اور مزدوروں میں مناقشہ ہوا اور اس ہتھیار سے کام لیا گیا - اضلاع کے حاکمانِ ضلع کو یہ اختیارات حاصل

ہیں کہ سرسری تحقیقات کے بعد دونوں فریق میں سے جو مجرم معلوم ہو اُسکو جلا وطن کر دیں۔ سرمایہ دار دولتمند ہیں وہ کیوں جلا وطن ہونے لگے تھے، خمیازہ غریب مزدوروں ہی کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ جلا وطنی میں نہ مردوں کو دیکھا جاتا ہے نہ عورتوں کو نہ بچوں کو حتیٰ کہ بعض وقت دس برس کی عمر کے بچوں کو بھی جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ تحقیقات سرسری ہوتی ہے اور اس میں بھی اثبات جرم کا شائبہ بھی نہیں ہوتا اور لوگ جلا وطن کر دیے جاتے ہیں۔ انکی تعداد بھی کم نہیں ہوتی۔ بعض وقت تو ایک ایک ضلع سے سیکڑوں کی تعداد میں جلا وطن ہوتے ہیں۔ اور وطن سے سیکڑوں میل پہونچا دیے جاتے ہیں۔ اعزا و اقارب کو خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں۔ راستہ کے مصائب اُن پر ایسے ایسے پڑتے ہیں کہ اگر تفصیل بیان کی جائے تو دل پگھل جائیں۔ میرا دل پتھر کا ہے کہ اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خدا ے تعالیٰ کے قانون انتقام کا یہ ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ یاد کرو اُن مصائب کو جن میں تم ہی نے مولدین کو مبتلا کیا تھا۔ تمہارے اخبار تمہاری زبان بن کر آج گلا پھاڑ پھاڑ کر تمہارا مرثیہ پڑھتے اور تم پر روتے ہیں اور کوئی شنوا نہیں۔ کبھی تم نے اُن بے زبان مولدین کی فریاد بھی سُنی تھی جو آج تک فضاے آسمانی میں گونج رہی ہے۔ اللہ ہی سب سے بڑا بینا ہے اور وہی منتقم حقیقی ہے۔ تم نے مولدین کی ماؤں کی گود سے بچے چھینے ہیں، آج تمہاری ماؤں کی گودوں سے بچے چھینے جاتے ہیں۔ تمہاری حالت توریت کی اس آیت کی مصداق ہے کہ "میں تجھ سے، تیری اولاد سے اور اولاد کی اولاد سے بدلہ لوں گا"۔

مزارعین

ہمارے ہندوستان کی طرح اسپین کا بڑا حصہ زراعتی ہے۔ اگر برسلونہ اور بلباؤ کو مستثنیٰ کر دیا جائے، جہاں کچھ کارخانے کھل گئے ہیں تو تمام ملک میں زراعت ہوتی ہے اور لوگ اسی پیشے کی بدولت اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

ہر زراعتی ملک میں مزارعین کو محاصل زمین بہت زیادہ عزیز ہوتے ہیں، اور اسی اُمید پر وہ محنتہاے شاقہ برداشت کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا اسپین میں جو زراعتی ملک ہے، مزارعین اپنی محنت سے بہرہ مند ہوتے ہیں یا زمیندار؟ اسکا مختصر جواب یہ ہے کہ غریب محنت کش مزارعین گھاٹے میں رہتے ہیں اور سب سے بڑا حصہ زمیندار لے جاتے ہیں۔

ہر زراعتی ملک میں زمینداروں کے حقوق کو گورنمنٹ تسلیم کرتی ہے۔ منجملہ اور وجوہ کے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ یا تو ملکیت زمین بطور انعام جاں نثاری حاصل کرتے ہیں یا

یا مدت بھر کی کمائی سے زمین حاصل کرتے ہیں۔ زمیندار خواہ پہلے فرقہ کے ہوں یا دوسرے کے بہرحال گورنمنٹ کے دست و بازو ہوتے ہیں اور آڑے وقت میں کام آتے ہیں۔ یہ لوگ بقدر اپنے ملک کے وقعت و عزت پیدا کر لیتے اور اُس سے فائدہ اُٹھاتے اور پہونچاتے ہیں۔ مگر شدہ شدہ انکی چیرہ دستیاں بڑھ جاتی ہیں اور انکی طرف سے فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ ایک سوال یہ بھی ہو کہ جب اسکو تسلیم کر لیا جائے کہ تمام اراضی ملک کی مالک سرکار ہے (ان الارض للہ یورثہا من یشاء) تو یہ درمیانی کڑی زمینداری کی کہاں سے آگئی؟ اور کیوں قائم رکھی جائے؟ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مہتمان بندوبست نے جلدی کی اور اسی بنا پر زمینداروں کے خارنا ذکو اکھاڑ کر پھینکدینے کا ارادہ کیا۔ منجملہ اسباب غدر کے ایک سبب یہ بھی تھا۔ غنیمت ہے کہ اب اس پر یہاں بہت کچھ کامیابی ہو گئی ہے۔ اسپین میں اس قسم کے سوال نہ پیدا ہوئے نہ ہونگے۔ وہاں زمینداروں کے حقوق اس درجہ تسلیم کیے جاتے ہیں کہ غریب مزارعین کی موت ہے۔ زمیندار مالکان زمین ہی نہیں ہیں بلکہ صحیح طور پر اپنی ملکیت کے حدود میں بے سامان بادشاہ ہیں، اور چھوٹے چھوٹے زمیندار بوجہ حاشیہ پوسان وزارت، بادشاہی کر رہے ہیں۔ قوانین مال انکی بیجا مراعات کرتے ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ مزارعین، جنکی تعداد بہت زیادہ ہے، گورنمنٹ کے شاکی ہیں۔

میں ذیل میں جنوبی حصۂ اسپین پر نظر ڈالتا ہوں، جہاں تعلقات مابین مزارع و زمیندار زیادہ خراب ہیں۔ اور ایک مدت سے خراب چلے آتے ہیں۔

اسپین میں ہر چیز کا دارومدار روایات و مراسم قدیمہ پر ہے۔ وہاں کے باشندے اب بھی عملی طور پر اسی ہوا میں اڑ رہے ہیں جس میں اُنکے بزرگ صدیوں پیشتر اڑتے تھے۔

اراضی کے متعلق جتنے جھگڑے ہیں، میں خوش ہوں کہ وہ نتیجہ ہیں اُن بے انصافیوں اور بے ایمانیوں کا جو عیسائیوں نے اُسوقت کی تھیں کہ جب اس ملک کو اُنھوں نے مسلمانوں سے فتح کیا تھا۔ انکے نقش قدم اب تک اندلس سے نہیں مٹے اور مزارعین کی رگوں میں تو اُن ہی کا خون دوڑ رہا ہو۔ پھر اسپینی بتاتا اور چیز ہے۔ جب مسلمان یہاں سے نکالے گئے تو اراضی مالک تعلقہ داروں ؎ کو بطور انعام خدمات جنگ بے سوچے سمجھے ایک ہی جگہ عطا کر دی گئیں۔ اس سے ایک ایک آدمی بڑی بڑی جاگیرات کا مالک و زمیندار ہو گیا۔ اسکے علاوہ اُنکے بہت سے حقوق

؎ میں نے Feudal barons کا ترجمہ تعلقہ دار کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان دونوں کی حیثیت میں بڑا فرق ہے، مگر اختصار کے لیے لفظ تعلقہ دار اختیار کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تسلیم کیے گئے۔ یہی حقوق مزارعین کا خون چوسے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی یہی کیا تھا (اور ہر فاتح یہی کرتا ہے) مگر انھوں نے ایک ہی جگہ ایک ہی آدمی کو بڑی جاگیر نہیں دی اور مزارعین کے حقوق کو تسلیم کرایا۔ اس کے علاوہ ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کو آباد رکھا کہ جاگیردار زور نہ پکڑیں اور مزارعین کے حقوق کی حفاظت رہے۔ عام اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان۔ مسلمانوں کے زمانہ میں نہ جاگیرداروں کو شکایت ہوئی نہ مزارعین کو۔ ہر ایک اپنے اپنے حال میں خوش تھا۔ یوں ایک قوم کی قوم پروری اور دوسری کی دوراندیشی اپنا اپنا پھل لائی۔

ان حقوق کے علاوہ جاگیرداروں نے اور اراضی خرید کر بھی پیر پھیلائے۔ سیاسی مظالم الگ رہے۔ ان ہی مظالم کی بدولت عام طور پر جاگیرداروں کو "قزاق" کہا جاتا ہے۔ میں بھی آئندہ یہی لفظ استعمال کروں گا۔

ایک اخبار نے قزاقوں اور کسانوں کی متقابل تصویر یوں کھینچی ہے:۔

اگر سیکڑوں نہیں تو بیسیوں قزاقوں نے اپنے علاقوں کو جا کر دیکھا بھی نہیں۔ اُن کے مختار عام، یا وکیل، یا ماسٹر گھر بیٹھے اُنکے لگان بھیج دیتے ہیں، اور یہ شہروں میں بیٹھے گلچھرے اُڑاتے ہیں۔ اگر کوئی قزاق اپنے علاقہ میں جاتا ہے تو اپنے بیسیوں احباب کو لیے ہوے سیر و شکار کے لیے۔ ان کا جانا غریب مزارعین کے لیے اور بھی مصیبت کا باعث ہوتا ہے، کہ کھیت روندے جاتے ہیں اور نذر و نذور کے علاوہ رسد ہم پہونچانا پڑتی ہے۔ اس کی کہیں داد و فریاد نہیں۔ قانون مزارعین کے لیے نہیں۔ مزارعین کی یہ حالت ہے کہ وہ گویا روز پیدائش سے اُسی زمین پر رہتا ہے جس پر محنت کرتے کرتے وہ وہیں پیوند خاک ہو جاتا ہے۔ قوانین مال اور شرائط پٹہ سے اُسکے ہاتھ پیر بندھے رہتے ہیں۔ ہر چیز کا بار ذمہ داری اُس پر ہے۔ لگان کے ادا کرنے میں وہ دیر نہیں لگا سکتا، اگر بارش نہ ہو، یا کوئی اور آفتِ ارضی و سماوی آئے، یا قزاقوں کے گھوڑ دوڑ کے ٹاپ اُسکی کھیتی برباد کر دیں، تو وہ تخفیف لگان کی اُمید نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اراضی میں کوئی ترقی کرتا ہے تو وہ قزاق کی ملکیت ہوتی ہے اُس کا کوئی نفع مزارع کو نہیں ملتا۔

یہ سب کچھ بیان کر کے وہ اخبار یہ رائے دیتا ہے کہ "مزارعین کے حقوق [illegible]

توجہ کرنا چاہیے، کیونکہ ہمارے ملک کی فلاح و دولت ان ہی پر منحصر ہے۔ انکی خدمات اور احسانات ایسے ہیں کہ فوراً ایسا قانون بنایا جائے کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ اس میں سستی نہ کرنا چاہیے۔ جو بات آج ہم بخوشی خاطر کر سکتے ہیں اس کو بغاوت اور انقلاب ہونے تک کیوں چھوڑ دیا جائے۔ آج گورنمنٹ سستی کر سکتی ہے، مگر بغاوت کے بعد وہی کچھ جلدی میں کرنا پڑیگا۔ اس میں گورنمنٹ ہی کا نقصان ہوگا"۔ یہ محض دھمکی ہی نہیں ہے بلکہ شدنی ہے۔

لگان اور شرائط پٹہ ہی وہ چیزیں ہیں ... جو مزارعین کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے ہیں انکی عزت و آبرو بھی تو کچھ نہیں سمجھی جاتی۔ ناچار وہ ایک جاگیردار کی زمین چھوڑتے ہیں اور دوسری جگہ اس امید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں امن و عافیت ملے، مگر آسمان سب جگہ ایک ہی ہے۔

مزارعین نے اپنی ایک ایسوسی ایشن قائم کرنا چاہی۔ ضلع ہالیتسیا میں یہ تحریک شروع ہوئی وہاں کے حاکم ضلع وہ شخص تھے کہ جن کی جاگیر اور زمینداری اس ضلع میں تھی۔ انھوں نے ایک نہ چلنے دی۔ مزارعین نے بیرونی مدد لی۔ ایک صاحب پیڈرو سینول نے صاحب ضلع کو اسکے متعلق لکھا۔ چھ مہینے تک جواب ہی نہیں ملا۔ بمشکل یہ جواب آیا کہ پارلیمنٹ کے ممبروں کے انتخاب کے بعد اس پر غور کیا جائیگا۔ وہ وقت بھی آگیا، اور جو قواعد بنائے گئے تھے وہ انھوں (صاحب ضلع) نے منظور کر لیے، مگر خفیہ طور پر ہدایات جاری کر دیں کہ اُن پر کوئی توجہ نہ کی جائے بلکہ رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ اس پر اخبارات میں بڑے بڑے مضامین چھپے۔ مگر مارچ ۱۹۲۱ء سے غالباً اب تک معاملہ وہیں کا وہیں ہے جہاں سے شروع ہوا تھا۔

غریب مزارعین کو بڑی مصیبت اُس وقت ہوتی ہے کہ جب کوئی فزاق کونسل کے انتخاب کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور اس سے زیادہ آفت کا سامنا اُس وقت ہوتا ہے کہ وہ منتخب ہو جاتا ہے۔ اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہر شخص خود قیاس کر سکتا ہے۔

بعض ایسوسی ایشن کے ممبروں کے زور دینے پر ایک قانون کونسل میں پیش کیا گیا کہ بڑی بڑی جاگیروں کو کسی طرح حصص میں تقسیم کر دیا جائے اور قزاقوں کی چیرہ دستیوں کی روک تھام کی جائے۔ یہ قانون بالکل نیک نیتی پر مبنی تھا، مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس قانون کا مسودہ ایسی بے احتیاطی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا کہ اس سے مزارعین کو بجائے فائدہ کے نقصان ہی پہونچا۔ قزاقوں کے گروہ نے اُس سے مخالفت نہیں کی اور دوسرے ممبروں نے اُس پر غور نہیں کیا اور وہ بلا ردو بدل تقریروں کے بعد ۱۹۱۹ء میں پاس ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں اور مسودہ بنایا گیا معلوم نہیں

کہ اُسکا کیا حشر ہوا۔ بہرحال اُمید یہ پڑتی ہے کہ اگر اس معاملہ کی طرف اسی طرح توجہ رہی تو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔

مزارعین کی شکایات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ڈکٹیٹر کو اس طرف توجہ کرنا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ڈکٹیٹر صاحب فوجی افسر ہیں، اور اُنکے بڑے بڑے جنرل قزاقوں کے فرقہ میں سے ہیں۔ اگر وہ مزارعین کی تکالیف رفع کرتے ہیں تو یہ قزاق کیا کھا کر جئیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بغاوت کا اندیشہ ہے اور ملک اسکے لیے شاید اب تیار ہو گیا ہو، کیونکہ امیر عبد الکریم کا خطرہ گیا، گو مزارعین کے دل کی جلن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور یہ خود مخدوش ہے۔

مسلمانوں کے انتظامات اراضی و محکمۂ مال کی خوبی کا یہ ثبوت ہے، کہ علاقہ اندلوشیہ (جنوبی اسپین) میں اب مزارعین اور اُنکے مددگار ایسوسی ایشنوں کا ... یہ مطالبہ شروع ہوا ہے کہ موجودہ انتظامات میں تبدیلی کر کے بعینہ وہی صورت پیدا کر دی جائے جو مسلمانوں کے زمانہ میں تھی۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

صوبۂ قتلونیہ میں ہوم رول وغیرہ کی تحریکات

یہ بہت نازک سوال ہے اور اسپین کو سخت پریشان کیے ہوئے ہے۔ اس میں اور ہندوستان کی موجودہ تحریکات آزادی میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ اگر ہندوستانی وہاں کی تحریکات پر غور کریں تو شاید بیجا اور خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ مگر اسپین کچھ اتنا پست ملک ہے کہ ہم ہندوستانی! وجود اپنی انتہائی ذلت و غلامی کے اُس طرف نگاہ نہ کریں گے۔ غرور و غلامی ایک عجیب طرح کا مرکب ہے! میں اس مضمون کو انتہائے اختصار سے لکھوں گا۔ گو میں اسکو تسلیم کرتا ہوں کہ یہ محتاج تفصیل ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو قتلونیہ ایسا علاقہ ہے کہ جسکو اسپین سے بہت کم تعلق ہے۔ خیالات، راہ و رسم، زبان، تاریخ وغیرہ وغیرہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ اگر کسانوں والے صرف اکھڑ سپاہی ہیں، تو یہ بلند نظر ہیں۔ مسلمانوں کی گرفت ان پر اتنی سخت رہی کہ یہ گوش کان نہیں ہلا سکے۔ اسکے ساتھ حقیقۃً مسلمانوں کے عدل و انصاف کی وجہ سے وہ فراموش نہ رہے، ورنہ اُنکے جو جوہر اب کھلے ہیں وہ پہلے سے اُن میں موجود تھے۔

جب اُنھوں نے مسلمانوں سے علاقہ چھینا ہے تو خیال یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت الگ قائم کر لیں گے۔ چند روز تک رہی بھی، مگر بگیاہوں کا خون رنگ لایا اور یہ غلام بنے۔ اسپین نے

ان پر یہاں تک ظلم کیا کہ انکی زبان تک کو مٹا دیا۔ اُنیسویں صدی کے ثلث اول (سنہ ۱۸۳۳ء) میں ان لوگوں کو کچھ زیادہ ہوش آیا۔ وہ دن اور آج کا دن کہ انکے مطالبات بڑھتے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے اس میں اغماض ہوا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیٹیکل قتل شروع ہوئے۔ وزراء پر بم پھینکے گئے اور سخت جان بادشاہ اسپین تو ہر وقت معرض ہلاکت میں رہتا ہے۔ جیسا کہ آئے دن معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کمیونسٹوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ روس کی سوویٹ گورنمنٹ اپنا لاسا چیٹکی لیے ہوئے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ مطالبات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ وہ ہوم رول چاہتے ہیں مگر اس خوبصورتی کے ساتھ کہ گویا آزادی کامل اُن کا نصب العین ہے۔ اسوقت اُن کے مطالبات یہ ہیں کہ:-

(۱) قطلونیہ کو سلف گورنمنٹ دیکر ایک الگ ریاست تسلیم کر لیا جائے اور اُسکو اپنے معاملات میں کامل اختیارات دیے جائیں۔

(۲) قطلونیہ میں پارلیمنٹ یا لیجسلیٹو اسمبلی قائم کرنے کا اختیار دیا جائے جس کو اسپین سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ صرف اپنے ہموطنوں کو جواب دہ ہو۔

(۳) قطلونیہ کو اکزیکیٹو کونسل قائم کرنے کا اختیار دیا جائے جو اپنی ہی پارلیمنٹ یا اسمبلی کو جواب دہ ہو۔

(۴) قطلونیہ کے قدیم قوانین اور کانسٹی ٹیوشن کو اسمبلی کی معرفت پھر نافذ کر دیا جائے۔

(۵) قطلونیہ اپنی ہائیکورٹ خود قائم کرے۔ اُس کا حکم ایسا ناطق ہو کہ بادشاہ تک کو اُسکے مرافعہ سننے کا اختیار نہ ہو۔

(۶) قطلونیہ کی زبان ہی زبان عدالت ہو۔ اُسی زبان میں جج کی خط وکتابت ہو اور قطلونیہ کے متعلق تمام سرکاری مراسلات لکھے جائیں۔ (حامیان اُردو کے لیے شاید یہ مطالبہ کچھ سبق رکھتا ہو)

(۷) قطلونیہ صرف معاملات خارجہ، بحری و بری فوج، سکہ، اوزان، پیمانہ، تجارت، محاصل بحری، ذرایع آمد و رفت وغیرہ وغیرہ میں اسپین کے ساتھ سردست متحد و متفق رہیگا، مگر دست نگر نہ ہو گا۔

یوں کہنا چاہیے کہ اُنکی جد و جہد اب شروع ہوئی ہے۔ ڈکٹیٹر صاحب نے سنہ ۱۹۲۳ء تک ادھر توجہ نہیں فرمائی تھی۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس معاملہ کو اُنھوں نے اہم نہیں سمجھا۔ دلوں کی جلن بڑھتی جاتی ہے اور معاملات بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اُمید نہیں پڑتی کہ ڈکٹیٹر قطلونیہ [illegible] سردتی پیش آئیں گے۔ بالخصوص [illegible] لیے کہ امیر عبدالکریم کی مہمات کا تمام خرچ قطلونیہ

سے وصول کیا گیا تھا اور انھوں نے اسپر سختی سے احتجاج کیا تھا۔ پریمو ڈی ریویرا کا بڑا مایہ فخر وناز یہی مہم تھی۔ اور اس میں ذرا بھی چون وچرا کرنے والوں سے پریمو سخت ترین دشمن ہو جاتے ہیں۔ مراقش والوں کے پاس اتنی فوج نہیں کہ وہ اپنی ہستی کا ثبوت دے سکیں۔ ورنہ اب اب تک اُنھوں نے فیصلہ کرا لیا ہوتا۔ بہر حال کچھ ایسے مواد موجود ہیں کہ بھک سے اُڑنے کو تیار رہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر قطلونیہ نے ہوم رول لیلیا تو اسپین کا بازو ٹوٹ جائے گا۔ دونوں طرف کشیدگی موجود ہے۔ انجام اللہ کے ہاتھ ہے۔ خدا خیر سے برانگیزد۔

اخبارات

باستثناء اسپین، قریبًا تمام یورپ کے اخبارات پرانے زمانہ کی عربی شاعری کا درجہ رکھتے ہیں کہ دل ودماغ کو بدل دیتے ہیں۔ اسپین اس معاملہ میں بھی یورپ سے ہزاروں میل پیچھے ہے کہتے ہیں کہ کسی ملک کے اخبار اُس ملک کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ اصول (اگر اسکو اصول کہا جائے) اسپین پر بہت زیادہ منطبق ہوتا ہے۔ یہاں کے اخباروں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ جنوبی و وسطی امریکہ کے اسپینی اخباروں سے بھی زیادہ ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ اسپین کے عوام شوق سے نہیں دیکھتے اور حکام اُن پر چنداں توجہ نہیں کرتے۔ اسکی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں نہیں۔ باوجودیکہ قابل و ہوشمند و سیاست داں آدمی اُنکے اڈیٹر اور مالک ہیں مگر ملک زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ اول تو اسپین میں اخبار نویسی (میرا مطلب اڈیٹری سے ہے) کوئی موقر پیشہ نہیں کہ کوئی بھلا مانس اور ذریعہ معاش چھوڑ کر اُسکو اختیار کرے۔ دوسرے اسپین کے عوام الناس اسکو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ کوئی شخص اتنا بے وقوف یا اس دل ودماغ کا آدمی ہوگا کہ وہ زندگی سی پیاری چیز اور اپنی تمام طاقتیں ایسی چیز پر خرچ کرے جو سب کے لیے نفع رساں ہو، یا وہ کسی خاص اصول پر ہمیشہ اڑا رہے۔ اور اپنی زندگی اُس پر فدا کرے۔ ہر شخص کا یہ خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ جو شخص یہ پیشہ اختیار کرتا ہے وہ اپنی ذاتی غرض سے۔ یہ خیال اُن لوگوں سے نفرت پیدا کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ جو کوئی اخبار پڑھے گا وہ اُس میں اسی کو ڈھونڈھے گا اور پا لیگا۔ اور اخبار کو نفرت سے اُٹھا کر پھینکدے گا۔ اب اس کی وجہ خواہ واقعی صحیح ہو یا عام رجحان عوام ہو، یا کمی تعلیم ہو۔ ہر کیف کیفیت یہ ہے کہ کوئی اخبار (خاص کر روزانہ) اپنا خرچ پورا نہیں کرسکتا۔ اُسکو کسی متمول

شخص سے مدد لینا پڑتی ہے اور وہ اخبار اُسی کا مداح یا اُسکی رائے کو سرہنے اور بڑھانیوالا ہوتا ہے اور وہ خیال کہ انکی سطروں میں کوئی خود مطلبی پنہاں ہے صحیح ہو جاتا ہے - اسکول یا کالج کے لڑکے نکلتے ہیں اُنھیں فوراً کسی شغل اور آمدنی کی فکر ہوتی ہے - وہ اخبار نویسی شروع کر دیتے ہیں یا کسی اخبار میں (جیسا کہ کسی زمانہ میں پیسہ اخبار تھا) ملازمت کر لیتے ہیں - آمدنی کم ہوتی ہے اور تنخواہ کم ملتی ہے - یہ لوگ ہری چُگ ہوتے ہیں چند ہی روز میں اچھی جگہ مل جاتی ہے اور وہ چڑیوں کی طرح اُڑ جاتے ہیں - ظاہر ہے کہ ایسا آدمی کیوں دل لگائے اور اسکی رائے کی کیوں وقعت ہو - رہ گئے پرانے اخبار نویس انکو تجربہ اتنا ضرور سکھا دیتا ہے کہ اسپین کے پولیٹکل معاملات ایسے نہیں ہیں کہ کوئی اصول رکھتے ہوں - اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی اخبار جو آج عوام الناس کا ہمدرد اور گورنمنٹ کا شاکی ہے کل اسکے برعکس مضامین لکھتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اُس کا قلم اُس شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اُنکو زیادہ دے -

مملکت اسپین کچھ بہت چھوٹی سی نہیں - اور پھر وہ یورپ میں واقع ہے - اس پر اُسکے اخبارات کی تعداد اشاعت ملاحظہ فرمائیے :-

سہ ماہی چھپنے والے	۶۱
ماہوار "	۷۱۷
مہینے میں دو بار "	۳۲۰
مہینے میں ۳ بار "	۱۰۱
ہفتہ میں دو بار "	۵۶۳
ہفتہ میں تین بار "	۳۶
روزانہ "	۲۹۰
دیگر موقت الشیوع	۳۴
وقت اشاعت نامعلوم	۱۲۷
میزان	۲۲۴۹

میزان

روزانہ اخبارات زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں نکلتے ہیں - انکی کمی اشاعت پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کئی کئی روزانہ اخبار کیوں خریدے - مگر اشاعت کی کمی کی وجہ اور بھی ہو سکتی ہے - ایک تو ابھی بیان ہو چکی ہے - دوسرے جہالت - جسکی مزدوروں اور متوسط الحال لوگوں

میں کمی نہیں۔ تیسرے اہالی اسپین کی اخباروں کی طرف سے عام بے پروائی، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں ہوں یا نہ ہوں۔ جنگ نے کچھ شوق پیدا کیا تھا، مگر اس پودے کی آبیاری ختم ہو رہی ہے، وہ مُرجھا رہا ہے اور چند روز میں مرجائے گا۔ اسپین کے اخبارات اب اپنے اخباروں کو زیادہ دلچسپ بنا رہے ہیں۔ اُنھوں نے ممالک غیر میں اپنے نامہ نگار بھیج رکھے ہیں، جو لوگ یہاں آتے ہیں اُن سے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں، مگر ابھی تک نتیجہ صفر ہے۔ اگر جہالت اور غفلت پر اخباروں کے ایکدوسرے کے ساتھ مقابلہ کو اضافہ کیا جائے تو یہ اُمید نہیں پڑتی کہ اشاعت میں کچھ ترقی ہوگی۔ تعجب یہ ہے کہ میڈرڈ کے دو روزانہ اخبار اس کا دعوے کرتے ہیں، کہ اُنکی تعداد اشاعت دو لاکھ روزانہ ہے۔ اور کوئی اخبار تو ایک لاکھ چھپنے کا بھی دعوے نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں اُنکی آمدنیاں ہرگز خرچ کو کفتی نہیں ہوسکتیں۔ خاص کر اس لیے کہ اشتہارات کا رواج یہاں اب تک ابتدائی حالت میں ہے، اور اخبارات میں کم ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جتنے اچھے اخبار یہاں نکلتے تھے اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنا خرچ خود برداشت کرلیتا۔ گورنمنٹ اُنکو امداد دیتی تھی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ آدھ آنے سے زیادہ قیمت نہیں بڑھا سکتے۔ (شاید اس لیے کہ اس سے زیادہ میں کوئی شخص نہیں خریدتا) حالانکہ اُن دنوں کاغذ اتنا گراں تھا کہ آدھ آنہ سے زیادہ کاغذ میں خرچ ہوجاتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کی امداد بھی رُک گئی، مگر اخباروں کی قیمت کم سے کم ایک آنہ کردی گئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ اشاعت کم ہوگئی۔ اسپین کا بنا ہوا کاغذ خراب اور گراں پڑتا ہے اور دیگر ممالک سے آیا ہوا گراں تر۔ حالانکہ گورنمنٹ نے محصول معاف کردیا ہے۔ باوجود اس کے اخبار ارزاں ہی فروخت کیا جاسکتا ہے۔

اسپین کے اخبارات کی غیر ہر دلعزیزی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ اوّل تو کاغذ خراب، دوسرے چھپائی اتنی خراب کہ اوّل تو پڑھنے والے کے ہاتھ اور کپڑے سیاہ ہوجائیں، پھر آنکھوں پر زور دے کر بھی نہ پڑھا جائے۔

اسکے علاوہ ذرائع آمد و رفت اتنے کم اور متعسر ہیں کہ ایک اخبار ہفتہ ہفتہ بھر کے بعد بعض مقامات میں پہونچتا ہے۔ اور بیکار ہوجاتا ہے۔ ریل ملک میں ہے مگر اس سے مسافر ہی نالاں ہیں، چہ جائیکہ ڈاک۔

اخبارات کی بے قدری ایسی نہیں ہے کہ اہالی اسپین بالکل مایوس ہوجائیں۔ زمانہ اپنا اثر کررہا ہے اور انکی حالت روز بروز درست ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر آفات ارضی و سماوی کا ذکر نہیں ہے

مثلاً یہ کہ ذرا سی ملکی خلش میں تمام اخبارات پر سنسر بیٹھ جاتے ہیں۔

حکومت فوجی

یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا وہ اسپین کا اگرچہ بالکل صحیح نقشہ ہے مگر ایسا کہ اس میں سوا پستی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ خیر خواہان اسپین خود سخت پریشان ہیں اور آل کار سے بدگمان۔ ملک پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی، اور ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ اولے اب پڑے کہ پڑے۔ یہ بھی برکات دم عیسوی ہیں کہ بیرونی خطرہ نہیں، اگر کوئی خدشہ ہے تو یہ کہ اندرونی زخم نہ پھوٹ جائے۔ اس تاریکی میں اگر امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے تو وہ حکومت فوجی ہے۔ اسکو میں کسی قدر تفصیل سے بیان کروں گا کیونکہ اسکا حال ہندوستان میں کم معلوم ہے۔ نیز اس سے اور امور پر بھی بہت کچھ روشنی پڑیگی۔ اگر نازک طبائع پر بار ہو، تو میں معافی خواہ ہوں۔

تمام ممالک نے بعد از تجربہ یہ قرار دیا ہے کہ حکومت میں لامرکزیت پیدا کرنا چاہیے کہ ہر قسم کی سہولت بھی ہو اور سستا کام بھی۔ مگر اسپین کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہاں مرکز حکومت میڈرڈ ہے اور ہر قسم کے اختیارات صرف ناظمان میڈرڈ کو حاصل ہیں۔ صوبجات دور افتادہ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ رعایا کی شکایات کو سن کر ان کا سدباب کریں۔ حکام صوبہ و اضلاع کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اپنے ذاتی منافع و پالٹکس میں اتنے گرفتار رہیں کہ کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تمام خرابیاں جو ایک بدنظم گورنمنٹ میں ہونا چاہییں مجسم ہو کر اسپین میں موجود ہیں۔ دوسری طرف شمالی مشرقی اسپین میں جو نہایت خفیف سی ترقی تعلیم ہوئی اس کے تمدن نے بھی اسی حصہ رسدی سے ترقی کی حرفت کی چھوٹی سی ترقی نے مزدوروں کے دلوں میں ہیجان پیدا کیا۔ محاصل کی تخفیف نے ملک کو کسی قدر امداد پہونچائی۔ جنگ میں ملک نے غیر طرفدار رہ کر کچھ تو لین دین میں ترقی کی۔ ہوشمند لوگوں نے غیر ممالک میں جا کر وہاں کی حالت کو اپنے ملک سے مقابلہ کیا۔ ان تمام باتوں کا متفقہ نتیجہ یہ ہوا کہ سونے والوں نے ذرا کروٹ لی، اب عملاً مزدوروں سے یہ کب امید کی جا سکتی ہے کہ وہ نیم فاقانہ زندگی بسر کرنے پر قناعت کرینگے۔

ملک میں جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی وہ ان فسادات سے ظاہر ہوئی جو کٹلونیہ اور دیگر مختلف اضلاع میں ہوئے۔ کٹلونیہ میں اپنی بھولی ہوئی قومیت یاد آگئی اور اپنے ہی علاقہ کو ترقی دینے کا خیال پیدا ہو گیا یہ وہ مقامات ہیں کہ جو بجبر کشتائل میں ضم کر لیے گئے تھے۔ خود کشتائل قدیم ہی کی حالت متزلزل تھی۔

اندلوشیہ، لیون، اور ایسٹر یمیڈورا میں مزارعین کی حالت نے کچھ ایسا رُخ بدلا تھا کہ تباہی اور بغاوت کے تمام اسباب مہیا تھے۔ ہر طرف سے یہ صدا آرہی تھی کہ مرکزی حکومت بالکل جمود کی حالت میں ہے۔ اربابِ بست وکشاد اس طرح کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے کہ اُن تک رعایا کی شکایات نہ پہونچتی تھیں اور وہ تحفظ حقوقِ شہریت کے متعلق ادنیٰ سا کام بھی نہ کرتے تھے۔ لبرل اور کنسرویٹو گروہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس طرح ہوگئے تھے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی ڈفلی الگ لیے ہوے اپنا ہی راگ الاپ رہا تھا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا، مصیبت تو یہ تھی کہ ہر شخص کو اپنے اپنے پیٹ کی فکر تھی۔ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ یہ لوگ ابھی تک ری پبلکن، ریفارمسٹ، فیڈرسٹ، سوشلسٹ اور کامیونسٹ، فرقوں سے نہیں جا ملے تھے اور ان فرقوں میں خود ایسے اختلافات تھے کہ ملک اُنکے خیالات سے بچا رہا۔ ملک نے اُنکو بھی ویسا ہی سگِ زرد سمجھا جیسا کہ وہ اپنے پرانے مربیوں کو شغال جانتے تھے۔

غرض ملک کی حالت کچھ ایسی نازک ہوگئی تھی کہ چاروں طرف فتنہ و فساد معلوم ہوتا تھا۔ اور اسپین بھر میں یہ اندیشہ تھا کہ اس حالت کے دفعیہ کے لیے تلوار میان سے نکلا ہی چاہتی ہے، جسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ کمیونسٹوں کے لیے دروازہ کھل جاتا اور بغاوت کی آگ سلگ اُٹھتی۔ ملک کے مصلحین (یا صحیح معنوں میں انقلاب پیدا کرنے والوں) کو یہ تو اُمید تھی کہ کلیسا ہمارے ساتھ ہوجائے گا، مگر یہ توقع نہیں تھی کہ فوج ہمارا ساتھ دیگی، کیونکہ بہت سے جنرل فرسودہ خیال تھے اور موجودہ حالت کو برقرار رکھنے میں اپنا ذاتی مفاد سمجھتے تھے، گو اُنکو بھی اپنے ماتحت افسروں اور سپاہیوں پر اعتماد کُلی نہ تھا کہ وہ اُن (جنرلوں) کا ساتھ دیں گے، کیونکہ یہ لوگ بیگار بھرتی کیے جاتے تھے۔ فوج کی عام حالت یہ تھی کہ وہ خود مرضِ بے ترتیبی اور بددیانتی میں گرفتار تھی۔ ریف میں اسپینی فوج کی تباہی سے پہلے، یعنی ۱۹۲۱ء میں ایسی علامات نظر آرہی تھیں کہ جنرلوں کے سوا تمام فوج میں سرکشی و بغاوت کے خیالات پیدا ہوچکے ہیں؛ ریف کی مصیبت کے بعد تو یہ بالکل صاف ظاہر ہوگئے تھے۔ چنانچہ امیر عبدالکریم کے مقابلہ میں نہ صرف فوج نے، بلکہ وزارتِ فوج نے اپنی نالایقی اور اپنا تذبذب ظاہر کردیا تھا۔ اس محکمہ کا یہ حال تھا کہ وہ امیر سے ایسے ڈرے ہوے تھے کہ اُنکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر مقابلہ کیا جائے۔ اب یہ بھی افواہیں اُڑنے لگیں کہ فوج اس لیے اپنے بادشاہ سے ناخوش ہے کہ اُس نے تمام کاروبارِ سلطنت اُن لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے جو اس تمام بدنظمی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا، کیونکہ کانسٹی ٹیوشن ہی ایسا ہے کہ اسکے سوا بادشاہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ بہرحال فوج یہ چاہتی تھی کہ وہ زور ڈال کر بادشاہ کو تخت سے اُتار دے اور ولیعہد (پرنس آف اسٹریاس) کو تخت پر بٹھا دے۔ یوں ناتجربہ کار نوجوان بادشاہ

کو اپنی کٹ پتلی بنا کر اُس سے اپنی پالیسی پر عمل کرالیں۔

اس تمام بے چینی کا مرکز کتلونہ کا صدر مقام بارسلونہ تھا۔ کیونکہ یہاں اس وجہ سے فوج زیادہ رکھنا پڑتی تھی کہ وہاں سنڈی کلسٹ، کمیونسٹ، انارکسٹ وغیرہ کا زور تھا۔ ڈون میگوئیل پریموڈی ریویرا، مارکوئیس ڈی ایسٹیلا ۱۲ ستمبر ۱۹۲۳ء سے پہلے یہاں حاکم فوج تھے۔ اُنھوں نے اپنے اور جنرلوں کو ساتھ ملا کر یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ ۱۵ ستمبر کو انقلاب کے لیے بغاوت کر ہی جائے۔ یہ خبر اُڑ گئی، اس لیے اُنھوں نے ارادہ کیا کہ بجائے ۱۵ کے ۱۲ ستمبر ہی کو یہ کارروائی کی جائے۔ ۱۹۲۱ء میں امیر عبدالکریم نے جو فاش اور شرمناک شکستیں اسپین کی فوج کو دی تھیں اُنکے متعلق یہ قرار نہیں دیا جا سکا تھا کہ انکی ذمہ داری محکمہ فوج پر پڑتی ہے یا محکمہ ملکی پر۔ ۱۹۲۳ء میں اُس نے بُری صورت اختیار کر لی۔ گورنمنٹ نے جو اسکے متعلق فیصلہ دیا تھا وہ اس قدر غیر تشفی بخش تھا کہ پیشہ ور رہبران ملک کے خلاف جو کچھ بھی کیا جاتا عوام الناس اُس سے بہت خوش ہوتے۔ یہ بات انقلاب کرنے والے لوگوں کی اور بھی تقویت کا باعث ہوا۔ ۱۲ ستمبر کو پریموڈی ریویرا نے ایک بیان شایع کیا جس میں لکھا تھا کہ "گورنمنٹ کی بدنظمیوں سے ملک کو بچانے کے لیے" اسپین کی فوج نے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اپنی کیبنٹ سے استعفا لے لے۔

شاہ الفانسو سیزدہم نے اسوقت بڑی عقل سے کام لیا۔ جس وقت پریموڈی ریویرا نے یہ مطالبہ پیش کیا بادشاہ سان سبسٹائن میں تھا۔ اُس نے وہیں تحقیقات کر کے یہ معلوم کر لیا کہ فوج واقعی بغاوت پر آمادہ ہے اور تمام رعایا اُسکے ساتھ ہے۔ اسکے بعد وہ میڈرڈ گیا اور وہاں جا کر وزراء اور کمانڈر فوج متعینہ میڈرڈ (جنرل کا وکلنٹی) سے اس معاملہ میں مشورہ کیا۔ وزیر اعظم (الہیوسماس) نے ایک حکم تحریری اس مضمون کا شاہی دستخطوں کے لیے پیش کیا کہ "بوا وجہ بغاوت فوجی پریموڈی ریویرا کو معزول کر کے گرفتار کیا جاتا ہے"۔ یہ حکم کانسٹی ٹیوشن کے موافق تھا۔ مگر بادشاہ نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وزیر اعظم نے استعفا دیدیا اور فوراً منظور کر لیا گیا۔ پریموڈی ریویرا کو بھی استعفا دینے کا حکم دیا گیا، مگر جب اُس نے انکار کیا اور صاف صاف باغی ہوگیا تو اُسکو بذریعہ تار طلب کر کے وزارت کا کام سپرد کر دیا گیا۔ اُنھوں نے آکر بحیثیت پریذیڈنٹ فوراً چند جنرلوں کی ایک کونسل عارضی بنالی۔ اور اُنکے تمام ماتحت افسران پہلے سے متفق الراء تھے۔ ملک نے کوئی مخالفت نہیں دکھائی، صرف اتنا ہوا کہ بلباؤ میں ایک پندرہ منٹ اسٹرائک ہو کر رہ گئی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اس عارضی کونسل کو موقوف کر کے دوسری مستقل کونسل بنائی گئی اور بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ

جسکی رو سے تمام نظم ونسق پریمو کے ہاتھ میں دیدیا گیا، سوا وزراے صیغۂ فوج وخارجہ کے تمام وزراء موقوف کردیے گئے، پارلیمنٹ توڑدی گئی، کانسٹی ٹیوشنل ضمانتیں موقوف کرکے تمام اسپین میں مارشل لا، جاری کردیا گیا، وغیرہ وغیرہ

اس نئی فوجی حکومت نے بروے اختیار مارشل لا[۱] سب سے پہلا یہ کام کیا کہ تمام دفاتر کا وقت ۹ بجے صبح سے ۲ بجے شام تک مقرر کیا اور حکم دیا کہ جو کوئی سوا نوبجے تک اپنے دفتر میں نہ پہونچ جائیگا وہ سزا پائیگا - نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں ایسے کلرک دفتر میں آموجود ہوے جنکی کبھی صورت بھی نہ دکھلائی دیتی تھی - یہ کلرک اکثر وزراء کے آوردہ یا پروردہ تھے - انکے نام قبض الوصول پر ضرور تھے، مگر وہ دفتروں میں صرف تنخواہیں لینے کے لیے آتے تھے - ان میں سے اکثر ایسے تھے کہ اتنی بھی تکلیف گوارا نہیں فرماتے تھے اور اپنے ملازموں کو بھیجکر تنخواہ منگوا لیتے تھے[۲] - ان میں سے اکثروں کو فوراً موقوف یا معطل کردیا گیا - اس سے عوام الناس میں خوشی ہوئی، مگر ان غریبوں کے گھروں میں کہرام مچ گیا -

تمام مقامی کونسلوں کو توڑدیا گیا اور میئروں کو موقوف کردیا گیا - لوگوں کو جتنی خوشی اس حکم سے ہوئی وہ بیان سے باہر ہے - مگر اس سے بھی زیادہ رنج اس حکم نے پہونچایا جسکی رو سے جوری کا قاعدہ توڑدیا گیا - رعایا نے برسوں کی مشقت کے بعد اسکو پایا تھا - جو بیک گردش قلم ختم کردیا گیا - ایک ڈیکوریٹ بنایا گیا جسکا پریزیڈنٹ ایک ایرالبحر ہے اور تین جنرل جج ہیں، اور دو مقامی آدمی ہیں - اس نے عدل وانصاف کی رہی سہی کمر توڑدی -

انکے علاوہ اور بہت سی اصلاحیں ہوئیں، انکی تفصیل کی ضرورت نہیں - بہت سے وعدے کیے گئے - مثلاً سول گورنمنٹ پھر بحال کی جائیگی اور قزاقوں کا زور توڑا جائیگا، وغیرہ - مگر دیکھیے یہ وعدے کبھی ایفاء بھی ہوتے ہیں یا نہیں - کئی احکام تو ایسے ہیں جن پر اسپین کے معمول کے موافق عمل نہیں ہوا اور بھول بسر گئے -

کمیونسٹ، سوشلسٹ، انارکسٹ فرقے اس فوجی حکومت کے دشمن ہیں - مزدور چند روز

---

[۱] خوش قسمت ہیں وہ اصحاب کہ جو مارشل لا کے معنی اور اسکی ہمہ گیری کو نہیں سمجھتے - راقم بدقسمتی سے مارشل لا کے ایام میں لاہور میں تھا اور اسکی سختیاں دیکھے ہوے ہے -

[۲] کوئی بوڑھے بزرگ شاید بتلا سکیں کہ شاہان اودھ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا تھا یا نہیں - کیونکہ انھیں کا زمانہ بدنظمی میں مشہور رہے -

خوش رہے، لیکن چونکہ وہ وعدے جو اُن سے کیے گئے تھے وہ ایفا نہیں ہوئے اس لیے اُن کی ناراضی بڑھتی جاتی ہے۔

اس حکومتِ قومی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ یہ تمام تحریک قتلونیہ سے شروع ہوئی اور اُسی صوبہ نے اس میں بڑی مدد کی، مگر یہ حکومت اُسی صوبہ کی بلندنظری کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے۔ یہ مسلّم کہ مارشل لا ہمیشہ اُس دہشت کو رفع کرتا ہے جو عوام کے دلوں میں کسی خاص فرقہ یا گروہ کی طرف سے پیدا ہو جاتی ہے، لیکن دہشت کا علاج دہشت انگیز کارروائیوں سے نہیں ہوتا بلکہ استمالت کرنے اور حتی الوسع شکایات کو رفع کرنے سے ہوتا ہے۔ اس میں یقیناً پریموڈی ریویرا نے کچھ زیادتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا، اور باوجود اُن کی دہشت کے وہاں خفیہ کارروائیاں شروع ہو گئیں (جو سلطنت کے لیے بہت خطرناک ہوا کرتی ہیں۔ کیمونسٹ اور انارکسٹ فرقہ کے قدم جمنے اور انکی گرفت اور عظمت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات کچھ پوشیدہ نہیں رہی کہ عوام الناس کی ناراضی بڑھ رہی ہے۔ انجام اللہ کے ہاتھ ہے۔

امیر عبدالکریم اسپین کے پہلو میں آہنی کانٹا تھے۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ (۱) اُنھیں کو تباہ کرنے کے لیے یہ اصلاحیں کی گئی ہیں (۲) رعایا کو اس میں مدد دینا چاہیے، اور (۳) بادشاہ کا وفادار رہنا چاہیے۔ اس خاص معاملہ میں کلیسا سے مدد لی گئی۔ مسلمانوں کے خلاف یہ وہ پُرانا ہتھیار رہے کہ صدیوں اس سے بکامیابی کام لیا گیا ہے۔ اسی کو پُرانے اسلحہ خانے سے نکالا گیا اور صیقل کرکے اسپین کے سامنے پیش کیا گیا۔ جیسا کہ یقین کیا گیا تھا، اس حربہ نے پورا کام دیا۔

امیر عبدالکریم کی حالت اور اُنکے حالات ایسے نہیں جو بھولے جا چکے ہوں۔ یہ کل کی بات ہے کہ اُنھوں نے اسپین کی فوج کو مولی گاجر کی طرح کاٹ پھینکا۔ ایک دفعہ نہیں، بارہا۔ سپاہی اُنکے مقابل جانے سے ڈرتے تھے۔ اُنکے نام کی وہ دہشت تھی کہ فوج کی فوج کو اپنے پُشتوں کا پُشتہ چھوڑ کر بھاگنا پڑتا تھا۔ قریب تھا کہ افریقیہ سے اسپین کی عظمت و اقتدار کا جنازہ اُٹھ جائے، کہ یہاں پریموڈی ریویرا برسرِ کار آ گئے۔ سازشیں ایسی چیز نہیں ہیں کہ جنکی کوئی شکایت کرے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مدبر سب کچھ کرتا ہے۔ پریمو نے ادھر اپنی فوج کا دل بڑھایا، اُدھر سازشوں کا جال بچھایا، امیر کو ایسے قبیلہ پر حملہ کرنے پر مجبور کیا جو بہت کچھ لے کر اسپین کا ہو چکا تھا، مگر فرانس کی رعیت تھا۔ بس یہ قیامت ہو گیا۔ پریمو نے فرانس سے ساز باز کیا، اُس سے فریاد کی، اور اُسکو امیر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ امیر نے جو کچھ اُس وقت تک کیا وہ معجزہ سے کم نہ تھا۔ اسپین کی تو

مجال نہ تھی کہ اُن سے آنکھ ملالیتا، مگر فرانس کا شامل ہو جانا امیر کے لیے غضب ہوگیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسپین تو کچھ مال نہیں، مگر فرانس کا مقابلہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اُنکے کارناموں کا آخری اعلان یہ تین فقرے تھے (۱) میں اُسوقت تک ہتھیار نہیں ڈالوں گا کہ جب تک میرے خاندان کا بچہ بچہ نہ کٹ جائے (۲) فرانس کی مالی حالت ایسی خراب کر دوں گا کہ دُنیا سے اُسکی ساکھ اُٹھ جائیگی۔ (۳) اسپین کی ملکی و سیاسی اقتدار کو مٹا دوں گا۔

افسوس کہ پہلا دعوے اس لیے پورا نہ ہوا کہ امیر نے باوجود اپنی ہوشداری کے غدار قبیلہ پر اعتبار کیا اور انھوں نے اُنکو گرفتار کرا دیا۔ چوں قضا آید طبیب ابلہ شود اسی کا نام ہے۔ افریقیہ و اندلس کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ بارہ سو برس کا یہ تجربہ ہے کہ اس قبیلہ (مصمودہ) پر اعتماد کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اس فرعون کے لیے موسیٰ کی ضرورت ہے۔ موسیٰ بن عمران (علی نبینا وعلیہ السلام) کی نہیں، بلکہ موسیٰ ابن نصیر (رحمۃ اللہ علیہ) کی۔

دوسرے دعوے کے پورا ہونے کو حضرات ناظرین نہ بھولے ہونگے کہ فرانس کی حالت اس درجہ متزلزل ہوگئی تھی کہ ایک مہینہ میں تین تین وزارتیں بدلی ہیں اور علاج نہ ہو سکا۔ سلطنت کا دیوالہ نکلنا معمولی بات نہیں۔ عوام نے سلطنت کی ہیت مدد کی تب جاکر یہ خطرہ مٹا۔ مگر اس واقعہ کو آج پانچ برس گزر گئے اب تک دنیا کے بازار میں فرانس کی ساکھ برقرار نہیں ہوئی۔

تیسرے دعوے کی یہ کیفیت ہے کہ اسپین کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اقتدار بالکل ختم ہو چکا ہے، اور یہ عمارت، جو پریموڈی ریویرا کے سر پہ کھڑی ہوئی ہے، ممکن ہے کہ چند ہی روز میں زمین پہ آرہے۔ یقین چاہیے کہ اگر برکاتِ دمِ عیسوی اُس کے شامل حال نہ ہوتیں تو دہ اسکا ساتھ دیدیتی۔

سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

اب کلیسا نے جو کچھ چاہا تھا اُسکو ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمالیجیے۔ پہلا اور دوسرا مطالبہ پورا ہوگیا تیسرا مطالبہ، جو سب سے زیادہ اہم تھا، اُسکا یہ انجام ہوا کہ پریموڈی ریویرا کی چیرہ دستیاں اتنی بڑھیں کہ آخر انھوں نے شاہ الفانسو سیزدہم سے اُس تاریخی دستاویز پر (یوں کہنا چاہیے کہ) بزورِ شمشیر دستخط کرا لیے کہ جسکے رو سے وہ ڈکٹیٹر بن گئے۔ اب سیاہ و سفید کے وہ مالک ہیں اور جناب الفانسو سیزدہم فرانس کے ہوٹلوں میں شراب پیتے پھرتے اور وہاں کے قمار خانوں میں جُوا کھیلتے پھرتے ہیں۔ بہر حال، پریموڈی ریویرا سے تاریخی بحث جا رہی ہے۔ امید یہ ہے کہ انکی عظمت ختم ہو کر رہیگی۔ دیکھیے وہ اپنے ساتھ کس کس کو لیکر ڈوبتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ میری ہی زندگی میں ہو جائے، حالانکہ میں گھر میں

میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں - یہ بات الگ ہے کہ خدا تعالیٰ میں یہ بھی قدرت ہے کہ وہ مُردے میں جان ڈال دے - اور وہ اپنے نبی حضرت عیسٰے (علیہ السلام) کے ذریعہ سے یہ کرتا رہا ہے - یہ ہے موجودہ اسپین کی مختصر کہانی -

"ہندوستاں ہمارا"

ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں ہر مذہب (میرا مطلب دین سے ہے) اپنے پورے زوروں پر ہے اللّٰھم زد فزد - اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ مجھ سے یہ سوال کیا جائے گا کہ "جس مُلک سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو آٹھ سو برس کے بعد نکالا ہے وہاں اسلام اور مسیحیت کا کیا حال ہے؟" اس سوال کے پہلے جزو کا جواب تو میں تیقن کے ساتھ دے سکتا ہوں کہ "اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ حتیٰ کہ قبریں تک نہیں رکھی گئیں۔ مگر مسلمانوں کی اوصلح طیبات ہر زندہ مسلمان سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ اُنکے لیے دعاے مغفرت کریں اور اُن کا انتقام لیں"۔ میں اپنے علم و یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کہ اُنکے حق میں دعاے مغفرت کرنے والا شاید دنیا بھر میں کوئی نہیں - الا ماشاءاللہ - انتقام کا ممکن ہے کہ کسی کسی کو خیال ہوتا ہو -

رہ گئی عیسائیت - میں اتنا جانتا ہوں کہ ملک بھر کیتھولک مذہب کا پیرو ہے، جو بت پرستی کا دوسرا نام ہے؛ مگر اصل مذہب عیسوی جو سینٹ جان نے سکھایا یہی ہے -

۱۹۲۱ء میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ حضرت مخدومی قاضی ولی محمد صاحب بالقابہ اسپین تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں - اُنھیں دنوں میں نے جناب ممدوح سے عرض کیا تھا کہ وہاں کی مذہبی حالت کو بغور ملاحظہ فرمائیں - بالخصوص یہ دیکھیں کہ آیا مسلمانوں سے اب بھی ویسے ہی تعصبات برتے جاتے ہیں، جیسے کہ آج سے تین چار سو برس پہلے تھے - جناب موصوف نے مجھے اسکے متعلق اطلاع دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا - میں ایک مرتبہ پھر جناب معزی الیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میری التماس پر توجہ فرماکر میری دو تین درخواستیں پوری کیں - جنکا سفرنامہ میں ذکر فرمایا ہے - مگر بدقسمتی سے اسی اہم سوال کا جواب نہیں ملا - میرا منصب شکایت کرنے کا نہیں ہے؛ بالخصوص اس لیے کہ ممدوح الشان کے عہدۂ جلیلہ کے کار ہا متعلقہ اتنے ہیں کہ نہ معلوم یہ سفرنامہ بھی کیونکر مرتب ہوگیا - نیز میں قیاس کر سکتا ہوں کہ ممدوح کے پاس وقت کی اتنی کمی تھی کہ دورانِ سیاحت میں وہ اسکو تحقیق نہ فرما سکے - مجھے جتنا بھی علم ہے وہ یہ ہے کہ اُنکی مذہبی حالت وہی ہے جو جہلا کی بالعموم ہوا کرتی ہے -

کہ اپنے خیالات میں غلاظ و شداد ہیں، لیکن فی الحقیقت مذہب کی انھیں کوئی واقفیت نہیں، اور ایک ادنیٰ سے بیرونی حملہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ لیکن تعصب مذہبی کا یہ عالم ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ اپنے سوا، تمام دنیا کے کیتھولکوں کو نہ صرف کافر بلکہ ناپاک سمجھتے ہیں۔ ایک یہ واقعہ میرے علم میں ہے کہ ایک شخص کا لڑکا ایک قصبہ کے پرائیوٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ بدقسمتی کو اس اسکول میں پراٹسٹنٹ مذہب کے مصنف کی ایک ریڈر پڑھائی جانے لگی۔ اس میں بعض خیالات بھی اسی مذہب کے تھے۔ اتفاق سے باپ کو معلوم ہوا تو اُس نے بیٹے کو بہت سخت سست کہا؛ وہ ریڈر پھاڑ ڈالی اور دوسری صبح کو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جو اُستاد وہ ریڈر پڑھاتا تھا اُسکو قتل کرا آیا![1] یہی واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس حلیم پیغمبر (علیہ السلام) کی بھیڑوں پر اُسکے علم و انکسار کا کوئی گہرا اثر نہیں۔ جہالت اُنکی سیدھی ہے اور انتہائی عصبیت مذہبی اُنکی راہبر۔

بلاشبہ اُنھوں نے بجبر مسلمانوں کو سور کھلایا۔ جسکا کھانا اب اہلِ اسپین کی عادتِ ثانیہ ہوگئی ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کو بھول بسر چکے ہیں۔ مورخ اذکر کے جو آثار اُنکے ملک میں رہ گئے ہیں وہ گویا نشاناتِ فتح ہیں کہ جن پر فخر کیا جاتا ہے۔ اُنکو یہ بھی خیال نہیں آتا کہ ہم میں سے اکثر کے نام عربی (بگڑی ہوئی ہی سہی) کیوں ہیں[2]

مجھے دو ایک واقعات ایسے معلوم ہیں کہ جن کو اس کا خیال دلایا گیا، وہ اگر مسلمان نہیں ہوے تو کم از کم اُنکو مسلمانوں کی طرف رجحان بلکہ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ یہ ہمارے ہندوستان کے سیاحوں

---

[1] اس واقعہ پر مجھے سرحد کا ایک واقعہ یاد آیا، جو جہالت کی بہترین مثال ہے۔ سرحد کا ایک نوجوان باشندہ حضرت خاتم المحدثین مولانا سید نذیر حسین صاحب نوراللہ مرقدہ کی شاگردی سے اپنے وطن میں تازہ وارد ہوا۔ کچھ طالبعلمانہ جوش کچھ عادت کہ اُسنے تشہد میں انگلی اُٹھا دی۔ ایک بوڑھا اجہل پٹھان اُسکے برابر ہی نماز پڑھ رہا تھا۔ اُسنے اس طالبعلم سے دریافت کیا کہ یہ بدعت کیسی؟ طالب علم نے جواب دیا کہ حدیث میں یوں ہی آیا ہے۔ بوڑھا پٹھان اُٹھا اپنے گھر سے تلوار لایا اور اُس بیگناہ طالب علم کو قتل کر ڈالا۔ وہ تلوار کا وار کرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ دیکھو حدیث شریف میں یوں آیا ہے۔

[2] چنانچہ ایک کاؤنٹ اننازہ تھے کہ اپنے خاندانی تحقیقات کے بعد اُنھیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان خاندان کے آدمی ہیں۔ وہ مسلمان ہوگئے۔ اسلامی ممالک کی اُنھوں نے سیاحت کی۔ ہندوستان بھی آئے تھے اور یہاں اگر میں غلطی نہیں کرتا تو) حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت سے مشرف ہوے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب کو اُنکی ذات سے بہت دنیوی فائدہ ہوا۔ پیرس میں رہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب انتقال فرما گئے۔ خدا تعالیٰ

کی بدولت ہوا

ایں شعلہ ہند گرم خیز است	اینجاست کہ آفتاب تیز است

یہی ہندوستانی اس فرض کفایہ کو ادا کرکے دوسروں کو سبکدوش کردیتے ہیں؛ ورنہ دوسروں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ قرطبہ کی مسجد کو دیکھ کر بھی ہنستے کھیلتے نکل جاتے ہیں۔

یہ نہ سمجھیے کہ امیر عبدالکریم اور اُنکے شرکا، کارزار کی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ اُنھوں نے وہ نقش ملک پر چھوڑا ہے کہ جلد مٹنے والا نہیں۔ جس طرح یورپ کی ترقی کا ایک آزجنگ صلیبی کو بتلایا جاتا ہے، بعینہ اسی طرح امیر عبدالکریم کی پچھلی جنگ اسپین پر، بذریعہ قیدیان جنگ اثر ڈالے بغیر نہیں رہی۔ آج وہاں کے بہترین دل و دماغ اس طرف لگے ہوے ہیں کہ اسپین کو مسلمانوں کے زمانہ کے نمونے پر ڈھالا جائے۔ نجی کی صحبتوں میں اس پر بحث ہوتی ہے، اخباروں میں اس پر مضامین لکھے جارہے ہیں، کاشتکار اس کا مطالبہ کررہے ہیں، ارباب سیاست اس پر غور کررہے ہیں۔ گیا گوس اور زامیدین انتقال کرچکے ہیں۔ اُن سے اُمید تھی کہ وہ اپنے علم و فضل سے کام لیکر صحیح حالات کی طرف رہنمائی کرتے۔ ایک دو کالجوں میں عربی کی تعلیم کا انتظام ہے؛ مگر طالب علموں کو ابھی برسوں چاہییں کہ وہ کارآمد ہوسکیں۔ قیدی سلطان حفیظ سے، یا ملک الشعراء مصر سے (جو میڈرڈ میں مقیم ہیں) یہ اُمید رکھنی بیکار سی ہے کہ وہ کچھ مددگار ہوسکیں۔ سلاطین ترک نے مسلمانان اندلس کو تباہ ہوتے دیکھا اور ایک اُنگلی نہیں اُٹھائی (حالانکہ وہ بہت کچھ کرسکتے تھے) شاہان مصر دور سے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے اور اُف تک نہیں کی۔ مراکش خود مرا ہوا ہے، اُس سے کیا اُمید ہوسکتی ہے کہ وہ جنبش بھی کرے۔ کچھ امید ہوسکتی ہے تو مسلمانان ہندوستان سے، جو غلام ہیں مگر ایک باہیبت و بااصول گورنمنٹ کی رعایا ہونے کی حیثیت سے غیر ممالک میں بہت کچھ ذی عزت اور محفوظ و مصئون ہیں

وہاں کے ایک بہت بڑے (ہندوستانی) فلسفی کی رائے ہے کہ "یہ ممکن نہیں کہ اسلام کو اسپین میں کامیابی نہ ہو، بشرطیکہ وہاں باقاعدہ اُس ملک کے حالات و ضروریات کو دیکھکر تبلیغ کیجائے۔" میں یہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتا، نہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں تبلیغی کوششیں نہ کی جائیں، یا مسلمانوں کو مسلمان نہ بنایا جائے۔ خدا تعالیٰ احمدیوں اور سید غلام بھیک اور اُنکے شرکا کو ضرور اسکی جزاء خیر دے گا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر مسلمانوں کی گڑیوں کو بچا رہے ہیں۔ لیکن آج یورپ کو کریم کا رساز نے وہ چیز بنا رکھا ہے کہ وہاں جس چیز کو کامیابی ہو وہ دنیا بھر میں کامیاب ہوتی ہے۔ اسپین میں تبلیغ بہترین نتائج پیدا کرسکتی ہے، وہ جس خوش قسمت کے نصیب میں لکھی ہو۔ بظاہر تو یہ فرض کفایہ اگر

کوئی ادا اگر سکتا ہے تو ہندوستان

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ارواحِ طیباتِ مسلمانانِ اندلس و صقلیہ ہر زندہ مسلمان سے اسی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اسی کو وہ انتقام سمجھتی ہیں۔ اور حقیقۃً اگر کوئی صحیح انتقام ہو سکتا ہے تو یہی۔

میں سالہاسال سے بڑے بڑے آدمیوں سے یہی درخواست کرتا پھرتا ہوں، مگر ابھی تک کوئی گوشِ شنوا نہیں ملا۔ مولانا محمد علی صاحب (امیر جماعت احمدیہ لاہور) سے التماس کیا، مگر ممدوح نے کمی خرچ کا عذر فرمایا۔ کئی برس متواتر حضرت خلیفۃ المسیح سے تحریری و زبانی عرض معروض کیا، مگر مطلق توجہ نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ میں غیر احمدی ہوں۔ غرض

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفتِ خوشحالان و بدحالاں شدم

ابھی تک راہِ کامیابی بالکل مفقود ہے۔ اوّل تو یہی کسے اُمید ہے کہ کوئی یہ سطور پڑھے گا، لیکن الناظر کے ذریعہ سے میں ایک مرتبہ تمام مسلمانانِ ہندوستان کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں۔ شاید کوئی اہلِ دل نکل آئے۔ اگر کوئی تیار ہو تو تدبیر و ترکیب بتانے اور اُنکے ہمراہ رکاب ہونے کو میں تیار ہوں۔ اگر میں بوڑھا اور ناتوان نہ ہوتا، تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا اور چل دیتا۔ مگر اب ضرورت ہے عصائے پیری کی۔ کاش وہ بہم پہنچ جائے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

محمد خلیل الرحمٰن
مترجم اخبار الاندلس وغیرہ وغیرہ

غزل قائم چاندپوری شاگردِ سودا

پڑھ کے قاصد خط مرا اُس بدزباں نے کیا کہا
کیا کہا پھر کہہ بتِ نامہرباں نے کیا کہا

غیر سے ملنا تمہارا سُن کے گو ہم چپ رہے
پر سُنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

آہ اے مرغِ چمن کچھ تو بھی واقف ہے کہ صبح
گُل نے کیا پوچھا تھا ہنس کر باغباں نے کیا کہا

سب خوارجِ مصر دیکھا زلیخا کو یہ سوچ
مول یوسف سے بشر کا کارواں نے کیا کہا

قائم اُس کو جو صفِ مجلس نہ آتا تھا یوں نہیں
کیا کہوں تجھ سے کہ اسکو پاسباں نے کیا کہا

ابن خلدون

ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں بمقام شہر ٹیونس (Tunis) پیدا ہوا اور بمقام قاہرہ ۷۴ سال کی عمر میں ۱۴۰۶ء میں راہی ملکِ بقا ہوا۔ عرب کے تاریخ نویسوں میں اس کا رتبہ بہت بلند ہے بلکہ ایشیا میں اُس کا ثانی شاید کوئی شاذ و نادر ہوگا۔ تاریخ نویسی پر جو مقدمہ اُس نے لکھا ہے تاریخ نویسوں کے لیے سبق آموز اور رہنما ہے۔ اس قابل عالم کی زندگی مصیبت اور عزت کا مجموعہ ہے۔ اسکے سوانح عمری پڑھ کر اس میں شک نہیں رہتا کہ یہ عالم استقلال طبع کا مالک تھا اس کا دماغ روشن اور معلومات کا معدن تھا۔ تاریخ نویسی کے وہ اسلوب جو زمانۂ حال میں صحیح سمجھے جاتے ہیں شروع میں اسی نے وضع کیے تھے۔ اخبار اسٹیٹس مین (Statesman) مورخہ ۲۲-جون ۱۹۲۶ء میں اس مورخ کی زندگی کے بعض حالات شایع ہوے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہم مختصراً چند حالات اُردو میں حوالۂ قلم کرتے ہیں۔

سویل (Seville) کے ایک معزز اور بارسوخ خاندان کے ساتھ ابن خلدون کی رشتہ داری تھی۔ بیس سال کی عمر میں وہ سلطان عبدالاسحاق ثانی کا پرائیوٹ سکرٹری تھا۔ یہ سلطان جو خافص خاندان سے تھا کم از کم نام کے لیے ٹیونس پر حکمراں تھا۔ یہ عہدہ ابن خلدون ترک کر کے فیض کو چلا گیا جو اُس وقت مرنی خاندان کے سلاطین کا دارالخلافت تھا۔ سلطان ابوعنین کے دفتر میں اُس نے ملازمت اختیار کرلی لیکن یہاں ناچاقی ہوگئی اور وہ مقید کرلیا گیا۔ سلطان کی وفات پر چند واقعات ایسے ظہور میں آئے کہ نہ صرف اُسکو قید سے رہائی مل گئی بلکہ وہ سلطان متوفی کے جانشین کا سکرٹری مقرر ہوگیا۔ لیکن رعایا کی بغاوت کی وجہ سے اسکی حالت مخدوش ہوگئی۔ اس کا آقا برطرف کردیا گیا۔ لاچار اُسکو ہسپانیہ واپس جانا پڑا (۱۳۶۲ء) سلطان ابواحمر نے جسکی وہ خدمات کرچکا تھا اُس کی آؤبھگت کی اور پھر سفیر کے اُسکو اُسکے وطن سیویل کو بھیجدیا۔ یہ شکایت پیٹر شاہ کیسٹل (Castile) کے دربار میں تھی۔ شاہ مذکور نے اُس سے اُسکی اجدادی جائداد کے واپس دینے کا اقرار کیا اور اس کا بہت اچھا استقبال کیا۔ مگر وہ غرناطہ چلا گیا جہاں وہ امن سے کچھ عرصہ رہا۔ بعد ازاں ایک ناخوش آیند واقعہ ظہور میں آیا۔ یعنی وزیر ابن خطیب نے اُسے فلقیہ جانے پر مجبور کیا۔ (۱۳۶۵ء) میں اُس نے بجایا میں مستقل سکونت اختیار کی جہاں وہ خافصہ خاندان کے سلاطین کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔ یہاں بھی فریب کو

امن نہ ملا۔ ایک ہمسایہ شاہزادہ کنسٹیل نے شہر پر دھاوا کرکے اُسے فتح کرلیا۔ ناچار ابن خلدون کو تلمیس جانا پڑا جہاں وہ کبھی شاہزادہ ابوحمون کا سکرٹری تھا۔ مگر جہاز سے اُترتے ہی مرینی خاندان کے سلطان عبدالعزیز نے اُسے گرفتار کرلیا۔ پھر معمولی تحقیقات کے بعد وہ رہا کر دیا گیا۔ سلطان کی خواہش تھی کہ اُس سے کام لے۔ کیونکہ خانہ بدوش عربی قوموں میں اس کا بہت رسوخ تھا چنانچہ سلطان کے فرزند ابوبکر سعید کے عہد تک وہ وہیں ملازم رہا۔ ان دنوں شہزادہ کی نابالغی میں وزیر مدارالمہام تھا۔ اس شہزادہ کی نابالغی کے زمانے میں شاہ غرناطہ نے ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے تئیں تخت کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نابالغ شہزادہ برطرف کر دیا گیا۔ اور اسی خاندان کا ایک اور شہزادہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ خلدون نے منت سماجت کی کہ اُسے ہسپانیہ جانے کی اجازت مل جائے۔ بجائے اجازت دینے کے اُسکے سابق مربی شاہ غرناطہ نے اُسے شہر بدر کر دیا۔ جب وہ افریقہ واپس آیا تو اُسکی حالت اور مخدوش ہو گئی۔ ادھر تو وہ مرینی خاندان کے علاقہ میں جا نہیں سکتا تھا اُدھر تلمس کے سلطان سے بدمزگی ہو چکی تھی۔ تاہم جب سلطان مذکور نے بلایا تو اُس نے انکار نہ کیا۔ اور اسکے پاس چلا گیا۔ درویشوں کے حجروں میں اُس نے سکونت اختیار کی۔ مگر جب موقعہ ملا یہاں سے وہ چلا گیا۔ اور صوبہ جدید اوران کے ایک قصبہ میں جو ایک گوشہ میں تھا وہ معہ اپنے کنبہ کے رہنے لگا۔ اس قصبہ کا نام لقاب الوسلایا تھا۔ ایک پرانے قلعہ میں آرام سے بیٹھ کر اُسنے چار سال میں مسلم تہذیب کی تاریخ تصنیف کی۔

۱۳۷۸ء میں وہ ٹیونس گیا تاکہ ایک بسیط تاریخ کے واسطے مسالہ جمع کرے یہاں سلطان ابوالعباس سے اُسے بہت مدد ملی۔ مسجدوں اور درسگاہوں میں بہت سی کتابیں تھیں۔ عوام کو بھی شوق کتب بینی کا تھا۔ چنانچہ یہاں اُس نے بربر اور زناتی اقوام کی تاریخ مکمل کی۔ ابھی چار سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اُسکے خلاف سازش شروع ہو گئی۔ حج کے لیے اجازت لیکر وہ سکندریہ پہنچ گیا سکندریہ سے وہ قاہرہ گیا۔ یہاں وہ قاضی القضات مقرر ہو گیا (۱۳۸۴ء) اور ایسا عمدہ انتظام کیا کہ درویش جو معاملات سرکاری میں دخل دیا کرتے تھے اوس سے کانپنے لگے۔ اُس نے احکام اس قسم کے جاری کیے کہ اُسکے دشمنوں کا شمار بڑھ گیا۔ ایک مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کا کنبہ ٹیونس جاتا ہوا بحری طوفان میں تباہ ہو گیا۔ عہدۂ قضا سے اُس نے استعفا دیدیا۔ ۱۴۰۰ء میں وہ والیِ مصر کے ہمراہ ایک مہم میں جو تیمور لنگ کے خلاف تجویز ہوئی تھی شام پہونچا۔ کمبختی سے یہاں پھر

مقید ہوگیا۔ کسی نہ کسی حیلہ سے اُس نے یہاں سے مخلصی حاصل کی اور پھر قاہرہ چلاگیا جہاں ایک* مرتبہ سے زیادہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر [illegible] رہا۔ اس مورخ نے سلطنتوں کے بہت اُتار چڑھاؤ دیکھے، عوام کی حالتیں بدلتی دیکھیں، [illegible] اپنے مصائب و آلام اتنے دیکھے کہ کبھی عرش پر کبھی تحت الثریٰ میں۔ اُسکی طبیعت نے جدید طرز تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی، مورخوں کو تعصبات اور غلط واقعات سے متنبہ کیا۔ اُسکی تاریخ میں نہ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے بلکہ سوسائٹی کی حالت بھی وہ شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔

ہم کو اُس کے مقابل کا ایک شخص صرف کلن مصنف راج ترنگنی معلوم ہوا ہے۔ جنے کشمیر کی تاریخ آزادانہ لکھی۔ حال کے تواریخ نویسوں کو ابن خلدون کا دیباچہ ضرور پڑھنا چاہیے۔

شمیم

غزل

جو ڈالے عکس اپنا وہ بت بے پیر پانی میں
نظر آنے لگے خورشید کی تصویر پانی میں

لب دریا کبھی پہونچا جو اُن زلفوں کا سودائی
تو اُسکے واسطے ہر موج تھی زنجیر پانی میں

کھڑے ہیں وہ لب جو اور برپا اک تلاطم ہے
تڑپتے لوٹتے ہیں سیکڑوں نخچیر پانی میں

جبیں حبب سوز غم سے اشک تو رخسار جلتے ہیں
نہ دیکھی آج تک یہ آگ کی تاثیر پانی میں

پڑا ہے عکس قاتل جو ہلالِ عید قرباں کا
نظر آتی ہے سربازوں کو اب شمشیر پانی میں

اُڑاتا ہے لب دریا جو تو خاک اپنے کشتہ کی
بہاتا ہے عبث لے سیمتن اکسیر پانی میں

دم تحریر نامہ جو حبیب آنسو ٹپکتے ہیں
ہوئی جاتی ہے نادان سب تحریر پانی میں

حبیب اللہ خاں حبیب رامپوری

---

* علامہ ابن خلدون کی سوانحعمری چھپی ہوئی موجود ہے اور دفتر الناظر بک ایجنسی سے مل سکتی ہے۔ ایڈیٹر

سرکار کا دربار

مصنفۂ احمد الیاس مجیبی (فرخ آبادی)

(صفحات ۱۵۲ - قیمت عہ/ ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی)

دنیا میں صرف وہ ہستیاں ایسی ہیں جو کسی دوسرے کو اپنے سے زیادہ قابل، زیادہ مالدار، زیادہ خوش و خرم، غرضکہ ہر حیثیت سے زندگی میں زیادہ کامیاب دیکھنے کی خواہشمند رہتی ہیں۔ اور وہ ماں اور باپ ہیں۔ جن کی نہ صرف یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہر شعبۂ زندگی میں زیادہ کامیاب دیکھیں بلکہ وہ اپنے اس نیک مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی امکانی کوشش اٹھا نہیں رکھتے ڈانٹ ڈپٹ سے، پند و نصیحت سے، لاڈ پیار سے، غرض ہر طرح سے وہ اسکی کوشش کرتے ہیں کہ انکے بچے برائیوں سے محفوظ رہیں اور اچھائیوں کو اختیار کریں۔ کیونکہ انکا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ اس کم سنی میں جبکہ بچوں کی حالت موم کے مانند ہوتی ہے کہ جس سانچے میں ڈھالو، ڈھل جاتے ہیں۔ انکے اخلاق کی درستی ہی کامیابی کی کلید ہے۔

بچوں کے اخلاق درست کرنے کے بہترین ذرایع کیا ہیں؟ یہ مسئلہ ہمیشہ سے ایک نہایت ہی معرکہ آرا مسئلہ چلا آتا ہے۔ اور ماہرین علم النفس نے اس موضوع پر بڑے بڑے مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے قریب قریب سب متفق ہیں کہ سختی یا خشک وعظ و تلقین تو کجا بچے کو اسکا احساس بھی نہ ہونا چاہیے کہ اسکو نصیحت کی جا رہی ہے۔ ورنہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ بچوں کی فطرت ہمیشہ خشک نصائح سے بغاوت کرتی ہے۔ اسی لیے یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اچھائیاں اور برائیاں دونوں، بچوں کے سامنے اس پیرایہ میں پیش کی جائیں کہ وہ ان میں خود بخود امتیاز کرنے لگیں جس سے انکے کیرکٹر کی تعمیر پر پورا پورا اثر پڑے، اور اصلاح و تربیت کا مقصد بغیر کسی براہِ راست کوشش کے بہ آسانی حاصل ہو جائے۔ ذاتی عمل سے بہتر اسکا اور کوئی طریقہ نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر انسان سراپا عمل نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ لازم ہوا کہ عظما کی مکمل ترین ہستیوں کے کارنامے اس انداز اور ایسی زبان میں انکے سامنے پیش کیے جائیں کہ مذکورۂ بالا مقاصد طرح مدنظر رہیں اور کسی طرح انکی سمجھ سے بالاتر بھی نہ ہوں۔

مسلمانوں کے نزدیک حضور سرورِ کائنات رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات

سے زیادہ تو کیا برابر بھی آج تک کوئی ہوا ہے اور نہ آیندہ ہو سکتا ہے۔ آپ دنیا کے سامنے ایک کامل ترین نمونہ بن کر آئے تھے۔ آپ کا ہر فعل احسن اور ہر قول خدا کا قول تھا۔ آپ کی پاک زندگی کا ایک کھلا ہوا درس ہے۔ ایک مستقل شمع ہدایت ہے۔ اس لیے مسلمان بچوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے آپ کے حالات سے بہتر اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ مجیبی صاحب نے ان ہی مقاصد کو ملحوظ رکھ کر "سرکار کا دربار" تصنیف کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں "دربار کا سلام" کے عنوان سے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی جیسے ناقد کا مقدمہ شامل ہے۔ جس میں موصوف نے چند معمولی لغزشیں نمایاں کرنے کے علاوہ ایک عجیب والہانہ انداز میں کتاب کی تقریب کی ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی ضرورت اور اہمیت دکھلانے کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اب تک جنھوں نے قلم اُٹھایا، یا تو اُنکے دلوں میں درد محبت کی کسک موجود نہ تھی اور یا دماغ کو تاریخی حقیقتوں کی قید گوارا نہ ہوئی۔ پھر اگر دونوں باتیں جمع ہو بھی گئیں، تو بوڑھا آدمی بچوں کی زبان میں باتیں کرنے کے لیے خود کہاں سے بچہ بن جائے۔"

یہ چند جملے کسی مزید تشریح کے محتاج نہیں۔ اور انکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب سے پہلے اب تک اُردو زبان میں اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں تاریخی حقیقت بھی نظر انداز نہ کی گئی ہو اور جو درد محبت سے بھی لبریز ہو۔ ساتھ ہی ساتھ زبان اتنی سادی اور پیاری ہو کہ بچوں کے لیے صرف گراں بار ہی نہ ہو، بلکہ ایک مرتبہ اگر وہ شروع کر دیں تو ختم کیے بغیر نہ اُٹھیں، اور اُٹھیں تو اپنے ہادیِ اعظم کی محبت کی ہلکی ہلکی موجیں اپنے سینوں میں اُٹھتی ہوئی محسوس کریں۔

کتاب میں رسول اکرمؐ کی ابتدائی زندگی کے حالات، خاص خاص لڑائیوں کے تذکرے، اور سخت سے سخت مصیبتوں اور آزمائشوں کے مقابلہ میں نہایت استقلال کے ساتھ اعلاے کلمۃ الحق کرتے رہنا، اور اشاعتِ اسلام کو جاری رکھنا زیادہ نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اسکے ساتھ ہی عقائدِ اسلام کی تشریح اور انکی اہمیت پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے اور آخر میں آپ کے اخلاقِ حسنہ کو ایک ایک کر کے نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے۔ خاص طور پر تمام کتاب میں اس چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان چیزوں کو منتخب کیا جائے جنکا تعلق براہِ راست بچوں کے کیرکٹر سے ہو۔ البتہ شاید مصنف کے ذہن میں یہی بات ہو جسکی وجہ سے حضورؐ کے معجزات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہرحال مثلاً آپ اس موقع کو ملاحظہ فرمائیں جہاں حیوانوں پر رحم کے سلسلہ میں حضورؐ کے چند ارشادات بیان کیے گئے ہیں۔ بچوں کی طبیعت

ہوتی ہے کہ چڑیوں کے انڈے بچے اُنکے گھونسلوں سے نکال لیتے ہیں اور اُن سے کھیلتے ہیں - اس کے متعلق چند واقعات کچھ اس پیرایہ میں بیان کیے ہیں کہ ایک مسلمان بچہ انھیں پڑھ لینے کے بعد اگر کبھی ایسی حرکت کرے گا تو فوراً اُسے حضورؐ کی تعلیم یاد آجائے گی اور وہ اس سے ضرور احتراز کریگا - وغیرہ وغیرہ

مجیبی صاحب نے زودِ تحریر میں ادب کے پہلو کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے - ہر جگہ انھوں نے اس قدر سنبھال کر لکھا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی - لیکن پھر بھی کہیں کہیں کامل توجہ کی ضرورت باقی رہ گئی ہے - مثلاً

"عرب اور خاص کر مکہ میں تو (گھر کی مرغی دال برابر تھی) کی مثل تھی" صـ۱۷

واقعیت سے یہ دُور نہ سہی لیکن طرزِ بیان ضرور کھٹکتا ہے - اُمید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں اس قسم کی فروگذاشتوں کی اصلاح کر دی جائے گی -

زبان کے لحاظ سے بھی بعض خامیاں نظر آتی ہیں - جن میں سے چند کا یہاں لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے - اگر مصنف صاحب مناسب سمجھیں تو آئندہ اڈیشن میں انکی جانب ضرور توجہ فرمائیں - بعض غلط یا غیر فصیح الفاظ استعمال کیے گئے ہیں - مثلاً

(۱) صـ۳۴ تپتی پتھریلی زمین بجائے تپتی
(۲) صـ۴۷ کبھی نہیں میٹ سکتا بجائے مٹا سکتا
(۳) صـ۸۸ دھیرے دھیرے بجائے آہستہ آہستہ
(۴) صـ۹۰ ساری رُکاوٹیں دھری رہیں بجائے رکھی رہ گئیں -
(۵) صـ۹۰ خدا نے جو کام انکے ذمہ دھرا تھا بجائے کیا تھا
(۶) صـ۳۹ اسکا ذکر کھول کر کیا جائیگا بجائے پوری طرح
(۷) صـ۹۹ دادا جی شاہ جی بجائے شاہ صاحب (اسمیں تذلیل کا پہلو نکلتا ہے -)
(۸) صـ۱۰۶ آپ نمرٹ جیسے تھے (اگرچہ انکار ہے لیکن پھر بھی ادب مانع ہے -)

اسکے علاوہ زبان کو سہل کرنے کے خیال سے بعض جگہ ہندی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں - جن میں سے اکثر یا تو غیر فصیح معلوم ہوتے ہیں یا اُن لفظوں سے زیادہ مشکل ہو گئے ہیں جن کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا ہے - مثلاً

(۱) صـ۴۶ ہمارا تمہارا سب کا پالن ہار
(۲) صـ۵۲ ابو طالب نے اپنے حضرت کو بُلا کر باتیں کیں اور کہا کہ اچھے پوت !
(۳) صـ۱۰۱ جنتی ماتی

(۴) صفحہ ۵۸ دین کے پرچار بجائے پھیلانے کے

کتاب میں اکثر جگہ اقبال کے اشعار بھی مناسب موقعوں پر دیے گئے ہیں۔ لیکن ایک موقع کی موزونیت بالکل ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ صفحہ ۹۶ پر سرکار کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اگر توحید کا معاملہ نہ ہوتا تو رسول پاکؐ ہمارے سرکار کے دیوانے حضرت صدیقؓ کے ان لفظوں کا سننا بھی گوارا نہ کرتے۔ ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال نے "شکوہ" نامی ایک نظم میں ایک جگہ لکھا ہے، اللہ میاں سے کہتے ہیں ؎

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذات قدیم　　پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ لطافِ عمیم　　بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

مصنف نے شاید "دیوانی" پر زور دیا ہے، لیکن میں ان کی توجہ "ورنہ" کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں

کتاب کے بالکل آخر میں حدیثوں سے اقتباس کر کے حضورؐ کے کچھ اقوال دیے ہیں اور اس کے بعد خواجہ حالی کے مسدس کے چند بند بھی دیے ہیں، جو اپنی جگہ پر موزوں اور مناسب ہیں۔ ہم پر زور تائید کرتے ہیں کہ ہر مسلمان بچے کو "سرکار کا دربار" کا مطالعہ ضرور کرانا چاہیے۔ اس لیے ہماری قطعی یہ رائے ہے کہ تمام اسلامی مدارس کو اپنے نصاب میں یہ کتاب داخل کر لینا چاہیے۔

محمود علی خاں (از دہلی)

رسید کتب

عربوں کا تمدن	مترجمہ سید نذیر نیازی بی اے (جامعہ)	عمار
ذکر میر (فارسی)	میر تقی میر کی خود نوشت۔ انجمن ترقی اردو	عمار
اسلامی تعلیم	مولفہ مولانا سید محمود زبیری الوری	ے/
سیرۃ باقی	مصنفہ حافظ سید عزیز حسن۔ دہلی	۱۲/

غالب

تنہا صاحب نے اُردو نثر نویسوں کا تذکرہ سیر المصنفین کے نام سے مرتب کیا ہے - جلد اول سنہ ۲۴ء میں شایع ہوئی تھی - دوسری جلد چھپ رہی ہے اور یقین ہے کہ سالِ رواں میں مکمل ہو جائے گی - اب آپ کی توجہ شعرائے اُردو کی طرف ہوئی ہے - شعراء کے متعدد تذکرے موجود ہیں، اور لالہ سری رام صاحب کا خُم خانۂ جاوید تو واقعی تذکرۂ ہزار داستان ہے، جو تکمیل کے بعد ایک حد تک اُردو شاعری کی انسائیکلوپیڈیا کہے جانے کا مستحق ہوگا - مگر تنہا صاحب اپنے مذاق کے مطابق شعراء کے حالات، اُنکی شاعری پر تبصرہ، اور اُنکے کلام کا انتخاب مرتب کرنا چاہتے ہیں اور وعدہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے کے سب مضامین ابتداءً الناظر ہی میں شایع ہوں گے، بعد کو کتابی صورت میں چھاپے جاسکیں گے - اسی قسم کے مضامین کا ایک سلسلہ ا - ز لکھنوی کے نام سے رسالہ زمانہ اور الناظر میں کبھی شایع ہوا کرتا تھا، مگر افسوس ہے کہ ناتمام رہا - تنہا صاحب کا اس سلسلہ کا پہلا مضمون حاضر ہے -

ترتیب کے لحاظ سے مرزا غالب کو اولیت کا فخر حاصل نہیں ہونا چاہیے تھا، اور تنہا صاحب کو اس طرف توجہ بھی دلائی گئی تھی - مگر وہ اس وقت کسی ترتیب کے پابند ہونا نہیں چاہتے، البتہ تدوینِ کتاب کے وقت ترتیبِ صحیح ملحوظ رکھی جائے گی -

"ایڈیٹر"

آپ کا نام میرزا اسداللہ خاں تھا اور غالب و اسد دو تخلص تھے - آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے تھے - آپ کا سلسلۂ نسب تورا بن فریدوں تک پہونچتا ہے اور آپکے آباؤ اجداد ایبک قوم کے ترک تھے - مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے - ترسم خاں نامی ایک امیرزادے کی اولاد میں تھے - مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولھا کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی، جو عمائدِ شہر آگرہ میں سے تھے - مرزا نے آگرہ ہی میں پرورش پائی اور سنِ شعور تک آگرہ ہی میں رہے - مرزا نے شیخ معظم سے جو اُس زمانے میں آگرہ کے نامی معلموں میں سے تھے تعلیم پائی اور اسکے بعد ایک شخص پارسی نژاد سے جسکا نام مسلمان ہونے کے بعد عبدالصمد کہا گیا تھا دو برس تک فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی -

اس کے سوا مرزا نے اور کسی کے سامنے زانوے ادب تہ نہیں کیا۔ اور اس لیے مرزا کا یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے

آنچہ در مبدأ فیاض بود آن من است　　　　گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں من است

مرزا کی شادی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی۔ تیرہ برس کی عمر میں ۷ رجب ۱۲۲۵ ہجری کو اُن کا عقد ہوگیا، اور اس تقریب سے دلی میں اُن کی آمد و رفت زیادہ ہوگئی۔ اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کرلی اور اخیر تک دلی ہی میں رہے۔

مرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے اَسلتے تلوں میں بسر ہوا تھا اور وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رُو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں وجاہت اور خوبصورتی کے آثار اُنکے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

دلی میں وہ قریب پچاس برس کے رہے لیکن نہ اپنے لیے کوئی مکان خریدا اور نہ بنایا۔ جب ایک مکان سے جی اُکتایا، اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ اسی طرح مطالعہ کے لیے بھی، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ آپ کتاب فروشوں کی دکان سے کرایہ پر کتابیں منگاتے تھے اور مطالعہ کے بعد کتابیں واپس کر دیتے تھے۔

مرزا نے کبھی کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تو اُنھوں نے ایک مثنوی بادِ مخالف لکھی، جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور اُنکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور دردانگیز طریقے سے بیان کیے ہیں۔

۱۸۴۲ء میں دلی کالج کے لیے ایک فارسی کے مدرس کی ضرورت تھی۔ مرزا صاحب کو مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند نے طلب کیا۔ مرزا گئے۔ لیکن اس خدمت سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اُن کا اعزاز و احترام جیسا کہ کیا جاتا تھا ملازمت کی صورت میں نہیں کیا جائے گا۔

۱۲۶۶ھ ہجری میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ، اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر دربار عام میں مرحمت فرمایا۔ اور خاندان تیموری کی تاریخ نویسی کی خدمت پر مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ مرزا نے ابتدائے آفرینش سے صاحبقران تیمور گورکان تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیرالدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک لکھے تھے کہ غدر ہوگیا اور یہ کتاب ناتمام رہی۔ البتہ مرزا نے حالاتِ غدر تحریر کیے۔

شیخ ابراہیم ذوق کے بعد بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہوگئی تھی، اور وہ

اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔

مرزا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ مرزا بدیہہ گو بھی تھے اور جو قطعہ اُنکے دیوان میں کمپنی ڈلی کے متعلق چھپا ہوا ہے وہ فی البدیہہ کہا گیا تھا۔

مرزا کو عربی میں خاصی استعداد تھی اور فارسی دانی اور عروض میں وہ کامل تھے۔ علم نجوم سے کسی قدر اور اُسکی اصطلاحات سے اُنکو پوری واقفیت تھی۔ علم تصوف سے اُنکو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُنکے مطالعہ سے گزرے تھے۔ مرزا کا خطِ نستعلیق شفیعہ آمیز نہایت پاکیزہ اور دلاویز تھا۔ اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص کر شاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا۔

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہوجاتے تھے اور اُنکی خوشی سے خوش اور اُنکے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھتے تھے۔ بیماری اور تکلیف میں بھی وہ اپنی اس عادت سے باز نہیں آتے تھے۔ مروت اور لحاظ بے حد تھا۔ اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُنکے دروازہ سے کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ سلوک کرتے تھے۔ مرزا لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھے۔ حافظہ بھی بلا کا پایا تھا اور شعر فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ حق پسند اور راست گفتار تھے۔ آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔ تاریخ وفات "آہ غالب بمرد" ہے۔ مرزا فارسی کے بڑے شاعر تھے، اور نثر اُردو میں جو طریقہ مکتوب نویسی کا اُنھوں نے ایجاد کیا اُس کا تتبع بھی آج تک کسی سے نہیں ہو سکا۔ چونکہ یہاں ہم کو اُنکی صرف اُردو شاعری اور خصوصاً غزل گوئی سے بحث ہے لہٰذا ہم اُنکے متعلق جو کچھ رائے رکھتے ہیں ذیل میں درج کرتے ہیں

غالب کے اُردو کلام پر تبصرہ

اگرچہ مرزا غالب کی اُردو شاعری اور اُنکے کلام پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن باوجود اس کے اب بھی دنیائے ہندوستان میں ایسے قدامت پرست اصحاب موجود ہیں جو لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور اُنھوں نے اپنے بزرگوں یا اُستادوں سے جو اتفاق سے ذوق مرحوم کے کلام کے دلدادہ تھے یہ سُن لیا

ہے کہ اُردو شاعری کا خاتمہ ذوق پر ہوگیا اور اس لیے اُن کا بھی یہ راسخ عقیدہ ہوگیا ہے کہ یہ رائے بلاشبہ درست اور سچا ہے۔ لیکن اگر وہ امعان نظر سے ذوق اور غالب کا موازنہ کریں تو انکو معلوم ہوجائے کہ آجکل کے تعلیم یافتہ اصحاب ہی نہیں بلکہ ہر صاحبِ ذوق یہی کہے گا کہ غالب سے ذوق کو غزل گوئی میں کوئی نسبت نہیں۔ بے شک ذوق مرحوم غزل گوئی کی استعداد رکھتے تھے لیکن ظفر کی فرمایشوں نے انکا ناطقہ بند کردیا تھا۔ اور وہ مجبور تھے کہ ایسی غزل لکھیں جو بادشاہ اور اراکین دربار کو پسند آئے۔ اور وہ لوگ صرف زبان کے چٹخارے پسند کرتے تھے اُنکو تخئیل سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چنانچہ تمام دیوان ذوق اسکی بین مثال پیش کرتا ہے۔ گنتی کے کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جو بلند خیالی کا ثبوت دیتے ہیں اور اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ ذوق میں ملکۂ شاعری ضرور موجود تھا لیکن درباری شاعر ہونے کی وجہ سے وہ جذبہ روز بروز کم ہوتا گیا اور آخرکار معدوم ہوگیا۔

ایک درباری شاعر کو اہل انگلستان نے کبھی شاعر نہ مانا۔ یہاں تک کہ ورڈس ورتھ ملک الشعرائی کی کرسی پر جلوہ افروز ہوا، اور اسکے بعد لارڈ ٹینی سن کو یہ جگہ دی گئی۔ جنھوں نے فرمایشوں سے قطع نظر کرکے اپنے جذبات کی ترجمانی کو مقدم سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرمایش پر کسی غزل یا نظم لکھنے اور اپنے جذبۂ دل سے بے اختیار لکھنے میں آورد اور آمد کا فرق ہے۔ اور اسی بنا پر ایک درباری شاعر کا کلام تصنع اور آورد سے لبریز نظر آتا ہے۔ اور قدرتی شاعر کے یہاں حسیات و جذبات کا دریا بہتا معلوم ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مرزا غالب کا کلام اول سے آخر تک یکساں نہیں ہے۔ بعض بعض اشعار ضرور مبتذل ہیں اور اُنکی شان سے بعید ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشعار کسی فرمایش کی بنا پر یا وقتی ضرورت کے لحاظ سے محض تفریح و تفننِ طبع کے لیے کہدیئے گئے ہیں، اور مرزا غالب کے قدردانوں نے انھیں بھی دیوان میں شامل کردیا ہے، مثلاً

پینس میں گزرتے ہیں جو وہ کوچے سے میرے ۔۔۔ کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

یا

کافی ہے نشانی ترے چھلّے کا نہ دینا ۔۔۔ خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

مرزا غالب نے جن اصحاب کو اپنا دیوان منتخب کرنے کے لیے دیا تھا وہ ضرور سخن فہم ہونگے لیکن اُنھوں نے اپنے انتخاب سے یہ ثابت کردیا ہے کہ بہت سا عمدہ کلام جسکو وہ مشکل سمجھتے تھے اور نظرانداز کردیا تھا اپنے اندر آسان اور عمدہ اشعار بھی رکھتا تھا اور بعض آسان اشعار جو محض زود فہمی کی بنا پر انتخاب کیے گئے نظر ثانی کرنے کے قابل تھے۔ تاہم ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور اکثر و بیشتر عمدہ ہی اشعار ہیں جو غالب کے کلام کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر دیوان غالب کے مطالعہ کا شوق اُس وقت ہوا جبکہ میں آٹھویں کلاس میں تعلیم پاتا تھا اور کثرتِ مطالعہ سے تمام دیوان غالب از بر یاد ہو گیا تھا - میں اُس وقت دیوانِ غالب کے بہت کم اشعار سمجھتا تھا لیکن بعض اوقات جب کوئی مشکل شعر خود بخود سمجھ میں آجاتا تھا تو میں اچھل پڑتا تھا اور یہ خیال ہوتا تھا کہ غالب کے دیوان میں یہ شعر پہلی ہی مرتبہ میں نے دیکھا ہے - ادھر مجھ کو دیوان غالب پڑھنے کا یہ شوق تھا اور اُدھر اپنے ہمجولیوں کو دیوانِ داغ کی تعریف میں رطب اللسان پاتا تھا - مجھکو اُس وقت اشعار کی خوبیاں بیان کرنے پر قدرت نہ تھی اور میرے ساتھی داغ کی صرف زبان کی تعریف کیا کرتے تھے اور دیگر شعراء سے صرف اسی بات کا موازنہ کیا کرتے تھے - داغ مرحوم زندہ تھے اور اُس وقت ہر مبتدی فن کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ مرزا داغ کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہو جائے جسکو دیکھو داغ ہی داغ پکارتا تھا - میں اگرچہ مرزا غالب کی شاعری کا مداح تھا لیکن اپنے دعوے کو ثابت نہیں کر سکتا تھا - ناظرین کرام میری اُس خوشی کا اندازہ فرما سکتے ہیں جبکہ ایک یا دو سال بعد میری نظر سے یادگارِ غالب گذری اور میں نے خواجہ حالی جیسے سخن شناس و سخنور کو بہ زعم خود اپنا ہمخیال پایا -

سچ یہ ہے کہ خواص نے مرزا غالب کے اُردو کلام کی ہمیشہ تعریف کی ہے اور اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے - عوام میں نہ اُنھیں مقبولیت حاصل ہوئی اور نہ آئندہ اُمید ہے کہ وہ عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کریں گے - لیکن یادگار غالب نے تعلیم یافتہ طبقہ کو دعوت دی کہ وہ کلامِ غالب کا مطالعہ کریں اور اُس سے لطف اندوز ہوں - چنانچہ ڈاکٹر اقبال سے لیکر ایک سکول کے طالب علم تک ہر شخص اُسی عجیب و غریب ہستی کے مطالعہ کلام میں مصروف ہے اور بس نہیں کرتا - شرح پر شرح لکھی جا رہی ہیں اور زمانۂ حال کے شعراء اپنے کلام کو بھی غالب ہی کے انداز پر ڈھال رہے ہیں - طرح طرح کے نسخہ دیوانِ غالب نکل رہے ہیں اور پبلک کی قدر دانی روز افزوں ہے -

اُردو کے غزل گو شعرا میں میر اور غالب کو پسند کیا جاتا ہے - میر نے عشق کو اور غالب نے فلسفۂ عشق کو بیان کیا ہے - میر کا انداز عام فہم اور آسان ہے - فلسفۂ عشق کے اظہار کے لیے زبان خواہ مخواہ دشوار اور ادق ہو جاتی ہے - اِس لیے غالب کا اندازِ بیان اگر ادق ہے تو اسکی کوئی شکایت نہیں کی جا سکتی - بلکہ غالب کے تخیل کے لیے یہی طرز ضروری اور لازمی تھا -

بعض اصحاب اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ "مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے" تو اسکے یہ معنی ہیں کہ جو علوم مشکل ہیں اُنکو ترک کر دینا چاہیے اور اسی طرح جو فن مشکل ہے اُسکو بھی چھوڑ دینا چاہیے

اگر زندگی کی یہی شکل اختیار کر لی جائے تو دنیا کبھی ترقی نہ کرے اور ادبی دنیا بھی جہاں ہے وہیں رہ جائے ایجاد اور نو آئینی ایکدم موقوف ہو جائے، ندرت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

ذوق کا مجھے ایک شعر یاد آ گیا جو بلحاظِ تخئیل نہایت اچھا شعر ہے، لیکن اُس کا طرز بیان ذوق کا سا نہیں رہا، بلکہ غالب کا رنگ آ گیا ہے۔

اُمید ہو گئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لیے

لہذا اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر لکیر کا فقیر ہونا منظور نہیں ہے تو ندرتِ بیان کے لیے طرزِ ادا ضرور مشکل اور ادق اختیار کرنا ہو گا۔ اور غالب کی تقلید لازمی کی جائے گی۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم ایسے اشعار سے خوش ہوں:۔

پانی طبیب دیگا ہمیں کیا سمجھا ہوا ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

ہم بتوں کو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے پر بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائینگے

ہمارے لیے بلند خیالی کی ضرورت ہے۔ پیش پا افتادہ مضامین ہم پر کچھ اثر نہیں ڈالتے۔

اُردو شاعری میں غالب نے فارسی تراکیب کثرت سے استعمال کی ہیں اور بہت سی ترکیبیں اُنکی خود ساختہ ہیں، لیکن تقریباً سب کی سب مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً شوخیِ تحریر، دامِ شنیدن، خمارِ رسوم، آتشِ خاموش، خانہ زادِ زلف، شبستاں، دریائے، جمع و خرچ دریا، آئینۂ انتظار، تکلف برطرف، دریا آشنا، محشرِ خیال، سلکِ عافیت، وادیِ خیال، دریائے بیتابی، گرمِ تماشا، دامِ تمنا، چشمِ صحرا، غبارِ وحشت، شیرازہ بستہ وغیرہ وغیرہ۔ ان تراکیب سے زبان میں بے حد وسعت پیدا ہو گئی ہے اور دوسروں کو بھی موقع ہے کہ وہ اِسی انداز پر اپنے اظہارِ خیال کے لیے ترکیبیں ایجاد کریں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ غالب کی فارسیت نے اُردو کے محاورہ کو بھی بدل دیا ہے، لیکن ہم اُسکو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ مثلاً

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

عذر لانا، عذر آوردن کا ترجمہ ہے لیکن یہ اُردو کا محاورہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ عذر لانے کا استعمال بالکل غلط ہے۔ نہیں معلوم غالب کے طرزِ بیان میں کیا دلکشی ہے کہ مجھے ذاتی طور پر اُس سے عشق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میر نے بہتر شعر (یا یہ تعداد دوگنی کر دی جائے) ایسے ضرور کہے ہیں کہ جنکا جواب نہیں، لیکن یہ اشعار میر صاحب کی تمام عمر کی کمائی ہیں اور اُنکے سات دیوانوں میں سے ہیں۔ غالب نے اپنے زورِ طبیعت کو فارسی کلام میں صرف کیا ہے۔ کبھی کبھی تفریحِ طبع کے لیے اُردو میں کچھ کہہ لیا ہے

اس پر یہ حال ہے کہ اُردو شاعری میں کوئی اُن کا ہمسر نظر نہیں آتا، اور الف سے ی تک تمام دیوان میں سے اگر ہنگہ شعر نکال دیے جائیں تو باقی تمام اشعار لاجواب نظر آئیں گے۔ (نسخۂ حمیدیہ کا ذکر نہیں دیوان سے وہ دیوان مراد ہے جو مرزا کی زندگی میں مرتب کیا گیا تھا)

میر صاحب فرماتے ہیں

رقع کو اُٹھا چہرہ سے وہ بُت اگر آئے   اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

کیا خوب شعر ہے۔ لیکن مرزا غالب کے حسب ذیل شعر میں کچھ اور ہی لطف ہے:

کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

میر صاحب کا ارشاد ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا   عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

فی الواقع یہ شعر دل پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے لیکن غالب اپنے مصائب کا حال اس طرح بیان کرتا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

یعنی مجھ پر وہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے کہ ایک دل کا کام نہیں جو اُسے برداشت کر سکے۔

کوئی اور شاعر کیا یہ شعر کہہ سکتا تھا؟

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں   ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اور اگر کہتا تو ہرگز اس طرح نہ کہتا۔ غالب کی خصوصیت یہی کہ بات میں سے بات پیدا کرتا ہے اور طرز ادا میں وہ جدت ہوتی ہے کہ معمولی بات بھی دلکش ہو جاتی ہے اور نئی معلوم ہوتی ہے۔ کیا کسی شاعر کے یہاں ایسا شعر مل سکتا ہے

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق؟   ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

ہمارے آسان فہم معترضین تو اس شعر کو بھی مہمل قرار دیتے اگر مولانا حالی خود مرزا غالب سے اس کا مطلب نہ دریافت فرماتے۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اُردو شاعروں میں غالب جیسا کہ اُن کا تخلص ہے سب پر غالب ہیں اُنکے آسان اور دشوار دونوں طرح کے کلام کا انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین اُس سے شاد کام ہوں:

کلام ادق

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

۲۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
۳۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا
۴۔ دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
۵۔ اسد یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے — جسے تو بندگی کہتا ہے دعوےٰ ہے خدائی کا
۶۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
۷۔ حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل — جہاں ساقی ہے تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
۸۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
۹۔ غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا
۱۰۔ رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
۱۱۔ کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
۱۲ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
۱۳۔ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
۱۴۔ دریائے معاصی تُنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
۱۵۔ گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
۱۶۔ جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟ — دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
۱۷ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے، عالم کے اجزائے پریشاں کا
۱۸۔ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
۱۹۔ رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
۲۰۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا
۲۱۔ بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
۲۲۔ دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
۲۳۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
۲۴۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
۲۵۔ ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
۲۶۔ لے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

۲۷۔ شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

۲۸۔ کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

۲۹۔ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

۳۰۔ نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

۳۱۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

۳۲۔ یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

۳۳۔ گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

۳۴۔ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

۳۵۔ میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ "یوں"

۳۶۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

۳۷۔ ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو، اہلِ نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

۳۸۔ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

۳۹۔ آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

۴۰۔ کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم!
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

۴۱۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

۴۲۔ قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں؟

۴۳۔ حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

۴۴۔ ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

۴۵۔ مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

۴۶۔ وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

۴۷۔ ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم، مگر تمہید جانے کی

۴۸۔ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے

۴۹۔ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

۵۰۔ ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۵۱۔ ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

۵۲۔ کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی — ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو، فرصت روانی کی

۵۳۔ رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، مے خانہ خالی ہے

۵۴۔ سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

۵۵۔ کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم — کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

۵۶۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ شاید یہ بھی میرے دل میں ہے

۵۷۔ تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

۵۸۔ ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

۵۹۔ جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

۶۰۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

۶۱۔ پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟ — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

۶۲۔ کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

۶۳۔ منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

۶۴۔ اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

۶۵۔ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

۶۶۔ خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

۶۷۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یا رب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۶۸۔ میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی — تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

۶۹۔ نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے — رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

۷۰۔ بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

۷۱۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر! — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

۷۲۔ مثال یہ مری کوشش کی ہے، کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

سہلِ ممتنع

۱۔ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

۲۔ میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے — عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

۳۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا؟

۴- یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
۵- کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی؟ جو جگر کے پار ہوتا
۶- کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
۷- میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
۸- دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا
۹- لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا
۱۰- یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُنکو، جو نہ دے مجھکو زباں اور
۱۱- آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
۱۲- ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
۱۳- آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟ — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
۱۴- آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
۱۵- زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
۱۶- مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
۱۷- لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
۱۸- ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
۱۹- نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
۲۰- کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
۲۱- وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُنکو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
۲۱- نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
۲۳- نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے، راتیں اُسکی ہیں — تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہوگئیں
۲۴- اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
۲۵- دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
۲۶- طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
۲۷- ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
۲۸- واں کر کیجیے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

۲۹ - جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید / مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
۳۰ - سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست / لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
۳۱ - کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو / نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
۳۲ - مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں / خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی
۳۳ - ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ / مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے
۳۴ - آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا / ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
۳۵ - اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی / سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
۳۶ - مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟ / اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
۳۷ - قطع کیجے نہ تعلق ہم سے / کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
۳۸ - اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ / ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
۳۹ - ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی / اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
۴۰ - ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام / ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
۴۱ - کوئی اُمید بر نہیں آتی / کوئی صورت نظر نہیں آتی
۴۲ - آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی / اب کسی بات پر نہیں آتی
۴۳ - جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد / پر طبیعت ادھر نہیں آتی
۴۴ - ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں / ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
۴۵ - جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود / پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
۴۶ - ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید / جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
۴۷ - بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ / کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
۴۸ - پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے / اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
۴۹ - تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں / تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
۵۰ - پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا / اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
۵۱ - رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل / جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے
۵۲ - میری قسمت میں غم گر اتنا تھا / دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے
۵۳ - اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق / وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

۵۴- عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا / ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
۵۵- منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید / ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
۵۶- عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ / کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
۵۷- فریاد کی کوئی لے نہیں ہے / نالہ پابندِ نے نہیں ہے
۵۸- ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی / ہرچند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
۵۹- سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے / کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
۶۰- کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر / پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
۶۱- بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ / کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
۶۲- نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن / بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
۶۳- واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو / کیا بات ہے، تمہاری شرابِ طہور کی
۶۴- گو، واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں / کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
۶۵- تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے / تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
۶۶- کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب / سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
۶۷- مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے / جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
۶۸- کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو / عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
۶۹- پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق / سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
۷۰- جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن / بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
۷۱- زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا / کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
۷۲- ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا / صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

محمد یحییٰ تنہا بی اے، ایل ایل بی

رسید کتب

عربوں کا تمدن - (مترجمہ سید نذیر نیازی بی اے (جامعہ)) اُردو اکاڈمی دہلی عگار

ذکرِ میر فارسی (میر تقی میر) انجمن ترقی اُردو عگا

نظرے خوش گزرے

دو سال ہوئے کہ ہندوستانی اکیڈمی کی تاسیس حکومت صوبجات متحدہ کے زیر غور تھی۔ ایک کرمفرما نے جن کو اکیڈمی کی تنظیم میں خاص دخل تھا، راقم الحروف کو بھی دعوت شرکت دی۔ اور خدمت گزاری اُردو کے غائبانہ شوق سے متاثر ہوکر اکیڈمی کا نظام اساسی دیکھنے سے قبل ہی ان کرمفرما کی دعوت قبول کرلی گئی۔ مگر جب اُس کا مسودہ وصول ہوا تو مناسب خیال کیا گیا کہ اس بارے میں مہاتما گاندھی سے بھی مشورہ کرلیا جائے کہ مبادا اس میں شرکت ترک موالات کے اصولوں کے منافی ہو۔ مہاتما جی نے اُس مسودہ کو ملاحظہ فرمانے اور کافی بحث وغور کرنے کے بعد بالآخر یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اکیڈمی میں شرکت تارکین موالات کے لیے جائز نہیں اور اس بنا پر میں نے اپنے کرمفرما سے اپنی معذرت کا اظہار کردیا۔

یہ فیصلہ دو سال ہوئے کیا گیا تھا۔ اسکے بعد اکیڈمی قائم ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اُسکا کاروبار جاری ہے۔ اس اثنا میں جو حالات بعض احباب کے ذریعہ سے معلوم ہوئے اُنکی بنا پر ماننا پڑتا ہے کہ مہاتما جی کی رائے نہایت صائب تھی۔ اور دلی مسرت ہے کہ اُنکے دانشمندانہ مشورہ کو قبول کرکے میں اس سرکاری ادارہ سے علٰحدہ رہا۔ جن بعض احباب نے کسی مصلحت سے اکیڈمی میں شرکت گوارا کرلی تھی امید ہے کہ وہ بھی اب زیادہ دنوں اُس سے وابستہ نہ رہ سکیں گے بشرطیکہ ترک موالات کی تحریک کے ساتھ اُنکو اب بھی وہی شیفتگی و دلچسپی باقی ہو جسکا اس سے قبل مظاہرہ ہو چکا ہے

سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہو کر بھی ادب کی خدمت کے کافی مواقع حاصل ہیں۔ انجمن ترقی اُردو، دارالمصنفین، انجمن اُردو، اور اردو اکیڈمی کے علاوہ اب ایک خالص سیاسی ادارہ بھی قائم ہو گیا ہے اور ان سب مجالس کو مخلص و سرگرم خدمتگزاروں کی ضرورت ہے۔ کاش حکومت کے خزانہ کا سہارا ڈھونڈھنے کے بجائے ہمارے احباب خود اپنے اور اپنی قوم کے وسائل پر اعتماد کریں اور سرکاری اداروں کو اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنکا مطمح نظر یا طریق کار آزادانہ جدوجہد سے موافقت نہیں رکھتا۔ بے شبہہ حکومت کی دولت و اقتدار کے سایہ میں رہنے والوں کیلیے جو عافیت و منفعت ہے آزاد قومی اداروں میں اُسکا سامان فراہم ہونا محال اگر نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن منافع کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں میں مضرت کے جو پہلو ہیں اُن سے تو بہرحال نجات رہیگی۔

اور یہ بھی تیسرے باب مین معلوم ہو چکا ہے کہ اون عدالتون مین ارباب جیوری نہین بیٹھتے ہین صرف حکام اپنی راے سے مقدمات فیصلہ کرتے ہین مگر بعد وہان اوٹھا لیجانے کے ... معلوم ہوا کہ اوس عدالت مین مقدمہ کا لیجانا نامناسب ہوا۔ انفصال اوس کا ارباب جیوری ہی کے سامنے مناسب تھا اور جس جلدی کے واسطے مقدمہ اوٹھا لیگئے تھے وہ بھی ظہور مین نہ آئی یعنی اوس طرح مین وہان بھی حکم اخیر اوس مقدمہ مین نہ ہوا۔ دوسرے طرح مین جب پیش ہوا وہان کے حکام نے یہ تجویز کیا کہ مقدمہ مین جعل اور فریب خواہمخواہ ہے مگر مدعی اوس مقدمہ کا اوس جعل اور فریب سے آگاہ نہ تھا اور چونکہ اوس نے محض میرے اعتماد پر روپیہ دیا اس واسطے مجھ پر لازم ہے کہ مدعی کا روپیہ ادا کرون اور میرا مواخذہ جعلسازون سے چاہیے اور اوس حاکم کو جس نے اور چار تمسک باطل کر دیے تھے اون کو وہان کے حاکمون نے حکم دیا کہ جعلسازون کی نسبت میرے واسطے جو مناسب جانین حکم دیوین اوس حاکم کی راے مین جیسا اون کی تجویز سے معلوم ہوا وہ حکم انصاف کے خلاف ہوا مگر چونکہ اوس حاکم پر وہان کے حکام بالا تھے اصل تجویز مقدمہ مین کچھ دخل نہ کر سکا مگر حکم دیا کہ جس قدر اوس عدالت سے میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے وہ کل میرے حق مین جعلسازون پر ڈگری ہو لیکن کیا فائدہ اول تو جعلساز مفرور تھے اور وہ مفلس بحت تھے اور وہ سارا اونکا طمطراق اوسی جعل اور فریب کے روپیہ سے میری ادا اور لوگون کے شکار کرنے کے واسطے تھا اوس اس مقدمہ کے فیصلہ کے بعد وزیر ہندوستان نے دفعتہً میری امانت سے ہاتھ کھینچ لیا ہر چند مین نے شور اور شغب کیا کہ صرف تمہارے روکنے سے مین یہان ٹھہرا اگر پہلے مقدمہ کے فیصلہ ہونے کے بعد مین یہان سے چلا جاتا تو کوئی میرا دامنگیر نہ تھا اس واسطے کہ اوس مقدمہ کی تجویز ثانی بھی تین چار مہینے کے بعد منظور ہوئی تھی مگر کسی نے کچھ نہ سنا۔ دوسری مصیبت میرے اوپر یہ ہوئی کہ تیس چالیس ہزار روپیہ کا میرا اسباب چوری ہو گیا چاندی اور سونا اور عمدہ عمدہ لباس کشمیری اور ریشمی فرنگی اور

عدالت سے حکم ہوا کہ مدعی کا روپیہ ادا کرے اور میرا مواخذہ جعلسازون سے چاہیے

جعلسازون پر میری ڈگری ہوئی مگر وہ مفرور اور مفلس تھے

وزیر ہندوستان نے میری امانت سے ہاتھ کھینچا

تیس چالیس ہزار روپیہ کا مال اسباب چوری ہو گیا

بہت کچھ زیورات جو مین نے تحائف کے واسطے جمع کیا تھا سب لٹ گیا چور پکڑے گئے ایک مدت تک اوس کے بکھیڑے مین راقم رہا اونکو سات سات برس کی قید ہوئی مگر دو چار چیزون کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ تیسری مصیبت یہ ہوئی کہ کچھ حصے ہندوستان کی ریلوے کے قریب ساٹھ ستر ہزار روپیہ کے مدت سے میرے قبضے مین تھے اوس کے منافع پانچ روپیہ سیکڑے کے جو تھے وہ کلکتہ مین اپنے اہل وعیال کے مصارف کے واسطے ادا کر دیے تھے وکلا کو اوس سے اطلاع ہو گئی اور وزیر ہندوستان نے خلاف وعدگی کر کے میری اعانت سے دست برداری کی وکلا نے وہ سب حصے بکوا کے تصرف کر لیا۔ کچھ تھوڑا سا اسباب رہا سہا تھا وہ بعضے دوستی اور محبت و دلنوازی کے فریب مین گیا کہ وہ دوسری اور تیسری ڈکیتی وہان ہوئی ہندوستان مین غدر کے ایام مین جو غدارون نے چھوڑا وہ سرکاری فوج نے لوٹ لیا کچھ مکانات میرے اکبر آباد مین تھے وہ یہان کے حکام نے نیلام کر ڈالے اوس کا قصہ بہت طول ہے حالانکہ ایک دفعہ ہندوستان کے وزیر نے حکم دیا کہ وہ نیلام ناانصافی کا ہے مگر اب بھی یہان کسی نے نہ سنا اب مین ہندوستان اور انگلستان دونون جگہہ مفلس بحت ہو گیا نوبت غریب فاقہ کشی کے پہونچی اس حالت مین جب مین نے بہت شور و شغب مچایا تب ایک بڑے جلیل القدر افسر نے وزیر ہندوستان کی کچہری کے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حتی المقدور سرکار بلند اقتدار کی بدنامی مین کچھ قصور نہین کیا بادشاہ کے مقدمہ مین کتابین چھاپ چھاپ کے سارے عالم مین سرکار کو رسوا کیا اب کا ہے کس منہ سے امید اپنی رفاہ کی رکھتے ہو اس کے ساتھ اب یہ بھی مجھے یقین ہو گیا کہ ارباب اقتدار یہ بھی نہین چاہتے کہ مین ہندوستان مین جاؤن اس گمان سے کہ شاید پھر بادشاہ کو آمادہ پارلیمنٹ مین استغاثہ کا کرون جب وزیر ہندوستان سے درخواست کی کہ اب میری نوبت یہان فاقہ کشی کی آئی میری رہائی کرائیے وہان سے یہ جواب ہوا کہ وہ مدعی جس کی میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے اوس کی تحریری اجازت داخل کرون

دوستانہ اور آشناؤن اور اہل غرض لوگون سے دغا اور بعض اور لوگون نے

ایک بڑے افسر عہدہ وزیر ہندوستان کی کچہری نے مجھے لکھا کہ سرکار کی بدنامی مین سارے عالم مین قصور نہین کیا مجھ کو سرکار سے کیون امیدوار ہے ہو گیا کہ ارباب

ارباب اقتدار کی یہ بھی مرضی نہین کہ مین ہندوستان مین جاؤن

تب قرض بھی میرا ادا کیا جائیگا اور جہاز کی سواری کی بھی اجازت دی جائیگی۔ اور حالانکہ وہ
مدعی مجھسے خواستگار اپنے دعوے کا نہ تھا اور اوس نے بھی مکرر عرایض وزیر ہندوستان کو
اس مضمون کے گذرانے تھے کہ حقیقت مین اوس کا دعوے اودھ کے بادشاہ پر ہے اس سبب
سے کہ اون کے مقدمہ کے خرچ کے واسطے روپیہ اوس نے دیا تھا سفیر کی ذات کے واسطے نہین
دیا اور وزیر ہندوستان پر ہے اس سبب سے کہ اونھون نے برابر اس مقدمہ مین اعانت روپیے اور
تدابیر سے بادشاہ کے سفیر کی کی ہے اسواسطے اوس کو امید ہے کہ وہ روپیہ ادا کرین۔ مگر جب
وزیر ہندوستان نے مجھے اجازت تحریری مدعی کی پیش کرنے کا حکم دیا راقم نے مدعی سے درخواست
کی کہ تم اپنی ڈگری میرے اوپر جاری کرواؤ تو مجھے کچھ چارہ نہین ہوگا بجز اسکے کہ مین انسالونسی کی
درخواست گذرانون جس کو ہندوستان کی اصطلاح مین دیوالہ نکالنا کہتے ہین اور اگر میرے اوپر
جاری کروانا ڈگری کا منظور نہین ہے تو اجازت تحریری مجھے دیدو کہ میری یہان سے نجات ہو۔
اوس نے کہا کہ نہ بالفعل مجھے تمہارے اوپر ڈگری جاری کرانا منظور ہے اور نہ مین تحریری اجازت
دونگا اور اگر تم چلے جاؤگے تو مین تمھین نہین روکونگا۔ اب راقم نے اپنے وکلا سے کہا کہ ہزارون
روپیہ تم میرا لے چکے ہو اب کچھ ایسا سامان کردو کہ مین یہان سے روانہ ہوجاؤن۔ بہزار دشواری قرض
ایک ہزار روپیہ کے اونھون نے تدبیر کی اوس روپیہ سے راقم نے ایک فرانسیس کی کمپنی سے
جس کے جہازات ہر مہینے مین ایک دفعہ مسافرون کو ہندوستان مین اور چین مین پہونچاتے
ہین اوس کمپنی سے بندوبست کیا جس کے ذریعہ نومبر ۱۸۶۳ء مین راقم لندن سے روانہ ہوا
چار دن ریل کا خشکی مین سفر ہوا اور سات دن دریا مین پارس اور مارسلیس کے راستہ سے
گیارھوین دن بلدہ اسکندریہ مین راقم پہونچا تین چار صندوق کچھ ضروری پوشاک اور چند کتابون کے لیکے
وہین اسکندریہ تک کرایہ کیا تھا اور ارادہ تھا کہ مفلسانہ وہان سے مکہ معظمہ مین جاؤن اسواسطے کہ جن

راقم کی روانگی لندن سے ماہ نومبر ۱۸۶۳ء مین

سہ ہماری شریعت کی اصطلاح مین جب کسی شخص کے پاس کچھ باقی نہ رہے اور قرضخواہ اوس کے بہت ہون تب ایک
قاعدہ ہے کہ قاضی اوس کا افلاس مشہور کرتا ہے اس حکم سے کہ اگر کوئی شخص فلانے شخص کو قرض دیگا۔ اوسکا دعوے
یہان نہ سنا جائیگا اس کو تفلیس کہتے ہین انسالونسی جو انگریزی قانون مین ہے اوس کے قریب ہے۔

نجاسات مین راقم مبتلا تھا بغیر زمزم سے دھونے کے طہارت ممکن نہ تھی۔ اگرچہ میرے عقیدہ مین
لنڈن مین کچھ نجاست نہ تھی میرے اپنے حرکات موجب نجاست تھے جس وقت مین اسکندریہ مین پہونچا
تیس چالیس روپیہ نقد میرے پاس باقی تھے اور گھڑی وغیرہ کئی سو روپیہ کا مال بھی تھا کہ مصر مین اگر
مین بیچتا تو گیارہ بارہ سو روپیہ کو وہ مال بکتا تھا۔ اب یہان کوئی چار سو روپیہ کو بھی نہین پوچھتا۔ ارادہ یہ تھا
کہ دس بارہ روپیہ مین اسکندریہ سے بندر سویس تک ریلوے کے ذریعہ سے پہونچون گا اور سویس سے
کوئی بغلہ دس پندرہ روپیہ مین جدہ تک پہونچا دیگا اور جس وقت جہاز اسکندریہ مین پہونچا اوس وقت
راقم نے بہ نیت صادق اور خالص بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی اور پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعہ گردانا اور عرض کیا کہ اب مین نے اپنے تئین خدا اور رسول کی
مہمانی مین سپرد کیا جس طرح سے ہو مجھکو بیت اللہ اور مدینۃ النبی مین پہونچائیے۔ کچھ شبہ
نہین ہے کہ اس روسیاہ کی دعا تیر بہدف ہوئی اور خدا اور رسول نے ایسی مہمانی کی کہ
جس کا مطلق وہم اور گمان بھی نہ تھا یعنی باوصف اس افلاس کے مثل امرا اور دولتمندون

راقم کا بہ نیت خالص اپنے تئین خدا اور رسول کی مہمانی مین سپرد کرنا اور منظور ہونا اوس مہمانی کا

کے دو حج کروائے اور چھ مہینے اقامت مدینۃ النبی مین میسر ہوئی کیا اوس کا سامان باندھا جو وہی
عَسٰی اَنۡ تَکۡرَھُوۡا شَیۡئًا وَّھُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ہوا۔ دستور ہے کہ جب جہاز پر چڑھتے ہین تو صندوقون پر
(ترجمہ: کم بعض چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے حق مین بہتر ہے)
اسباب کے نام و نشان جہان تک اسباب جائیگا لکھ دیتے ہین۔ بعضے اتفاقیات سے مارسلیس
مین جہاز پر مین اوس وقت پہونچا جب اوس کا لنگر اوٹھتا تھا مہتمین نے جھٹ پٹ
صندوق اوٹھا کے مخزن مین پھینک دیا اوس پر نشان لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ صندوق
اسکندریہ مین اوترین گے۔ اور اوس جہاز پر چین کے مسافر بہت تھے جب لنگر ہوا مین جہاز
پر منتظر کھڑا رہا کہ میرے صندوق خزانہ سے نکلین تو پہچان کے مین لے لون۔ لوگون نے کہا
گھاٹ پر چلو وہین اسباب آتا ہے وہان لے لیجیو۔ گھاٹ پر مین پہونچا تو شام ہو گئی وہان لوگون
نے کہا اب اندھیرے مین اسباب نہیں مل سکتا۔ اس وقت جا کے کہین اقامت کرو صبح کو آکے
اسباب لے جانا۔ مین تو شہر مین چلا آیا اور وہان اسباب رات ہی کو چین کے مسافرون کے ساتھ

گم ہونا اسباب کا غلطی سے جہاز مین اور رد ہونا

ریل پر لد گیا صبح کو پھر گھاٹ پر پہونچ کے اسباب ڈھونڈھا کہین نہ ملا جہاز کی کمپنی کے مہتمم جو اسکندریہ
مین تھے اون کے پاس جا کے ظاہر کیا اونھون نے اوسی وقت قاہرہ مین اور سویس مین ٹیلیگراف
کے ذریعہ سے خبر بھیجی کہ اس اس طرح کے صندوق فلانے مسافر کا اسباب ہے وہ آگے نہ بڑھے
جہان پہونچے وہین روک لو اور مجھ سے کہا تم قاہرہ مین جاؤ تمکو اسباب وہان ملیگا راقم قاہرہ مین آیا
اور وہ اسباب سویس مین بھی نہ روکا جہاز پر لد کے چین کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب میرے پاس
وہی کپڑے جو بدن پر تھے وہ رہ گئے اور ایک باگ یعنی چمڑہ کا ایک بٹوہ رہا جو میرے گلے مین
تھا اور تیس چالیس روپیہ کی انگریزی اشرفیان اور ایک سونے کی گھڑی وغیرہ جس کا مین نے اوپر
ذکر کیا مصر مین گیارہ بارہ سو روپیہ اوسکے ملتے تھے وہ بھی اوس بٹوہ مین تھی جب مین اسباب سے
مایوس ہوا تب انگریزی کنسل یعنی بالیوز جو قاہرہ مین وکیل التجارت تھا اوسکے پاس گیا ان بالیوزون
کا یہی کام ہے کہ جس سلطنت کا بالیوز ہوتا ہے اوس سلطنت کی رعایا کے انفس اور اموال کا محافظ
رہتا ہے اوس سے اپنی مصیبت کا حال بیان کیا پہلے اوس نے کہا کہ ہم کس طرح سے جانین کہ
تم سلطنت برطانیہ کی رعایا مین ہو۔ اتفاقاً لندن سے روانہ ہوتے وقت راقم نے وزیر ہندوستان
کو ایک چھٹی لکھی تھی کہ میری یہان سے نجات کروا دیجیے اونھون نے اوسکے جواب مین یہی
لکھا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اپنے مدعی کے پاس سے تحریری اجازت داخل کرو تو تمھاری
اعانت ہو وہ چھٹی اوسی کیسہ مین چمڑے کے تھی . . . وہ چھٹی مین نے دکھائی اوس کو دیکھکے وہ مطمئن ہوا اور
جہاز کی کمپنی کے لوگون سے مواخذہ شروع کیا کہ فلانے شخص کا اسباب منگوا دو اور جب تک
اوس کا اسباب نہ آویگا دس روپیہ روز اوسکے خرچ کے واسطے اور جو کچھ نقصان توقف اور تاخیر سے
بیان ہوگا وہ سب تم کو دینا پڑیگا۔ اب ایک اور اتفاق عجیب ہوا کہ شب کو راقم قاہرہ
مین ایک فرنگی مہمان سرا مین جا کے رہا تین چار اشرفی انگریزی جو بٹوہ مین میرے پاس
تھین وہ کسی نے چورا لین اب میرے پاس ایک حبہ نہ رہا جو روزمرہ کے خرچ کو کافی ہو
مین نے بالیوز سے کہا کہ مین کس طرح سے بسر کرون اوس نے اپنے میر منشی کے ہمراہ

کچھ تھوڑا سا روپیہ نقد میرے پاس تھا وہ
رات کو جہاز مین کسی نے چورا لیا

مصطفیٰ پاشا قاہرہ کے گورنر کے پاس بھیجدیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جو
اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کے اقربا اون مین تھے کہ سلطانی مسافرخانہ مین ان کو بھیجدو سلطان کی طرف سے
ہر شہر مین مسافرخانہ ہین بہت عمدہ مکانات نہایت تکلف سے فرش و فروش سے آراستہ
ہر قسم کے خدام خدمت کے واسطے اگر سواری کی حاجت ہو گھوڑے کی گاڑیان
سواری کی۔ کھانا پینا بہت عمدہ سرکاری مگر وہان صرف عمایداور امرا اور شاہزادے
جو مسافرانہ اوس شہر مین وارد ہوون اقامت کرتے ہین۔ عام مسافرخانے نہین ہین مصطفیٰ
پاشا نے فوراً مجھکو وہان بھیجدیا۔ اب یہ پہلا اثر میری اجابت دعا کا تھا کہ کس خوبصورتی
سے خدا اور رسول نے میری مہمانی کی مصر کے ممالک مین یہان سرائین ہین قہوہ خانے
ہین کہ وہین لوگ اقامت کرتے ہین دو تین دن اسکندریہ مین او قاہرہ مین اون قہوہ خانون مین
راقم رہا پسؤون کی کثرت سے مطلق نیند نہ آئی اور فرنگی ہوٹل انگریزی اور فرانسیسی اور اطالیاتی جو وہان
ہین وہ البتہ بہت پاک وصاف رہتے ہین لیکن اسکندریہ مین جب جہاز پہونچا اور مین نے دعا کی
جس کا مین نے ذکر کیا اوس وقت یہ بھی نیت کی تھی کہ اب فرنگی کھانے پینے سے مین احتراز کرونگا
جب قہوہ خانون مین وہ تکلیف ہوئی اور مین پھر فرنگی ہوٹلون مین جانے کے لیے مجبور ہوا تو مجھے
نہایت ملال ہوا کہ اللہ تعالے کی مرضی نہین ہے کہ مین اس بدنامی سے بچون اس واسطے کہ اون
سب ہوٹلون کا دستور ہے کہ کوئی اونکے یہان کھانا پینا کھائے یا نہ کھائے وہ کرایہ مع مصارف
کھانے پینے کے مجرا لیتے ہین اور میرے پاس گنجایش بھی مصارف کی نہ تھی اور ظاہر ہے اگرچہ شرعاً
وہان کے کھانے پینے مین کچھ قباحت نہ تھی اور مصر کے لوگ سب باہم مختلط تھے مگر راقم نے اپنے ہندستان
کے دستور کے موافق باقتضاے اِتَّقُوا مِن مَوَاضِعِ التُّهَمِ (تہمتون کی جگہ سے پرہیز) عزم احتراز کا کیا تھا اس سبب سے
دل مین بہت ملال پیدا ہوا کہ نقض عہد کرنا پڑا جناب اقدس الٰہی نے وہ سامان کر دیا کہ ہر اتب فرنگی
ہوٹلون سے زیادہ وہان آسایش ہوئی اور میرا اسباب چھ مہینے کے بعد سیلان یعنی سراندیپ مین
پہونچ کے وہان سے پھر کے آیا اور مین اسکندریہ مین اواخر جمادی الثانی ۱۳۰۸ مین پہونچا تھا اور

[illegible]

ذیقعدہ اوسی سال تک قاہرہ مین اور وہان رہا ان مسافرخانون مین جو آسایش پائی اوس کے ادا سے شکر کی زبان کہان ہے خصوص ماہ مبارک رمضان مین افطاری اور کہانا اور سحری کس کثرت سے آتی تہی عمدہ عمدہ کہانے میٹہے اور سلونے ترکی آتے تہے جو راقم اکیلا تن تنہا کہا پیتا تہا وہی خرچ تہا باقی سب مسافرخانہ کے خدام کو نصیب ہوتا تہا اوسی عرصہ مین قاہرہ کے بالیوز نے میری درخواست پھر وزیر ہندوستان کے پاس بہیجی اور میری زحمت اور تکلیف سے اطلاع دی۔ ظاہر مین پہلے اونہون نے انکار مطلق میری اعانت سے کی مگر بالیوز کو خدا جانے کچھ مخفی کیا لکہا آیا کہ وہ مجھ سے اصرار کرتا تہا اور کہتا تہا کہ تم اب ہندوستان مین نہ جاؤ وہان تم جا کے خوش نہ ہوگے قسطنطنیہ کا سفر کراؤ وہین کچھ فکر اپنے معاش کے پیدا کرنے کی کرو مجھ سے جو اعانت ممکن ہے وہ کرونگا۔ مین نے جواب دیا کہ مین حج کرآؤن پھر جیسا مناسب ہوگا وہ کرونگا اور اوسی بالیوز کی معرفت وہی گھڑی وغیرہ اپنا اسباب پانسو روپیہ پر مین نے رہن کیا جسکے سبب سے چھ مہینے مصر کے ایام قیام مین سب اپنے مصارف بالائی امیرانہ مین کرتا رہا اور وطن مین اپنے عزیزون کو اطلاع کی کہ جلد میری کچھ اعانت کرو تاکہ مین وطن مین پہونچون اور جب اسباب سب سراندیپ سے پھر کے آیا تو کچھ تھوڑا سا پشمینہ باقی رہ گیا تہا اور پانسو روپیہ جو اسباب رہن کرکے ہاتھ آئے تہے وہ سب خرچ ہوگئے اب ذیقعدہ کی پچیسوین یا چھبیسوین راقم نے ارادہ جدہ کی روانگی کا کیا اوسی انگریزی بالیوز نے خدیو مصر کا حکمنامہ ایک جہاز بخاری پر جو مصری جہاز سویس سے جدہ تک آتے جاتے ہین اور ایک ریلوے کے مہتمم پر جو قاہرہ سے سویس تک تہی لکہوا کے منگوا دیا۔ الغرض راقم بہت آسایش سے پہلے درجہ کی ریل پر سویس تک پہونچا وہان دو تین دن توقف ہوا پھر جہاز پر سوار ہوا چوتھی یا پانچوین ذی الحجہ کی جدہ مین پہونچا اور وہان سے ایک دن یا دو دن پیشتر اون کے جس دن امیرالحاج عرفات کی طرف روانہ ہوگا مکہ معظمہ مین داخل ہوا وہ قلیل پشمینہ قاہرہ مین ڈیڑھ یا پونے دو سو

شاید قسطنطنیہ ... [illegible] ... میری بہاری اعانت کرینگے
کچھ عجب نہیں کہ ... ہندوستان مین ... [illegible]
... وزیر ہند کے خفا ہونے سے ... [illegible]

واسطے اون دونون کے جو جہاز بخاری کے واسطے [illegible]
انگریزی بالیوز نے خدیو مصر سے ... [illegible]

روپیہ کو پہنچا تھا کہ جہاز کے اور ریل کے کرایہ کے سوا اور مصارف بالائی مین کام آئے تین چار روپیہ
میرے پاس باقی تھے۔ اب نہایت تشویش ہوئی کہ وہ سفر حج کے واسطے کافی نہ ہون گے
اگرچہ بہت سے لوگ وہان اہل تعارف سے موجود تھے جن سے درخواست قرض کی کیجاتی روپیہ
مل جاتا مگر حمیت اور غیرت مجاز کسی سے طلب کے نہین کرتی تھی۔ مجبوری سے ایک بڑے تعلقہ دار
علیگڈھ کے علاقہ کے وہان مہاجر ہو کے رہے ہین اون کے پاس مین گیا کہ اون سے کچھ قرض مانگونگا
وہان پہونچ کے پھر حمیت مقتضی طلب کی نہ ہوئی اور ذہن مین یون گذرا کہ مفلسانہ پیادہ پا چل کے
حج کرو کسی سے کچھ طلب نہ کرو یہ دل مین تصور کر کے اوٹھ کھڑا ہوا۔ اوسی وقت ایک شخص نے آکے
خبر دی کہ جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مغفور کے پاس ایک ہزار روپیہ کی ہنڈوی میرے گھر
سے میرے مصارف کے واسطے آئی ہے مولوی صاحب ممدوح حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ
کے نواسہ مولوی اسحاق صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی وہان مہاجر ہو کے جا رہے تھے اور سارے
اہل ہند کے بہت سے امور مین حاجت روا رہتے تھے اور راقم جا کے اونھین کے گھر مین فروکش ہوا
تھا الغرض اس روپیہ کے پہونچنے سے جو وہ ایک اور اثر میری اجابت دعا کا تھا راقم نے نہایت آسایش سے
جا کے حج کیا اور حج سے فراغت کر کے اواخر محرم ۱۲۸۱ھ مین مدینہ منورہ کی عزیمت پر روانہ ہوا جو قافلہ ہ یہاں سے کچھ عبارت چھوٹ گئی ہے۔
حج کر کے وہان جاتا ہے دستور ہے کہ اکثر آٹھ روز وہان اقامت رہتی ہے تاکہ چالیس نماز جو حدیث
شریف مین واقع ہوئی ہین وہان ادا کرین راقم نے جو روپیہ وطن سے آیا تھا نصف اوسمین
جناب مولوی یعقوب صاحب ممدوح کے پاس امانت رکھا اور نصف لے لیا کہ حج کے سفر مین اور مدینہ
منورہ کے سفر مین خرچ کرونگا اس نیت پر کہ وہ نصف بقیہ معاودت کے واسطے ہندوستان مین کافی
ہو ہلال صفر کا شاید مکہ معظمہ یا مدینہ شریفہ کے راستہ مین دیکھا گیا دوسرے یا تیسرے دن مکہ معظمہ سے
روانگی کے مین قضاے حاجت کے واسطے اونٹ پر سے اوترا ساربان جو بدوی لوگ ہین اون کا
عجب دستور ہے کیسی ہی ضرورت ہو قافلہ سے جدا کر کے ایک اونٹ کو نہین ہونے دیتے مین تو قضاے حاجت کے واسطے
جو اوترا اونٹ میری سواری کا کہ نہیں مین قافلہ سے الگ ہو گیا پھر قافلہ مجھے نہ ملا مین جنگل مین ادھر اودھر پایا دہا

آخر بس کئی شیخ بدویون کے یہ خبر سن کے میری تلاش کے واسطے نکلے کہ وہ اونکا ایک شکار تھا اونمین سے ایک شیخ مجھے پکڑ لیگیا راقم کے پاس جیب مین چند ریال تھے۔ وہان مشہور ہے کہ بدوی لوگ جس قافلہ گم کردہ کو پکڑ لیجاتے ہین صرف کپڑے وغیرہ جو اوسکے پاس ہین چھین نہین لیتے بلکہ اوس کو قتل کر ڈالتے ہین یا کہین بیچ لیتے ہین سر رستہ مین اوس شیخ نے جب مجھے پکڑا مین نے کہا میرے پاس یہ چند ریال ہین اور میرے کپڑے ہین یہ لیلو اور مجھے قافلہ مین پہونچا دو۔ اوس نے کہا نہین تم ہمارے ساتھ چلو مین نے کہا کیا تم کو میرا خون ناحق کرنا منظور ہے اسکے جواب مین اوس نے کہا استغفراللہ ایسا ہم نہین کرینگے رستہ مین اور دو تین شیخ اونٹون پر سوار آکے اون کے شامل ہوگئے اون کو یہ شیخ جو میرے میزبان تھے شریف کہتے تھے یعنی وہ سید تھے۔ غرض وہ شیخ مجھے اپنے خیمہ صحرائی مین لیگیا اور دہان پہونچ کے ایک شخص کو بھیجا کہ ہمارے قافلہ مین اطلاع کرے کہ قافلہ گم کردہ آدمی یہان موجود ہے۔ اس حکایت کو جس نے سنا بہت تعجب کیا والا سب ہمارے قافلہ کے لوگ میری طرف سے مایوس ہوچکے تھے۔ بدویون کا صحیح وسالم مجھکو چھوڑ دینا اور خود قافلہ مین اطلاع کر بھیجنا یہ بھی اثر اوسی میری دعا کا تھا کہ جناب اقدس الٰہی تعالےٰ شانہ نے اون کے ہاتھ سے میری حفاظت کی جب قافلہ چند میل اوس مقام سے جہان مین تھا پہونچا بدوی لوگ جو ہمارے قافلہ کے ساربان تھے وہان آئے اور جب شام کو قافلہ نے کوچ کیا تو وہ مجھے ہمراہ لیکے قافلہ کے شامل ہوئے اور اوس شیخ نے میری بہت مدارات کی اور بدوی جو وہان تھے وہ مجھ سے کہتے تھے کہ تم بڑے خوش نصیب ہو جو اس شیخ کے ہاتھ آنے والا اور لوگ تھین آخر کر ڈالتے وہ لوگ جن کو ہمارے شیخ شریف کہتے تھے وہ استہزاءً مجھ سے کہتے تھے۔ ہم تم کو قتل کر ڈالین مین کہتا تھا ہم تمھارے قابو مین ہین جو چاہو سو کرو بعد اوسکے وہی شیخ اوٹھے اپنے دوسرے خیمہ مین جاکے ایک بڑی سینی مین باجرے کا ملیدہ دودھ مین بناکے لائے اور اوس مین ایک سیر بھر گھی چھوڑ دیا جتنے لوگ وہان جمع تھے سب کے آگے رکھدیا مجھکو بھی شریک کیا شام کے قریب جب مجھے رخصت کیا تین چار ریال جو میرے پاس تھے راقم نے اون کے نذر کیے اور وہان سے اپنے بدویون کے ساتھ قافلہ مین آکے شامل ہوا سب لوگ قافلہ کے

بہت خوش ہوے اور ہر ایک میری حفاظت سے نہایت متعجب تھا کہ بدویون کے قبضہ مین جاکے زندہ رہنا یا کہین بک نہ جانا ایک امر عجائبات سے ہے۔ بعضے شیوخ ہندی جو قافلہ مین تھے اور میرے گم ہونے سے دست افسوس ملتے تھے اور دعا کرتے تھے اونکے مریدین اور معتقدین میری حفاظت کو اونکی کرامات پر محمول کرتے تھے غرض قافلہ جسکے ساتھ راقم تھا دسوین یا بارھوین دن مدینہ منورہ پہونچا اور چونکہ دستور ہے جو قافلہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو جاتا ہے ساربانون کے اختیار مین رہتا ہے اس واسطے کہ اونٹون کا کرایہ آمد و رفت دونون کا لیا کرتے ہین اور اکثر وہ روپیہ کرایہ کا پیشگی لے لیا کرتے ہین پھر جب مدینہ منورہ مین پہونچے تو جو تاریخ وہان سے معاودت کی ساربان لوگ معین کر دیتے ہین اوسی تاریخ سارا قافلہ جمع ہو جاتا ہے کبھی آٹھ دن کبھی کم یا زیادہ جو اون بدویون کو مصلحت معلوم ہوتی ہے اوسکے بموجب زائرین مجبور اونکی اطاعت کے رہتے ہین راقم جب مدینہ منورہ مین پہونچا اور مشرف زیارت سے ہوا تو دل یہ چاہتا تھا کہ وہان زیادہ توقف کرے مگر زاد و راحلہ کی کمی کے سبب سے علی الخصوص مدینہ منورہ مین جو ساتھ لیگیا تھا اوسمین کچھ قلیل باقی رہگیا تھا نصف اوس کا جو وطن سے روپیہ آیا تھا مکہ معظمہ مین چھوڑ گیا اور افکار اپنی معیشت کے اور اہل و عیال کے ظاہر مین مانع بہت توقف کے تھے مگر چوتھے یا پانچوین دن اوس بلدہ متبرکہ مین پہونچنے کے موافق دستور کے پانچون وقت کی نماز مسجد نبوی مین علی صاحبہا الف الف تحیۃ و سلام ادا کر کے جب مواجہہ شریف کے سامنے دعاے زیارت پڑھنے کو گیا تب راقم نے نہایت تضرع و زاری سے روح مبارک کی طرف متوجہ ہو کے دعا کی کہ آج شب کو مین دعاے استخارہ پڑھون گا اس نیت پر کہ ... جو میرے حق مین دین اور دنیا کے لیے بہتر ہے مجھکو صاف صاف بلا تعبیر کے خواب مین حکم ہو جاے کہ یہان مین اقامت کرون یا قافلے کے ساتھ معاودت کرون اور اوسی شب کو وہ عمل استخارے کا جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قول جمیل مین لکھا ہے وہ پڑھا اور جناب مولانا عبد الرشید مد ظلہ بیٹے اور خلیفہ سجادہ نشین مولانا احمد سعید بیٹے اور خلیفہ سجادہ نشین حضرت شاہ ابو سعید خلیفہ و سجادہ نشین حضرت شاہ غلام علی

(راقم نے استخارہ کیا کہ مین یہان اقامت کرون یا معاودت قافلے کے ساتھ کرون۔ جواب مین حکم اقامت نکلا ہو)

خلیفہ و سجادہ نشین حضرت شاہ مظہر جانجانان قدس اللہ اسرارہم کے جو وہان مہاجر ہو کے رہے ہین اونھون نے تبلایا تھا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بقدر اوس کے اعداد جمل کے جو پڑھ کے سو وے وہ اپنے مطلوب پر خواب مین آگاہ کیا جاتا ہے وہ بھی اوس عمل کے ساتھ ضم کیا اوسی شب کو مین نے خواب مین دیکھا کہ ایک گھوڑا سبزہ رنگ معہ ساز و یراق میری سواری کے لیے کھڑا ہے اور مین سوار ہونے کا ارادہ رکھتا ہون کہ کسی شخص نے پکار کے کہا جسکی مین نے غالبًا صورت نہین دیکھی کہ رسول اللہ جانے اور سوار ہونے کو منع فرماتے ہین مین اپنے عقیدہ مین یہ نعمت عظمی بہ تصدق رسول مقبول صلے اللہ علیہ الف الف تحیۃ وسلام اپنے اوپر سمجھتا ہون جو استخارے کے جواب مین مجھے ارشاد ہوا اور جو دعا اور آرزو نہایت تضرع اور زاری سے جہاز سے فرنگستان کے سفر کے اوترکے راقم نے کی تھی کہ اپنے تئین دعوت اور مہمانی مین خدا اور رسول کے سپرد کیا تھا اس طرح کی میری دعوت اور مہمانی اس دار دنیا مین ہوئی کہ اوس سفر حج مین ایسی راحت اور آسایش سے بسر ہوئی کہ بڑے بڑے دولتمندون کی بھی بسر نہ ہوئی ہوگی اور اس روسیاہ نالایق اور ہیچکارہ کو حکم ہوا اور اجازت قیام کی مدینۃ النبی مین ملی اور بہت امیدواری فوز و فلاح آیندہ کی حاصل ہوئی اسی طرح سے مجھے امید اور آرزو ہے کہ عقبے مین بھی مقبول ہو جاؤن اور عاقبت میری بخیر ہو اس طرح کا جواب صاف صاف پہلی شب مین استخارہ کرنے کے جس نے سنا نہایت تعجب کیا اس واسطے کہ اول استخارون مین آٹھ آٹھ نو نو یا کم اور زیادہ شبون مین ایسی خوابین نظر آتی ہین کہ تعبیر اور تاویل سے لوگ اپنا مطلب سمجھتے ہین یا الٰہ العالمین برکات اوس کے اور جو عزت اور مکرمت مجھکو وہان حاصل ہوئی جب تک دنیا مین زندہ ہون اور عقبے مین بعد مفارقت روح کے بدن سے میرے اوپر دایم اور قایم رہے واللہ ھو المؤید والمستعان

لِكُلِّ رَاجٍ عَاصٍ الغرض راقم چھ مہینے کامل مدینہ منورہ کے قیام سے مشرف رہا اور پنجگانہ نماز مین اول جماعت مین مسجد نبوی کے اداکین اور موافق وہان کے دستور کے ہر نماز کے بعد مواجہہ شریف مین دعاے زیارت پڑہا گیا جو جو فیوض اور برکات وہان حاصل کیے شرح اوس کی مصلحت نہین ہے چند مرتبہ خواب مین بھی شرف زیارت کا ہوا۔ پہلے سعادت شرکت مجلس

[illegible]

دوازدہم ربیع الاول ہین حاصل ہوئی اور رجبی کی مجلس مین جو ستائیسوین رجب کی معراج کے ذکر کے واسطے ہوتی ہے شریک ہو کے مشرف ہوا اور سب خلفا اور ایمہ کے عرسون مین جو مختلف مہینون مین ہوتے ہین شریک رہا۔ حضرت امیر حمزہ کے عرس کے بعد جو ستائیسوین رجب سے شروع ہو کے پانچ چھ دن تک اوس کا مجمع بطور میلہ کے ہوتا ہے وہان سے مکہ معظمہ کے عزم پر روانہ ہوا برشتگی طبیعت کی اوس بلدہ طیبہ اور مناسک معظمہ کی مفارقت سے اور حرمان نصیبی سے جو حاصل ہوئی اور کیفیت بے اختیاری گریہ وزاری کی جو ہنگام رخصت مین پیش آئی یاد اوس لذت سوز وگداز کی اب خواب وخیال ہوگئی آرزو یہ ہے کہ انفاس بقیہ چند پھر وہین بسر ہون افسوس ہے کہ تعلقات دنیاوی علایق اور عشایر کے سنگ راہ ہوے وا لا ایام قیام حرمین شریفین کے ایک برس اور دو مہینے کے قریب جس راحت اور آسایش اور بے فکری مین گذرے مدۃ العمر اس ستر برس مین کبھی نصیب نہین ہوے تھے اس کا مقتضا یہ نہ تھا کہ یہ چند انفاس باقیہ کہین اور بسر ہون مگر وطن کے آب ودانہ نے نہ چھوڑا اور اون برکات سے محروم کیا۔ غرض ہلال شعبان ۱۲۸۱ھ کا دوسری یا تیسری منزل مین اوس بلدہ طیبہ سے روانہ ہو کے دیکھا غالباً چوتھے دن وہان سے روانگی کے سفر خشکی ترک کیا اور ایک بغلہ کرایہ کر کے لنگر بحر عرب مین اوٹھایا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ اس تین چار دن کے سفر خشکی مین ایک مصیبت عظیم پیش آئی ایک منزل مین جس کا نام سہو ہوگیا ہے ایک قلعہ تھا وہان کچھ فوج ترکی مامور تھی بدوی ساربان جو ہمارے قافلہ کے ساتھ تھے کنوین سے پانی بھرنے مین اون سے اور ترکی لشکریون سے کچھ تکرار ہوئی منازعت زبانی منجر جنگ وجدال کی طرف ہوئی دونون طرف سے بندوقین چلنا شروع ہوگئین بیچ مین قافلہ ایک طرف ترکی فوج مہذب دوسری طرف جنگلی بدوی قریب دو گھنٹہ کے مار دھاڑ رہی کتنے قافلہ کے مرد اور عورت کا خون ناحق ہوگیا بعضے مجروح ہوے ایک حافظ بیچارے یاد بخیر مولوی عبد القیوم صاحب کے بیٹے کو قرآن شریف حفظ کرواتے تھے اور اکثر تمنا شہادت کی کیا کرتے تھے ہم چند آدمی ایکسم ہی جگہ پر بیٹھے تھے وہ حافظ بھی ہمارے ساتھ

(ایک بار حرمین زادہما اللہ شرفاً میں سنہ ۱۲۸۱ھ میں پھر حاضر ہو کر حج ادا کر کے معاودت فرمائی)

تا قافلہ کے اوپر
بیٹھے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ایک گولی اونکے آکے لگی وہ بیچارے شہید ہو گئے آخرش ترکون نے رحم کھا کے ہاتھ کو روک لیا والا بدویون نے تو سارے قافلہ کو تمام کر دیا تھا غرض دو گھنٹہ کے بعد امن ہو گیا جناب اقدس الٰہی تعالے شانہ نے شامل اونکی حفاظت اور عنایت اور شفقت کے اس مصیبت مین بھی اس روسیاہ کو محفوظ رکھا والا بہت سی گولیان سر پر سے اور داہنے اور بائین دونون طرف لگی نکل گئین ساری رات اور وہ دن الامان اور توبہ اور انابت مین گذرا صبح کو دوسرے دن پھر کوچ ہوا قافلہ کے بہت سے لوگون نے اس خوف سے کہ پھر رستہ مین مبادا ترک کی فوج سے جو جا بجا قلعون مین مامور تھی اور بدویون سے بکھیڑا ہو جائے خشکی کا سفر ترک کیا۔ جس بغلہ پر راقم سوار ہوا اوسی پر چند اپنے احباب ہمجنس شامل مولوی عبدالقیوم صاحب سلمہ اللہ تعالے مولانا عبدالحی مغفور کے بیٹے اور مولانا اسحاق حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسہ کے داماد مع اپنے اہل وعیال کے بھی سوار ہوئے لیکن جس دن سے بغلے نے لنگر اوٹھایا برابر ہوا مخالف رہی دسوین یا گیارھوین دن بہت صعوبت سے بندر جدہ مین لنگر ہوا دو ایک دن اونٹون کی تلاش مین وہان اقامت رہی آخرش اواسط شعبان مین مکہ معظمہ مین بخیریت داخل ہوئے مشفقی حاجی سعید بخت سلمہ اللہ تعالے سلہٹ کے ایک بڑے زمیندارون مین مہاجر ہو کے امیرانہ وہان رہتے تھے پہلے سال مین بھی بعد فراغت کے حج سے جو پندرہ بیس دن وہان اقامت ہوئی تو وہ مبالغہ ہو کے اپنے مکان مین راقم کو اوٹھا لیگئے تھے اب کے دفعہ بعد معاودت کے مدینہ طیبہ سے پھر وہ مبالغ ہوے اور راقم اونھین کے ہمخانہ ہوا اور بیشتر سے اونھون نے اب زیادہ محبت یہ کی کہ راقم کو اکل کھانے پینے کا بندوبست نہ کرنے دیا۔ لیکن حساب دوستان در دل براتب زاید اونکے مصارف سے ایک لبادہ قاقم کا جو لندن مین چھ سات سو روپیہ مین راقم نے تیار کروایا تھا اور وہ بھی لندن کے مال مسروقہ مین تھا جو اسباب میرا چوری ہو گیا تھا مگر بعضی اور چیزون کے ساتھ وہ مل گیا تھا وہ ہدیتہً راقم نے اون کو نذر کیا۔ رمضان شریف سنہ ۱۲۸۱ھ کا مکہ معظمہ مین بہت برکات سے گذرا آٹھ سات عمرے اوس ماہ مبارک مین ادا کیے اور اوس سال کا حج جو میری قسمت سے

بسبب ورود عصیان کے خشکی کا سفر ترک کر کے بحری سفر اختیار کیا بحری سفر کیا ہو ...
باوجودیکہ ان بندر جدہ مین لنگر ہوا اور اواسط شعبان مین مکہ معظمہ مین داخل ہوئے

حج اکبر واقع ہوا یعنی روز حج روز جمعہ تھا بخیر و خوبی ادا ہوا۔ عجیب اتفاق ہوا کہ جب امیر الحاج نے حج کے واسطے کوچ کیا مجھکو سواری نہ میسر ہوئی اور با وصف یسر کے حج مسنون یعنی پیادہ پا کرنا پڑا مکۂ معظمہ سے منا تک پیادہ پا گیا چونکہ اوس مین بہت بڑا ثواب ہے تصور ہوا کہ یہ بھی فضل و عنایت ہے جو اوس سفر مین میرے اوپر جناب اقدس الٰہی کی مبذول ہوئی ہین۔ لیکن بسبب ضعف سن کے متحمل اوس کا نہ ہو سکا۔ منا مین کچھ زیادہ خرچ کرنے سے ایک اونٹ کرایہ کا عرفات تک دونون آمد و رفت کے واسطے مل گیا۔ شکر الٰہی جس کی طاقت ادا کی ہرگز نہین ہے بجالایا اور نصف حج پیادہ پا ہوا۔ جب حج سے فراغت ہوئی منا مین پھر کے آئے وبا ہیضہ کی شروع ہوئی اوس کے زور و شور کا کچھ بیان نہین ہو سکتا پندرہ بیس دن تک بازار ملک الموت کا ایسا گرم رہا کہ العیاذ باللہ ہزارون آدمی آخر ہو گئے۔ بہت سے ہمخانہ اور ہمصحبت لوگ کوچ کر گئے ہزارون آدمی بہت سے مناسک مسنون حج کے چھوڑ کے معاودت کر گئے اوسی حالت مین ایک مرتبہ راقم بھی اسہال مین مبتلا ہوا کہ نوبت وصیت نامہ بھی لکھنے کی پہونچی لیکن اس مصیبت سے بھی جناب اقدس الٰہی نے نجات دی ایک شب کو ایک بزرگ کے دفن کرنے کے واسطے جنت المعلےٰ مین اتفاق جانے کا ہوا چونکہ وہان لاشون کو بیت ہی اوتھلا غار کھود کے دبا دیتے ہین ہزارون لاشین گویا زمین پر رکھی ہوئی تھین شدت تعفن سے میری عجیب کیفیت ہو گئی کہ معاودت دشوار ہوئی غش کی صورت پر مکان مین پہونچ کے مین گر پڑا عشا کی نماز کے واسطے حرم مین جانے کی نوبت نہ آئی۔ شاید آدھی رات کو اقامت گاہ مین اوٹھ کے نماز پڑھی۔ بالجملہ اواخر محرم ۱۲۸۲ھ مین معاودت کے ارادے سے مکۂ معظمہ سے روانہ ہو کے جدہ مین آیا۔ یہان قریب ایک مہینے کے اوس اسباب کے بندوبست کے واسطے جو قاہرہ مین راقم رہن کر کے آیا تھا توقف ہوا پہلے ارادہ تھا کہ خود مصر مین جا کے اور اسباب رہن سے نکال کے وہین سے جو جہازات ہماری ہندوستان کو آتے ہین اون پر سوار ہو کے روانہ ہون مگر کچھ روپیہ کا بندوبست نہ ہو سکا

منیٰ سے عرفات تک اونٹ کرایہ کا ملا وقت سواری نصف حج پیادہ پا ادا ہوا اور نصف حج سواری پر

عرفات سے جب معاودت ہوئی ہیضہ کی وبا شروع ہوئی ہزارون آدمی دن دن مرتے تھے راقم بھی ایک شب اسہال مین مبتلا ہوا

اواخر محرم ۱۲۸۲ھ مین راقم وطن کے ارادہ سے مکۂ معظمہ سے روانہ ہو کے جدہ مین آیا

آخر ایک تاجر حاجی قاسم نام میمن تھے اون کے ساتھ بندوبست کیا کہ وہ اسباب منگوا کے بمبئی مین بھیجدین گے اور اس نظر سے کارباب اقتدار سلطنت کے مبادا یہ شبہہ کرین کہ مین کلکتہ مین پہونچ کے پھر بادشاہ کو پارلیمنٹ مین مرافعہ کے واسطے بھکاؤنگا کلکتہ جانے کا عزم موقوف کیا منتظر تھا کہ کوئی بخاری جہاز بمبئی کا جانے والا ملے تو اوسپر سوار ہون - اتنے مین جناب مولوی عبد القیوم صاحب مع اپنے اہل وعیال کے بھی معاودت کے ارادہ پر جدہ مین آئے اور ایک بادبانی جہاز پر اونھون نے بندوبست روانگی کا کیا اون کی رفاقت اور مصاحبت کی نظر سے راقم نے بھی اوسی جہاز پر ایک کمرہ لیا - ربیع الاول کے شروع مین جہاز نے جدہ سے لنگر اوٹھایا اور پچیس روز مین بمبئی مین داخل ہوا - چونکہ عین ایام بارش کے تھے اور اوس سال برسات بہت زور شور کی ہوئی - اور جب تک ریلوے کی سڑک طرف بمبئی سے برہان پور تک جاری ہوئی تھی برہان پور سے آگے رستہ بہت خراب تھا لاچاری سے قریب تین مہینے کے بمبئی مین توقف ہوا اور آخر جمادی الثانی ۱۲۸۲ھ مین بمبئی سے ریلوے کے ذریعہ سے برہان پور تک پہونچا یہان سے بمعیت مولوی عبد القیوم صاحب کے خشکی کا سفر اختیار کیا بھوپال مین آیا وہان دو تین ہفتہ تک توقف ہوا بعد اوس کے کرانچی کی ڈاک پر آگرہ مین پہونچا وہان سے ریلوے کے ذریعہ سے کانپور مین آیا - کانپور سے لکھنؤ تک جب تک ریل نہین تیار ہوئی تھی گھوڑے کی گاڑی کی ڈاک پر چوتھی شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۲ - دسمبر ۱۸۶۵ع وطن مین داخل ہوا چونکہ بعد سلطنت اودھ کی ضبطی کے حکم تھا کہ سب بادشاہی نوکرون کو پنشن دیا جاے اس سبب سے راقم نے اپنی طرف سے اور اپنے بڑے بیٹے مولوی فریدالدین خان سلمہ اللہ تعالے کی طرف سے پنشن کی درخواست کی مدت تک اوس کا جھگڑا پڑا رہا آخرش یہ درخواست منظور نہ ہوئی - لارڈ لارنس گورنر جنرل تھے اور عجب طرح کا اتفاق ہوا کہ جب راقم لندن مین تھا لارڈ موصوف وزیر ہندوستان کے ایک مشاورین مین تھے اور راقم وزیر ہندوستان کے محکمہ مین اکثر جاتا تھا چونکہ لارڈ ممدوح سے ہندوستان مین کبھی شناسائی اور تعارف نہ تھا مین اونکے پاس

شروع ربیع الاول مین بادبانی جہاز پر سوار ہو کر ۲۵ دن مین بمبئی پہونچا - تین ہفتے وہان توقف ہوا

۴ شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ع کو وطن مین پہونچا

کبھی ملاقات کے واسطے نہین گیا اور ظاہر امزاج اون کا بہت خوشامد طلب ہے۔ یہ امر اون کو ناگوار ہوا۔ جب اون کے پاس میری درخواست پنشن کی۔ اور ایک دوسری درخواست اس مضمون کی گذری کہ میرا دعوے بادشاہ اودھ پر چار لاکھ روپیہ کا ہے اور ایکٹ ۳۲ سنہ ۱۸۶۰ع کا نفاذ پایا ہے کہ کسی طرح کا کوئی دعوے بادشاہ پر بدون اجازت خاص گورنمنٹ کے کسی عدالت مین مسموع نہ ہوگا اس واسطے مین امیدوار ہون یا خود گورنمنٹ میرے دعوے کو اونکے اوپر فیصلہ کرے یا مجھے اجازت دیوے کہ مین عدالت مین نالش کرون۔ مجھے یقین ہے کہ لارڈ ممدوح نے اوسی ناراضمندی کے سبب سے جو میری طرف سے اون کے دل مین تھی میری دونون درخواستون کو نامنظور کردیا۔ اگرچہ راقم نے اوس کا مرافعہ وزیر ہندوستان کے پاس بھی کیا مگر کچھ وہان بھی اب تک شنوائی نہ ہوئی۔ شرح اور تفصیل اپنی تباہیون کی جو اس سلطنت کے ارباب اقتدار کی عدم توجہ سے میرے حال پر ہوئی بسبب یاس کلی کے کسی نتیجہ خیر سے عبث اور فضول ہے اور اصل وہی ہے جو اوپر ایک جلیل القدر کا قول راقم نے نقل کیا ہے کہ بادشاہ اودھ کے مقدمہ مین لندن مین بعضے تصانیف جو راقم نے چھاپ کے مشتہر کیئے تھی وہ باعث میرے حال پر شفقت اور رحم نہ کرنے کے ہوئے اور بادشاہ والاجاہ اودھ جنھون نے راقم کو ان مصایب مین گرفتار کیا اون کی عقل اور فطانت اپنی سلطنت کھو دینے سے ظاہر ہے اون سے کچھ امید یہ ہو دکھنا طول امل سے بھی کچھ بڑھکے ہے ایسی حالت مین بجز قہر درویش بر جان درویش اور کچھ نہین ہے اور کسی سے محل شکایت نہین ہے بجز اپنی تقدیر کے کبھی ایسا تصور ہوتا ہے کہ اگر مین لندن نہ جاتا تو بہتر ہوتا کہ اتنی تباہی نہ آتی پھر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی عَسٰی اَنْ تَکْرَہُوْا شَیْئًا وَّ ہُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ تھا غدر کا عہد جونکہ بمصالح سلطنت اندھا عہد تھا کچھ تعجب نہین ہے کہ لوگ پھانسی پر چڑھا دیتے اس حفاظت کے واسطے آب ودانہ نے وہان کھینچا تھا۔ غرض اس عالم اسباب مین لاکھون تدبیرین معاش پیدا کرنے کی ہین مثل مشہور ہے پاے مرا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست جب تک ہاتھ پاؤن چلتے ہین محض عنایت اور شفقت الٰہی سے مین مایوس نہین ہون اگر

[illegible]

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم
- فسانۂ عجائب
- انشائے سرور ۶ر

امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات نا مکمل
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- مینائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم
- سرمایۂ زبان اردو
- مضمونہائے دلکش
- نظم نگارین
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸ر
- افادۂ تاریخ
- قواعد المنتخب ۴ر

مرزا محمد عباس ہوش مرحوم
- فسانۂ نادر جہاں
- پیاری سہیلی ۴ر
- دفتر سحر ۸ر
- المیمون ۱۲ر

منشی افضل حسین ثابت
- حیات دبیر
- دربار حسین

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ کے ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزالی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- رودھنی ۱۰ر

پریم چند
- پریم پچیسی
- [illegible]

مولانا عبد الحلیم شرر
- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گزشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- [illegible] بازار

حکیم محمد علی خان مرحوم
- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال ۴ر
- گنجینہ ۱۲ر
- سیکفن اور لوسی ۲ر

خواجہ عبد الرؤف عشرت
- زبان دانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- " دوسری کتاب
- " تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد حسن وحشی
- مجموعۂ گزشت
- جام زہر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم
- یاد ایام
- تذکرۂ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " " " دوم
- " " " سوم
- " " " چہارم
- " " " پنجم
- " " " ششم
- " " " ہفتم
- " " " ہشتم
- " " " نہم
- " " " دہم
- " " " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری
- الاسلام والنصرانیہ
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عرب و عربستان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ ترکی سلطنت

منشی سید احمد دہلوی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

گوتم بدھ۔ مہاتما بدھ کی مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۔۔ ۴ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم

خیالات عزیز

دکن ہار ڈی

خواجہ عباد اللہ اختر

صدیق اکبر

حضرت زید

مشاہیر اسلام

بغداد

دمشق

دیوان خواجہ

مفتی انوار الحق ایم اے

تاریخ ابو البشر

تذکرۃ الحبیب

حقائق اسلام

میر ولی اللہ بی اے

بندگی

کاس الکرام

لسان الغیب جلد اول

" " دوم

" " سوم

" " چہارم

سید راس مسعود بی اے

نصاب اردو

جاپان کا تعلیمی نظم

انتخاب ندین

مولانا حسرت موہانی

شرح دیوان غالب

کلیات دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے

خیالستان

حکایات و احساسات

زہرا

جلال الدین خوارزم شاہ

فلسفیانہ مضامین

مسٹر ظفر عمر بی اے

حوروں کا کلب

نیلی چھتری

بہرام کی گرفتاری

مستقبل اسلام

پروفیسر فخر الدین

تحفۂ سائنس

ناول

خونبہائے عشق

حکیم محمد شجاع بی اے

بابا کا گناہ

حسن کی قیمت

منشی عبد الحمید سالک بی اے

راہ و رسم منزل‌ها

چیاو دیگر افسانے

چھڑا چکور

منشی احمد علی بی اے

تاریخ تمدن

شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے

فلسفہ جذبات

مکالمات برکلے

پیام امن

تصوف اسلام

زود پشیمان

منشی محمد لطیف بی اے

اکبر

اورنگ زیب

رنجیت سنگھ

پروفیسر ابو العلی ایم اے

معارج الدین

تذکرۃ المصطفیٰ

صحف سماوی

شمع سخن

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

جذبات نظرت چار حصہ

معاشیات ملت

مناظر قدرت

علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن

سیرۃ عائشہ

حیات امام مالک

خلافت عثمانیہ

خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی

اسوۂ صحابہ دو جلد

سیرۃ عمر بن عبد العزیز

انقلاب الامم

تاریخ الحرمین الشریفین

تمدن اسلام

تمدن نسوانی

شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی

برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول

سیر انصار ۲ جلد

سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی

اسوۂ حسنہ

کتاب الوسیلہ

ترکی بادشاہ

خواجہ حسن نظامی

قرآن آسان قاعدہ

میلاد نامہ

محرم نامہ

فاطمی دعوت اسلام

تذکرہ غوث پاک

کرشن جیون

شامی جہاد

سیپارۂ دل

گرو نوت

چنگیز خان

اتالیق خطوط نویسی

روزنامچہ

بیوی کی تعلیم

بیوی کی تربیت

اولاد کی شادی

جگ بیتی کہانیاں

آپ بیتی

دنیا کی کہانیاں

سی پارہ

سفرنامہ

دہلی کے افسانے

یزید نامہ

طمانچہ

اردو دعائیں

تسکین احساس

روزنامچہ

اسلام کا انتظام

تسخیر قہر

مولوی عبد الرشید الخیری

الزہرا

صبح زندگی

شام زندگی

شب زندگی

نوحۂ زندگی

دُرِّ شہوار

منازل السائرہ

سراب مغرب

بنت الوقت

قطرات اشک

جوہر قدامت

عروس کربلا

یاسمین شام

تیغ کمال

ماہ عجم

محبوب خداوند

نیاز فتح پوری

گلستان

جذبات بھاشا

نگارستان

صحابیات

تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی

چراغ سخن

نشتر یاس

مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ

دی مرہٹوں کے استقلال

خانی خان

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ہندوستان ایل ۲۷۰۸

الناظر

ایڈیٹر ــــ ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ/ قیمت فی پرچہ ۸/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
کی روانگی پر آدھا
اور
کی روانگی پر پورا

ہدیتہً لیجیے
کی روانگی پر الناظر ایک سال
اور
تا کی روانگی پر کی کتابیں،

مرزا غالب مرحوم

- اُردوئے معلیٰ
- عودِ ہندی
- دیوان غالب
- مکمل دیوان غالب

سرسید مرحوم

- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- اسبابِ بغاوتِ ہند
- سیرتِ فریدیہ
- خطوطِ سرسید

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث ۱۲
- کتاب المحبۃ والشوق
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم

- امجاد الفحول
- سفرنامہ مصر جلد

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندانِ فارس
- نگارستانِ فارس
- نیرنگِ خیال
- سیرِ ایران
- ڈرامہ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد ۸
- نصیحت کا کرنپھول
- جانورستان ۱۰
- بیاضِ آزاد
- تذکرۂ علماء
- لغت آزاد
- دیوان ذوق مرتبۂ آزاد

میر نصیر شہباز مرحوم

- زندگانی بےنظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن ۱۱

مولانا نذیر احمد مرحوم

- حمائل شریف ترجمہ
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش ۹
- مراۃ العروس ۱۲
- توبۃ النصوح ۱۰
- موعظۂ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعہ تعزیراتِ تنظیر
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات ۶
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا شرر مرحوم

- حیات امیر
- ایشیائی شاعری
- نورجہان بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان ۱۲

مولانا حالی مرحوم

- یادگارِ غالب
- حیاتِ سعدی
- مقدمۂ شعر و شاعری
- حیاتِ جاوید
- دیوانِ حالی
- مسدسِ حالی
- مجموعۂ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات ۲
- شکوۂ ہند ۲

مولوی بشیر الدین احمد

- واقعات دارالحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- عزیز طفلان
- انشاء عمر
- مصائبِ پیری
- لخت جگر
- حسنِ معاشرت
- اصلاحِ معیشت
- اقبالِ دلہن
- شمع ہدایت
- انشائے بشیر
- دیوانِ بشیر

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول
- جلد دوم
- سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم
- پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- کرزن نامہ
- آئین قیصری
- صحیفہ زریں
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم
- جغرافیہ ریاضیہ ۱۲
- جبر المبتدی
- الجبرا کا جبر و مقابلہ
- رسالہ علم تناسب
- معاون الحساب
- مساحت اقلیدس

سید محمود مرحوم

- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- کتاب
- شرح قانون شہادت

مولوی عبدالحمید انصاری

- المدنیۃ والاسلام
- تحریر المراۃ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ جون ۱۹۲۸ء

نمبر ۶ — جلد ۳۴

نئی کتابیں

نہرو رپورٹ کا اُردو ترجمہ تیار ہے قیمت عہ

سیر المصنفین (جلد دوم) مصنفہ مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی - جسکا دیباچہ الناظر میں شایع ہو چکا ہے' اب تیار ہوگئی ہے - اس ۶۵۰ صفحے کی کتاب میں تیسرے دَور کے نثر نویسوں کے حالات، اُنکی تصانیف کا تذکرہ، اُنکی تحریروں کے نمونے ہیں - اور اُنکی انشاپردازی پر تبصرہ کیا گیا ہے سرسید، چراغ علی، آزاد، ذکاءاللہ، سید علی بلگرامی، نذیر احمد، حالی، شبلی، سرشار و شرر کے علاوہ حاجی اسمٰعیل خاں، محسن الملک، وحیدالدین سلیم، ماسٹر پیارے لال، سید احمد، عزیز مرزا، ظفر علیخاں، بشیر احمد - منشی سجاد حسین سید سلیمان ندوی و منشی عبدالرزاق کانپوری وغیرہ کے حالات اس جلد میں آگئے ہیں - قیمت ؏

آئینۂ حقیقت نما (جلد دوم) مولانا اکبرشاہ خاں نجیب آبادی کی قابل قدر تاریخ ہند کا پہلا حصہ شایع ہو کر حسن قبول حاصل کرچکا ہے - اب دوسرا حصہ تیار ہوا ہے جس میں تغلق اور لودی خاندانوں کی حکومت کے حالات ہیں - حجم ۱۵ جزو - قیمت ؏

خاکِ پروانہ - اُردو کے مشہور ادیب و فسانہ نویس پریم چند کے ۱۴ بہترین افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شایع ہوا ہے - شایقین فوراً طلب کریں - قیمت صرف عہ

مرآۃ محمدی - یعنی مسلمان سلاطین گجرات کے مستند حالات - مصنفہ شیخ غلام محمد مرحوم مصنف مرآۃ عالمگیری وغیرہ - جو مصنف کے انتقال کے بعد اُنکے جانشیں نے طبع کرائی ہے - قیمت ؏

تحفۂ احباب - مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب رحمانی نے چند قرآنی آیات کی تفسیر لکھ کر ثابت کیا ہے کہ کتاب اللہ کی آیات میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر آیت دوسری آیت کی موید و مفسر ہے - نیز انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق غلط روایتوں کی تردید کرکے قرین عقل مطالب بیان کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ قصص قرآن میں ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے کارآمد نصایح ہیں - قیمت ؏

روضۃ الہدیٰ میں مصنف تحفۂ احباب نے بعض دوسری آیات قرآنی کی تفسیر بیان کی ہے - اہم ذات منکر نبوت، علم مرتد، بحث قبلہ، میراث، حج بدل، گوشت خوری، تخلیق و تصویر، بعثت انبیاء غیر مسلم لوح محفوظ وغیرہ مضامین اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں - قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ :- **الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۴ — جون سنہ ۱۹۲۸ء

خان جہاں لودی

تمہید محمد بن قاسم علیہ الرحمہ کی فتوحاتِ ہند سے لیکر سلطان شہاب الدین غوریؒ کی وفات تک ہندوستان کے شمالی و مغربی صوبے اکثر مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہے لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک الگ مستقل سلطنت قطب الدین ایبک کے زمانے سے شمار کی جاتی ہے۔ قطب الدین ایبک۔ شمس الدین التمش۔ غیاث الدین بلبن اور اُنکی اولاد کا دَورِ حکومت ختم ہوکر خاندان خلجی ہندوستان کی فرماں روائی پر فائز ہوا۔ خلجیوں کے بعد تغلقوں کی شہنشاہی کا نمبر آیا۔ ان تینوں فرمانروا خاندانوں کے عہد سلطنت میں وزیر اعظم کو الغ خاں کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ الغ خاں ترکی زبان کا لفظ ہے جسکا ترجمہ سردارِ اعظم، خان جہاں، خان خاناں، خانِ اعظم، مسندِ عالی، حضرتِ اعلیٰ وغیرہ الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ حملۂ تیمور نے جب خاندان تغلق کا خاتمہ کرکے ایک نئے مجہول النسب خاندان کو فرمانروائی کا موقع دیا تو اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ خضر خاں نے اپنے آپ کو تیمور کا وائسرائے قرار دیکر اپنا لقب مسندِ عالی تجویز کیا۔ مسند عالی خضر خاں کے بعد اُسکے بیٹے نے ایک خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ لیکن الغ خاں کا ترکی خطاب پھر ہندوستان میں نہیں سُنا گیا۔ اس خاندان کے بعد لودیوں کی حکومت شروع ہوئی تو ایک ہی وقت میں کئی کئی شخصوں کو مسند عالی، خان خاناں اور خان جہاں کے خطابات ملے۔ سکندر لودی اور ابراہیم لودی کے عہد حکومت میں کئی خان خاناں، کئی مسند عالی، اور کئی خان جہاں تھے۔ خان جہاں کا خطاب

تو ایک جمعیت فراہم کرکے اپنے وطن سے چلا اور ۷۶۴ھ میں جبکہ فیروز تغلق بنگالہ کے سفر سے ناکام واپس آچکا تھا دہلی پہونچ کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنے سابقہ حقوق اور حاجی الیاس کی شکایات زبان پر لاکر ہر قسم کی جانفشانی و جانفروشی پر آمادگی ظاہر کی سلطان نے بھی ظفر خاں کو اپنی مہربانی و عنایت کا یقین دلایا۔ شمس سراج عفیف سلطان فیروز کے الفاظ کو اس طرح روایت کرتا ہے کہ

آں شہریار بر احم شاہی و عواطف پادشاہی ظفر خاں را بسیار پرسیدہ و بنایت نواختہ فرماں فرمود کہ ظفر خاں خاطر جمع دارد و اندیشہ را بسوے خود گذار اگر چہ شدائد بسیار و مکائد بیشمار دیدی و رواہاے مخالف دیدہ اے مخوف پیمودی المنۃ للہ بعقبہ رسیدی ہر چہ در سنارگاؤں و شتی امصاف آں بتو مفوض خواہد شد۔

چنانچہ ظفر خاں کو سلطان نے زمرۂ امرا میں شامل کیا۔ وہ اول نائب وزیر پھر ۷۶۹ھ میں صوبہ گجرات کا حاکم مقرر ہوا۔ ظفر خاں لودی جب ۷۷۵ھ میں فوت ہوا تو اسکے بیٹے دریا خاں لودی کو سلطان فیروز تغلق نے ظفر خاں کا خطاب دیکر باپ کی جگہ گجرات کی حکومت پر مامور کیا۔ تین سال کے بعد ۷۷۸ھ میں دریا خاں لودی المخاطب بہ ظفر خاں ثانی حاکم گجرات کو ٹھوبہ کی حکومت پر اس لیے تبدیل کیا گیا کہ یہاں کے سرکشوں اور باغیوں کو کوئی دوسرا سردار قابو میں نہیں لاسکا تھا۔ خان جہاں ثانی ایک ہندوزادہ فیروز تغلق کا وزیر اعظم تھا اُس نے خاندان شاہی کے خلاف ایک سازش میں شریک ہوکر ظفر خاں ثانی کو جو خاندان شاہی اور سلطان کے بیٹے ناصر الدین محمد شاہ تغلق کا طرفدار تھا دھوکے سے ۷۸۹ھ میں قتل کرادیا۔ یہی قتل خاندان تغلق کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ظفر خاں ثانی نے چار بیٹے چھوڑے تھے جنکے نام ملّو خاں، سارنگ خاں، عادل خاں، محمود خاں تھے۔ جب تیمور نے ۸۰۰ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تو سارنگ خاں نے تیمور کے پوتے پیر محمد کا ملتان میں مقابلہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد بڑی بہادری سے لڑکر مارا گیا۔ لاہور میں عادل خاں نے اپنی مٹھی بھر جمعیت سے تیمور کی ۹۲ ہزار جرار فوج کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ کامیاب نہ ہوسکا مگر دوست و دشمن دونوں سے اپنی شجاعت و بہادری کا اقرار کرالیا۔ تیمور جب دہلی پہونچا تو بڑے بھائی ملّو خاں لودی المخاطب بہ اقبال خاں نے چالیس ہزار کی بھیڑ بھاڑ لیکر جسمیں تجربہ کار جنگجو کم اور دہلی کے ناتجربہ کار شہری لوگ زیادہ تھے تیمور کی ایک لاکھ بائیس ہزار فوج کا

مقابلہ کیا (چونکہ پیر محمد کی فوج بھی جنگ لاہور کے بعد شامل ہوگئی تھی اس لیے اب تیموری لشکر کی تعداد ایک لاکھ بائیس ہزار تھی) غرض ہندوستان میں تیمور کو ظفر خاں کودی ہی کی اولاد سے بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ تیمور کے بعد محمود خاں لودی الخاطب بہ اقبال خاں نے دہلی میں آکر پھر سلطنت اسلامیہ قائم کی اور خضر خاں سند عالی کو جو سارنگ خاں کا رگید اہوا مدت کے جنگلوں میں چھپا چھپا پھر رہا تھا اور تیمور کے آنے پر اسکی خدمت میں پہونچ کر ہندوستان کی سند حکومت تیمور سے حاصل کرچکا تھا دہلی پر قابض نہ ہونے دیا۔ آخر سات آٹھ سال کی فرماں روائی اور خود مختارانہ حکومت کے بعد ۱۹۔ جمادی الاول ۸۰۸ھ کو خضر خاں اور گجرات کی متحدہ فوجوں سے ملتان کے قریب لڑتا ہوا اپنے ایک ہمقوم ملک شاہ لودی ابن بہرام خاں لودی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ خضر خاں نے ملک شاہ لودی کو اس برادر کشی کے صلہ میں اسلام خاں کا خطاب دیا۔ ملتان میں خضر خاں کی حکومت مستقل ہوگئی لیکن دہلی پر پھر بھی قابض نہ ہوسکا۔

دہلی میں اقبال خاں لودی کے بھتیجے دولت خاں ابن محمود خاں لودی نے سلطنت کو سنبھالا اور آٹھ نو سال تک ایک طرف خضر خاں حاکم ملتان دوسری طرف ابراہیم شاہ شرقی پادشاہ جونپور کا کامیاب مقابلہ کرتا اور دہلی کو دونوں کی بار بار کی یورشوں سے بچاتا اور دشمنوں کو شکست دے دے کر بھگاتا رہا۔ ۸۱۵ھ میں سلطان ناصرالدین محمود جو شاہ شطرنج سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا فوت ہوا تو دہلی کے تمام امرا و شرفا و علما نے متفقہ طور پر دولت خاں لودی کو تخت سلطنت پر جلوس کرنے اور پادشاہ بننے پر مجبور کیا۔ اس طرح ۸۱۷ھ تک دولت خاں لودی سلطان دہلی رہا۔ اسکو مورخین دولت خاں اول کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آخر خضر خاں دہلی پر قابض ہونے اور دولت خاں اول کو قتل کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ خضر خاں اور اسکی اولاد کے عہد حکومت میں ملک شاہ لودی الخاطب بہ اسلام خاں نے خوب ترقی کی۔ اسی اسلام خاں لودی کا بھتیجا بہلول خاں لودی ہندوستان کا پادشاہ ہوا۔ جسکے پوتے ابراہیم خاں لودی کے عہد حکومت میں دولت خاں اول کا پوتا یا پڑپوتا دولت خاں دوم پنجاب کا صوبہ دار تھا جس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ یہ دولت خاں دوم سلطان سکندر لودی کے زمانے میں پنجاب کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ اسکے کچھ ہی رشتہ دار ملک احمد لودی کے چاروں بیٹے دولت خاں، نصرت خاں، بہادر خاں، موسیٰ خاں، لاہور آئے اور دولت خاں دوم نے انکو مناسب جاگیریں عطا کر کے نصرت خاں ابن ملک احمد لودی کے ساتھ اپنی بیٹی

کی شادی کر دی۔

خان جہاں لودی کا خاندان

نصرت خاں کے بھائی دولت خاں کو ایک دن دولت خاں دوم صوبہ دار پنجاب کی مجلس میں کسی شخص نے دولت خاں کہکر پکارا تو دولت خاں صوبہ دار اور دولت خاں ابن ملک احمد دونوں اُس طرف متوجہ ہوئے اس پر دولت خاں صوبہ دار نے کہا کہ برادرم دولت خاں یا تو میں اپنا نام تبدیل کروں یا تم اپنا نام تبدیل کرو۔ اُس نے جواباً عرض کیا کہ آپ کو اپنا نام مبارک ہو میرا دوسرا نام تجویز فرما دیجیے۔ چنانچہ دولت خاں دوم صوبہ دار پنجاب نے دولت خاں کا نام شیر خاں تجویز کیا۔ اور پھر وہ شیر خاں ہی کے نام سے موسوم رہا۔ جب دولت خاں لودی حاکم پنجاب اور ابراہیم لودی سلطان ہندوستان دونوں کی عمر و دولت ختم ہوگئی تو شیر خاں، نصرت خاں اور پہاڑ خاں تینوں بھائی پنجاب سے سفر کرکے صوبہ بہار میں پہونچے جہاں پٹھانوں کی سلطنت و حکومت ابھی باقی تھی۔ پٹنہ میں محمود خاں ابن سلطان سکندر لودی برادر سلطان ابراہیم لودی کو امرائے افاغنہ نے بادشاہ بنایا تو دولت خاں المعروف بہ شیر خاں بھی اس جدید سلطان کی فوج میں بھرتی ہوا۔ فرید خاں الملقب بہ شیر خاں بھی جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ ہوا سلطان محمود خاں لودی کے ساتھ جونپور کی طرف گیا تھا۔ اسی سفر میں ہر دو شیر خاں ایک دوسرے سے واقف اور ہمنامی کے سبب ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ جونپور کی جنگ میں سلطان محمود خاں لودی کو شکست ہوئی دولت خاں المعروف بہ شیر خاں زخمی ہوکر پٹنہ واپس آیا اور سپہ گری سے دستکش ہوکر تجارت میں مشغول ہوا۔ جب شیر شاہ نے ہمایوں کو پہلی مرتبہ بکسر کے قریب شکست دیکر بھگا دیا اور شیر خاں سے شیر شاہ بن گیا تو شیر خاں (دولت خاں) اپنے تجارت کے کاروبار کو چھوڑکر شیر شاہ کی خدمت میں آیا۔ شیر شاہ نے پُرانی دوستی و شناسائی کو مدنظر رکھکر مروت و عزت کا سلوک اور زمرۂ امرا میں شامل کیا۔ اسکے بعد مالوہ کے زمینداروں اور رئیسوں نے شیر شاہ کے پاس درخواستیں بھیجیں کہ ہم آپ کے فرماں بردار و مطیع ہیں کسی سردار کو اس طرف بھیج دیجیے کہ ہم سب اُسکے ساتھ ہوکر ہمایوں کے کارندوں کو اس ملک سے خارج کر دیں۔ شیر شاہ نے اپنے بڑے بیٹے قطب خاں کو مالوہ کی طرف روانہ کیا، اور شیر خاں کو بطور اتالیق قطب خاں کے ہمراہ بھیجا۔ چونکہ امرائے مالوہ نے خود درخواست بھیجی تھی اور ہر قسم کی جانفشانی کا اقرار کیا تھا لہذا قطب خاں کے ساتھ کوئی بڑی فوج نہیں بھیجی گئی۔ خیال تھا کہ مالوہ کی تمام فوجیں قطب خاں

کے زیرِ علم فراہم ہو جائیں گی۔ قطب خاں اور شیر خاں جب مالوہ میں پہونچے تو ہمایوں نے آگرہ سے اپنے بھائی مرزا عسکری و مرزا ہندال کو اُس طرف روانہ کیا۔ امرائے مالوہ ازراہ بدعہدی قطب خاں کو تنہا چھوڑ کر مرزاؤں کے شریک ہو گئے۔ قطب خاں سے جب اُسکے ہمراہیوں نے کہا کہ یہاں سے بھاگ چلو تو اُس نے جواب دیا کہ میرے سوا شیر شاہ کے اور بھی بیٹے موجود ہیں میرے مارے جانے سے کوئی ہرج و نقصان واقع نہ ہوگا لیکن مرزاؤں کے مقابلے سے میرا فرار ہو جانا ہمارے خاندان کی عزت کو نقصان پہونچائیگا۔ یہ کہکر وہ اپنے مٹھی بھر ہمراہیوں کے ساتھ مقابلہ پر ٹوٹ گیا۔ اور بڑی بہادری کے ساتھ مارا گیا۔ قطب خاں کے مارے جانے پر شیر خاں سے ہمراہیوں سے کہا کہ اب کیا باقی رہا ہے اپنی جان میدان سے سلامت نکال لیجیو۔ شیر خاں نے کہا میں اپنی سفید داڑھی شیر شاہ کو کیسے دکھا سکتا ہوں۔ یہ کہکر حملہ آور ہوا اور بہت سے دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر خود بھی قطب خاں کے پاس پہونچ گیا۔ شیر شاہ نے قطب خاں اور شیر خاں کے مارے جانے کا حال سنکر ٹپنہ سے شیر خاں کے چاروں بیٹوں کو بلایا جنکے نام محمود خاں، عمر خاں، قاسم خاں اور کمال خاں تھے۔ ان چاروں کو بڑی بڑی جاگیریں اور طوغ و علم و نقارہ عطا کر کے معزز و سربلند کیا۔ عمر خاں کو اپنے پاس رکھکر باقی تینوں کو اُن کی جاگیروں کی طرف رخصت کر دیا۔ بہار پور کے فاروقی فرمانروا کا سپہ سالار عالم خاں لودھا جب شیر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو شیر شاہ نے عالم خاں کی بیٹی سے عمر خاں ابن شیر خاں کی شادی کر دی۔ پھر چند روز کے بعد عمر خاں کو بھی جاگیر کی طرف رخصت کیا۔ ان چاروں بھائیوں کی نسبت کئی مرتبہ لوگوں نے شیر شاہ کی خدمت میں شکایتیں پہونچائیں۔ شیر شاہ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ ابھی تک شیر خاں کا خون مالوہ کی زمین پر خشک نہیں ہوا ہے میں اُسکے بیٹوں کو ہرگز آزردہ نہ کروں گا۔ شیر شاہ کے بعد سلیم شاہ نے عمر خاں اور محمود خاں کو اٹیہ اور قنوج و گوالیار و بیانہ و سنبھل وغیرہ کی طرف حکومت و انتظام ملکی پر مامور رکھا۔ ۹۵۶ھ میں عالم خاں لودی کی بیٹی کے پیٹ سے عمر خاں کا بیٹا دولت خاں قلعہ گوالیار میں پیدا ہوا۔ سلیم شاہ کی وفات کے بعد جب عدلی تخت نشین ہوا تو وہ عمر خاں اور اُسکے بھائیوں سے ناخوش رہا۔ آخر اُس نے محمود خاں، قاسم خاں اور کمال خاں تینوں بھائیوں کو اُنکی جاگیروں سے بیدخل کر کے چنار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ یہ سنتے ہی عمر خاں فرار ہو کر مالوہ کے کسی غیر معروف مقام میں چلا گیا۔ عدلی نے جب چنار سے ہیمو بقال کو فوج دیکر آگرہ و دہلی کی جانب روانہ کیا، تو محمود خاں، قاسم خاں،

کمال خاں، تینوں بھائیوں کو قید خانہ سے نکال کر خلعتِ فاخرہ عطا کیے اور ہر قسم کے انعام و اکرام کا متوقع کر کے ہیمو کے ساتھ روانہ کیا۔ پانی پت کے معرکہ میں محمود خاں و قاسم خاں دونوں بھائی مغلیہ فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ عمر خاں بھائیوں کے مارے جانے اور پٹھانوں کے قبضے سے سلطنت کے نکل جانے کی خبر سنکر مع اہل و عیال گجرات کی طرف روانہ ہوا اور ۹۶۳ھ میں احمد آباد پہونچکر گجرات کے مشہور سردار شیر خاں فولادی کا نوکر ہو گیا۔ عمر خاں کا بیٹا دولت خاں جب جوان ہوا تو وہ گجرات کے ایک دوسرے امیر حاجی خاں کا نوکر ہوا اور موضع اٹاوہ متصل احمد آباد دولت خاں کی تنخواہ میں بطور جاگیر مقرر ہوا۔ ۹۸۰ھ میں جب اکبر کی فوجوں نے گجرات پر حملہ کیا تو میدان جنگ میں شیر خاں فولادی کے بیٹے محمد خاں کے ہمراہ عمر خاں بھی مارا گیا اُسوقت دولت خاں کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔

مسند عالی دولت خاں سوم

جب گجرات پر مغلوں کا قبضہ ہوا تو دولت خاں احمد آباد سے سورت چلا گیا۔ سورت کے راجہ نے دولت خاں کے ساتھ عزت و تکریم کا برتاؤ کیا اور اُسکو اپنے زمرۂ مصاحبین میں داخل کر لیا۔ شاہ ابو تراب محاسب گجرات نے ۹۸۳ھ میں دولت خاں کو سورت سے بلوا کر خان اعظم مرزا عزیز کوکہ صوبہ دار گجرات کی خدمت میں پیش کیا۔ مرزا عزیز کوکہ نے دولت خاں کو اپنی مصاحبت میں داخل کر کے پرگنہ جھالا واڑ جاگیر میں عطا کیا۔ جب گجرات سے مرزا عزیز کو آگرہ طلب کیا گیا تو مرزا کے ساتھ دولت خاں بھی ہمسفر ہوا۔ راستہ میں بمقام سروہی کے قریب راجپوتوں کی ایک زبردست جماعت نے مرزا عزیز کے قافلہ پر اچانک حملہ کیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور بظاہر بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دولت خاں نے اُسوقت بڑا کام کیا اور تنہا راجپوتوں کے سپہ سالار سے جا بھڑا۔ اگرچہ خود بھی زخمی ہوا مگر راجپوتوں کے اس سردار کو قتل کر دیا۔ سردار کے قتل ہوتے ہی راجپوت بھاگ گئے۔ اور مرزا عزیز نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اُسی وقت دولت خاں کو دو ہزار روپیہ اور ایک گھوڑا انعام دیا۔ دار السلطنت پہونچکر دولت خاں کے اس کارنامہ کا حال بادشاہ کو سنایا۔ اکبر نے دولت خاں کو اپنے سامنے بلوایا تو اُسوقت تک اُسکے چہرہ کا زخم پورے طور پر مندمل نہ ہوا تھا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر اپنے کاندھے سے طوسی دوشالہ اُتار کر دولت خاں کو دیا۔ چند روز کے بعد مرزا عزیز کوکہ نے بادشاہ سے ناراض ہوکر امارت ترک کی اور گوشہ نشین ہو گیا۔ دولت خاں نے اس حالت میں بھی مرزا عزیز کی رفاقت ترک نہیں کی۔ مرزا عزیز نے عبدالرحیم

ابن بیرم خاں المخاطب بہ مرزا خاں کو جو ابھی تک خان خاناں نہیں ہوا تھا اپنے پاس بلوایا۔ دولت خاں کا ہاتھ پکڑ کر مرزا خاں کے سپرد کیا اور کہا کہ "یہ ایک امانت ہے جو تم کو سپرد کرتا ہوں اسکے حال سے کبھی غافل نہ ہونا اور ہمیشہ اسکے ساتھ بھائیوں کی طرح سلوک کرنا"۔ مرزا خاں نے بیحد خوشی کا اظہار کیا اور دولت خاں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ بھائیوں سے بڑھ کر عزیز رکھا اور کبھی اُسکو ناراض ہونے کا موقع نہ دیا۔ ۹۸۳ھ میں دولت خاں کا تعلق مرزا عبدالرحیم کے ساتھ قائم ہوا۔ ۹۸۵ھ میں اکبر نے شہباز خاں کمبوہ اور مرزا خاں کو اودیپور میواڑ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ رانا پرتاب بانسواڑہ کے پہاڑوں میں بھاگ گیا اور کوبھلمیر و اودیپور پر شاہی فوج کا قبضہ ہوا۔ اس معرکہ میں سب سے زیادہ دولت خاں نے خدمات شایستہ انجام دیں۔ پھر ۹۹۱ھ میں اکبر نے مرزا عبدالرحیم کو مظفر گجراتی کے خلاف گجرات پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس معرکہ میں دولت خاں ہی نے مرزا عبدالرحیم کو سنبھالا اور وہ رستمانہ حملے کیے کہ تمام دشواریاں آسانی سے تبدیل ہو گئیں۔ اسی فتح گجرات کے صلے میں مرزا عبدالرحیم کو خان خاناں کا خطاب اور پنجہزاری منصب ملا۔ اسکے بعد سندھ کی تسخیر میں دولت خاں سے وہ بہادری وصف شکنی ظہور میں آئی کہ بادشاہ نے خوش ہو کر دوہزاری منصب عطا کیا اور سندھ کے قصبات دولت خاں کے نام پر لکھے گئے۔ شہزادہ مراد دکن کی فتح پر مامور ہوا تو خان خاناں کو شہزادہ کا اتالیق بنا کر بھیجا گیا۔ دولت خاں خانخاناں کے ہمراہ تھا اور خانخاناں کوئی کام دولت خاں کے مشورہ بغیر نہیں کرتا تھا۔ مراد کے مرنے پر اُسکے بھائی شہزادہ دانیال کو بادشاہ نے دکن کا ناظم مقرر کیا۔ اور خانخاناں و دولت خاں اس شہزادے کی اتالیقی پر بھی مامور ہوے۔ شہزادہ دانیال خانخاں کا داماد بھی تھا۔ شہزادہ نے یہ دیکھکر کہ دولتخاں سے بڑھ کر بہادر اور صائب الرائے دوسرا تلاش نہیں کیا جا سکتا خانخاناں سے فرمایش کی کہ دولتخاں کو میری سرکار سے متعلق کر دو۔ خانخاناں نے اول عذر کیا لیکن جب شہزادہ نے اپنی بیوی یعنے خانخاناں کی بیٹی سے بہت زور ڈلوایا اور خود بھی مسلسل اصرار کرتا رہا تو خانخاناں نے مجبور ہو کر کہا کہ یہ معاملہ دولت خاں کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں۔ دولت خاں سے کہا گیا تو اُس نے کہا کہ خانخاناں کو اختیار ہے کہ وہ مجھ کو اپنے پاس سے جدا کر دے لیکن میں خود اُس سے جدا ہونے کی خواہش کبھی نہ کروں گا۔ آخر بڑی رد و کد کے بعد ماہ صفر ۱۰۰۹ھ میں دولتخاں شہزادہ کے متوسلین میں شامل ہوا۔ شہزادہ دانیال نے دولت خاں کو حاصل کر کے ایسی خوشی کا اظہار کیا جیسے کسی بڑی عظیم الشان سلطنت پر قبضہ پایا۔ شہزادہ نے دولتخاں کو سند عالی

کا خطاب دیکر اپنے تمام کاموں کا مدار المہام اور مختار کل بنا دیا۔ اس کے بعد اکبر خود برہان پور گیا اور شہزادہ دانیال کو احمد نگر سے برہان پور طلب کیا تو وہ دولت خاں کو احمد نگر چھوڑ کر خود باپ کی خدمت میں برہان پور حاضر ہوا۔ ۲۸ شعبان ۱۰۰۹ھ کو مسند عالی دولت خاں کا احمد نگر میں انتقال ہوا۔ باون سال کی عمر پائی۔ جنازہ برہان پور میں لاکر دفن کیا گیا۔ یہی مسند عالی دولت خاں ابن عمر خاں ہے جسکو مورخین "دولت خاں سوم" کہتے ہیں۔ اگر دولت خاں سوم کے دادا کا نام دولت خاں کی جگہ شیر خاں مشہور نہ ہوا ہوتا تو اسکو دولت خاں سوم اور اسکو دولت خاں چہارم کہا جاتا۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کہا کرتا تھا کہ "ہر شخص میں خواہ کتنی ہی خوبیاں ہوں مگر کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے لیکن دولت خاں ایسا شخص ہے کہ مجھ کو سوائے خوبیوں کے کوئی عیب اس میں نظر نہ آیا۔ ہاں اگر کوئی عیب دولت خاں سے منسوب ہی کرنا پڑے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہمت رکھتا ہے سو یہ ایسا عیب ہے کہ اس پر ہزار خوبیاں قربان کی جا سکتی ہیں"۔ مسند عالی دولت خاں نے دو جوان بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ ایک کا نام محمد خاں اور دوسرے کا نام پیر خاں تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی مہارہات دکن میں باپ کے ساتھ بڑی بڑی بہادریاں دکھائی تھیں اور فنون سپہگری کے علاوہ علم و فضل سے بھی بے بہرہ نہ تھے شہزادہ دانیال نے ان دونوں کو اپنی مصاحبت میں داخل کرکے ہر قسم کی رعایت و تربیت انکے حال پر مبذول رکھی۔ محمد خاں ابن دولت خاں ۱۰۱۱ھ میں ایک بیٹا خضر خاں نامی چھوڑ کر فوت ہو گیا۔ اب مسند عالی دولت خاں کا صرف ایک بیٹا پیر خاں باقی رہا۔ یہی پیر خاں ابن دولت خاں ہے جو بعد میں خانجہاں کے خطاب سے مخاطب ہو کر آج تک خاں جہاں لودی کے نام سے مشہور رہا اور اس نگارش کا موجب ہے۔

خان جہان لودی

۱۰۰۹ھ میں پیر خاں ابن دولت خاں لودی شہزادہ دانیال کی مصاحبت میں داخل ہوا پیر خاں کی قابلیت و اہلیت نے بہت جلد شہزادہ کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اور اس نے بیٹے کو باپ کا نعم البدل پاکر اس کے اختیار و اقتدار میں اضافہ کرکے دولت خاں کی ذمہ داریاں اسکے سپرد کر دیں۔ یکم ذیحجہ ۱۰۱۳ھ کو شہزادہ دانیال کا دکن میں انتقال ہوا۔ اسکے ساڑھے چھ مہینے بعد ۱۳ رجادی الثانی ۱۰۱۴ھ کو اکبر بھی فوت ہو گیا۔ شہزادہ سلیم نے جو اکبر کے بعد جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا ۱۰۱۳ھ میں جبکہ شہزادہ دانیال زندہ تھا دو مرتبہ پیر خاں کے پاس پیغام بھیجے کہ تم ہمارے پاس چلے آؤ۔

غالباً جہانگیر پیر خاں کو اس لیے اپنے پاس بلانا اور شہزادۂ دانیال سے جدا کرنا چاہتا ہوگا کہ شہزادۂ دانیال ہی تخت سلطنت کے لیے جہانگیر کا رقیب اور مدمقابل بن سکتا تھا۔ پیر خاں کی بہادری اور قابلیت کی شہرت جہانگیر تک پہونچ چکی تھی۔ اُس نے ہر قسم کے لالچ دیے مگر پیر خاں نے شہزادۂ دانیال سے جدا ہونا پسند نہ کیا۔ جب اکبر کا انتقال ہوا تو خانخاناں اور پیر خاں دونوں برہان پور میں موجود اور معاملات دکن کے سلجھانے میں مصروف تھے۔ مرزا عزیز اور مان سنگھ دونوں جہانگیر کی تخت نشینی کے مخالف اور جہانگیر کے بیٹے خسرو کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ خسرو مان سنگھ کا بھانجا اور مرزا عزیز کا داماد تھا۔ اگر شہزادہ دانیال زندہ ہوتا تو خانخاناں دانیال کی تخت نشینی کے لیے جہانگیر کے خلاف ضرور کوشش کرتا اور پیر خاں کو بھی اس کوشش میں حصہ لینا پڑتا۔ لیکن خانخاناں اور پیر خاں کو دانیال کی وفات نے اس مصیبت سے پہلے ہی نجات دیدی تھی۔ جہانگیر کو بھی اب خانخاناں یا پیر خاں سے کوئی اندیشہ نہ رہا تھا لہذا اُس نے تخت نشیں ہوتے ہی خانخاناں کے پاس مہاتِ دکن کے اہتمام کی سند اور خلعت بھیجکر پیر خاں کو اپنی خدمت میں طلب کیا۔ خانخاناں نے شاہی ایلچیوں کے ہمراہ عرضداشت بھیجی کہ پیر خاں کا اسوقت یہاں سے جدا ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ جہانگیر چونکہ عرصہ سے پیر خاں کو اپنے پاس بلا رہا تھا اس لیے خانخاناں کی درخواست پڑھ کر آتش شوق اور بھی تیز ہوئی۔ دوبارہ تاکیدی حکم بھیجا گیا کہ بلا توقف پیر خاں کو ہمارے پاس بھیجدو۔ اس حکم کے پہونچنے پر پیر خاں برہان پور سے روانہ ہوا۔ اور لاہور میں جبکہ جہانگیر خسرو کو گرفتار کرکے مع اپنے وغیرہ کو سزا دے چکا تھا، جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہانگیر پیر خاں کے آنے سے بہت خوش ہوا۔ صلابت خاں کا خطاب اور دو ہزاری منصب عطا کیا۔ اسکے بعد جہانگیر کابل کی طرف روانہ ہوا اور پیر خاں لودی المخاطب بہ صلابت خاں کو ہمراہ لے گیا۔ اس سفر میں ہر روز جہانگیر کا التفات صلابت خاں کی نسبت بڑھتا گیا۔ کابل سے لاہور واپس آکر جہانگیر نے صلابت خاں کو پنجہزاری منصب اور خانجہاں کا خطاب عطا کرکے اپنی فرزندی سے بھی مفتخر کیا۔ چنانچہ بادشاہ نے خود تصنیف فرماکر اپنے قلم سے ایک کاغذ پر یہ سجع لکھا ؎

"فرزند خاص شاہ شد از قدسیہ الہٰ
خانِ جہان مرید جہانگیر بادشاہ

پھر ملا احمد مُہرکن کو طلب فرماکر حکم دیا کہ اس سجع کو انگوٹھی کے نگینہ پر کندہ کرکے لاؤ۔ ملا احمد انگوٹھی

تیار کر کے لایا تو بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے وہ انگوٹھی جس پر سجع مذکور کندہ تھا خان جہاں کو عطا کی خان جہاں کے حال پر اس قدر شفقت و عنایت مبذول دیکھ کے بعض حاسدوں نے بادشاہ سے تنہائی میں موقع پاکر عرض کیا کہ ایک افغان کو ایسا بلند مرتبہ عطا کرنا اور فرزندی کے مقام رفیع تک پہونچانا احتیاط و عقل کے خلاف ہے۔ جہانگیر پر اسکا اثر اُلٹا ہوا۔ اُس نے اگلے روز دربار میں خان جہاں کو خلعتِ خاص، اسپ خاص، تسبیح جواہر، کمر دخنجر مرصع، شمشیر مرصع عطا کر کے تمام امیروں اور وزیروں سے اونچے مرتبے پر بٹھایا۔

دارالسلطنت آگرہ میں پہونچکر جہانگیر نے خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ تمام امرائے بادشاہ کے اس ارادہ کی تائید و توثیق و تصویب کی۔ خانجہاں اس مجلس میں شریک نہ تھا اور شاید دانستہ شریک نہیں کیا گیا تھا۔ بادشاہ کے اس ارادے کا حال سُن کر خود بادشاہ کی خدمت میں پہونچا اور نہایت آزادی کے ساتھ عرض کیا کہ "خان اعظم کی ماں جیجی نے آپ کے باپ کو دودھ پلایا ہے۔ خان اعظم کے باپ شمس الدین محمد خاں اتگہ نے اُسوقت جبکہ سلطنت خطرے میں تھی بیرم خاں کو شکست فاش دے کر سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کیا۔ اسی کارنامے نے اُسکے حاسدوں کو اُسکی جان لینے پر آمادہ کیا اور وہ آپ کے باپ پر قربان ہوگیا۔ مرزا عزیز کوکہ کے کارنامے اور بادشاہ اکبر کا اُسکی نازبرداریاں کرنا کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مرزا عزیز آپ کا چچا اور آپ کے لیے عزت و عظمت کا مقام ہے۔ اُسکی کسی اضطراری غلطی پر سخت گیری یا سنگدلی کا برتاؤ کرنا ہرگز آپ کے شایانِ شان نہیں"۔ بادشاہ پر خانجہاں کی گفتگو کا بڑا اثر ہوا اور اُسی وقت مرزا عزیز المخاطب بہ خانِ اعظم کی تمام لغزشوں کو معاف فرماکر ہفت ہزاری منصب اور خلعت و اسپ عطا کیا۔

عبدالرحیم خانخاناں اگرچہ جہانگیر کی تخت نشینی کے وقت جہانگیر کا مخالف و مزاحم نہ تھا، اور نہ وہ دارالسلطنت آگرہ میں اُسوقت موجود تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں پہلے تک وہ جہانگیر کی تخت نشینی کے خلاف تھا لہذا کچھ دنوں بعد جہانگیر کے انتقامی جذبہ میں تحریک پیدا ہوئی اور اُس نے خانخاناں کا پنجہزاری منصب اور تمام سامان اِمارت اور جاگیر وغیرہ ضبط کر کے اُسکو نظر بند کرنا چاہا۔ امرائے دربار بھی خانخاناں کے مخالف و بدخواہ تھے اور اگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی بھی تھی تو اس قدر جرأت نہ تھی کہ خانخاناں کی نسبت کلمۂ خیر زبان تک لاسکے۔ اس نازک موقع پر جبکہ زمین و آسمان سب خانخاناں کے مخالف نظر آرہے تھے، خانجہاں لودی نے

اپنی شرافت و انسانیت کا اظہار اس طرح کیا کہ نہایت بیباکانہ و آزادانہ لہجہ میں سر دربار بادشاہ سے عرض کیا کہ "خانخاناں خاندان سلطنت کا قدیمی پروردہ و تربیت کردہ ہے اُسکو ذلیل و رسوا کرنا اور اذیت پہونچانا ہرگز شان شاہانہ کے شایاں نہیں"۔ پھر یہ شعر پڑھا کہ ؎

"چوب را آب فرو می نبرد از پئے آنکہ
شرم دارد ز فرو بردن پروردۂ خویش"

خانجہاں کے کلام نے تازیانہ کا کام کیا اور جہانگیر کے دل میں عفو و درگزر کی صفت حسنہ نے فوراً واپس آکر خانخاناں کے منصب و جاگیر کو بدستور بحال رکھا اور وہ دکن کی نظامت پر مامور ہوا۔

اسکے بعد جہانگیر دوبارہ خانخاناں سے ناراض ہوا اس لیے کہ اُسنے عنبر حبشی کے ساتھ دوستی پیدا کرکے جالنہ وغیرہ چند پرگنے بخوشی عنبر کو دیدیے تھے۔ خانخاناں آگرے میں طلب ہوا۔ اور قریب تھا کہ اُسکو عبرتناک سزا دی جائے اس مرتبہ بھی خانجہاں نے ہی اپنی جان پر کھیل کر خانخاناں کی سفارش کی۔ اور ایسے لطیف و عاقلانہ انداز سے بادشاہ کو سمجھایا کہ اُسکا تمام غیظ و غضب فرو ہوگیا۔ اور خانجہاں سے خانخاناں کی ضمانت لیکر اُسے پھر دکن کی نظامت پر بھیجدیا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ خانجہاں لودی کے باپ دولت خاں سوم کا مرزا عزیز اور مرزا عبدالرحیم سے کس قسم کا تعلق تھا۔ خانجہاں نے اپنے باپ کے ان دونوں قدردانوں اور محسنوں کے حقوق کو بخوبی ادا کیا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ جہانگیر نے جب راجہ مان سنگھ کے استیصال کا ارادہ کیا تو کسی کو بھی وہم و گمان نہ تھا کہ مان سنگھ کی سفارش کے لیے کوئی شخص اپنی زبان کھول سکے گا۔ مان سنگھ ہی وہ شخص تھا جس نے جہانگیر کو محروم رکھ کر خسرو کو اکبر کے بعد تخت نشین کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی تھیں۔ اُسی نے خان اعظم مرزا عزیز کوکلہ کو بہکا کر اپنا ہمخیال اور شریک کار بنایا تھا۔ جہانگیر کے دل میں مانسنگھ کی جانب سے سخت نفرت تھی اور وہ راجپوتوں سے بہت بدگمان ہوگیا تھا۔ دربار جہانگیری میں کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو مانسنگھ کی نسبت کلمۂ خیر کہہ سکے۔ لیکن اس موقع پر بھی خانجہاں لودی ہی آگے بڑھا۔ اور اُس نے مان سنگھ کے اُن تمام کارناموں اور جاں فروشیوں کی داستان سنائی جو اکبر کے عہد حکومت میں اُس سے ظہور میں آئی تھیں۔ ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی توجہ

دلائی کہ پادشاہ کے لیے اور سلطنت کے استحکام و رونق کے لیے بھی عفو کا نتیجہ انتقام سے بدرجہا بہتر ثابت ہوگا۔ چنانچہ جہانگیر نے مان سنگھ کے قتل کا ارادہ ترک کرکے اُسکو دکن کی جانب ایک مناسب جاگیر دے کر رخصت کردیا اور وہ وہیں فوت ہوا۔ گویا خان جہاں لودی نے ہر شاہی معتوب کی سفارش کرنے اور ہر معزز شخص کی عزت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ اگر خانجہاں لودی نہ ہوتا تو جہانگیر مذکورہ ہر سہ امیروں (خان اعظم مرزا عزیز کوکہ، عبدالرحیم خانخاناں، راجہ مانسنگھ) کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرکے ہندوستان کے نہایت بدنام پادشاہوں میں شامل ہوچکا ہوتا خان جہاں لودی کے ان کارناموں اور اُسکے اُس اثر و اقتدار کو جو دربار جہانگیری میں اُس کو حاصل تھا عہد شاہجہانی کا کوئی مورخ اس لیے مفصل بیان نہیں کرسکا کہ شاہجہاں کے زمانہ میں خانجہاں لودی کو دشمنِ سلطنت اور باغی و طاغی قرار دیا جاچکا تھا جیسا کہ آگے یہ دلخراش داستان بیان ہونے والی ہے۔ مذکورہ حالات زیادہ تر عہد جہانگیر کی تصنیف شدہ مخزن افغانی مصنفۂ حبیب اللہ ہروی سے ماخوذ ہیں۔ دکن کی سلطنت نظام شاہی اور سلطنت دہلی کے تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے تھے۔ جہانگیر نے شہزادہ پرویز کو دکن کی جانب روانہ کیا لیکن شہزادہ کو رخصت کرنے کے بعد کسی زبردست سپہ سالار اور صاحب تدبیر شخص کا اُس طرف بھیجنا ضروری محسوس ہوا۔ امرائے دربار خان جہاں لودی کے اثر و اقتدار کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے اور اُسکو پادشاہ سے جدا رکھنا چاہتے تھے سب نے یکزبان ہوکر مشورہ دیا کہ خان جہاں سے بہتر کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دکن کی مہمات کو بحسن و خوبی انجام دے سکے۔ یہ مشورہ غلط اور حقیقت کے بھی خلاف نہ تھا اور خان جہاں کے مانند کوئی دوسرا شخص دارالسلطنت میں موجود نہ تھا جہانگیر نے با دل ناخواستہ خان جہاں کو اپنے پاس سے جدا کرنا گوارا کیا اور خانجہاں شروع ۱۰۱۹ھ میں شہزادۂ پرویز کے پاس برہان پور پہونچکر مہمات دکن میں شریک ہوا۔ ۴ ماہ صفر ۱۰۱۹ھ کو ملکاپور کے میدان جنگ میں خانجہاں اور اُس کے بھتیجے خضر خاں نے دکنی لشکر کے مقابلہ میں رستم و اسفندیار کے کارناموں کو تازہ کرکے دکھایا اور دکن میں سلطنت دہلی کی دھاک بٹھادی۔ عبدالرحیم خانخاناں بطور اتالیق شہزادہ کے ہمراہ تھا لیکن ابھی تک کسی سے کچھ نہ ہوسکا تھا۔ خانجہاں کے پہونچتے ہی مہمات دکن کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ نظام الملکی لشکر کو جب خان جہاں کے مقابلے میں پے در پے چند شکستیں ہوئیں تو عنبر جی حبشی کی جانب سے صلح کی درخواست آئی۔ خان جہاں لودی اور شہزادہ پرویز اگرچہ صلح پر رضامند نہ تھے لیکن خانخاناں اور دوسرے امرائے لشکر صلح پر آمادہ ہوگئے اور عنبر جی حبشی نے

بالاگھاٹ اور جالنہ وغیرہ کئی پرگنے دیکر اور دیکر صلح کرلی - اس صلح کے بعد شہزادہ مع خانخاناں وخان جہاں برہان پور آگیا جو اُس زمانے میں ناظم دکن کا مستقر حکومت تھا - ۹ر ماہ رجب ۱۰۱۹ھ کو مہابت خاں بادشاہ کا فرستادہ پہونچا اور خان خاناں کو شاہی حکم پہونچا یا کہ فوراً اپنی تمام ذمہ داریوں کا چارج خانجہاں کو سپرد کرکے آگرہ پہونچو - چنانچہ عبد الرحیم خان خاناں شہزادہ کی اتالیقی اور دکن کی تمام ذمہ داریاں خان جہاں کو سپرد کرکے مہابت خاں کے ہمراہ آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ خان جہاں پونے دو سال تک شہزادہ کا اتالیق اور صوبجات دکن وبرار کا ناظم وفرماں روا رہا۔ ۲ - ربیع الاول ۱۰۲۱ھ کو ارادت خاں المخاطب بہ خان اعظم شاہزادہ کی اتالیقی پر مامور ہوکر برہانپور آیا اور خان جہاں بدستور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ پر قائم رہا - ۱۹ر شعبان ۱۰۲۱ھ کو برہان پور سے خان اعظم شہزادہ پرویز کو ہمراہ لیکر دولت آباد کی جانب روانہ ہوا - جہانگیر نے حکم دیا تھا کہ برسات کے گزرنے اور سہیل کے طلوع ہونے کے بعد برہانپور کا لشکر شمال ومشرق کی جانب سے اور عبداللہ خاں فدوی حاکم گجرات مع علی مرداں خاں وخان عالم شمال ومغرب کی جانب سے دولت آباد پر حملہ آور ہوں - اسی قرارداد کے موافق خان اعظم برہانپور سے روانہ ہوا - لیکن احمد نگر کی نظام شاہی فوجوں نے صوبہ خاندیس پر حملہ آوری شروع کردی تھی لہذا صوبۂ خاندیس کی حفاظت کے لیے خانجہاں مقرر ہوا - خان جہاں نے موضع روہکھیڑ کے قریب نظام شاہی فوجوں کو شکست فاش دیکر دکنی لشکر کی کمر توڑدی اور صرف میں روز کے عرصہ میں خاندیس اور سرحدات خاندیس سے حملہ آوروں کو بھگا کر اس طرف کے خطرہ کا قابل اطمینان سد باب کردیا - اور یہاں سے روانہ ہوکر شہزادہ سے جو باہستگی دولت آباد کی طرف بڑھ رہا تھا جاملا - وہاں جاتے ہی یہ خبر سنی کہ عنبر حبشی نے یعقوب خاں حبشی اور آدم خاں کو بیس ہزار سواروں کے ساتھ بالاگھاٹ سے خاندیس پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا ہے - یہ سنتے ہی خان جہاں لودی بالاگھاٹ کی جانب اس ارادہ سے روانہ ہوا کہ مذکورہ نظام شاہی فوج کو شکست دیکر اس طرف سے دولت آباد کی جانب روانہ ہو جائے گا - اس یلغار میں راجہ مان سنگھ وسورت سنگھ بھی خانجہاں لودی کے ہمراہ تھے - بالاگھاٹ کے قریب پہونچکر دکنیوں کے لشکر کو شکست فاش دیکر خان جہاں دولت آباد کی جانب روانہ ہوا - دولت آباد پر حملہ کرنے کی تاریخ پہلے سے مقرر ہوچکی تھی کہ اسی روز عبداللہ خاں فدوی اور خان جہاں ہردو جانب سے حملہ آور ہونگے - خان جہاں بالاگھاٹ سے روانہ ہوکر دولت آباد کی جانب ایسے وقت روانہ ہوچکا تھا کہ مقررہ تاریخ پر وہاں عنقریب پہونچ جاتا

لیکن ایک قدرتی رکاوٹ یہ پیش آگئی کہ راستہ میں نہایت سخت بارش ہوئی اور دو تین دن لشکر کو مجبوراً مقام کرنا پڑا - بارش نے جب ذرا مہلت دی تو دولت آباد کی طرف کوچ ہوا عبداللہ خاں فدوی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خان جہاں لودی ابھی دولت آباد کے قریب نہیں پہونچا اور دو تین روز کا تامل ضروری ہے . لیکن اس نے محض اس شوق میں کہ دولت آباد کی فتح تنہا میری کوشش سے حاصل ہو، خان جہاں کا انتظار نہ کیا اور بڑھا چلا آیا - دولت آباد سے بارہ کوس کے فاصلہ پر موضع بھنیا پور میں عنبر حبشی سے مقابلہ ہوا - عبداللہ خاں شکست کھا کر بھاگا - علی مردان خاں اور مرزا برخوردار خاں المخاطب بہ خان عالم دونوں سردار زخمی ہو کر گرفتار ہو گئے خانجہان لودی دولت آباد سے ۴۲ کوس کے فاصلہ پر پہونچا تھا کہ اسکو عبداللہ خاں کے شکست کھا کر فرار ہونے اور مذکورہ دونوں سرداروں کے زخمدار و گرفتار ہو جانے کا حال معلوم ہوا - اسی جگہ خان اعظم بھی مع فوج خانجہاں سے آملا - اور شہزادہ پیچھے ملکاپور میں مقیم رہا - لشکر گجرات یعنی عبداللہ خاں کی شکست اور علی مردان خاں و خان عالم کی گرفتاری کا حال سنکر لشکر شاہی اور سرداران لشکر کے حوصلے پست ہو گئے - سب نے یہی مناسب سمجھا کہ برہان پور کی طرف واپس لوٹ چلیں کیونکہ دشمن کی فوج بہت زیادہ اور لشکر شاہی کے لیے سامان رسد کا کوئی بند وبست نہیں ہے - خان جہاں لودی نے واپسی سے قطعاً انکار کیا اور کہا کہ تم سب واپس چلے جاؤ میں تنہا اپنے ذاتی آدمیوں کے ساتھ دشمن پر حملہ کروں گا - اس اختلاف نے بہت طول کھینچا - نوبت یہاں تک پہونچی کہ خان اعظم، مان سنگھ، نرسنگدیو بندیلہ، خواجہ ابوالحسن وغیرہ تمام سردار خانجہاں لودی کے خیمہ میں آئے اور سب نے مل کر منت سماجت کے ساتھ واپسی پر آمادہ کرنا چاہا مگر خانجہاں کسی طرح رضامند نہ ہوا - اسی اصرار و انکار میں تین دن گزر گئے اور نظام شاہی فوج کے بعض دستے لشکرگاہ کے قریب پہونچکر شوخی دکھانے لگے جن کو شکست دے دے کر بھگا دیا تھا - اس قضیہ کو طے کرنے اور خان جہاں کو واپس لیجانے کے لیے مان سنگھ، خواجہ ابوالحسن اور دوسرے سرداروں نے یہ تدبیر سوچی کہ دستاویز تیار کی جائے اور چنانچہ اس مضمون کی دستاویز لکھی گئی کہ خانجہاں واپسی پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے ہم مفادِ سلطنت اور شاہی مقاصد کو مد نظر رکھ کر مصلحت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہاں سے واپس لوٹ چلیں اور دولت آباد کی طرف ہرگز قدم نہ بڑھائیں - ہم سب مجبور کر کے خانجہاں کو واپس لیے جاتے ہیں اگر ہماری اس واپسی کو بادشاہ نے ناپسند کیا تو ہم ہی شاہی عتاب کے مورد

ہوں گے خانجہاں پر اسکا کوئی اثر نہ ہوگا - یہ تحریر بطور دستاویز خان جہاں کو سپرد کی جاتی ہے۔
جب سب کے دستخطوں سے مکمل ہوکر یہ تحریر خان جہاں کے روبرو پیش ہوئی تو وہ واپسی پر آمادہ
ہوا - لیکن ابھی کوچ نہ ہوا تھا کہ ملکاپور سے شاہزادہ کی تحریر پہونچی کہ احمدنگر کی نظام شاہی حکومت
نے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے ذریعے صلح کی درخواست بھیجی ہے اور دربار بیجاپور سے
سفارت ہمارے پاس پہونچی ہے - عارضی طور پر جنگ ملتوی کرکے تمام سردار وامرا مع فوج
ملکاپور واپس آجائیں تاکہ صلح کے معاملے میں مشورہ کیا جاسکے - چنانچہ سب ملکاپور پہونچے اور
صلح نامہ مرتب ہوا - اسی قصبۂ ملکاپور میں جبکہ صلحنامہ کی تحریر وتکمیل ہو رہی تھی ۲۰ رماہ محرم ۱۰۲۰ھ
کو حبیب اللہ ہروی، خان جہاں لودی کے ملازم نے کتاب مخزن افغانی لکھنی شروع کی اور ۱۰ محرم
۱۰۲۱ھ کو برہان پور میں یہ کتاب ختم کی - صلحنامہ کی تحریر وتکمیل کے بعد شہزادہ پرویز ملکاپور سے روانہ
ہوکر آخر ماہ محرم ۱۰۲۰ھ کو مع امرا برہان پور پہونچ گیا - ماہ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ تک خان جہاں
لودی برہان پور میں شہزادہ پرویز کے ہمراہ رہا - ۲ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ کو شاہی حکم کے بموجب
خان جہاں لودی صوبۂ برار کا گورنر مقرر ہوکر برہان پور سے ایلچ پور کی جانب روانہ ہوا - پادشاہ
جہانگیر نے صوبۂ برار کی گورنری کا فرمان اپنے قلم سے لکھ کر مع خلعت وشمشیر روانہ کیا تھا - اس زمانہ
میں صوبۂ برار سرحدی صوبہ تھا اور اس صوبہ کی حکومت پر سب سے زیادہ ذی ہوش ومعتمد اور طاقتور
شخص کی ضرورت تھی - اسی سال بماہ شعبان شب جمعہ ایلچپور میں خان جہاں کو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی - خان جہاں نے صبح بیدار ہوکر اس خوشی میں اپنا تمام مال و
اسباب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کردیا - ایلچپور میں خان جہاں ذیحجہ ۱۰۲۲ھ تک مقیم رہا -
اور اس سرحدی صوبے کا نہایت اچھا انتظام کیا - یہاں اسکے پاس بہت سے علما وصلحا وصوفیا
جمع ہوگئے تھے - اس نے اپنے اوقات کا بڑا حصہ عالموں اور باخدا لوگوں کی صحبت میں گزارا -
ایلچپور میں جہانگیر کا شقہ جو پادشاہ نے اپنے قلم سے لکھا تھا خان جہاں کے پاس پہونچا جسکے الفاظ
یہ تھے :-

"فرزند سعادت مند صاحب اقبال گوہر درج دولت و اجلال منظور انظار مرید با اقتدار
خان جہاں باستفاضہ انوار خاطر دانش آرائے منظور ملحوظ بودہ خاطر اشرف اقدس
مار انگران خود شناسد وچوں مہات دکن عمدۃ الملک رکن السلطنت خانخاناں سپہ سالار
وابستہ بالعقل ہمے کہ باعث توقف آں فرزند باشد درمیان نیست باید کہ خودرا متوجہ

درگاہ سازد واگر دریں باب تعلل نماید بعد ازیں بطلب او چیزے نوشتہ نخواہد شد۔"

اس شاہی شقہ کے پہونچنے پر بھگوانداس وکیل سلطنت نے جو ایلچپور میں مقیم تھا خان جہاں کو مشورہ دیا کہ شاہزادہ پرویز اور خانخاناں سے ضرور مشورہ لینا چاہیے۔ خان جہاں نے برہان پور میں شاہزادہ کو اطلاع دی۔ شاہزادہ نے خان جہاں کو فوراً لکھا کہ تم ایلچپور کو ہرگز نہ چھوڑو میں بادشاہ کو تمہاری نسبت لکھتا ہوں کہ خان جہاں کا ایلچپور سے جدا ہونا فی الحال کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ شاہزادہ کی تحریر کے دربار میں پہونچنے اور خان جہاں کے نہ آنے پر خان جہاں کے حاسدوں کو باتیں بنانے اور جھوٹی شکایتیں کرنے کا خوب موقع ملا۔ اور بادشاہ کو یقین دلایا گیا کہ خانجہاں خود ہی دربار میں آنا نہیں چاہتا کیونکہ شاہان دکن سے اس نے تعلقات دوستی قائم کر لیے ہیں۔ جہانگیر کے دل پر بدگویوں کی باتوں کا اس قدر اثر ضرور ہوا کہ اس نے خان جہاں کو برار کی صوبہ داری سے گجرات کی حکومت پر تبدیل کر دیا اور تبدیلی کے فرمان میں لکھا کہ گجرات کا صوبہ برار کے صوبے سے بہتر ہے اور وہاں کولی اور بھیل قوم کے متمردوں نے جو پہاڑوں میں مسکن گزیں ہیں سرکشی اور بے راہ روی اختیار کی ہے تم ہی وہاں پہونچ کر انکا علاج بخوبی کر سکو گے۔ چنانچہ خان جہاں ایلچپور سے روانہ ہو کر اول برہان پور شاہزادہ پرویز کی خدمت میں پہونچا۔ پھر وہاں سے گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ شاہزادہ کو خان جہاں سے بہت محبت ہو گئی تھی اور وہ اسکو اپنے پاس سے جدا کرنا نہ چاہتا تھا۔ خانجہاں نے گجرات پہونچ کر قلعہ تھالینر میں قیام کیا اور چند روز میں وہ ملک ہر قسم کے فتنوں سے پاک ہو گیا۔ خان جہاں ڈیڑھ سال گجرات میں رہا اسکے بعد شہزادۂ پرویز نے بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی کہ خان جہاں کے اب گجرات میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی میری خواہش ہے کہ خان جہاں کو میرے پاس برہانپور میں رہنے کی اجازت دیدیجائے۔ جہانگیر نے شہزادہ کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اور خان جہاں ۲۷ شعبان ۱۰۲۳ھ کو تھالینر سے روانہ ہو کر یکم رمضان کو برہان پور میں شہزادہ کے پاس پہونچ گیا۔ خان جہاں کو شاہزادۂ پرویز کے پاس برہان پور آئے ہوئے نو مہینے گزرے تھے کہ نور جہاں بیگم نے جہانگیر کو اس بات پر مجبور کیا کہ خان جہاں کو برہانپور سے دار السلطنت میں بلوایا جائے۔ چنانچہ جہانگیر نے پھر خان جہاں کو خط لکھ کر شوق ملاقات کا اظہار کیا اور اپنے پاس بلایا۔ اس مرتبہ شہزادۂ پرویز کی تمام تدبیریں اور کوششیں بیکار ثابت ہوئیں جہانگیر کی طرف سے طلبی کے فرامین پیہم پہونچے اور ۱۴ جمادی الثانی ۱۰۲۴ھ کو خان جہاں برہان پور سے اجمیر کی طرف جہاں جہانگیر مقیم تھا روانہ ہوا۔ شاہزادہ پرویز نے خان جہاں کو

بادلِ ناخواستہ بچشمِ پُرآب رخصت کیا۔ خان جہاں جب اجمیر سے دو تین منزل پر پہونچا تو جہانگیر نے شاہزادۂ خورم (شاہجہاں) کو استقبال کے لیے روانہ کیا اور خلعت و اسپ خاصہ معتمد خاص کے ذریعہ بھیجا ہوا۔ جب اجمیر سے ایک منزل پر پہونچا تو پادشاہ نے اعتماد الدولہ پدر نور جہاں و آصف خاں وزیر اعظم مہابت خاں کو جو سب سے بڑے امیر تھے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ اجمیر میں خان جہاں کے لیے نہایت شاندار خیمہ و سراپردہ استادہ کرایا گیا۔ نور جہاں نے مٹھائیاں اور فواکہات اور پادشاہ نے مطبخ خاص سے انواع و اقسام کے کھانے بھجوائے۔ لحظہ بلحظہ پادشاہ کی طرف سے کوئی نہ کوئی تحفہ پہونچتا رہا۔ نماز عصر کے بعد خان جہاں پادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پادشاہ نے دُور سے دیکھتے ہی فرمایا کہ "بابا خان جہاں خوش آمدی پیش بیا" جب خان جہاں تخت شاہی کے قریب پہونچا تو پادشاہ نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہوکر خان جہاں سے معانقہ کیا اور اُسکی پیشانی کو بوسہ دیا پھر نہایت محبت اور خصوصی التفات کے ساتھ حالات سفر اور خیریت دریافت کرتا رہا۔ خان جہاں نے نذرانے اور تحفے جو بہت قیمتی تھے پیش کیے۔ رات کو پھر پادشاہ نے صحبت خاص میں طلب کیا اور ہر قسم کی گفتگو دیر تک ہوتی رہی۔ (یہاں تک خان جہاں لودی کے جو حالات لکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر حبیب اللہ ہروی مصنف مخزن افغانی کی تحریر سے ماخوذ ہیں جو چشم دید راوی اور عینی شاہد ہے۔ حبیب اللہ ہروی کا بیان خانجہاں کو جہانگیر کے پاس بمقام اجمیر پہونچا کر ختم ہوجاتا ہے اور یہیں تک خان جہاں کے عروج و اقبال کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ آگے چل کر زوال شروع ہونے والا ہے)

خانجہاں کی زندگی کا نصف آخر

خان جہاں لودی ایک بہادر، باوفا، اور یکرنگ و یک رُخ انسان تھا۔ دربار سلطنت اس زمانے میں سازشوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ آصف خاں وزیر اعظم چاہتا تھا کہ جہانگیر کے بعد اُسکا داماد شاہزادۂ خورم (شاہجہاں) تخت نشیں ہو۔ اُسکی بہن نور جہاں بیگم جو سلطنت کے کاموں میں دخیل اور جہانگیر کے دل پر قابض تھی، شہزادۂ شہریار کو جہانگیر کے بعد پادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ شہزادۂ پرویز کو خود جہانگیر نے ولیعہد بنایا تھا اور خان جہاں لودی و خان خاناں وغیرہ امرا اُسکے طرفدار تھے۔ نور جہاں نے خان جہاں کو برہانپور سے اسلیے بلوایا تھا کہ اُس پر اثر ڈال کر شہریار کا ہوا خواہ و معاون بنائے۔ آصف خاں اس کوشش میں تھا کہ خانجہاں کو خورم کا طرفدار بنا دے۔ جہانگیر کے سامنے جب دکن کے معاملات پر خان جہاں کی موجودگی میں گفتگو چھڑی تو سارا دربار شہزادۂ پرویز کا مخالف نظر آیا۔ اُسکی برائیاں نور جہاں اور آصف خاں دونوں کے طرفدار دو [illegible] زباں ہوکر بیان کرنی شروع کیں۔ اور

اور خان جہاں سے جو سب سے بہتر اور ثقہ گواہ ہوسکتا تھا تائید چاہی۔ اگر خان جہاں دوسرے امیروں کی طرح زمانہ ساز اور چالاک شخص ہوتا تو یہ رنگ دیکھ کر کم ازکم خاموش ہی رہتا، لیکن وہ اس قسم کا آدمی نہ تھا۔ اُس نے نہایت جرأت کے ساتھ شہزادۂ پرویز اور خانخاناں کی خوبیاں بیان کرکے نہ صرف اُسکی بیگناہی بلکہ مستحق ستایش ہونے کے زبردست دلائل اس خوبی سے بیان کیے کہ سب ہونٹ چاٹتے رہگئے۔ ایک روز شہزادہ خورم (شاہجہاں) نے دربار خاص کی بے تکلف صحبت میں موقع پاکر پادشاہ سے استدعا کی کہ مجھ کو دکن کا ناظم بناکر شہزادۂ پرویز کی جگہ برہانپور بھیجدیجیے میں ایک ہی سال میں سلطنت احمدنگر اور سلطنت بیجاپور کو فتح کرکے ممالک محروسہ میں شامل کردونگا" آصف خاں وزیر اعظم نے اسکی تائید کی لیکن خان جہاں لودی نے بلاتامل شہزادۂ خورم کو اس طرح مخاطب کیا کہ " یہ کلام آپ کی شان کے بالکل خلاف اور نہایت گستاخانہ ہے۔ آپ اپنے بڑے بھائی کی تحقیر کررہے ہیں اور چھوٹے ہوکر بڑے پر فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ہرگز کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی"۔ خان جہاں کے یہ بیباکانہ الفاظ اگرچہ جہانگیر کو ناگوار نہیں گزرے لیکن شہزادہ خورم (شاہجہاں) کے لیے تیر وخنجر سے ہرگز کم نہ تھے۔ نہ صرف خورم بلکہ آصف خاں وزیر اعظم کے دل میں بھی خانجہاں کے ان الفاظ نے ناسور ڈال دیے۔ اور خان جہاں کے یہی الفاظ اُسکی تباہی کا باعث ہوے۔ نورجہاں بھی اس سپاہی پیشہ آزادمنش اور صاف گو سردار سے مایوس ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے کوشش کرکے خان جہاں کو گجرات کی حکومت پر اور شہزادۂ پرویز کو برہانپور سے جدا کراکر بنگالہ کی حکومت پر بھیجوادیا۔ شہزادۂ پرویز کا سب سے بڑا دوست اور معاون خان جہاں لودی تھا۔ جب اُسکی دوستی کو دشمنی میں تبدیل نہ کیا جا سکا تو ایک کو مشرق اور دوسرے کو مغرب میں بھجوادیا گیا تاکہ ایک دوسرے کو کوئی امداد نہ پہونچا سکے۔ اس کام سے فارغ ہوکر بہن اور بھائی یعنے نورجہاں اور آصف خاں کی سازشی معرکہ آرائی خوب زور وشور سے شروع ہوئی۔ نورجہاں نے مہابت خاں کو تقویت پہونچاکر اپنا آلۂ کار بنایا۔ آصف خاں نے بوڑھے سردار خانخاناں اور اُس کے بیٹوں کو اپنی طرف توڑلیا۔ مگر دونوں کے لیے یہ دونوں سردار کچھ کارآمد ثابت نہ ہوے۔ آخر وہ وقت آگیا کہ شہزادۂ خورم نے سرکشی اختیار کی۔ وہ جب بنگالہ کی طرف پہونچا تو شہزادۂ پرویز کو مہابت خاں کے ذریعہ امداد پہونچائی گئی۔ پرویز کے مقابلہ میں خورم کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ وہاں سے وہ دکن کی جانب متوجہ ہوا تو شاہی حکم کے موافق پرویز بنگالہ کی حکومت مہابت خاں کو سپرد کرکے اُس کے تعاقب میں

میں روانہ ہوا۔ یہ سب نورجہاں کی تدبیریں تھیں کہ پرویز کو بنگالہ کی حکومت سے بھی جدا کر دیا گیا ورنہ خرم کے تعاقب میں مہابت خاں بھی جا سکتا تھا۔ شہزادہ خورم نے جب احمد نگر کی فوجوں کے ساتھ برہان پور کا محاصرہ کیا تو خان جہاں لودی کا سب سے بڑا دوست اور دستِ راست لودیخا نامی سردار جو برہان پور میں موجود تھا لڑائی میں مارا گیا۔ شہزادہ پرویز نے بنگالہ سے برہانپور پہونچکر شہزادہ خورم کو شکست دیکر بالکل بے سازوسامان بنا دیا۔ برہان پور سے بحالت تباہ شہزادہ خورم ٹھٹھہ کی جانب اس ارادہ سے آیا کہ ملک ایران کی طرف چلا جائے۔ آصف خاں اپنے داماد شہزادہ خورم کی اس خطرناک حالت سے بیخبر نہ تھا۔ اسکے توڑ جوڑ عین وقت پر کام آئے۔ اُدھر مہابت خاں جو بنگال پر حکومت کر رہا تھا آصف خاں سے مل گیا اُدھر شاہزادہ پرویز برہانپور میں مرگِ مفاجات کا شکار ہوا۔ شہزادہ پرویز کے یکایک فوت ہو جانے پر حیرت تو سب کو ہوئی مگر اُسکی وفات کا اصلی سبب کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ مہابت خاں نے بنگال میں سرکشی کا اظہار کیا۔ ان واقعات نے بچھی ہوئی شطرنج کی چالوں میں تغیرِ عظیم پیدا کر دیا۔ خورم ایران کا ارادہ فسخ کر کے دکن کی جانب چلا گیا۔ پرویز کے مرتے ہی خان جہاں لودی کی جانب سے اب کسی کو کوئی اندیشہ نہ رہا تھا۔ خورم نے خان جہاں لودی صوبہ دار گجرات کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ سفارش کر کے پادشاہ سے میری خطائیں معاف کرا دیں۔ اُدھر مہابت خاں نے پادشاہ کی خدمت میں عفوِ تقصیرات کی درخواست بھیجی۔ دونوں کی خطائیں معاف ہوئیں۔ خورم (شاہجہاں) تو دکن کی جانب رہا۔ مہابت خاں کو بنگالہ سے دربارِ شاہی میں طلب کیا گیا۔ خان جہاں لودی کو ناظمِ دکن بنا کر گجرات سے برہانپور تبدیل کیا گیا۔

مہابت خاں جو پہلے نورجہاں کے اشاروں پر کام کرتا تھا اب آصف خاں کے مقاصد کا مؤید تھا۔ وہ بنگالہ سے خوب مستعد ہو کر اور راجپوتوں کی تازہ فوج بھرتی کر کے اپنے ہمراہ لیکر حاضر ہوا اور غالباً آصف خاں کے مشورہ اور سازش سے جہانگیر کو قید کر لیا۔ مہابت خاں کی قید سے آزاد ہو کر جہانگیر کا جلدی ہی یعنی ماہ صفر ۱۰۳۷ھ میں انتقال ہو گیا۔ شہریار تخت نشیں ہو کر مارا گیا اور ہندوستان کی حکومت شہزادہ خورم کے حصہ میں آئی جو شاہجہاں کے نام سے ہندوستان کا مشہور بادشاہ ہوا۔

شاہجہاں نے تخت نشیں ہو کر تمام امرا کے مناصب و مراتب بلند کیے۔ آصف خاں بدستور وزیرِ اعظم اور مدار المہام سلطنت رہا۔ مہابت خاں کو خانخاناں کا خطاب ملا۔ خان جہاں لودی کا

کی باتیں پادشاہ اور وزیر دونوں کو یاد تھیں۔ اُسکا استیصال فوراً مناسب نہ سمجھ کر اول صرف یہ انتظام کیا گیا کہ خانجہاں کو برہان پور سے مالوہ کی صوبہ داری پر تبدیل کرکے مہابت خاں خانخاناں کو ناظم دکن بنایا گیا اور خانخاناں کو حکم دیا گیا کہ تم اپنی طرف سے اپنے بیٹے خان زماں کو برہانپور بھیجدو۔ خان جہاں برہان پور سے مالوہ آکر ابھی اطمینان سے بیٹھنے نہ پایا تھا کہ جھجار سنگھ ابن نرسنگدیو بندیلہ نے علامات سرکشی کا اظہار کیا۔ اُسکی سرکوبی کے لیے خانجہاں کے پاس حکم پہونچا اور بعض دوسرے امرائے شاہی بھی اس مہم پر مامور ہوے۔ خانجہاں نے اس مہم میں حسب توقع اپنی شجاعت و قابلیت کا اظہار کیا۔ بندیلہ مذکور کو عاجز کرکے حکم شاہی کے موافق اُسکے مقبوضہ علاقہ کا بڑا حصہ اُس سے جدا کر لیا گیا۔ اور بھاری نذرانہ وصول ہونے کے بعد اُسکی خطا معاف ہوی۔ خان جہاں لودی کا یہ کارنامہ سنہ جلوسِ اول شاہجہانی میں ظہور پذیر ہوا لیکن اُس گرہ کو جو اُسکی طرف سے شاہجہاں کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی نہیں کھول سکتا تھا۔ امرائے دربار بھی معہ آصف خاں وزیر اعظم درپئے انتقام تھے۔ ایسے بے عذر، بہادر اور شمشیر برہنہ شخص کو کسی خطرناک مہم اور ہلاکت کے مقام میں بھیجکر اُس کا قصہ پاک کرا دینا کوئی دشوار کام نہ تھا، اور پادشاہ ہر قسم کی بدنامی اور مردم ناشناسی کے الزام سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن اس طرح خانجہاں لودی کی شہرت و عزت کو کوئی نقصان نہ پہونچتا اور وزیر و پادشاہ دونوں کے جذبہ انتقام کو پوری تسکین حاصل نہ ہوتی لہذا اب خانجہاں کو زیادہ مہلت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اُسے آگرہ طلب کیا گیا یا وہ خود جھجار سنگھ بندیلہ کی مہم سے فارغ ہو کر رسم تہنیت ادا کرنے آیا۔ پادشاہ بظاہر عزت کے ساتھ پیش آیا لیکن صوبہ مالوہ کی طرف واپس جانے کی اجازت اور رخصت نہیں دی گئی۔ وہ چند روز آگرہ میں مقیم اور روزانہ دربار شاہی میں حاضر ہوتا رہا۔ کسی صوبہ دار کو اُسکے صوبہ کی طرف جانے کے لیے رخصت نہ کرنا معمولی بات نہ تھی۔ خانجہاں اس طرز عمل سے پہلے ہی اندیشہ مند تھا کہ اسی اثنا میں اُسکو معلوم ہوا کہ وہ معہ اہل و عیال گرفتار ہو کر کتے کی موت مارا جائے گا۔ یہ سُن کر خانجہاں بہت پریشان ہوا۔ اُس نے اپنے دروازہ کے سامنے پٹھانوں کی فوج کا جو اُسکے ہمراہ تھا پہرہ مقرر کرکے دربار میں جانا ترک کر دیا۔ منتخب اللباب کا مصنف لکھتا ہے کہ مخلص خاں کے بیٹے نے جو خانجہاں کے بیٹے کا دوست تھا محض دللگی اور مذاق کے طور پر یہ کہا تھا کہ خانجہاں کو بہت جلد قرار واقعی سزا ملنے والی ہے۔ یہی باعث خانجہاں کے وہم کا ہوا۔ مگر یہ مورخ موصوف کی دللگی، و شاہجہاں کی غیر ضرورکالت ہے۔ خانجہاں لودی کوئی جنگلی، پہاڑی، وحشی یا گنوار

آدمی نہ تھا کہ اس طرح لڑکوں کی گفتگو اور دل لگی کی باتوں میں آکر ایسی غیر معمولی حرکت کا ارتکاب کرتا۔ وہ اول درجہ کا امیر، خانجہاں، فرزندِ شاہ کے خطاب سے مخاطب اور دکن کے چار صوبوں کا وائسرائے رہ چکا تھا۔ جہانگیر کے دربار میں اُس کی سب سے زیادہ عزت و توقیر تھی۔ وہ عبدالرحیم خانخاناں، مرزا عزیز کوکہ، مان سنگھ، شہزادہ پرویز کی سفارشیں کرکے شاہی عتاب سے اُنکو بچا چکا تھا۔ جہانگیر کے خاص الخاص مشوروں میں دوسرے تمام وزراء سے بڑھ کر اپنے صائب الرائے ہونے کا ثبوت پیش کرتا رہا تھا۔ وہ صاحب السیف والقلم تھا۔ یعنی شجاعت و بہادری کی مخصوص صفت کے علاوہ علم و فضل سے بھی بے نصیب نہ تھا۔ اُس کی ساری عمر میدان جنگ میں سپہ سالاری اور درباروں میں پادشاہ کی مصاحبت و ندیمی کرتے ہوئے گزری تھی۔ شہزادوں اور وزیروں کی صحبت اُسکو ہمیشہ رہی تھی۔ وہ خود دل کا صاف، زبان کا سچا، قول کا پکا اور وعدہ کا وفا کرنے والا تھا لیکن دنیا داروں کی چالاکیوں اور دھوکہ بازیوں کو ساری عمر دیکھتا رہا تھا۔ ایسے شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اُس نے ایک لڑکے سے دل لگی کی بات سنکر بلا وجہ دربار کا جانا ترک کر دیا اور اپنے دروازہ پر اپنے ہم قوم پٹھانوں کا پہرہ مقرر کیا سب سے زیادہ تمسخر انگیز بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خانجہاں کو ہلاک اور ذلیل کرنے کے منصوبے مکمل ہو چکے تھے۔ خان جہاں کو اسکی صحیح صحیح خبریں ضرور معلوم ہو چکی تھیں۔ کوئی دوسرا کم ہمت شخص ہوتا تو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے چھری کے نیچے گردن رکھ دیتا۔ یا خانجہاں اگر حقیقتاً اپنے آپ کو خطا وار جانتا تو وہ بھی ہر قسم کی سزا برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن وہ چونکہ اپنے آپ کو بالکل بےخطا یقین کرتا تھا۔ لہذا آخر وقت تک دیانت اور بہادروں کی طرح جان دینے پر آمادہ ہو گیا۔ منتخب اللباب کی روایت ہے کہ شاہجہاں کو جب خانجہاں کے اس طرح گوشہ نشین ہونے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے اسلام خاں کو تسلی کے لیے بھیجا اور اسکو ہر قسم کا اطمینان دلایا۔ چنانچہ خانجہاں پھر بدستور دربار میں آنے لگا۔ مگر چند روز کے بعد بعض مصاحبوں نے خانجہاں کو یقین دلایا کہ یہ چند روزہ ڈھیل مصلحتاً دیگئی ہے اور ہلاکت بہت قریب ہے۔ مصاحبوں کے اس بیان کو بھی منتخب اللباب میں غلط ہی بتایا گیا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہر شخص خان جہاں ہی سے دل لگی کرتا تھا اور لطف یہ کہ آیندہ کے واقعات سے یہ تمام دل لگی کی باتیں حقیقت و اصلیت کے سانچے میں ڈھلجاتی ہیں۔

شجاعت و بہادری کے حیرت انگیز کارنامے

آخر ایک روز رات کو دو گھڑی رات گئے خان جہاں آگرہ سے روانہ ہوا جس کی

تفصیل خافی خاں نے ان الفاظ میں بیان کی ہے

"شبے از شبہا بعد از انقضاے دو ساعت نجومی با سائر متعلقان صغیر و کبیر کہ بعضے را بر فیلاں و برخے را بر اسپان برقع پوش سوار نمودہ جریدہ خانہ بدوش گشتہ معہ دو ہزار سوار افغان جرار کہ اکثر آں از خویش و تبار و یکجان و دو قالب بودند و دوازدہ نفر فرزندان و داماد و دو صد سہ صد پیادہ و شاگرد پیشہ ہوا خواہ قدیمی از آگرہ نقارہ و طبل زناں برآمدہ مرحلہ پیماے تیہ حیرانی گردید"

شاہجہاں کو خان جہاں کے اس طرح آگرہ سے فرار ہونے کا حال معلوم ہوا اُس نے فوراً خواجہ ابوالحسن - خدمت پرست خاں عرف رضا بہادر میر آتش - سید مظفر خاں بارہہ - نصیر خاں - خواص خاں بھٹی - مرحمت خاں بخشی - راجہ بتیھلداس سہ ہزاری پسر راجہ گوپال داس - راجہ پرتھی راج - معتمد خاں - خان زماں - رائے رایاں - راجہ جے سنگھ وغیرہ بیس مشہور سرداروں کو تیس چالیس ہزار فوج اور زبردست توپخانہ کے ساتھ خانجہاں کے تعاقب میں روانہ کیا -
شاہجہاں کو جب خانجہاں کے روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا اُس سے چار گھڑی یعنے ڈیڑھ گھنٹہ بعد یہ فوج آگرہ سے روانہ ہو چکی تھی - سوچنے کے قابل بات یہ ہے کہ صرف دو ہزار پٹھانوں کی فوج کے تعاقب میں بیس بڑے بڑے سپہ سالار ایک عظیم الشان لشکر اور زبردست توپ خانہ لیکر روانہ ہوتے ہیں - آدھی رات کا وقت ہے جبکہ سب آرام میں ہیں - اس قدر جلد اس لاؤ لشکر کا مرتب و مسلح ہو کر روانہ ہو جانا یہ شبہہ پیدا کرتا ہے کہ یہی رات خانجہاں کے گرفتار یا قتل کرنے کی پہلے سے مقرر ہو چکی تھی - اور یہ تمام سردار معہ اپنی اپنی فوج اور توپخانہ کے پہلے سے مستعد اور حکم کے منتظر تھے کہ حکم پاتے ہی خانجہاں کے مکان کا محاصرہ کرلیں - خانجہاں کو اتفاقاً تھوڑی دیر پہلے اسکا علم ہوا اور وہ نہایت سراسیمگی کے عالم میں اپنا ننگ و ناموس بچانے کے لیے اس طرح روانہ ہوا کہ عورتوں کو برقعے پہنا کر گھوڑوں پر سوار کرنا پڑا - اگر اُسکو پہلے سے اسکا علم ہو گیا ہوتا تو یہ کچھ بھی دشوار نہ تھا کہ وہ کم از کم اتنے ہاتھی فراہم کر لیتا کہ عورتیں اُن پر سوار ہو سکیں - یا وہ اپنی کوئی جاے پناہ متعین کر کے عورتوں کو پہلے سے وہاں بھیج دیتا - لیکن آیندہ پیش آنے والے واقعات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ خانجہاں اپنے لیے کوئی جاے پناہ اور منزل مقصود متعین کیے بغیر آگرہ سے روانہ ہوا تھا - خانجہاں کی ہیبت اور اُسکا رعب شاہجہاں کے دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا اسکا اندازہ صرف اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ

کہ دو ہزار کے چھوٹے سے لشکر کو جس کے ساتھ عورتیں، بچے، مال و اسباب اور شاگرد پیشہ لوگ بھی تھے اس قدر خطرناک تصور کیا تھا کہ مذکورہ عظیم الشان لشکر کو بھی جو رات ہی میں روانہ ہو چکا تھا کافی ہو چکا تھا کافی نہ سمجھ کر صبح اٹھتے ہی شاہجہاں نے آگرہ سے پیہم کمکی فوجیں بھیجنی شروع کر دیں۔ خان جہاں کی بہادری و سپہ سالاری کے مرتبے کو سمجھنے کے لیے مذکورہ تصور سے بہت کچھ روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ خان جہاں کے دل گردہ کا اس بات سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آگرہ سے چوروں کی طرح نہیں بھاگا بلکہ نقارہ بجاتا ہوا چلا۔

جنگِ چمبل

آگرہ سے اٹھارہ کروہ (کوس) کے فاصلہ پر جبکہ خانجہاں دریائے چمبل کو عبور کرنے کیلیے کشتیاں فراہم کر رہا تھا اور سورج افقِ مشرق سے کچھ تھوڑا ہی بلند ہوا تھا کہ مذکورہ شاہی لشکر پہونچ گیا۔ خانجہاں نے اس عجلت میں عورتوں اور بچوں کو دوسرے کنارے پر پہونچایا اور خود دریا کے اسی طرف رُک کر حملہ آور فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ تماشا دیکھنے کے قابل ہوگا جبکہ نہایت گراں بار بے معین و مددگار مٹھی بھر فوج اس عظیم الشان شاہی لشکر کے مقابلے میں جسکی پشت پر کمکی فوجوں کا تانتا بندھا ہوا تھا مصروفِ جنگ ہوئی ہوگی۔ خان جہاں کے لیے یہ اور بھی نازک موقع تھا کہ اُسکی پشت پر دریا تھا۔ نہ اِدھر اُدھر حرکت کرنے کا موقع تھا، نہ کسی امداد کی توقع تھی۔ مگر شاہی لشکر کا سیلاب ان مٹھی بھر افغانوں سے ٹکرایا تو معلوم ہوا کہ دریائے چمبل کے کنارے کوئی ریتی کی دیوار نہیں بلکہ فولادی قلعے کی دیوار یا سنگ خارا کا ایک پہاڑ تھا۔ پانی کا سیلاب جب پہاڑ سے ٹکراتا ہے تو شور بلند ہوتا ہے۔ یہاں بھی غریو لشکر سے میدان گونج اُٹھا۔ بہادری و مردانگی نے اپنے پورے حسن و جمال کا تماشا دکھایا۔ شجاعت نے مَردوں کے منہ چومے تو سنے تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھاتی سے لپٹا لیا۔ خون کی بارش نے صفحۂ زمیں کو زرافشاں بنایا اور مقتولوں کی خوں فشاں لاشوں نے اُس پر بیل بوٹے بنائے دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی عورتیں اپنے شوہروں، بھائیوں، اور بیٹوں کی جاں فشانیوں کو سکتے کے عالم میں دیکھ رہی تھیں اور دریائے چمبل کا آب رواں اپنی سُریلی آواز میں اس طرح نغمہ خواں تھا ؎

بہادر جو نامی ہیں وقتِ ستیز　　بدن میں نہیں رکھتے پاسے گریز

اس ستیز و آویز کا نتیجہ یہ ہوا کہ خان جہاں کے دو بیٹے عظمت خاں و حسین خاں، ایک داماد شمس خاں اور شمس خاں کے دو بھائی محمد خاں و محمود خاں کُل پانچ قابل تذکرہ سردار اور کُل ستر پٹھان کشتوں کے پشتے لگا کر شجاعت و مردانگی کا آخری مرحلہ طے کر گئے اور سرخروئی کے ساتھ اس جہان فانی

سے عالم جاودانی کی جانب رخصت ہوئے۔ ان پانچوں مذکورہ سرداروں کی نسبت پٹھانوں کے مخالف اور غیر ہمدرد مورخ خافی خاں کے الفاظ یہ ہیں کہ

"ہر پنج پنجۂ شیر ژیاں را از دو نبرد بر نجہ می داشتند و در معرکۂ مصاف فیل دماں را امان نمی دادند"

خان جہاں کے مذکورہ نقصان کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہی لشکر کے نقصانات پر بھی غور کرو خدمت پرست خاں میر آتش۔ سید محمد خاں نبیرۂ سید مظفر خاں بارہہ۔ سید محمد شفیع نبیرۂ سید مظفر خاں بارہہ۔ راجہ بیتھلداس کے دو بھائی۔ سادات بارہہ کے ۱۹ اور ستاس بہادر۔ گئی راجپوت سردار۔ ستر ستّل سردار جان سے مارے گئے۔ اور راجہ بیتھلداس، راجہ پرتھی راج، سید مظفر خاں بارہہ۔ خواص خاں بھٹی ایسے زخمی ہوئے کہ لاشوں میں سے زندہ نکالے گئے اور کئی کئی مہینہ کے علاج معالجہ کے بعد اُٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ شاہی لشکر کے تمام مقتولین کی کوئی صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکتی۔ لیکن انکی تعداد کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ خانجہاں لودی اس شاہی لشکر کا دریائے چمبل کے کنارے ستھراؤ کر کے دریائے چمبل کے پار ہو کر روانہ ہوا ہے تو اگلے روز یعنی لڑائی ختم ہونے اور خان جہاں کے دریا سے عبور ہو کر روانہ ہونے کے بعد ام گھنٹے تک بقیۃ السیف شاہی لشکر کو لاشوں کے دفن کرنے سے فرصت نہ ملی۔ آگرہ سے تازہ دم فوجیں بھی پہونچ گئیں اور اگلے روز دوپہر کو شاہی لشکر دریائے چمبل کو عبور کر کے خانجہاں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مذکورہ زخمیوں کو دھولپور میں چھوڑا اور گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ خانجہاں گوالیار، چندیری، بندیلکھنڈ ہوتا ہوا گونڈوانہ پہونچا۔ شاہی لشکر کے دل پر خانجہاں کی ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ وہ خان جہاں سے دور ہی دور پیچھے پیچھے رہا۔ گونڈوانہ سے خانجہاں احمدنگر کی سلطنت نظام شاہی میں داخل ہوا۔ اور دولت آباد پہونچ کر قیام کیا۔ شاہی لشکر مالوہ کے پہاڑوں اور جنگلوں کو طے کرتا اور خان جہاں کا سراغ لگاتا ہوا بلکلانہ پہونچکر مقیم ہوا۔ شاہجہاں کو اطلاع دیگئی کہ بغیر آپ کے تکلیف فرمائے کام نہیں چلیگا۔ بیتھلداس، پرتھی راج، سید مظفر بارہہ، خواص خاں بھٹی وغیرہ مذکورہ مجروحین اب اچھے ہوگئے تھے۔ شاہجہاں نے انکو بلا کر خلعت ہائے فاخرہ اور بڑے بڑے انعام عطا کیے انکے مناصب و مراتب بھی بڑھائے۔ خواجہ ابوالحسن اور دوسرے سردار جو تعاقب فوج کو لیے ہوئے بلکلانہ میں خیمہ زن تھے وہ بھی مورد تحسین و آفرین ہوئے ان کے مناصب میں بھی اضافہ کیا گیا۔

خان جہاں کے مقابلہ پر شاہجہاں

یکم ربیع الآخر ۱۰۳۹ھ کو شاہجہاں ایک عظیم الشان لشکر ہمراہ لیکر آگرہ سے روانہ ہوا۔ کوچ و مقام کرتا ہوا دریائے نربدا کو عبور کرکے سرحد خاندیس میں داخل ہوا اور ارادت خاں و شائستہ خاں و اعظم خاں و راجہ گج سنگھ کی سرداری میں پچاس ہزار فوج دیکر ارادت خاں کو اس کل فوج کا افسر اعلیٰ اور ذمہ دار سپہ سالار بنا کر خان جہاں کی گرفتاری کی تاکید کی اور خود ۸ جمادی الآخر ۱۰۳۹ھ برہانپور پہونچکر قیام کیا۔ اسی دوران قیام میں برہان پور کا نام دار السرور تجویز ہوا۔ خواجہ ابو الحسن جریدہ برہان پور میں حاضر ہوکر باریاب خدمت ہوا اُسکو بدستور خانجہاں کی گرفتاری پر مامور رکھ کر اُسکے ساتھ شاہ نواز خاں کو بھی ایک شائستہ فوج دیکر روانہ کیا گیا۔ شیر خاں گورنر گجرات کے پاس حکم بھیجا گیا کہ احمد آباد میں اپنا نائب اور قائم مقام چھوڑکر معہ لشکر گجرات ابو الحسن کی مدد کو پہونچے۔ بگلانہ کے راجہ کو فرمان بھیجا گیا کہ اپنی پوری طاقت اور تمام ذرائع کو شاہی لشکر کی امداد و اعانت میں صرف کرو۔ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت اور شمالی ہند کی مغلیہ سلطنت کے درمیان اگرچہ پہلے سے حالت جنگ قائم تھی مگر شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد کوئی خصوصی سرگرمی طرفین سے ظاہر نہ ہوئی تھی۔ اب خانجہاں کے اس طرف آجانے پر شمالی ہند کی فوجوں کا ٹڈی دل دکن کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ریاست احمد نگر نے بھی مقابلہ کی تیاری کی۔ شاہجہاں نے کالپی کے صوبہ دار عبد اللہ خاں کو بھی بلا کر اس حملہ آوری میں شریک کیا۔ تلنگانہ، خاندیس، بگلانہ تین طرف سے ریاست احمد نگر پر حملہ آوری شروع ہوئی۔ امام قلی خاں پسر جاں سپار خاں، پسر شجاعت خاں، راجہ ستر سال سنگھ برادر زادہ مانسنگھ، دیانت خاں وغیرہ نامی سردار لڑائیوں میں مارے گئے۔ گردھر داس اور بہت سے راجپوت سردار زخمدار ہوئے شاہجہاں نے ریاست احمد نگر پر نہ صرف جنگی دباو ڈالا بلکہ امرائے احمد نگر اور رعایائے احمد نگر کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش و سازش بھی جاری رکھی۔ چنانچہ اسی دوران جنگ میں بہت سے سرداران ریاست احمد نگر آکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے بڑے مناصب اُنکو عطا کیے گئے۔ ان لوگوں میں جادو رائے (سیوا مرہٹہ کا نانا)۔ ساہو بھونسلہ (پدر سیوا مرہٹہ و داماد جادو رائے)۔ مگدیو (جادو رائے کا سالا)۔ تلنگ راو۔ تاوجی وغیرہ مرہٹے خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں جن کو بڑی بڑی جاگیریں اور اعلیٰ درجہ کے منصب شاہجہاں سے عطا کیے۔ اسی زمانہ سے مرہٹوں کے حوصلے بلند ہوئے اور نظام شاہی حکومت کی نگاہ میں

بھی اس غداری کے سبب اُنکی اہمیت بڑھ گئی۔ مسلمان سرداروں میں سادات خاں اور شرزہ خاں قابل تذکرہ ہیں جو شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہو کر مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ شاہجہاں کی اس تدبیر نے نہ صرف ریاست احمد نگر بلکہ خانجہاں لودی کو بھی سخت پریشان و متحیر بنا دیا۔

جنگ راجوری

مذکورہ غدار مرہٹوں کی تحریک اور شاہجہانی ترغیب سے مرہٹوں کی جمعیتوں نے فرنگیوں کو اپنے ساتھ . . . . شامل کرکے ساحل سمندر کی جانب ریاست احمد نگر کے لیے سخت مشکلات پیدا کر دیں لیکن خان جہاں نے ایک طرف شاہی لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا دوسری طرف وہ فرنگیوں اور مرہٹوں کے اس فتنے کو بھی فرو کر رہا تھا۔ جو شاہی فوج خان جہاں کے مقابلہ پر معرکہ آرا تھی۔ خان اعظم اُسکا سپہ سالار اعظم تھا اور یہی سب سے بڑی اور زبردست فوج تھی۔ جب اعظم خاں (خان اعظم) سے عرصۂ دراز تک کچھ نہ ہو سکا تو شاہجہاں نے اعظم خاں کی جگہ آصف خاں وزیر اعظم کو سپہ سالار بنا کر برہان پور سے روانہ کیا۔ اعظم خاں کو بمقام بھیلی گانوں جب آصف خاں کے مامور ہونے کی خبر پہونچی تو بہت نادم و شرمندہ ہوا۔ اسی اثنا میں خبر پہونچی کہ خان جہاں لودی مرہٹہ اور فرنگی باغیوں کی سرکوبی سے فارغ ہو کر تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ معہ اہل و عیال قصبۂ راجوری میں مقیم اور شاہی لشکر کی جانب سے بالکل بے خوف و مطمئن ہے۔ اعظم خاں نے اپنی ابتک کی ناکامیوں کی تلافی کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر آصف خاں کے آنے سے پہلے ہی ایک عظیم الشان جرار لشکر کے ساتھ یلغار کیا اور خان جہاں لودی کو جا گھیرا۔ اعظم خاں کے ساتھ ہی لینا رئیں بہادر خاں ابن دریا خاں، راجہ جے سنگھ، راجہ بھیلداس، سپہدار خاں، خواص خاں، سردار خاں، مرحمت خاں، اہتمام خاں داروغۂ توپ خانہ، ناہر داس جھالہ، راجہ انوپ سنگھ، راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ، خان زماں، دلہراسپ پسران مہابت خاں، شیر خاں، شاہنواز خاں، چندرمن بندیلہ، کیلوجی مرہٹہ، اچی رام مرہٹہ، جگدیو مرہٹہ، صف شکن خاں وغیرہ نامی گرامی سردار موجود تھے۔ خان جہاں لودی نے اس بلائے ناگہانی کے ورود پر عزم و استقلال کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ عورتوں اور بچوں کو معہ ساز و سامان قریبی پہاڑ کے دروں میں بھیجدیا اور خود اپنی قلیل جمعیت کو جو اُس کے رشتہ داروں اور وفادار جاں نثاروں پر مشتمل تھی لیکر مقابلہ پر ڈٹ گیا اور شاہجہانی لشکر کو جنگ جمپل کا مزا ایک مرتبہ پھر چکھا دیا۔ اس معرکہ کی ایک خاص قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ بہادر خاں ابن دریا خاں شاہی مقدمۃ الجیش کا سردار اور سب سے

زیادہ بہادر شخص تھا دوسری طرف اس کا باپ دریا خاں لودی خان جہاں لودی کا ہمدم و دستِ راست اور چوٹی کا سردار تھا۔ دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ خان جہاں لودی کے ایک بھتیجے کا نام بھی بہادر خان تھا وہ اپنی بہادری اور صف شکنی میں بہادر خاں ابن دریا خاں کا حریف اور مدمقابل تھا۔ شاہی فوج نے خانجہاں لودی اور اُسکے ہمراہیوں کو چاروں طرف سے احاطہ کرلیا۔ بظاہر کوئی صورت خاں جہاں کے بچنے کی باقی نہ رہی تھی۔ تیر اور تلوار اور نیزہ و خنجر کے علاوہ شاہی فوج کا ایک بڑا حصہ بندوقوں سے بھی مسلح تھا۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ شاہجہانی سردار بہادر خاں ابن دریا خاں تیر کے دو زخم اور تلوار کا ایک زخم کھا کر ہلاک ہوا۔ ناہر سنگھ جھالا بھی اُسکے ساتھ مارا گیا۔ ایک خونریز شدید شمشیر زنی کے بعد شاہی لشکر میں شکست کے آثار نمودار ہوے یعنی تمام لشکر سمٹ کر ایک پشتۂ کوہ کی طرف مجتمع ہوا اور خان جہاں جو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دشمنوں کے نرغہ میں مصروف حریف افگنی تھا میدان پر قابض نظر آیا۔ شاہی لشکر نے سمٹ کر اور سنبھل کر پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تلواروں کی بجلیوں نے چمک چمک کر دامن کوہ میں خون کے ندی نالے بہادیے اور شجاعتِ افغانیہ نے شاہجہانی لشکر کے چھکے چھڑا دیے۔ اس مرتبہ بہادر خاں برادرزادۂ خانجہاں لودی بہت سے زخم کھا کر میدان جنگ میں کام آیا اور دوست و دشمن دونوں کو بتا گیا کہ بہادر ایسے ہوتے ہیں اور میدان جنگ میں اس طرح جان دیا کرتے ہیں۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ

"ہر کہ از زخم کاری می رسید آرزوے زخم دیگر نمودہ قدم جرأت بقصد سربازی پیش می گذاشتند تا آنکہ بہادر خاں از طرف خصم از زخمہاے پیاپے از پا درآمد بہادر خاں کہ از بسیاریِ زخم افتادہ بود چوں رمقے باقی داشت بمدد غیرت از جاے خود برخاستہ با زروے بلشکر پادشاہی دست بشمشیر بردہ حملہاے مردانہ نمودہ آخر بزخم گولہ تفنگ افتاد۔ راجپوتے آمدہ کہ سر او را جدا سازد بہمہ ازکمر برآوردہ چناں افتادہ بر راجپوت انداخت کہ گوش او بباد داد و راجپوت زخم خوردہ دست از دو برنداشت سر او را جدا ساختہ با انگشتریِ دست وی را قراول نزد اعظم خاں آوردہ۔"

خان جہاں لودی نے اب میدان میں دیر تک قیام مناسب نہ سمجھ کر اپنے اہل و عیال کی طرف منہ موڑا اور اُنکو ہمراہ لیکر صاف نکل گیا۔ جس ہاتھی پر عورتیں سوار تھیں وہ ایسا مرگل

تھا کہ چل نہ سکا مجبوراً عورتوں کو گھوڑوں پر برقع پوش سوار کراکر روانہ ہوا۔ شاہی فوج میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُس کا تعاقب کرسکتی۔ شاہی لشکر کو اس لڑائی میں بہت سے آدمی اور متعدد سوار قتل کراکر صرف اس قدر کامیابی ہوئی کہ خان جہاں کا بھتیجا بہادر خاں مارا گیا۔ بہادر خاں کی انگوٹھی اعظم خاں نے برہان پور بادشاہ کے پاس روانہ کی۔ اس انگوٹھی کے نگینے پر بہادر خاں کا نام کندہ تھا۔ یہ انگوٹھی اس بات کی زبردست دلیل تھی کہ بہادر خاں مارا گیا۔ شاہجہاں نے اس انگوٹھی کو دیکھ کر خوشی کے شادیانے بجوائے اور برہان پور میں چراغاں کیا گیا۔

احمد نگر کی نظام شاہی ریاست کو اگرچہ خان جہاں کے پہونچنے سے بڑی تقویت حاصل ہوگئی تھی اور خانجہاں کی پامردی و جوانمردی کا نتیجہ تھا کہ اس چھوٹی سی ریاست نے ہندوستان کے شہنشاہ شاہجہاں کا کامیاب مقابلہ کرکے اپنا رعب و وقار قائم رکھا۔ لیکن اب مسلسل معرکہ آرائیوں سے تنگ آکر دربار احمد نگر صلح کی جانب مائل اور خان جہاں کو گرفتار کرکے شاہجہاں کے سپرد کرنے کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔ خاں جہاں تک یہ خبریں پہونچ چکی تھیں لہذا وہ دکن کو بھی اپنے لیے جائے پناہ نہ دیکھ کر اس بات پر آمادہ ہوا کہ مالوہ و راجپوتانہ و پنجاب کے وسیع ملکوں کو چیرتا ہوا پشاور و افغانستان کے پہاڑوں میں پہونچ کر دم لے جہاں پٹھانوں کے قبائل سے اُسکو ہمدردی و اعانت کی توقع تھی۔ خان جہاں جب حدود ریاست احمد نگر سے نکل کر حدود خاندیس میں داخل ہوا تو شاہجہاں حواس باختہ اور بجد فکرمند ہوا۔ اُس نے عبداللہ خاں۔ سید مظفر خاں بارہہ۔ سرفراز خاں، درگا داس۔ ہادو سنگھ۔ کیتا تاز خاں وغیرہ سرداروں کو فوجیں دیکر مامور کیا کہ دریائے نربدا کے تمام گھاٹوں کی حفاظت کریں اور خان جہاں لودی کو دریائے نربدا عبور نہ کرنے دیں۔ دو دو گرزبردار ہر سوار کے ساتھ محض اس کام کے لیے مامور ہوئے کہ ایک کی خبر دوسرے کو پہونچاتے رہیں۔ اس طرح دو سو گرزبرداروں کو مصروف ہونا پڑا جو دلیل اس بات کی ہے کہ مذکورہ سرداروں کی تعداد ایک سو تھی جو دریائے نربدا پر مامور ہوئے تھے۔ خانجہاں لودی نے دریائے نربدا کو عبور کیا اور کوئی اُسے نہ روک سکا۔ مالوہ اور راجپوتانہ کے جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کو طے کرتا ہوا دیپال پور تک پہونچ گیا۔ بظاہر احمد نگر اور دیپال پور معمولی الفاظ معلوم ہوتے ہیں لیکن ہندوستان کے نقشے میں احمد نگر اور دیپال پور کے مقاموں کا فاصلہ دیکھو اور یہ بھی دیکھو کہ راستے میں کون کون سے پہاڑ، دریا، اور شہر و قصبات حائل ہیں، پھر یہ بھی سوچو کہ برہان پور میں شاہجہاں بادشاہ اعظم ہندوستان کی پوری طاقت لیے ہوئے پڑا ہے

اور رات دن اس فکر میں مبتلا ہے کہ خان جہاں کا کانٹا جلد از جلد چھپایا جائے۔ خان جہاں کا صرف ہزار بارہ سو تباہ حال وافسردہ خاطر پٹھانوں کی جمعیت کے ساتھ دیپال پور پہونچ جانا معجزہ سے کم نہ تھا۔ اور اگر وہ افغانستان کے پہاڑوں تک پہونچ سکتا تو بہت زیادہ ممکن تھا کہ شیرشاہ اعظم کی سلطنت پھر پٹھانوں کے قبضہ میں آجاتی اور شاہجہاں کو اپنے پردادا ہمایوں کی منزلیں ایران و ہندوستان کے درمیان طے کرنی پڑتیں۔ مگر خدائے تعالیٰ کو اس طرح نہیں، بلکہ حضرت عالمگیر علیہ الرحمہ کے ذریعہ ہندوستان میں اسلامی اثر قائم رکھنا منظور تھا۔ پنجاب و پشاور کے صوبہ دار غافل نہ تھے اور دیپال پور سے آگے بڑھ کر پنجاب یا سندھ کے میدانوں میں خان جہاں کا قتل و گرفتاری سے محفوظ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ خانجہاں کی خبر سنتے ہی جالندھر سے پشاور تک کی چھاؤنیوں میں حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ لہٰذا خانجہاں دیپال پور سے پھر مالوہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سرونج پہونچ کر دو تین روز قیام کیا۔ عبداللہ خاں صوبہ دار کالپی اور سید مظفر خاں بارہہ سرونج کی جانب متوجہ ہوئے لیکن سرونج پہونچکر معلوم ہوا کہ خان جہاں لودی دو روز پہلے سرونج سے روانہ ہو چکا ہے اور دو شاہی ہاتھی جو سرونج میں موجود تھے انکو اپنے ہمراہ لے گیا ہے۔

دریا خاں کی شہادت

سرونج سے روانہ ہو کر خان جہاں بکرماجیت ابن جھجار سنگھ بندیلہ کے علاقے میں داخل ہوا تو بکرماجیت اپنا لشکر جرار لے کر خان جہاں کی گرفتاری کے لیے چلا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خان جہاں آگرہ سے صرف دو ہزار افغانوں کی جمعیت لیکر چلا تھا۔ ان دو ہزار افغانوں میں سے کسی نے اُسکی رفاقت ترک نہیں کی۔ حالانکہ اُنکو کسی جگہ بھی چین سے بیٹھنا اور سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ ہر روز مصروف قتال رہنا یا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مقابلہ بھی ہمیشہ دس گنی، بیس گنی یا پچیس گنی فوج سے ہوتا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ خان جہاں کی قابلیت سرداری زیادہ مستحق تحسین ہے یا اُسکے دو ہزار رفیقوں کی وفاداری زیادہ مستوجب آفریں ہے۔ کم از کم یہ ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خانجہاں ایسا لائق اور شریف سردار تھا کہ اُسکے گرد ایک دو نہیں بلکہ دو ہزار ایسے مستعد، بہادر، وفادار، جان نثار اور انتخاب روزگار اشخاص جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ہر قسم کی سختیاں سہنے اور بالآخر اپنی جانیں قربان کر دینے میں تامل نہیں کیا۔ کسی سپہ سالار اور شریف سردار کی اس سے بڑھ کر اور کوئی تعریف نہیں کیجا سکتی کہ اُسکے ماتحت اُسکے فرمانبردار ہو

جاں نثار اور آخر دم تک وفادار تھے۔ سیکڑوں معرکہ آرائیوں کے بعد جن میں سے بعض بڑی بڑی لڑائیوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے خان جہاں کے پاس دو ہزار جاں فروشوں میں سے اب صرف نو سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ ان نو سو مصیبت زدہ مسافروں کے قافلے میں بہت سے زخمی، بیمار، عورتیں، بچے، سامان رسد، ڈیرے خیمے سب کچھ تھے۔ ایسے گرانبار قافلہ کا لوٹ لینا بکرماجیت بندیلہ کے لیے کیا مشکل تھا جو دس پندرہ ہزار سواروں کا لشکر لیکر گھر سے نکلا تھا۔ خان جہاں نے ان نو سو آدمیوں سے بکرماجیت کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن دریا خاں نے باصرار تمام خان جہاں کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ پانسو آدمیوں کے ساتھ عورتوں، بچوں اور بیماروں کو لیکر آگے نکل جائے اور دریا خاں چار سو آدمیوں کے ساتھ بندیلہ کے لشکر کو روکے۔ عورتیں اور بچے خاں جہاں کے لیے وبال جان بنے ہوئے تھے اور ہر جگہ انھیں کی وجہ سے اُسکو دقتیں پیش آتی تھیں۔ اگر عورتوں اور بچوں کی رسّی اُسکے گلے میں پڑی ہوئی نہ ہوتی تو غالباً ہندوستان کی تاریخ میں کوئی بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہوتی۔ بہرحال خان جہاں عیال و اطفال کو لیکر آگے بڑھا اور دریا خاں نے رُک کر بکرماجیت کا مقابلہ کیا۔ یہ چار سو بہادر ایک ایک کرکے مارے گئے اور دریا خاں بھی میدان جنگ میں پیشانی پر بندوق کی گولی کھاکر مارا گیا۔ بکرماجیت نے صبح سے شام تک ان چار سو آدمیوں کو بمشکل جام شہادت پلایا اور خان جہاں کو اس یکروزہ وقفہ کے سبب آسانی بکرماجیت کے علاقے سے سلامت نکل جانے کا موقعہ مل گیا۔ بکرماجیت نے دریا خاں کا سر کاٹ کر شاہجہاں کے پاس برہان پور بھیجدیا۔ بادشاہ نے بکرماجیت کے اس عظیم الشان کارنامے سے خوش ہو کر خلعت، جمدھر، شمشیر خاص اور نقارہ اُسکو عطا کیا۔ اُسکے منصب اور مرتبے کو بڑھایا۔ خان جہاں اور اُسکے ہمراہی پیہم سفر کرتے کرتے تنگ آ گئے تھے آخر مقام بھانڈیر کے قریب جو جھانسی سے شمال و مشرق میں ہے قیام کرکے آرام کرنا ضروری معلوم ہوا۔

جنگ بھانڈیر

خان جہاں کے اس قلیل جمعیت کے ساتھ قیام کی خبر سُن کر سید مظفر خاں بارہہ ایک لشکر عظیم کے ساتھ پہونچ گیا۔ خان جہاں کو اُس کے قریب پہونچنے کا حال ایک روز پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ اُس نے اہل و عیال، مجروحوں اور بیماروں کو ایک منزل آگے روانہ کیا اور خود مظفر خاں کے مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ دریا خاں کے مارے جانے کے بعد خان جہاں لودی اپنی زندگی سے بیزار اور دنیا و مافیہا سے متنفر ہو چکا تھا۔ سید مظفر خاں سے یہ مقابلہ بہت عظیم الشان اور قابل یادگار رہا۔ اس معرکہ کی نسبت منتخب اللباب کے الفاظ

یہ ہیں کہ

عجب مقابلہ و مقاتلہ دستانہ از ہر دو طرف رو داد کہ سیدان بارہہ مقابل شمشیر افغانان کہ ہر یکے چوں سد سکندر ثبات در زیدہ وادِ شرطِ نمکخواراں آخر روز سیداو پروانہ وار بہ شعلہ کوہ زدہ جوہر شجاعت بروئے کار آوردند و از افغاناں نیز چپقلش ہائے مردانہ مردم را بظہور آمد کہ سادات بارہہ آفرین گفتند ؎

چو برق از رگ ابر ہر معاملت | بروں کردہ شمشیر خود از غلاف
چناں گشت دست و بغل کارزار | کہ شد تیغ با جفت مقراض وار

خان عالم کا خویش مسمیٰ شیر زاد و راجہ درگا داس راجپوت اس لڑائی میں خان جہاں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ خان جہاں اور اُسکے اکثر ہمراہی زخمی ہوئے۔ خان جہاں کے دو بیٹے بندوق کی گولیوں سے مارے گئے۔ خان جہاں یہاں سے کالنجر کی طرف گیا۔ اب اُسکے ہمراہ سو دو سو آدمیوں سے زیادہ نہیں رہ گئے تھے کالنجر کے قلعہ دار سید احمد نے اپنی رستمی دکھانے کا بہت اچھا موقع پایا اور خانجہاں کے بیٹے حسن خاں اور بعض زخمیوں کو گرفتار کر سکا اور اس قابل رحم قافلے سے بعض ڈیرے خیمے اور سامان رسد چھین لینے میں کامیاب ہوا۔

آخری معرکہ خان جہاں کالنجر سے روانہ ہو کر تالاب سندرہ کے قریب پہونچا جو کالنجر کے شمال میں کین ندی کے کنارے ہے۔ چند ہمراہی جو باقی رہ گئے تھے انکو قسمیں دے دیکر رخصت کرنا چاہا کہ اپنی جان سلامت لیکر جدا ہو جاؤ، مگر کسی نے جدائی گوارا نہ کی۔ سب نے آخر وقت تک ساتھ رہنے کی قسمیں کھائیں۔ راجہ ادھو سنگھ بھی گذشتہ معرکے کے بعد سید مظفر بارہہ سے آملا تھا۔ یہ دونوں یلغار کرکے خان جہاں کے قریب پہونچ گئے۔ اب خان جہاں کے ہمراہ صرف بیس آدمی اور دو ہاتھی تھے۔ ان دونوں ہاتھیوں کو مورچہ بنا کر اہل مروت خدنگ اندازی ہوئے۔ اسکے بعد شمشیر و خنجر تک نوبت پہونچی۔ اس شیر بیشۂ شجاعت کی آخری ساعتوں کا حال میں اپنے الفاظ میں لکھنا نہیں چاہتا۔ خافی خاں کو خان جہاں سے مطلق ہمدردی نہیں۔ وہ خان جہاں کو بُرا کہنے اور گالیاں دینے میں ذرا باک نہیں کرتا اور اُسکی ذلت و تباہی کا تذکرہ ہمیشہ خوش ہو ہو کر کرتا ہے۔ میں اس جگہ خافی خاں کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔

"خان جہاں چوں تیر خوردہ زخم رسیدہ غرش کناں بر دستانہ پرداخت ؎

نر امیدہ شیران بگشت آمدند | نہنگان ز دریا بدشت آمدند

دراں عرصہ شورے برانگیختند کہ درچشم محشر نمک ریختند
زبُرندگیہا ے شمشیر کیں لب زخم بر تیغ گفت آفریں

وآں از جاں سیر آمدہ خوں گرفتہ درعرصہ کارزار ہیچ وجہ کوتاہی ننمودہ داد مردانگی میداد تا طناب عمرش بتیغ اجل بریدہ گشت وبہ برچھی ادھو سنگھ از پا درآورد وباوجود زخم دیگر کہ بہ پاے رسید باز بعد از افتادن خودداری نمودہ نشستہ تا دم واپسیں از دوست ودشمن آفریں شنیدہ درجواب محاربۂ حریف کوتاہی وپہلو خالی ننمودہ تا رسیدن سید مظفر خاں بدستیاری حربۂ جانستاں بعالم بقا شتافت۔ گویند شاہ قلی نام گرز بردار سراورا از تن جدا ساخت"

اس آخری معرکہ میں بھی خان جہاں لودی سید مظفر خاں کے ایک پوتے اور ستائیس دوسرے شاہجہانی بہادروں کو خاک وخون میں ملا کر شہید ہوا۔

شیر نرکی ڈردک سے بڑے بڑے پہلوانوں اور نوجوانوں کا پیشاب بلکہ پاخانہ بھی خطا ہوجاتا ہے۔ شیر نر جب ہاتھی پر حملہ کرتا ہے تو ہاتھی سُرنی کے بل زمین پر گر پڑتا ہے۔ شیر نر جب غرّا کر کچھار سے اُٹھتا ہے تو ہم نے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں کی جوتیاں ڈھیلی ہوجاتی ہیں۔ لیکن ہم نے یہ تماشا بھی اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ مرے ہوے شیر کی کھال ایک چمار اُتار رہا ہے اور اُسکی مونچھ کے بال بڑے اطمینان کے ساتھ دیا سلائی سے جلائے جارہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے شیر نر کی دُم پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے اور اُسکی آنکھوں کو انگلیوں سے ٹٹول رہے ہیں۔ عقلمند ایسے نظاروں سے عبرت حاصل کرتے اور غافل بے پروائی کے ساتھ گزرجاتے ہیں۔

مذکورہ دو ہزار بہادروں میں سے صرف تیس آدمی خان جہاں کے لڑکے بچے جو اہل وعیال ....کو لیکر بھاگے یا مختلف موقعوں پر قید ہوگئے تھے باقی سب کے سب ایک ایک کرکے خانجہاں پر پروانہ وار نثار ہوے۔ خانجہاں کا سر شاہجہاں کے پاس عبداللہ خاں لیکر پہونچا تو شاہجہاں نے عبداللہ خاں کو ششش ہزاری منصب اور فیروز جنگ کا خطاب عطا کیا۔ خوشی کے شادیانے بجے۔ جشن برپا ہوے اور شاہجہاں کے دم میں دم آیا۔ آخر جمادی الثانی یا شروع رجب سنہ ۱۰۴۰ھ میں خانجہاں مارا گیا۔ خانجہاں کے کٹے ہوے سر کو شاہجہاں نے شہر بشہر گشت کرایا۔ ۵

سرگشتہ بر نیزہ می زد نفس
کہ معراج مرداں ہمین ست وبس

اکبر شاہ خاں۔ نجیب آباد

۶۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء

پتنگے

اختر، قصبہ س ـــــ کا ایک نوعمر رئیس (جسکی جائداد حال ہی میں کورٹ آف وارڈس سے چھوٹی تھی) اور آنریری مجسٹریٹ، اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھ رہا تھا۔ کچھ دن پہلے مقدمہ کے فریقین کے گواہ گزر چکے تھے اور جرح ہوچکی تھی اور صبح تک اُسے فیصلہ لکھکر سنا دینا تھا اور اپنے حاکم تحصیل کے پاس بھیجدینا تھا۔ شام ہوچکی تھی اور پانی ابھی ابھی برس کر کھلا تھا۔ اختر نے کمرے کی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں اور دروازوں پر پردے چڑھا دیے تھے تاکہ ہوا آسانی سے کمرے میں آسکے لیکن ہوا اُرکی ہوئی تھی اور کمرے میں نہیں آرہی تھی۔ تیز روشنی والا لمپ جسکے اوپر گلوب نہیں چڑھایا گیا تھا اپنی روشنی کمرہ کی دیواروں پر ڈال رہا تھا۔ صرف دیوار کے اُس حصے پر روشنی نہیں پہونچتی تھی جہاں تصویریں لٹک رہی تھیں اور جنکے سائے ٹیڑھے ترچھے ہوکر دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ لمپ کی چمنی نے کمرے کی چھت میں ایک بڑا ہلکے رنگ کا گول دھبا ڈال رکھا تھا اور سامنے آتشدان کے کارنس پر رکھی ہوئی تصویروں کے شیشے چمک رہے تھے۔

اختر نے اب تک کب کا فیصلہ لکھ لیا ہوتا۔ وہ محنتی آدمی تھا اور وقت کا پابند اور ہر کام کو اپنے وقت پر کرتا تھا مگر کبھی جب اُسکی طبیعت خراب ہوتی تو مجبوراً اُسے اپنے اصول توڑنے پڑتے اور وقت کے خلاف کام کرنا پڑتا۔ دو دن سے اُسکی طبیعت خراب تھی۔ موسم کی تبدیلی اور ہوا کے وقت ناوقت چلنے نے اُسکے جوڑ جوڑ میں درد پیدا کردیا تھا جسکی وجہ سے وہ کام کرنے کے لائق نہ رہا تھا اور آرام کرتا رہا تھا۔ دن کو اُس نے فیصلہ لکھ لینے کے لیے ارادہ کیا تھا مگر ٹھیک اُسوقت جبکہ وہ کام کرنے جارہا تھا اُس نے چند لوگ ملنے آگئے جنھوں نے اُسکے کئی گھنٹے خراب کیے۔ وہ کچھ نہ کرسکا تھا اور اور اب لکھنے بیٹھا تھا۔

یکایک ایک بڑا سا سیاہ چیونٹا جسکے پر نکل آئے تھے معلوم نہیں کہاں سے اڑکے آیا اور لمپ کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ چکر کاٹ کر وہ اختر کے سامنے کاغذ پر آکے گرا جسے اُسنے مُنہ سے پھونک کر اُڑادیا۔ اُسکے بعد ایک پروانہ آیا اور طوافِ شمع کرنے لگا۔ اختر نے اُسے بھی پہلے کیڑے کی طرح اُڑا دینا چاہا مگر یہ اُسکی بہ نسبت زیادہ مستقل مزاج تھا اور اسکی کوشش کے باوجود وہاں سے نہ ہٹا۔ دیکھتے دیکھتے پردار چیونٹے، پروانے، جنگلی بوٹ، اور بیسیوں کیڑے اور پتنگے جنکے

نام کسی کو نہیں معلوم، لیمپ کے گرد جمع ہو گئے اور لیمپ کی سطح پر، میز پوش پر، کاغذ پر رینگنے لگے اور دوات اور اُس کے قمیص کے اندر داخل ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے باری باری اُڑ کے گیت گانا شروع کیا۔ کچھ سیاہ رنگ کے ناش کے دیول کے برابر کیڑے اُڑتے اُڑتے تھک کے ایک جگہ گر پڑے اور دیر تک بے حرکت گویا دم سادھے مُردے کی طرح پڑے رہے اور اُن میں سے ایک طرح کی بو آنے لگی۔ کچھ کیڑے اور پتنگے اُسکے گریبان اور آستینوں کی راہ سے اُسکے کپڑوں کے اندر گھس گئے اور بعض اُسکے مُنہ اور رخساروں پر طمانچے مارنے لگے ایک سیاہ پتنگے نے اُسکے قلم کے راستے میں اپنے آپ کو لا ڈالا اور مُصر ہوا کہ یا وہ لکھنا بند کر دے یا اُسکو پامال کر ڈالے۔ ایک دوسرا کیڑا اُسکے ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے کاغذات کی تہ میں گھس گیا اور کاغذ کو اُچھالنے لگا۔ اُس نے کاغذ اُٹھایا اور اُسے پھونک کر اُڑا دینا چاہا مگر وہ اُڑ کر کسی اور طرف جانے کے بجائے اُسکے منہ کے اندر چلا آیا.....

آخر یہ اتنے بہت سے کہاں سے آئے ہیں؟" اختر نے خیال کیا "جب روشنی نہیں ہوتی تو یہ ڈھونڈھنے سے بھی کہیں نظر نہیں آتے اور چراغ جلتے ہی یہ ہر طرف سے اپنی جان ہتھیلی پر لیکر دوڑتے ہیں۔ شاید یہ اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں اور اسی وقت مر جاتے ہیں۔ اس بری طرح جان دینے میں انھیں کیا مزہ آتا ہے؟ اللہ ہی اُن پر رحم کرے اور انھیں سمجھ دے۔ انھیں کوئی کیسے سمجھائے؟ آدمی ہاتھی کو پکڑ سکتا ہے اور شیر کا شکار کر سکتا ہے اور میدانِ جنگ میں ہزاروں آدمیوں کا خون بہا سکتا ہے مگر پروانے نہیں اُڑا سکتا۔" اُس نے غور سے انھیں دیکھنا شروع کیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی جانیں تھیں جن کی زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ اُڑتے تھے اور پھر پھڑ پھڑاتے تھے، رینگتے تھے اور ٹھہر جاتے تھے۔ بہت سے پروانے جل کے مر چکے تھے اور بہتوں کے پر اُنکے بازوؤں سے علیحدہ ہو کر میز پوش کے سطح پر پڑے تھے اور وہ خود پرواز کی قوت کھو کے شمع کا طواف صرف رینگنے پر اکتفا کرتے تھے۔

"مگر ان سے کوئی کب تک لطف اُٹھائے؟" اختر نے سوچا "اس لیے فرصت کی ضرورت ہے اور اچھی صحت کی۔ میرے پاس نہ فرصت ہے نہ اچھی صحت۔ مجھے کام کرنا ہے۔ میرے جسم میں درد ہو رہا ہے اور مجھے آرام کرنا ہے۔" اُس نے پھر لکھنا شروع کیا مگر پھر اُسے پتنگے کام سے روکنے لگے اُسے مقدمہ کی روئداد پڑھنا تھی اور وکیلوں اور گواہوں کے بیانات اور بحثوں پر غور کرنا تھا اور خیالات اکٹھا کرنے تھے مگر ان سب سے زیادہ دشوار اور غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ پروانے کیونکر اُڑائے جائیں،

وہ اُٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آکے اُس نے پیاز کے کچھ ٹکڑے لمپ اور میز پر رکھے ۔ اسکے بعد اُس نے کمرے کی سب کھڑکیاں بند کردیں اور دروازوں کے پردے گرا دیئے لیکن کیڑوں کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی ۔

آخر وہ کیا کرے ؟ اُسکے پاس صرف یہی رات تھی اور اسی رات اُسے فیصلہ لکھ کر تیار کرلینا تھا ۔ مگر وہ کیونکر لکھے ؟ اگر صبح تک اُس نے فیصلہ نہ لکھ لیا اور کل نہ سنا دیا اور مسل کو تحصیل نہ بھیجدیا تو اُسکی بڑی سُبکی ہوگی اور اُسکی ساری ساکھ خاک میں مل جائے گی ۔ وہ ایک عزت دار رئیس تھا اور اُس کا سارے حکام اور رعایا پر بڑا اثر تھا ۔ معلوم نہیں فیصلے میں تعویق ہوئی تو اسکا کیا اثر پڑے ۔ اِن پتنگوں کو کیا معلوم کہ اُنکے اس ننھے سے مشغلۂ تفریح میں اُسکے لیے کیسی تلخ مصیبت کا سامنا تھا ۔ اُسے غصہ سا آنے لگا ۔ کمرے کی گرمی اور اُمس نے اُسکے مزاج میں اور برہمی پیدا کی ، وہ دروازہ کھول کر لمپ کو باہر پھینکدینا چاہتا تھا ۔ اُسکی پیشانی سے پسینہ کے چند قطرے کاغذ پر ٹپک پڑے جن کی سیاہی نے اُسکی کوششوں پر پانی پھیر دیا ۔ اور اُسکے لکھے ہوے کو مٹانا شروع کیا ۔ اُس نے تنگ آکر قلم کاغذ پر زور سے پٹک دیا جس نے کاغذ اور میز پوش پر کئی گل بوٹے کھلا دیے ۔ اِن گل بوٹوں نے اُسکے دماغی توازن میں اور خلل پیدا کی ۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے لمپ کو مُنہ سے پھونک کے گل کردیا ۔

تاریکی یکدم چھا گئی ۔ کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی اور حباب یا روشنی کی ایک شعاع بھی کسی طرف نہ آتی تھی ، صرف تاریکی ۔ کسی فوٹو گرافر کے ڈارک روم سے زیادہ تاریک ۔ کیونکہ اُس میں بھی دھیمی سرخ روشنی حیات کا پتہ دیتی ہے ۔ ملٹن کے مشہور بیان کردہ تاریکی سے زیادہ تاریکی ہر طرف چھا گئی ۔ کائنات جو گویا لمپ کے وجود کے ساتھ زندہ تھی سیاہ ہوگئی ، یکدم جیسے مرگئی ، چُپ ہوگئی ......

آہستہ آہستہ اختر نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے اور دروازے کو ڈھونڈھا اور آہستہ آہستہ ٹٹولتے ہوے وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہونچا اور بستر پر پڑ گیا ۔ دن بھر سرد ہوا چلی تھی اور اسوقت بھی خنکی تھی اور وہ ملاقاتیوں کے ساتھ دن بھر تکلف سے بالکل بندھا ہوا ، جکڑا ہوا ، اپنی طبیعت پر جبر کرکے بیٹھا رہا تھا اور اُس نے آرام نہ کیا تھا ، جسکی وجہ سے اُس کا بدن ٹوٹ رہا تھا ۔ اب پروانوں نے آکر اُسکے دماغ میں ابتری پیدا کردی تھی ۔ اُس نے بستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلیں اور اپنے پیر بار بار دے دے مارے ۔ اس کے دل و دماغ میں اسوقت ایک کھچڑی پکی تھی اور وہ اپنے کو ایک بہت بدقسمت آدمی خیال کر رہا تھا ۔ مجھے ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے ... مگر جب یہ

پتنگے کچھ کرنے دیں" اُس نے اپنے پیروں کے نیچے سے کمبل اُٹھا کر اُسے اپنے بدن پر ڈال لیا۔ اور اپنے کانوں سے سرہانے رکھی ہوئی تولیا لپیٹ لی ....

آہستہ آہستہ فضائے سیاہ کو چیر کر اُس کمرے کی ہر چیز اُس میں سے اُبھرنے لگی اور صاف نظر آنے لگی۔ اُسکے سرہانے اُسکی چھوٹی میز تھی جس پر سفید مُہیا لرد ار میز پوش پڑا تھا۔ داہنی طرف دیوار سے برابر برابر لگے ہوے بید کے مونڈھے تھے سامنے کی دیوار سے لگی ہوئی اُسکی سنگار میز تھی جسکا بڑا قلبی آئینہ اس تاریکی میں چمک رہا تھا .... دوسری طرف کمرے میں سے ہارمونیم کی دلربا تان اور ہلکے رسیلے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ اُسکی بیوی اور اُسکی چھوٹی سالی تھیں جو آپس میں خوش فعلیاں کر رہی تھیں اور نغمہ سرائی کر رہی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ اختر کو اسوقت اِن مسرت بھرے قہقہوں اور رسیلی آوازوں کے بجائے غمناک اور ترحم آمیز لہجوں، ہمدرد و غمگسار آوازوں کی ضرورت تھی، جو اُسکے حال کو سنبھالیں، ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی جو اُس کا حال اُس سے پوچھے اور ممکن ہو تو اُس کے پیر دبائے۔

"میرے پیر کون دبائے ؟" اختر نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ خیالات کی دُنیا عجیب دُنیا جس طرح کمرے کی فضائے سیاہ میں سے ہر چیز اُبھری تھی اور اُسکی آنکھوں کے سامنے آئی تھی اسی طرح اُسکے دماغ اور خیال کی دنیا میں دبے ہوے گڑے ہوے خیالات اُبھرنے لگے اور دیدۂ دل کے سامنے آگئے۔ نہ معلوم کس طرح اُسے وہ رات یاد آئی جب اسی طرح کی تاریکی تھی اور اُسکی ماں، اُسکے باپ سے آہستہ آہستہ سرگوشی کر رہی تھی اور سسکیاں بھرتی جاتی تھی۔ اُسے صاف یاد آیا۔ وہ ایک رات تھی جب اُسکی شادی نہیں ہوئی تھی اور اُسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اُس لڑکی سے شادی کرنے پر اصرار کر رہا تھا۔ مگر اُسکی ماں کے آنسو اُسکے وقتی جذبۂ محبت پر غالب آئے تھے اور اُس نے اس لڑکی سے شادی نہیں کی تھی۔ اور اُسے یہ خیال کر کے افسوس ہوا کہ اُسکی شادی اُس لڑکی سے نہیں ہوئی جسے وہ اس قدر چاہتا تھا جسکے لیے وہ دیوانہ ہو گیا تھا، اور جو اَب تک کنواری تھی۔ کیا اچھا ہوتا اگر اُس نے اپنی اُس پہلی مایوس محبت کی یاد میں اپنی زندگی بغیر شادی کے گزاری ہوتی۔ لوگ اُسے دیکھتے اور اُسے ایک عجیب و غریب شخصیت سمجھتے، ایک پُر راز ہستی جو ایک کھوئی ہوئی محبت کی یاد کو کلیجہ سے لگائے ہے اور اسی کے سہارے زندگی ختم کرتا ہے۔

"مگر یہ ہے کیا ؟" اُس نے خیال کیا "پتنگوں کو میری کھوئی ہوئی محبت سے کیا تعلق ہے

اور یہ خیالات میرے دل میں کیسے آئے؟" اور یہ وہ نہ سمجھ سکا۔ اُس نے کروٹ لی اور اُس کے جسم کی ہڈیاں چٹ چٹ بولیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسکے نیچے کا دھڑ اُسکے بدن سے علحدہ ہو گیا ہے اور اُسکا نہیں ہے کسی دوسرے کا ہے۔ بستر پر اُسے کل نہیں آ رہی تھی اور اُسکے دماغ کی کوئی کل بگڑ گئی تھی اور اُسکے خیالات میں ایک جنگ سی ہو رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُسکے جسم کا ہر حصہ اُس جنگ عظیم سے مغلوب ہے۔ وہ بستر سے اُٹھا اور کمبل اور تکیے لیکر وہ بستر کے نیچے فرش پر پڑ رہا تاکہ خیالات کی آمد کو روک سکے اور انتشار دماغی کو کم کرے لیکن ایسا نہ ہوا اور اُسے اپنی زندگی کے بعید سے بعید واقعات اور حادثات یاد آتے رہے جیسے اُس رات خیالات نے قسم کھائی تھی کہ اسکی ساری گذشتہ زندگی اُسکے سامنے لے آئیں گے اور دوہرا دیں گے۔

پورے دو گھنٹے گزر گئے ......

یکدم کہیں سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور کپڑوں کی سرسراہٹ سُنائی دی۔ اُسکی بیوی اپنے ہاتھ میں موم بتی لیے آ رہی تھی اور اُسکے پیچھے بارہ برس کی ایک خوبصورت نازک چھوکری کشتی میں چائے کا سامان لیے تھی۔ فوراً جیسے مُردہ زندہ ہو جائے اختر چونک پڑا اور سراسیمگی میں کمبل اور تکیوں کو اُٹھاکے وہ اپنے بستر پر آیا اور ایسے اہتمام سے چُپ پڑ گیا جیسے وہ گھنٹوں سے بے خبر سو رہا ہے۔

"چائے لائی ہوں .... کیا سو گئے؟ اختر نے اپنی بیوی کی سُریلی آواز سُنی۔

اُس کی بیوی نے اُسے بیدار کیا اور لمپ روشن کیا اور اُسے چائے پلائی اور اُس سے اچھی باتیں کرتی رہی اور چلی گئی۔ خوب گہرے رنگ کی تیز چائے کی تین پیالیاں پی کر اختر کی جان میں جان آئی۔ پھر اُس نے کئی سگرٹیں سلگائیں اور ان کے دھوئیں اُڑائے اور کمرے میں ٹہلتا رہا ..... گیارہ بجے کے قریب وہ دفتر کے کمرے میں داخل ہوا اور میز کے سامنے بیٹھا اور دو بجے صبح تک خوب دھنواں دار مضمون لکھتا رہا ....

میزپوش پر پروانوں کے پر اب تک پڑے تھے مگر پروانے اُڑنا اور باہر سے پتنگے آنا اب بند ہو گئے تھے۔

جلیل احمد قدوائی، بی۔ اے

افکارِ وحشت

نہاں بلا کی تپش جانِ بیقرار میں ہے — کشش یہ کس کی دل آویزیِ بہار میں ہے
تری ادا کی جھلک شوخیِ بہار میں ہے — تری نوائے طرب نغمۂ ہزار میں ہے
نہیں ہے ایک طرف سے کشش محبت میں — کچھ اپنے دل میں ہے اور کچھ نگاہِ یار میں ہے
تو ہی تو ہے چمن رنگ و بو کا جلوہ فروش — ترا ہی عشوہ تو رنگینیِ بہار میں ہے
ہوا ہے مدعیِ دید دیدۂ حیراں — لبِ خموش بیانِ حدیثِ یار میں ہے
اگرچہ خاک ہوا دل ترے تغافل سے — ہنوز تیری توجہ کے انتظار میں ہے
ہم اپنے عقدۂ مشکل کو دیں مبارکباد — کسی کا گوشۂ ابرو کشادِ کار میں ہے
دلِ اسیر کا میرے رہینِ منت ہے — وہ پیچ و خم جو تری زلفِ تابدار میں ہے
مرے ہی جوشِ محبت کی ہے سکھائی ہوئی — وہ دلبری کی ادا جو نگاہِ یار میں ہے
نہیں ہیں راہ نوردانِ عشق بے ساماں — علاجِ آبلۂ پا کا نوکِ خار میں ہے
بجھا ہوا ہے دل ایسا کہ کچھ اثر ہی نہیں — نگاہِ یار کی شوخی نگاہِ یار میں ہے
جہان کا رہے یہ اور تو دلِ ناداں — فریبِ مسئلۂ جبر و اختیار میں ہے
گواہِ شوق نہیں صرف ایک دامنِ چاک — نشاں جنوں کا گریباں کے تار تار میں ہے
خزاں کے دستِ تعدی کو جس سے تھی تحریک — وہی پھر اب چمن آرائیِ بہار میں ہے
امیدیں بڑھتی ہیں اُس کی بقدرِ مایوسی — عجیب بات یہ تیرے امیدوار میں ہے
عدوئے امن و اماں تھی کشاکشِ ہستی — میسر اب مجھے آسودگی مزار میں ہے
ہے میری آنکھ کا نور اور میرے دل کا سرور — وہ جامِ مے جو مرے دستِ رعشہ دار میں ہے
رہے گا دل اثرِ بیخودی سے گم کب تک — نگاہ اُسکی تقاضائے بار بار میں ہے
اثر ہوا نہ ذرا بھی ترے تغافل کا — کہ اک زمانے سے شوق اپنے کاروبار میں ہے

تمام عمر نہ اُترے گا نشۂ وحشت کا
یہی جو کیف تری چشمِ پُرخمار میں ہے

رضا علی وحشت

روح رواں

یوں تو سب جانتے ہیں کہ اُردو کا پُتلا بقول آزاد سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے بنا ہے، باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ زبان اُردو پر جس قدر مسلمانوں کے احسانات ہیں اُسی قدر ہندوؤں کے بھی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش کے دور میں اس حقیقت کو اکثر اصحاب نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اور سیاسی تنازع البقاء کے ہنگامہ نے ادبیات میں بھی ایک اچھا خاصا محاذ جنگ قائم کر رکھا ہے۔ ایک فریق کی کوشش تمام تر اس پر صرف ہو رہی ہے کہ زبان میں اجنبی سے اجنبی عربی و فارسی الفاظ بہ افراط استعمال کیے جائیں اور اُردو کو خالص اسلامی رنگ دے دیا جائے۔ وہ اپنے نزدیک اسی کو "ادبِ لطیف" کہتے ہیں کہ چند غیر مانوس الفاظ و تراکیب کو جمع کر دیا جائے۔ مطلب ہو یا نہ ہو۔ دوسرے گروہ کی سعی کا مدار اس پر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عبارت میں سنسکرت اور ہندی کے ثقیل سے ثقیل الفاظ داخل کر دیے جائیں۔ خواہ سادگی و روانی کا خون کیوں نہ ہو جائے۔ ایسے حضرات روزمرہ میں سیکڑوں عربی و فارسی الفاظ بولتے ہیں مگر عام تحریر و تقریر میں بہ تکلف ہندی لفظ تلاش کرتے ہیں۔

ایسے نازک دور میں اس مشترکہ ملکی زبان کی صحیح خدمت کی آواز جس طبقہ سے بھی بلند ہو قابلِ صد تبریک ہے۔

حال میں بابو جگت موہن لال صاحب رواںؔ ایم اے ایل ایل بی وکیل اُناؤ کا کلیات اُردو نہایت دیدہ زیب طباعت کے ساتھ روحِ رواں کے نام سے شایع ہوا ہے۔ جسکو دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ برادرانِ وطن میں اپنی ملکی زبان سے صحیح ذوق رکھنے والے موجود ہیں۔ رواں صاحب قانون اور انگریزی لٹریچر میں کافی دستگاہ رکھنے کے ساتھ فارسی ادبیات کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اور اُردو کے ایک نکتہ سنج سخنور ہیں۔

اس حسین و جمیل مجموعہ کو اُنھوں نے منظومات، غزلیات، قطعات اور رباعیات کے عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم اگرچہ منطقی نہیں اور بابیجا متداخل معلوم ہوتی ہے، تاہم مصنف نے غالبًا اسی میں سہولت سمجھی۔ موضوعات کے اعتبار سے اُنھوں نے مناظر، واقعات،

جذبات، اخلاق، تصوف، فلسفہ، تغزل سبھی پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اپنی قدرتِ کلام اور تنوع تخیل کا درخشاں ثبوت دیا ہے۔

منظومات کے تحت میں وہ نظمیں ہیں جن میں جناب رواں نے کسی تخئیلی یا حقیقی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ بعض نظموں میں چند مسامحات بھی موجود ہیں جو غالباً ابتدائی مشق کے زمانہ کی یادگار ہیں، اور جو انھوں نے خود شاعر کا میلانِ سخن اور ارتقای مذاق دکھانے کے لیے بدستور قائم رکھے ہیں۔ نظمیں مجموعی طور پر بلند اور دل آویز ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ شاعری کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں

شاعری کیا ہے اک احساسِ قوانینِ وجود دل کے جذبات کا اظہار بہ تائیدِ قیود

برہمن ہے دلِ شاعر، بتِ فطرت معبود جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حُسنِ نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ پہ تصویر اتر آتی ہے

اللہ اللہ رے وسعتِ دامانِ غزل بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل

ختم ہوجائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل پوچھیے حافظ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

جذبات کا تموج انسانی دل میں کم و بیش ہونا ضروری ہے۔ مگر شاعر و غیر شاعر میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر زیادہ حساس اور ذکی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے احساسات کو بیان کرنے کے لیے بہترین اسلوب اختیار کر سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کسی قدر اس نظم سے ہوتا ہے جو رواں نے لاوارث بچہ کے عنوان سے لکھی ہے۔ شاعر نے ایک نومولود حسین بچے کو دیکھا ہے جو گھورے پر پڑا ہوا ملا ہے۔ اور معاً اسکے جذبات میں تلاطم پیدا ہوا ہے۔ جسکو اس طرح ادا کیا ہے۔

آہ اے نو واردِ بزمِ رہا طِ روزگار آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار

آہ اے دیباچہ شرحِ کتابِ دردِ دل آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جانگسل

آہ اے تعبیرِ خوابِ مستِ ایامِ شباب آہ اے تفسیرِ کیفِ بادۂ جامِ شباب

اسی قسم کے چند اشعار کے بعد جن کی دل آویز اور بلیغ تراکیب شاعر کی جودتِ طبع کا پتہ دیتی ہیں اس طرح استفسار ہوتا ہے

سچ بتا بچے ترا والد ترا والی ہے کون پھول ہے تو کس شجر کا اور ترا مالی ہے کون

زینتِ آغوش ہے تو جسکی وہ مادر ہے کون ۔۔۔ نور ہے جس گھر کا تو، بچے بتا وہ گھر ہے کون
تو کوئی اسرارِ پنہانی کا دفتر تو نہیں ۔۔۔ تو کسی میخانۂ معنی کا ساغر تو نہیں

حیف کیا میں مان لوں دنیا کے لوگوں کی دلیل ۔۔۔ تجھ کو سمجھوں ثمرۂ بدکاریِ نفسِ ذلیل

شاعر کے خیالات میں ایک پُر اضطراب اُلجھن رونما ہے۔ ایک طرف اُس حسین و جمیل معصوم مورت کو "ثمرۂ بدکاریِ نفسِ ذلیل" ماننے سے گریز کرتا ہے۔ دوسری طرف "حضرتِ انسان کی کمزوریاں" دیکھتے ہوئے اپنے فیصلہ کو "دنیا کے لوگوں کی دلیل" کا تابع قرار دینے پر مجبور ہے۔ آخر عالمِ حیرت میں یوں چلا اُٹھتا ہے

حسن کا برباد ہونا کچھ مجھے بھاتا نہیں ۔۔۔ میرے مالک کچھ سمجھ میں رازیہ آتا نہیں
باپ ماں کے نفسِ سرکش کی کہانی ہائے ہائے ۔۔۔ اے معاذ اللہ بچے کی زبانی ہائے ہائے

خود غرض انسان تیری خود پرستی الاماں ۔۔۔ یہ تری ناعاقبت اندیش مستی الاماں

نظم کی نظم یکسر جذبات، اخلاقیات، اور ادب لطیف کا دلکش مرقع ہے۔ جناب رواں نے ایک اور نظم "شوہر کُش حسینہ" کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ جو شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔ رواں کا دل ایک طرف حسینہ کے بے پناہ حُسن کے تاثرات سے متاثر معلوم ہوتا ہے، دوسری طرف اُسکی سفاکی اور شوہر کُشی کا شکوہ سنج نظر آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بے وفا سمجھوں تجھے یا باوفا سمجھوں تجھے ۔۔۔ حسن فطرت کے فرشتے بول کیا سمجھوں تجھے
کیا تجھے مظلوم کج فہمی دنیا مان لوں ۔۔۔ یا مجسم میں کوئی سرِّ خدا سمجھوں تجھے

شاعر جو حُسن کو اپنا مرکزِ پرستش مانتا ہے اُسکی نامرادی اور شکستہ حالی دیکھ کر تصویرِ حیرت ہے۔ اور اس طرح سوال کرتا ہے

قید ہی گر تجھکو بھاتی ہے تو میرے دل میں آ ۔۔۔ کیسلے مٹی کی دیواروں میں زندانی ہے تو
انجمن افروز ہوتی آ نہ تو وہ شمع تھی ۔۔۔ کیسلے زنداں میں وقفِ سوزِ پنہانی ہے تو
قدسیوں میں ہو جگہ تیری تر اوہ حسن تھا ۔۔۔ سچ بتا کیوں مبتلائے عالمِ فانی ہے تو

ذیل کا شعر شاعر کے افتادِ طبع کی کتنی سچی ترجمانی کر رہا ہے

دوسروں کو تو کوئی وجہ تسخر ہو تو ہو ۔۔۔ مجھ کو لیکن باعثِ تکلیفِ روحانی ہے تو

شاعر توسن جذبات کو مطلق العنان چھوڑنا نہیں چاہتا اور ایک سا متو منیرِ اخلاق کی آواز سے چونکتا ہو کر ٹھٹک جاتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اُسکی تعلیم فلسفۂ اخلاق شروع ہوتی ہے اور یہی اُسکا

کمال ہے۔ سنیے وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس میں بھی خشک استدلال کے بدلے شاعرانہ رنگینی کا عنصر نمایاں ہے۔ یہی واعظ و شاعر کا بین فرق ہے

یہ جفائیں اے نگاہِ ظلم پرور کس لیے — یہ ستم تو نے کیے آخر ستمگر کس لیے
جاں گدازی کو نگاہِ ناز کافی تھی تری — حلقِ عاشق پر کیا تھا تیز خنجر کس لیے
کیا رہیگا آہ بتلا تیرے پائے ناز پر — تو نے کاٹا عاشقِ جانباز کا سر کس لیے
اضطراب دل کا تھا کیا کم تماشا دلفریب — رقصِ بسمل کا ہوا منظور منظر کس لیے
کیوں کیا بدنام تو نے حسن کی عصمت کو آہ — داغ ڈالا دامنِ شرم و حیا پر کس لیے

کام تو نے اے حسیں جانِ وفا کیونکر کیا
خون اپنے شوہرِ ناشاد کا کیونکر کیا

اسکے بعد وہ بیگناہ مقتولِ ستم شوہر کی نعش سے مخاطب ہوتا ہے

آہ اے مقتول۔ آہ اے کشتۂ خنجرِ حسن — آہ اے صیدِ جراحت خوردۂ شمشیرِ حسن
آہ اے مسحورِ سحرِ گیسوئے افعی سرشت — آہ اے تازہ اسیرِ حلقۂ زنجیرِ حسن

سچ بتا دے تجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی
حسنِ عالم سوز کو کیوں تجھ سے ایسی کد ہوئی

پوری نظم پڑھیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

"منظرِ عبرت" میں ایک مزدور کی زبان سے اُسکی داستانِ درد بیان کی گئی ہے۔ یہ غریب سادگی، محنت، نیکی اور خلوص کا مجسمہ ہے۔ اور تمام گھر کی اُمیدوں کا مرکز۔ مزدوری کے لیے نکلا ہے اور زمین کھودنے کی خدمت پر مامور ہے۔ اچانک اوپر سے ایک کگار ٹوٹتی ہے اور اُسکی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس نظم میں اگرچہ ادبی لطافت زیادہ نہیں لیکن اُسکے سراسر پُرتاثیر ہونے میں شک نہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف پہلا بند لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

منظرِ عبرت ہے اے رہرو ذرا تھم دیکھ لے — روبرو آئینہ اسرارِ عالم دیکھ لے
حالتیں دیکھے گا پھر ایسی بہت کم دیکھ لے — حسرتوں کا خون ارمانوں کا ماتم دیکھ لے

داستانِ خانہ ویرانی ذرا سُن لے تو جا
سرگزشتِ عالمِ فانی ذرا سُن لے تو جا

اسی سلسلہ میں کچھ مذہبی نظمیں ہیں۔ جن میں "رحلتِ بلال" نسبتاً بہتر ہے۔

رواں صاحب کو اولے جذبات کے علاوہ تصویرِ مناظر کھینچنے میں بھی خاص کمال ہے۔ گنگا کنارے کی شام نہایت پیاری نظم ہے۔ اور جن لوگوں نے کبھی گنگا کے کنارے شام کا دلفریب منظر دیکھا ہے وہ یقیناً اسکی داد دیں گے اور اعتراف کرینگے کہ رواں کا قلم جزئیات کا احاطہ کرنے میں کس قدر مہارت رکھتا ہے۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں

اُف یہ فضا ... یہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ... موجوں کا پھیلا پن فطرت کے یہ کرشمے
حدِ نظر تک ... پھیلا ہوا ہے پانی ... پانی میں تیرتے ہیں ہلکورے ہلکے ہلکے
یوں ... ایک ایک پہ یہ موجیں ... ملنے کو مضطرب ہیں گویا کہیں کسی سے
آئینہ ہے کہ پانی اللہ ری دلفریبی ... اک آسمان اوپر اک آسمان نیچے
پُرنشہ خیز ... یہ دل ربا موسم ... یہ جانفزا مناظر گنگا میں تیرے صدقے

مسرور کر رہی ہے گو ہم کو سیرِ دریا
... ہے دل کو لے کاش تم بھی ہوتے

حصۂ منظومات ... ناکمل رہیگا اگر رواں کی نظم "دو آئینے" کی نسبت اظہارِ خیال نہ کیا گیا۔ اس میں ایک ہندو بیوہ سے پیامِ شادی اور بیوہ کا جواب ہے۔ پوری نظم کی نقل کے ... سفینہ ... ناکافی ہوگا۔ اور انتخاب کرنا درحقیقت شاعر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس لیے پوری نظم کے مطالعہ کے لیے اہلِ نظر کو دعوتِ نظر دیتے ہوئے میں اس حصہ کو ختم کرتا ہوں اور قدر گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے عندیہ میں یہ نظم اُردو ادب کے شاہکاروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ ہندو عورت کے جذبات کی اس سے بہتر ترجمانی میں نے نہیں دیکھی۔

غزلیات رواں دَورِ جدید کے عمدہ غزل لکھنے والوں میں ہیں۔ ... تغزل، تصوف، فلسفہ، اخلاق، غرض دَورِ جدید کی غزل کے تمام خصائص اُنکے یہاں ملتے ہیں۔ اُنکا فلسفۂ شعر آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ اُردو کے قدیم اساتذہ میں رواں میرؔ اور غالبؔ کے معتقد ہیں۔ ان دونوں شاہانِ سخن کی بارگاہ میں وہ اپنا خراجِ عقیدت اس طرح ادا کرتے ہیں

میرؔ سمجھا تھا فقط معنیِ اسرارِ سخن
ختم غالبؔ پہ ہوئی گرمیِ بازارِ سخن

تغزل کی بابت اُن کا خیال ہے کہ وارداتِ عشق کو اس طریقہ سے بیان کیا جائے کہ جو اثر بیان کرنے والے پر ہوا ہے سننے والے پر بھی مترتب ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اسلوبِ بیان اور مضمون

ایسا ہو کہ بڑے چھوٹوں کے سامنے یا چھوٹے بڑوں کے سامنے ادا کر سکیں۔ اس شرط کو نباہنے میں وہ نمایاں طور پر کامیاب ہوئے ہیں جیسا کہ آیندہ انتخاب پڑھنے والوں کو اندازہ ہوگا۔

رواں بالطبع فلسفی واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی غزلیات اور رباعیات میں فلسفہ اور اخلاقیات کا عنصر زیادہ ہے۔ تصوف کا مذاق بھی اسی کا اثر ہے۔ گر انکا فلسفہ اور تصوف بشیتر ہندو تخیل کا رہین منت ہے اور ہر ہر قدم پر ویدانت، تناسخ، تنوطیت کی تعلیم ملتی ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید تمہید کے بجائے ہر خصوصیت سے متعلق کچھ نمونہ پیش کیا جائے جس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو سکے۔

مضامین تغزل و عشق

مرے زخم جگر وہ لذتیں پھر یاد کرتے ہیں ذرا حسن نمک آلودے کردے خبر ظالم

کہ اب ڈھونڈھے نہیں ملتا چمن میں آشیاں مجھکو گزاری اتنی مدت قید میں صیاد کی میں نے

اک سرمگیں نگاہ گلو گیر ہو گئی میں کہ چلا تھا داور محشر سے حال دل

تجھے خبر نہیں کیا لطف انتظار میں ہے طلسم وعدۂ فردا کے توڑنے والے

آج یا میں ہی نہیں یا مرا صیاد نہیں دیکھیں گرتی ہے قفس پر کہ چمن پر بجلی

کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا میں کیا ہی کرتا تھا اپنے حواس

نظر کے سامنے ہی لا کے شاخ آشیاں رکھدی قفس میں اور یہ صیاد نے مجھ پر ستم ڈھایا

مڑ کے دیکھا بھی نہ اُس محو خود آرائی نے آبلے دل کے یہاں ٹوٹ کے ناسور ہوئے

یہ تازگی مرے داغ کہن میں آئی ہے تری نگاہ جراحت نواز کے صدقے

بچا بچا، کہ یہ تصویر ہے زمانے کی ارے مرے دل رنگیں کے روندنیوالے

میں کیا کروں یہی سرخی ہے اس فسانے کی وہ عرض حال میں اشکوں پہ معترض ہیں عبث

بہت سی راتیں ہوئیں ایک کی سحر نہ سہی گلہ فضول ہے طول شب جدائی کا

کہ آج چل کے چکالیں معاملہ دل کا بہت دنوں میں ہوا ہے یہ فیصلہ دل کا

تصوف و فلسفہ

اشعار ذیل میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ رواں نے فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ اور مضمون کے خشک ہونے کے باوجود انداز بیان کی رنگینی کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ تخیل قدرۃً بلند ہے مگر زبان میں سلاست اور بیان میں تاثیر ہر جگہ موجود ہے۔

کس نے دنیا کو دکھلا دیں آنکھیں دیکھنے والے　دوا کر ہوش کی اے کہنے والے بے نشاں مجھکو
مآلِ زندگی ہے کام کرنا کام کرتا ہوں　تاسف ہے اگر ہو کاوشِ سود و زیاں مجھکو
کجا راحت عدم کی اور کجا ہنگامۂ ہستی　کہاں سے کھینچ لائی ہے مری قسمت کہاں مجھکو

زندانیانِ کاکلِ ہستی کدھر کو جائیں　اک زلف سب کے پاؤں کی زنجیر ہوگئی
بس تھم گیا سفیرِ عمل کو سکے یا نصیب　جس جا پہ ختم منزلِ تدبیر ہوگئی

روشنیِ روح کی موقوفِ فنائے تن ہے　جلتے جب شمع کو دیکھا تو پگھلتے دیکھا

سیہ کاری پہ آتا ہے جب انساں کا دلِ غافل　یہ بالکل بھول جاتا ہے کہ کوئی دیکھتا بھی ہے

نظمِ ہستی کو سمجھتا ہوں میں اک خوابِ جنوں　کون بتلائے مرے خواب کی تعبیر مجھے
مل گیا حل گیا انجامِ گنہ اے داور　اب خیالات مرے دیتے ہیں تعزیر مجھے
سدِّ انوارِ حقیقت ہے مرا پردۂ زیست　توڑ دینا ہے یہ آئینۂ تصویر مجھے

گلوں کو پیار نہ کر مجکو ڈھونڈنے والے　کہ میرے حسن کا جلوہ ہر ایک خار میں ہے

ہوئی جاتی ہے تنہائی میں لذت روح کی ضائع　لٹا جاتا ہے ویرانہ میں گنجِ شائگاں میرا
عناصر بنتے ہیں دنیا کی وسعت سکڑاتی ہے　کسی سے پوچھتے ہیں اہلِ بینش جب نشاں میرا

پروردۂ عصیاں ہے دنیائے خطا مسلک　اے کاش کہ میں اس میں پیدا نہ ہوا ہوتا

پیہم دیے وہ رنج کہ انساں بنا دیا　منت پذیر ہوں ستمِ روزگار کا

مائۂ روح ہے ایامِ گذشتہ کا خیال　حیف کچھ ایسی بھی باتیں ہیں کہ جو یاد نہیں

اس قالبِ انساں میں کیا میں نے ترقی کی　آوارۂ منزل ہوں آوارۂ منزل تھا

جو بزمِ تن میں ہے اک نور پرتوِ رخِ یار　جو کم نظر ہیں اُسے شمعِ جاں بھی کہتے ہیں

میں کسی سے کیا چاہوں میں کسی سے کیا مانگوں　دولتِ ہمہ عالم میری تنگدستی ہے

عرش تک چھائی ہوئی ہے تیرے نغمہ کی صدا　اپنی لے سے بیخبر اے نے نوازِ زندگی
کاش عطا ہو پھر وہی نورِ نشاطِ بیخودی　قلب سیاہ ہو گیا کاوشِ امتیاز میں
وجد میں روحِ آرزو۔ رقص میں عقدہ ہائے دل　اُف یہ کسی نے کیا کہا خاص زبانِ راز میں

یہ کس نے آخرِ شب پردہ ہائے نور سے جھانکا　کہ لَو دینے لگا ایک ایک ذرہ بزمِ امکاں کا

اہلِ جہاں کے کفر و توہم کا کیا علاج　آئینہ کہہ رہا ہے کہ آئینہ ساز تھا

دھوکے کا تعین بھی دھوکا نظر آتا ہے　تصویر سمجھتا ہوں پردہ نظر آتا ہے

یہ محض مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اُنکے اکثر اشعار کی تان تصوف یا فلسفہ پر آکر ٹوٹتی ہے۔ ہر شعر کی تفصیل کیجانے تو مضمون زیادہ طویل ہو جائے گا۔ اسلیے دوسرے اصنافِ سخن کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔

قطعات - میں بھی بیشتر یہی انداز پایا جاتا ہے اگرچہ اتنے دلکش نہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک قطعہ ملاحظہ ہو :-

جہانِ عشق میں بیہوشیوں کی انتہا جو ہے
وہیں سے عالم عقل و خرد کی ابتدا سمجھو
علاج درد کا جب تک دلِ غافل رہے لب تک
وہی چارہ ہے کہ جب تک تم مرض کو لا دوا سمجھو

رباعیات - ڈیڑھ سو سے کچھ اونچی ہیں اور ان میں سے اکثر خیالات کی بلندی اور زبان کی صفائی کے لحاظ سے اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ رواںؔ کو رباعی سے خاص شغف ہے اور وہ رباعی نویس کی حیثیت سے زیادہ مشہور رہیں۔ یوں تو اُنکی غزلیں اور دوسری نظمیں بھی عموماً مذاق عام سے بلند ہیں، لیکن رباعی میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز و مخصوص درجہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے وسیع خیالات کو ادا کرنے کے لیے رباعی کی تنگنا ے کو منتخب کیا ہے۔ اور جہاں جہاں انکا توسن قلم اس نازک اور دشوار گزار مرحلہ سے عہدہ برآ ہوا ہے اُسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔ خیالات زیادہ تر تصوف یا فلسفہ کے بحث سے متعلق ہیں اور وہی ہر جگہ بار بار آتے ہیں۔ اگرچہ بیشتر مقامات پر شاعر نے اپنے طرز ادا سے گونہ تازگی پیدا کردی ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر ہم چند عنوانوں کے ماتحت بعض رباعیوں کے نمونے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں :-

تدبیر و تقدیر

تدبیر پہ منحصر نہ اوقات پہ ہے
انجام عمل خدا ہی کی ذات پہ ہے
یہ کوشش نامراد کہتی ہے رواںؔ
تقدیر کی راہ اتفاقات پہ ہے

ایضاً

مذہب فقط اک ہوس ہے ایمان نہیں
اب ایمان کا کوئی عنوان نہیں
نیکی کرنا تو خیر مشکل ہے رواںؔ
بندے کے لیے گناہ بھی آسان نہیں

آزادی و اسیری

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے
دل بے پروا رہے امیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعث قید رواںؔ
محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

تنوطیت

دھوکے میں جہاں کے ہر بنی آدم ہے — عنوانِ خوشی بھی سُرخیِ ماتم ہے
یہ فیصلۂ نگاہِ عبرت ہے رواں — عشرت کدۂ جہاں میں غم ہی غم ہے

حقیقتِ انسانی

جتنا ہوش تر ہوں دانا تر ہوں — جتنا مشہور تر ہوں رُسوا تر ہوں
اے میرے ستانے والے معلوم نہیں — میں ہستی و نیستی سے بالا تر ہوں

رازِ عالم

غم کی عظمت کسی کو معلوم نہیں — رازِ فطرت کسی کو معلوم نہیں
سب محوِ خیالِ اہلِ دنیا ہیں رواں — اپنی قیمت کسی کو معلوم نہیں

ایضاً

دل! رازِ ثبات تجکو معلوم نہیں — اصلی حالات تجکو معلوم نہیں
تو نقطۂ اصل و مرکزِ ہستی ہے — شاید یہ بات تجکو معلوم نہیں

ثباتِ ہستی

ہے گرم بپا رسمتِ بازارِ فنا — ہے دارِ حیات سربسر دارِ فنا
لیکن کیونکر جہاں کو فانی سمجھوں — ذرّے کو بھی جب نہیں ہے اقرارِ فنا

تناسخ

یہ ہستی جزو و کُل نہیں ہونے کی — مستی پابندِل نہیں ہونے کی
محفل بدلے لگن بدل جائے مگر — یہ شمعِ حیات گُل نہیں ہونے کی

فلسفۂ گناہ

گر مجھ پر کبھی زندگی عنایت کرتا — مالک میرے خودی عنایت کرتا
ہوتے ہیں گناہ وجہ تکمیلِ حیات — پھر ذوقِ گناہ ہی عنایت کرتا

تہذیب و فطرت

تابع ہمیں عقل کا کیے دیتی ہے — آزادیِ دل فنا کیے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے — فطرت سے ہمیں جدا کیے دیتی ہے

تشکیک

دیں شیخ کا - مذہب برہمن کیا ہے ‌ ‌ ‌ کیا غایتِ جاں ہے مقصدِ تن کیا ہے
دعوے کے ہیں یہ قصہ ہائے نار و جنت ‌ ‌ ‌ کس کو معلوم سببِ مُردن کیا ہے

بعض رباعیوں میں اپنے رنگ کے خلاف رندی و سرمستی کے خیالات ادا کیے ہیں - اور اس جوش و خروش کے ساتھ کہ تعجب ہوتا ہے کہ آیا یہ وہی غم پرست شاعر ہے! کوئی اور - ایک رباعی سنتے جائیے :-

نوروز ہے غرقِ بادہ دنیا کردے ‌ ‌ ‌ میرا ارمان آج پورا کردے
پیالوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی ‌ ‌ ‌ تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کردے

ہمیں رواں صاحب کے فلسفۂ حیات سے اختلاف ہو یہ امر دیگر ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے کنوکشن (معتقدات) کو جوش اور رنگینی کے ساتھ شاعری کے پیرایہ میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں - اور خصوصاً رباعی میں وہ ایک بلند پایہ سخنور کہے جانے کے اہل ہیں -

اسی کے ساتھ ساتھ کلیات میں بعض مقامات پر زبان کی خامیاں اور فروگذاشتیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً صفحہ ۳۷ پر پران ناتھ استعمال کیا ہے حالانکہ تقطیع میں پ یا ر گر جاتی ہے - اگرچہ ہندی زبان دونوں حرفوں کا تلفظ ایک حرف کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے، مگر اردو اسکی متحمل نہیں ہو سکتی - صفحہ ۴۰ پر ذوالاکرام ہے - جسکے کچھ معنی نہیں - ذوالکرم اس موقع پر ہونا چاہیے یا قافیہ و وزن کی رعایت سے نیکنام وغیرہ - اکثر جگہ لگانے قابل، دیکھنے قابل لکھا ہے - حالانکہ یہ غیر فصیح ہے - اسی طرح سے صفحہ ۴۸ پر مسافر کے بدلے سفیر کا لفظ بے محل ہے - صفحہ ۱۴۲ پر ہر بنی آدم تحریر کیا ہے - ظاہر ہے کہ بنی آدم جمع ہے اسیر ہر بنی آدم لکھنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے -

علاوہ بریں صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۶ پر مثنویات کو نظمات کی ذیل میں درج کر دیا ہے - یہ اور اسی قسم کی چند اور فروگذاشتیں ہیں - جو اگر نہ ہوتیں تو بہتر تھا - تاہم ان جزوی تسامحات کی بنا پر جناب رواں کے کلام کے مجموعی اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا - بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ادبی کمال کی وجہ سے ملک کے خوشگو شعرا کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں -

ضیاء احمد ایم اے بدایونی
(لکچرار - علیگڈھ)

۲۴ - اکتوبر ۲۸ء

غلط رہ نمائی

دو چیز تیرۂ عقل است، دم فرو بستن
بوقتِ گفتن، و گفتن بوقتِ خاموشی

لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے، ہندوستان کے زعماء و رہنمایانِ قوم و ملک یکجا ہوتے ہیں۔ چار روز کامل جلسوں، مشوروں اور فیصلوں میں گزرتے ہیں اور خاتمہ پر شرکاءِ مجلس اس عظیم الشان جلسہ کے بخیر و خوبی اتمام پر باہمدگر مبارکباد دیتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند سال کی خانہ جنگیوں اور بہیمیت کی نمائش کے بعد بالآخر ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہاتھ آگیا جس سے بد نصیب ہندوستان تیرہ و تاریک ہنگاموں سے نکل کر آزادی کی روشنی بخش جد و جہد میں گامزن ہونے کے لائق بنجائیگا، اور ملک میں پھر وہی یکجہتی و اتحاد کی ہوا چلنے لگیگی جو ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے اندر معراج حاصل کرنے کی دلخوش کن توقعات پیدا کرنے کی موجب ہوئی تھی۔

کانفرنس کے اندر مسلمانوں کی تینوں بڑی سیاسی مجالس کے نمایندے تشریف رکھتے ہیں آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے اُس ذیلی مجلس کے ارکین موجود ہیں جو ہندوستان کے لیے دستورِ اساسی ترتیب دینے کے متعلق غیر مسلم جماعتوں سے گفت و شنید کرنے پر مامور تھی، مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ تین روز تک لکھنؤ میں منعقد رہتا ہے، اور آخری دن میں نمایندے کانفرنس کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ اپنی محترم جماعت کی طرف سے دس بزرگوں کو نمایندگی کے لیے انتخاب کرتی ہے۔ کانفرنس کا اجلاس قیصر باغ کی مشہور بارہ دری میں بڑے طمطراق اور جاہ و جلال کے ساتھ شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے دستورِ اساسی مرتب کرنے والی کمیٹی کے ارکین کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف اور شکریہ کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ مجلس خلافت کی طرف سے مولانا شوکت علی صاحب نہرو کمیٹی کا شکریہ ادا فرماتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ایک حرفِ مخالفت بھی زبان سے نکلے تو میری زبان مفلوج ہو جائے، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلما اپنی محترم مجلس کی طرف سے شکریہ ادا فرماتے ہیں اور مولوی محمد یعقوب صاحب گزشتہ اجلاس مسلم لیگ کے صدر مسلم لیگ کی نمایندگی فرما کر تجویز شکریہ کی تائید فرماتے ہیں۔ اور جب تجویز کی منظوری کا وقت

آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مولانا حسرت کے سوا جنکی مخالفت کی تائید اُس جماعت کے کسی رُکن نے بھی نہ کی جسکے نمائندہ ہوکر وہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، کسی کو اظہار تشکر میں عذر نہیں۔

اسکے بعد ڈومینین سٹیٹس (یعنی برطانوی نو آبادیات کے ساوی درجہ) والی تجویز پیش ہوتی ہے تو سب سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو ایک علان برات پڑھتے ہیں جس پر اُنکے علاوہ دیگر ہندو مسلمانوں کے دستخط ثبت تھے اور جسکا مفہوم یہ تھا کہ ہم لوگ آزادیٔ کامل کے حامی ہیں اس لیے حصول مدعا کے لیے اپنی آزادیٔ عمل کو قائم رکھتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ اس تجویز کی تائید ہم نہیں کرسکتے، مگر چونکہ کانفرنس کے کام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے اس لیے اس تجویز کے متعلق ووٹ دینے سے ہم اجتناب کریں گے۔ پھر مسٹر سبھاش چندر بوس اپنی اور شعیب قریشی صاحب کی جانب سے اعلان فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم لوگ اس کمیٹی کے رکن تھے جس نے یہ دستور اساسی مرتب کیا ہے، لیکن آزادیٔ کامل کی جد وجہد کرنے کے متعلق ہم بھی اپنی آزادیٔ عمل پر قرار رکھیں گے۔ البتہ اس تجویز کی منظوری میں ہارج نہ ہونگے۔ اسکے بعد خلافت کمیٹی کی جانب سے مولانا شفیع داؤدی صاحب صدر مجلس خلافت، اور جمعیۃ العلماء کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند بھی اسی قسم کے اعلان فرماتے ہیں، اور بالآخر مولانا حسرت موہانی کی واحد اختلافی رائے کے ساتھ تجویز منظور کرلی جاتی ہے۔

اب فرقہ وارانہ مسائل کی باری آتی ہے اور سب سے پیشتر مسئلۂ سندھ کے بارے میں اعلان ہوتا ہے کہ سندھ کے ہندو مسلمان اور پارسی نمایندوں نے باہمی سمجھوتے سے ایک تجویز منظور کرلی ہے جس پر مسلمانوں کی جانب سے مولانا شوکت علی صاحب اور مولانا شفیع داؤدی صاحب نے بھی دستخط فرمادیے ہیں۔ اور یہ تجویز جلسہ کے سامنے پیش ہوکر منظور کی جاتی ہے۔ خدا بہتر معلوم نہیں کہ مولانا حسرت نے جو ہر تجویز سے اختلاف کرنے کے لیے گویا مامور تھے اس تجویز کے بارے میں اپنا اختلاف ثبت کرایا یا جلسہ کے اندر جس جوش وخروش کا اظہار اس موقع پر کیا گیا اس نے اُنکو اپنے وظیفہ سے غافل کردیا۔

پھر تالیوں کی گونج میں پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ نمایندوں کی جانب سے ایک متفقہ سمجھوتہ پیش ہوا۔ جسکے متعلق مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی کو ضامن بنانے کے بجائے غلطی سے ڈاکٹر سپرو، مولانا ابوالکلام اور مسز سروجنی نائیڈو کو واسطہ بنایا گیا تھا۔

مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب، جمعیۃ العلماء کے چار محترم نمایندے مراجعت فرمائے وطن ہوچکے تھے ورنہ وہ مشاہدہ

فرماتے کہ جب یہ سمجھوتہ سنایا گیا اور اس پر دستخط کرنے والوں کے نام پڑھے گئے تو شرکائے بزم نے کس درجہ مسرت و انبساط کا اظہار کیا۔

دفعتاً مولانا شوکت علی صاحب "اوسٹرم" (تقریر کرنے کا مقام) پر تشریف لائے اور بپھرے ہوئے انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں اعلان فرمایا کہ خلافت کمیٹی نے اسکے خلاف تجویز منظور کی ہے اور خلافت کمیٹی اُسی تجویز پر قائم ہے۔

بجلی کی کوندھ دیکھکر یا بادل کی گرج سُن کر جو حالت لوگوں کی ہوتی ہے بعینہ یہی سماں اُسوقت جلسہ میں نظر آرہا تھا۔ غیر مسلم انگشت بدنداں تھے کہ صوبۂ پنجاب کے نمایندوں کے باہمی سمجھوتے کے بعد اس قسم کے اعلان کا کیا محل تھا۔ اور مسلمان ندامت سے سرنگوں تھے کہ اُنکے محبوب ترین رہنما مقتضیات وقت سے کس درجہ ناآشنا ہیں۔

اسی حالت میں بعض نمایندگان پنجاب نے مولانا سے استفسار کیا کہ مجلس خلافت نے اس قسم کے اعلان کی کب ہدایت کی تھی؟ اور مولانا نے زبان سے کم مگر چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ کی جنبشوں سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کا جواب بھی مرحمت فرمایا اور اُنکے نیچے اترتے ہی مولانا عبدالقادر قصوری نے پنجاب کے مسلمان نمایندوں کے طرز عمل کے حق بجانب ہونے کے متعلق ایک واضح بیان دے کر اہل جلسہ کی تشویش و حیرت کو دفع کر دیا۔

پھر بنگال کی جانب سے مسٹر سین گپتا اور مولانا اکرم خاں صاحب نے اعلان کیا کہ بنگال کے ہندو مسلمانوں کو نہرو رپورٹ کی وہ تجاویز منظور ہیں جنکا تعلق اُس صوبہ کی فرقہ وارانہ نمایندگی سے ہے۔

اب بقیہ سفارشات کے متعلق ترمیمات پر بحث شروع ہوئی نمایندگان جمعیۃ العلماء میں سے مولانا حسرت کو سب سے زیادہ تقریر فرمانے کے مواقع حاصل ہوئے کیونکہ اُنھیں باب بسم اللہ سے لیکر تائے تمت تک غالباً ہر چیز سے اختلاف تھا۔ اور دس نمایندوں میں سے ایک جب فرض کفایہ کی ادائگی کے لیے اس درجہ مستعد ہو تو بقیہ اصحاب کے سر سے ساری ذمہ داری ساقط ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔

مسلم لیگ کے نمایندوں میں سے مولوی محمد یعقوب صاحب تو ادائے شکریہ کے بعد ہی تشریف لے گئے تھے البتہ ڈاکٹر کچلو اور مسٹر چھاگلہ کانفرنس کی کارروائی میں برابر حصہ لیتے رہے اور آخر الذکر کی ایک اہم ترمیم بحث و مباحثہ کے بعد اصولاً قبول بھی ہو گئی

مجلس خلافت کے نمایندوں میں سے پنجاب کے بعض اصحاب نے پورا پورا حصہ لیا۔ مولانا شوکت علی تو پہلے ہی شیر مار چکے تھے اس لیے اب چھوٹے چھوٹے پرندوں اور ننھے ننھے پرندوں کے شکار کی طرف کیوں مائل ہوتے۔ البتہ مولانا شفیع داؤدی صاحب نے بعض ترمیمات پیش کیں۔ ایک میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بعض تبدیلیاں تجویز کیں جسے انھوں نے بھی قبول فرما لیا اور کانفرنس نے بھی اُسکی منظوری دیدی۔ بعض کے متعلق صدر نے یہ فیصلہ کیا کہ منظور شدہ تجاویز کی بدولت اب یہ ترمیمات خلاف ضابطہ ہو گئیں اور آخری ماندہ ترمیم پیش کرنے کے وقت معلوم ہوا کہ صاحب موصوف صدر کے اس فیصلہ سے ناراض ہو کر کسی دعوت میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ اور انھوں نے یا مولانا شوکت علی صاحب نے خلافت کمیٹی کے کسی دوسرے نمایندے کو بھی یہ خدمت سپرد نہیں فرمائی کہ اس ضروری ترمیم کو جلسہ کے روبرو پیش کرے۔

دو دن بعد مولانا شوکت علی صاحب لکھنؤ سے دہلی پہونچے اور ہمدرد کے ذریعہ آل پارٹیز کانفرنس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اور بمبئی پہونچ کر کانفرنس کی مخالفت میں اخبار خلافت کے ذریعہ مسلسل گولہ باری شروع کر دی گئی اور کانفرنس کے ساتھ ہی ساتھ مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام اور "پنجابی ٹولی" سبھی کو تاک تاک کر مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔

ادھر مولانا شوکت علی نے شبخون مارا اور اُدھر جمعیۃ علماے ہند کے اخبار الجمعیۃ نے بازم مارنا شروع کر دی اور حضرات صدر و ناظم جمعیۃ نے اسی پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ بعض مشتبہ چال چلن کے لوگوں کی معیت میں جامع مسجد دہلی میں ایک جلسہ کرکے کہرام مچا دی کہ لکھنؤ میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو گیا۔

ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ایسی جماعتیں پہلے سے موجود تھیں جو آتش افتراق کو شعلہ زن کرنے کے لیے ہوا دینے پر مامور تھیں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء کی شرکت سے اُنکے نصیب کھُل گئے۔ اور سارے ملک میں طوفان وتلاطم بپا ہو گیا۔ اور مسلمانان ہند دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

نہرو رپورٹ کوئی خدائی ضابطہ نہ تھا کہ اُسکے خلاف زبان کھولنا گناہ قرار پائے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کی غرض ہی یہ تھی کہ اس رپورٹ کے مالہ وما علیہ پر غور و بحث ہو۔

کوئی شخص یہ توقع نہیں کرتا تھا کہ ہندوستان کے تبیس کروڑ باشندوں میں سب ہی اسکے حرف حرف کو تسلیم کر لیں گے۔ اور کم سے کم ہر قوم کے اندر ایک جماعت ایسی ضرور موجود تھی جسکے متعلق آسانی سے پیشینگوئی کی جا سکتی تھی کہ خواہ باہم اُنکے درمیان کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو مگر اس رپورٹ کی مخالفت میں وہ ضرور متفق الخیال ہونگے۔

لیکن یہ توقع بیجا نہ تھی کہ ملک کے وہ تمام ہی خواہ، جو موجودہ اجنبی حکومت سے کسی نہ کسی حد تک بیزار ہیں اور متمنی ہیں کہ اس ملک میں بھی اہل ملک کو وہی حقوق حاصل ہوں جو اغیار اور دنیا کی اکثر دوسری اقوام کو اپنے اپنے ممالک میں حاصل ہیں، اس رپورٹ کو پورے غور و خوض اور ضروری تغیرات و ترمیمات کے بعد ضرور قبول کر لیں گے تاکہ کسی قسم کی مشترکہ جدوجہد ممکن ہو۔

مجلس خلافت کے ایک مخلص کارکن، اس رپورٹ کی تیاری میں شریک رہے تھے اور سوائے ایک دو باتوں کے رپورٹ کے بقیہ حصص کے بارے میں اُن کا اختلاف بھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔

مجلس خلافت میں جب تین دن کے قریب بحث ہوئی تو اُسوقت بھی صرف بعض جزئیات میں ترمیم کا مطالبہ کیا گیا۔ پوری رپورٹ مسترد نہیں کی گئی۔

جمعیۃ العلماء نے البتہ غالباً اس غلط فہمی (غلط فہمی اس لیے کہ بعد کو ڈاکٹر انصاری صاحب نے تحقیقات کی تو آل پارٹیز کانفرنس کا دعوت نامہ دفتر جمعیۃ العلماء کے کاغذات سے برآمد ہوا) میں کہ آل پارٹیز کانفرنس نے اُسکو دعوتِ شرکت نہ دے کر اُسکی اہمیت کو نظر انداز کیا، اپنی بعض مخالفانہ رایوں کو قبل از وقت شایع کر دیا۔ لیکن جب اُسکے نمایندے کانفرنس میں شریک ہوئے تو اُن کا فرض تھا کہ جن جن امور میں اختلاف تھا کانفرنس کے روبرو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتے اور شرکائے کانفرنس کو موقع دیتے کہ اُنکے اعتراضات کو جانچیں اور فیصلہ کریں کہ وہ کہاں تک قابل قبول یا لائق استرداد ہیں۔ لیکن یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ دلوں کی باتیں زبانوں پر نہیں آئیں۔ بیشتر حضرات صم وبکم بنے بیٹھے رہے اور اب ہر طرف سے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق پامال ہو گئے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہو گیا۔ وغیر ذلک۔

اب اگر غور کیا جائے تو اس سارے شور بے ہنگام کا باعث سوائے اسکے کیا ہو سکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب کے بقول آل پارٹیز کانفرنس میں بعض رہنمایان خلافت اور چند علماء کرام کی وہ آؤبھگت نہیں ہوئی جسکے یہ حضرات اپنے تقدس منصب کے لحاظ سے حقدار تھے۔

اگر یہی تھا، اور اسکے سوا بظاہر کوئی معقول بات کہی بھی نہیں گئی، تو ذرا غور کرنا چاہیے کہ اسکی ذمہ داری کس پر ہے؟ مولانا شوکت علی صاحب اور مولانا شفیع داودی صاحب دونوں بزم صدر کے پشت پر جو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں وہیں مولانا ابوالکلام اور مہاراجہ صاحب محمود آباد وغیرہ کے پاس تشریف فرما تھے۔ اور جب سندھ کا معاملہ پیش ہوا تو باوجودیکہ ان حضرات کو سندھ سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا مگر انکی منزلت پر نظر کرکے ان دونوں صاحبوں سے بھی سندھ کے سمجھوتے پر دستخط کرائے گئے۔ حضرات علماے کرام جلسہ میں بہت دیر کو تشریف لائے اور آخری نشستوں میں دیگر نمایندگان جمعیۃ العلماء و مجلس خلافت کے پاس بیٹھ گئے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کو یہ امر نامناسب معلوم ہوا تھا تو وہ بہت آسانی سے بابو موہن لال سکسینہ یا اور کسی کارکن کو توجہ دلاکر ان حضرات کے لیے عمدہ نشست کا انتظام فرما سکتے تھے۔ بلکہ زیادہ آسان یہ تھا کہ وہ خود آگے کی صف میں جہاں تشریف رکھتے تھے اُس جگہ کو خالی کرکے ایک صاحب کو وہاں لیجاکر بٹھا دیتے جسکے سبب منتظمین کانفرنس کو غالباً اس غلطی کے انسداد کی طرف توجہ ہو جاتی۔ مگر شاید وہ بھول گئے کہ

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است

اور اسلامی تعلیم کے بموجب تو غالباً یہ بات ایسی وقیع نہ تھی کہ اتنی اہم مجلس کی کاروائی پر اس کا اثر پڑنے دیا جاتا۔ پھر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داودی کو تو اس کس پرسی کی بھی شکایت کا موقع نہیں۔ اور اسی لیے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ ان حضرات کی موجودہ روش کا سبب کچھ اور ہی تھا۔ وہ سبب کیا ہو سکتا ہے؟

کیا یہ کہ مجلس خلافت کے آخری اجلاس میں مولانا شوکت علی صاحب کی رائے و مرضی کے خلاف انگورہ فنڈ کے اس سرمایہ سے جو اسی جلسہ میں مجلس خلافت کی ملک قرار دیدیا گیا، بیس ہزار روپیہ جامعہ ملیہ کی اعانت میں دینا منظور ہوا۔ اور اُسکی ذمہ داری اُنکی رائے گرامی میں ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام اور سینجابی ٹولی کی سازش پر ہے۔ یا پھر جیسا کہ اُنکی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کہ پنجاب کے بارے میں جو سمجھوتہ ہوا ہے اُسکے متعلق اُنکی رائے والا یہ ہے کہ پنجابی ٹولی اور مولانا ابوالکلام نے اس سمجھوتے کے ذریعہ سے مجلس خلافت کو ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے، میں کچھ ذاتی واقفیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اتفاق سے اُس وقت میں مجلس خلافت کے جلسہ میں موجود نہ تھا۔ البتہ جو کچھ سُنا اُسکی بنا پر سمجھتا ہوں کہ خواہ یہ تصفیہ مولانا شوکت علی صاحب کی رائے کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہوا ہو، مگر یہ بات کچھ ایسی نہ تھی کہ

اس کا اثر آل پارٹیز کانفرنس کے معاملات میں قبول کیا جاتا۔

اب رہی دوسری بات، تو میری ناقص رائے میں اول تو مرکزی خلافت کمیٹی کی ذلت و رسوائی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ سمجھوتہ کرنے کے گناہگار سب کے سب مجلس خلافت کے رکن ہیں۔ اور کم سے کم دو حضرات ایسے ہیں جو سنین ماضیہ میں مجلس خلافت کے صدر رہ چکے ہیں۔ دوسرے جو تھوڑی بدنمائی پیدا ہوئی ہے اُسکے ذمہ دار بھی بہت کچھ مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی ہیں۔ کیونکہ سمجھوتے کا اعلان ہونے سے قبل دونوں حضرات کو بتا دیا گیا تھا کہ نمائندگان پنجاب کیا تصفیہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُنکا فرض تھا کہ وہ مجلس مرکزیہ خلافت کا ملتوی شدہ جلسہ طلب کرتے اور تمام صورت حالات کو اُسکے روبرو پیش کرکے ازسرِنو فیصلہ کرا لیتے۔ اور جیسا کہ مجلس خلافت کے اندر رائے شماری سے ظاہر ہوا تھا یہ امر یقینی ہے کہ مجلس خلافت اس سمجھوتے کو قبول کر لیتی۔ کیونکہ ابتدائً جب یہ مسئلہ پیش ہوا اور رائے شماری کی نوبت آئی تو پہلے اہل پنجاب کی رائے لی گئی۔ ۴ نے تحفظ نشست کے خلاف اور ۱۱ نے موافق رائے دی۔ پھر جب سب اراکین کی رائے لی گئی تو اُسوقت ۲۶ موافق اور ۱۵ مخالف تھے۔ اب اگر یہ سمجھوتہ سامنے آتا تو ۱۵ پنجابی اور ۱۱ دیگر صوبجات کے نمائندوں کی مجموعی طور پر ۲۶ رائیں سمجھوتہ کے موافق ہوتیں اور زیادہ سے زیادہ ۵ رائیں مخالف۔ بہت ممکن تھا کہ مخالفت کرنے والوں کی تعداد اس سے بھی کم ہو جاتی اسلیے کہ تحفظ کی موافقت میں رائے دینے والوں میں سے بعض حضرات نے محض اہل پنجاب کی اکثریت کا ساتھ دیا تھا۔ کانفرنس میں جانے سے قبل بھی عرض کیا گیا اور کانفرنس میں سمجھوتہ ہو جانے کے بعد تو ۱۱ اراکین خلافت نے تحریری درخواست دی کہ مجلس خلافت کا ملتوی شدہ جلسہ طلب کیا جائے۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

بہرحال اس تمام روداد سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے رہنمایانِ کرام کے سامنے قوم و ملک کی فلاح و بہبود کے بجائے ذاتیات کا سوال کتنی زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور شکوک و شبہات یا کدورت و رنجش پر ملک و قوم کے اہم سے اہم مقاصد کس طرح قربان کر دیے جاتے ہیں۔ اور بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ

اب کسے رہنما کرے کوئی؟

۲۷۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء

ظفر الملک

نظرے خوش گزرے

سفیر اودھ ، اس پرچہ میں مکمل ہوگئی ہے۔ صرف سرورق چھپنا باقی ہے۔ جن اصحاب نے اسکے اوراق رسالہ سے علیحدہ کرکے کتابی صورت میں رکھے ہوں دفتر کو مطلع فرمائیں تاکہ سرورق چھپنے کے بعد ارسال خدمت کیا جائے۔

ہمدرد کے سلسلہ میں دہلی کی مسلسل ہفتہ وار حاضری کا نتیجہ یہ ہوا کہ الناظر کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہوتی رہی تا آنکہ اب ختم سال میں دو ماہ سے بھی کم باقی رہ گئے ہیں اور الناظر کے چھ پرچے شایع ہونا باقی ہیں۔ پہلے خیال تھا کہ دو سہ ماہی نمبر نکال کر سال آیندہ سے پرچہ کی بروقت اشاعت کا انتظام کیا جائے مگر آیندہ چند ہفتوں میں غیر معمولی معروفیت کا سامان فراہم ہے، اسلیے امید نہیں کہ اس پر عمل کیا جاسکے گا۔

ماہ رواں کے آخر میں سائمن کمیشن ناخواندہ مہمان بنکر لکھنؤ آرہا ہے اور دس دن تک یہاں قیام کرنیوالا ہے۔ ان بن بلائے مہمانوں پر اہل شہر کو مختلف مظاہروں کے ذریعہ یہ امر واضح کرنا ہے کہ دفتری اقتدار کے کارندے خواہ کتنے ہی نمایشی طریقوں سے انکا خیر مقدم کریں مگر اہل لکھنؤ اس خیر مقدم میں شریک نہیں۔ پھر ۶ دسمبر کو مولانا محمد علی صاحب یورپ سے ہندوستان واپس پہونچنے والے ہیں۔ انکی تشریف آوری پر ہمدرد کے سلسلہ میں غالباً کامل ایک ہفتہ دہلی میں رہنا ہوگا اور بڑے دن کی تعطیل میں قومی ہفتہ کی شرکت کے لیے کلکتہ جانے کا قصد ہے۔ ان تمام معروفیتوں کو پیش نظر رکھ کر تہیہ کرنا پڑا ہے کہ ۱۹۲۸ء کی دوسری ششماہی کا کوئی پرچہ شایع نہ کیا جائے بلکہ نئے سال سے الناظر کو بروقت شایع کرنے کی کوشش کی جائے۔ جن اصحاب کی میعاد خریداری جون میں ختم ہوتی ہے انکا سال خریداری آیندہ جولائی کے بجائے جنوری سے شروع ہوگا اور جنوری ۱۹۲۹ء کا پرچہ انکی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کیا جائیگا۔ اور بقیہ اصحاب کی میعاد میں چھ مہینے کی توسیع کردی جائیگی تاکہ کسی صاحب کا اس تاخیر سے نقصان نہ ہو۔

کرمی جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل غازی آباد الناظر کے لیے امریکہ کی تاریخ ترجمہ و تلخیص کے بعد تیار کررہے ہیں۔ انشاءاللہ نئے سال سے اسکے اوراق ماہ بماہ نذر ناظرین ہونگے۔ اور کوشش کیجارہی ہے کہ ۱۹۲۹ء کے اندر اندر یہ کتاب مکمل ہو جائے۔ وما توفیقی الا باللہ

ظفر الملک ۔۔ ۸ نومبر

عجز اور قصور ہمت کا عایق نہ ہو تو مجھے ایسی امید داری ہے کہ میرے امثال مین کمتر کسی کو ہوگی جب تک تلاش کی طرف توجہ نہین ہے البتہ کچھ عسرت اور افکار مین گرفتاری ہے چنانچہ اوسی خانہ نشینی کے عرصہ مین بدون اس کے کہ میری طرف سے کچھ درخواست ہو نواب محمد علی خان ٹونک کے نواب نے کمال آرزو سے گھر بیٹھے مجھے طلب کیا اور پانسو روپیہ درماہہ میرا مقرر کیا۔ بعضے وجوہ سے اوس کے قبول کرنے مین تامل تھا آٹھ مہینے تک راقم نے آرے اور بلے مین رکھا اور باوصف اونکے اصرار کے اور تاکید طلب کے وہان جانے کا اتفاق ہوا۔ اس عرصہ مین اون پر ایک مصیبت آئی یعنی سلطنت انگریزی کی عدالت اور انصاف نے اون کو حکومت سے معزول کر دیا اب اصرار اور مبالغہ نواب محمد علی خان کا میری طلب مین اور زیادہ ہوا اور جو قصہ اون کی معزولی کا سنا اوس سے معلوم ہوا کہ جن رفع مظالم کی نیت سے اون کی معزولی ہوئی اوس مین اوس بیچارے کی ذات پر مظالم واقع ہوئے اگرچہ پچھلے امتحانون سے راقم اپنے دل مین عہد کر چکا تھا کہ کبھی ہندوستان کے پولیٹکل یعنی نظم سلطنت کے باب مین گورنمنٹ کی تدابیر کے مخالف کسی تدبیر مین راقم شرکت نہ کریگا لیکن صرف اس نظر سے کہ ایسے اوقات مین اس جنس کے رؤسا اکثر غدار اور مفسد اور طماع لوگون کے پھندے مین پڑ جاتے ہین اور تباہ ہوتے ہین شاید اگر میرے مشورہ کو قبول کرین تو اون کے دستبرد سے بچین اور اس معزولی کی بلا سے زائد اور تباہی مین نہ پھنسے ہین راقم نے اون کی رفاقت اور مصاحبت قبول کی اگرچہ اوسکے قبول کرنے مین راقم فی الجملہ اپنی ہتک سمجھتا تھا جب راقم اون کے پاس آیا تب اونھون نے نہایت عجز اور الحاح سے مجھ سے کہا کہ پانسو روپیہ مہینا جو حالت قیام ریاست مین اونھون نے وعدہ کیا تھا اب اوس کا ایفا اون سے نہین ہو سکتا ایک مہینا اوس حساب سے دیکے درخواست کی کہ تین سو روپیہ مہینا سے زیادہ اب وہ متحمل نہین ہو سکتے چونکہ مین اون کے پاس آ چکا تھا اور وہ عذر اون کا قابل قبول تھا راقم نے قبول کیا وہ بس تک باوصف اس کے کہ اون کی رفاقت مین راقم کا بہت نقصان ہوا اون کے

ذکر نواب محمد علی خان والی ٹونک کی معزولی اور حال بحالی کا اور مصنف کی طلبی کا اور ان کے پاس جانے کا اتفاق ہوا

نواب محمد علی خان کے معزولی کے بنا پر صاحب راقم کی طلبی اور مصنف کا ان کے پاس جانا اور رفاقت ان کی قبول کرنا

ہمراہ رہا۔ اس صحبت دراز مین اگرچہ اون کو راقم نے حسن اخلاق اور تواضع اور فروتنی اور بعضے اور صفات مستحسنہ مین فرو پایا مگر شان ریاست اور سرداری سے اون کو عاری پایا اور چونکہ علی العموم اہل ہند خصوص رؤسا اور بالتخصیص اون مین اہل اسلام ادبار اور نکبت مین گرفتار ہین سو اپنا نیک و بد سمجھنے کی کسی کو لیاقت نہین ہے اور بالتخصیص رؤسا آدمی کو بالکل نہین پہچانتے اور مطلق دوست اور دشمن مین اونکو تمیز نہین ہے جیسا مولوی معنوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہین چشم واندو گوش واز واین زکا + خیرہ ام از چشم بندی خدا + کوئی ایک نصیحت میری اونھون نے قبول نہ کی جہان تک ممکن تھا مصارف لغو سے مین اون کو روکتا رہا سگر بہرچہ فروش گندم نما لوگون کے ہاتھ مین جیسے وہ پھنسے تھے ویسے ہی پھنسے رہے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا اسباب ٹونک سے ساتھ لائے تھے وہ سب اوڑا دیا۔ میری صلاح یہ تھی کہ کہین کسی کو وکیل کر کے نہ بھیجین صرف وہین بیٹھے ہوئے ایک مرافعہ وزیر ہندوستان کے پاس کر دیوین اگر کچھ مفید ہو تو بہتر نہین تو صبر اور شکر کرین آخر اونھین کا بیٹا رئیس ہے۔ پانچ ہزار روپیہ درماہہ اون کا مقرر ہے جو اسباب پاس ہے اوس کی حفاظت کرین۔ ایک نہ سنی جو پاس تھا اوس کو ضایع کیا۔ آیندہ دیکھیے اون کی کیا گت ہوتی ہے خدا اون کو زندہ رکھے بعضے صفات مستحسنہ مین بے نظیر ہین غرض صحبت راقم کی اون کے ساتھ برہم ہوئی اور رفاقت اونکی ترک ہوئی۔ اب میری غیبت مین ٹھنڈے لوہے کے پیٹنے کی تدبیرون مین جڑ گیا

ذکر اولوالعزمی اور ناموری راقم باجمال

سو گیا آیندہ دیکھیے کیا کھوتے ہین۔ ان سب کوایف کے نقل کے بعد بموجب مضمون بلاغت مشحون وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اس امر کے اظہار سے راقم کو باک نہین ہے
(اپنے پروردگار کی نعمت کا بات چیت مین ذکر کر)
کہ مجھ سا بد لیاقت ناقص اور ناتمام اپنے جوہر ذاتی مین اس وقت تک جسکی عمر ستر برس کی پہونچی جناب اقدس الٰہی تعالیٰ شانہ نے محض اپنے لطف و کرم سے بدون استحقاق کے اوسکو اوس رتبہ اور ناموری پر پہونچایا کہ جس نے میرے آبا اور اجداد کی جو شہرت اور بلند پایگی تھی اوس کو روشن کیا۔ انگلستان مین سلطانہ برطانیہ اعظم اور ایرلینڈ اور ہندوستان وغیرہ یعنی ملکہ معظمہ وکٹوریا دام اقبالہا و حشمتہا جس کا جھنڈا شوکت اور عظمت کا اکثر کرہ عالم پر اوڑ رہا ہے اوس کے دربار مین

راقم نے نہایت عزت اور امتیاز کے ساتھ راہ پائی۔ اونکے کھانے کی سیر پر مدعو ہوا تھا اگرچہ باقتضاے تقدیر کے جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے اوس کا ظہور نہ ہوا۔ ہندوستان مین ایک وقت مین کئی سو سوار اور پیادے انگریزی فوج کے میری سواری کے جلو مین دوڑے۔ قطع نظر اپنے ہندوستانیون کے ابناے جنس سے برافراشتگان انگلشیان جو آج ہندوستان مین سر تفاخر عرش برین پر رکھتے ہین جس صحبت کی شرکت سے اور جس دعوت مین مطلوب ہونے سے نہایت اپنا فخر اور اعزاز سمجھتے ہین اور شاید بعضون کو وہ صحبت اور دعوت باوصف کمال سعی کے میسر نہ ہو یا دشواری سے میسر ہو اون صحبتون اور دعوتون مین راقم سنرباون کی بہت خواہش اور آرزو سے شریک ہوا۔ آنریبل مسٹر گلاڈاسٹن جو آجکل ملکۂ معظمہ سلطنت برطانیہ اعظم کے وزیر اعظم ہین اونکی لیڈی نے اپنی صحبت شبینہ مین جہان تمام ارکین سلطنت اور وزرا اور امرا جمع تھے دو دفعہ اپنا رقعہ طلب کا بھیج کے اوس مجمع کی شرکت سے راقم کو مشرف کیا اور بہت سی دعوتون اور صحبتون مین جن کے میزبان اوس عہد مین مسٹر گلاڈاسٹن سے عزت اور امتیاز مین چڑھ کے تھے شریک ہونے سے راقم نے عزت اور امتیاز حاصل کی نام بنام سب کا ذکر کرنا عبث اور فضول ہے بہت سے لوگون کے نام راقم بھول بھی گیا ہے۔ صدہا میری تصویرین چھپی ہوئی اور کھینچی ہوئی مرقعون مین اور دفترون مین ارکین اور شاہزادون کے برطانیہ اعظم کے اور فرانسیس اور روس اور پروش اور اطالیا اور صقالیا اور جرمن اور پرتگیز اور اسپانیول اور روم اور شام اور مصر کے موجود ہین جب تلک ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی حکومت پر رہی اوس کے کورٹ آف ڈیرکٹرز کے ساتھ اور بورڈ آف کنٹرول کے ساتھ اور قبل اور بعد اوسکے برخاست کے سلطنت کے وزرا کے اور اکثر ارکین اور امرا کے ساتھ مراسلات اور مکاتبات ہوا کیے شاہنشاہ فرانسیس کے خطوط حسب الحکم میرے نام پر آئے اوس سلطنت کے اکثر امرا کے ساتھ مکاتبات رہے اکثر لوگ بہ لقب ہز اکسلنسی مجھکو لکھا کیے۔ الغرض سایۂ عزت و امتیاز ہر خاص و عام کا اوس ممالک کے اشارہ کے واسطے میری طرف اوٹھتا تھا اور میری دعاے شبانہ روزی اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مَحْسُوْدًا وَّ لَا تَجْعَلْنِیْ حَاسِدًا الحمد للہ والمنۃ کہ مستجاب ہوئی کہ یہ گمنام ناچیز ہمیشہ محسود خاص و عام کا

رہا کہ اوس سے اب بھی اس حالت کم مایگی مین بھی بچاؤ نہین ہے اور اگرچہ اس ناموری اور بلند پایگی کے ساتھ جو ہزارون مرتبہ میری حیثیت اور لیاقت سے زاید ہے اور لاکھون روپیہ میرے ہاتھ سے صرف ہوا اور ہاتھ مین آکے نکل گیا کچھ مایہ توکل جو اعقاب کے کام آوے یا میری حالت بے دست وپائی مین کام آوے وہ مین نے نہ چھوڑا اور جو تھوڑا بہت مدتون کی محنت اور مشقت نے اکٹھا کیا تھا وہ انگلستان مین دشمنون کے اور عدالت کے مصارف کے نذر کیا لیکن مال و منال کو مین ہاتھ کا میل سمجھتا ہون آیا اور صاف ہوگیا۔ اب صرف دو آرزو مین ہین جس کے واسطے شبانہ روز دست بدعا ہون ایک یہ ہے کہ اللہ تعالے میری عاقبت بخیر کرے اور دوسری یہ ہے کہ میرے اعقاب فکر حصول ناموری کی اپنی ذات سے کرین اور عیش وعشرت دارین مین بسر کرین اور رزے سعادت اونکی اگر میرے انفاس بقیہ چند کو طلب اور تلاش سے فارغ رکھین۔ گو آرزو یہ ہے کہ ضیق اور عسرت حالیہ کو یاد اے فرایض اور واجبات جو میری گردن پر ہین اس قدر اللہ تعالے اور مجھے اس عالم مین رکھے کہ مین خود اوسکو دفع کرون اور اوس کا بوجھ اعقاب کی گردن پر نہ ڈالون اس واسطے کہ اب تک ہاتھ پاؤن چلتے ہین لیکن اِرَادَۃُ اللّٰہِ غَالِبٌ عَلٰی کُلِّ اِرَادَۃٍ جو مقدر ہو چکا ہے اور لوح محفوظ مین لکھا جا چکا ہے وہ خواہ مخواہ واقع ہوگا۔ راقم کے اولاد ذکور مین ایک میرا بڑا بیٹا مولوی فریدالدین خان سلمہ اللہ تعالے ہے۔ سلخ صفر المظفر ۱۲۵۹ھ مین مطابق یکم اپریل ۱۸۴۳ع پیدا ہوا۔ الحمد للہ نہایت سعید اور رشید ہے بہت تقوے کے ساتھ بسر کرتا ہے استعداد عربیت مین اچھی حاصل کی حدیث شریف کے درس مین بہت اوس کو شغف ہے مشکوۃ شریف اور صحیح بخاری سند کر چکا ہے۔ اور معمولی تحصیل کی کتابون مین متوسطات سے فارغ ہو چکا ہے اب بھی شغل چلا جاتا ہے فکر ہین مطولات سے فارغ ہونے کے ہے۔ سوائے فرایض اور واجبات اور سنن اور مستحبات حتی المقدور ترک نہین کرتا۔ اللہ تعالے نے اب تک با نصیب رکھا ہے تین برس کی عمر مین اودھ کی سلطنت سے قدامت آبائی کی نظر سے سات سو روپیہ مشاہرہ اوسکے واسطے مقرر ہوا اگرچہ پھر تخفیف مین قریب نصف کے

راقم کی اولاد ذکور مین بڑا بیٹا مولوی
فریدالدین خان ہے اور ... چھوٹا ... احمد

رہا مگر سلطنت کی ضبطی تک ملا کیا۔ چونکہ بسبب شغل درس و تدریس کے قوانین سلطنت کے یاد کرنے مین اونکو توجہ نہین ہے اور نہ ایسا کوئی اپنا مربی باقی رہا جس کو نظر رعایت کی ہو۔ سر دست اس سلطنت مین ایسا کوئی عہدہ اون کو ملنا جو موافق حیثیت آبائی کے ہو عسیر معلوم ہوتا ہے۔ اور فضل آلہی سے چونکہ ذہین اور باعلم ہین قوانین یاد کر لینا اور امتحان دینا کچھ دشوار نہین ہے۔ اگر کوئی ایسا مربی ہاتھ آوے کہ فتوح اور فلاح بالیقین ہو تو امخواہ امتحان دینگے اسی نظر سے کہ باوصف ایسی محنت گوارا کرنے کے کچھ حاصل نہو توجہ نہین کرتے۔ بہر صورت اون کی سعادت مندی اور رشادت سے مجھے امید ہے کہ جناب اقدس آلہی تعالے شانہ کوئی راہ اونکی فلاح کی نکالیگا۔ قریب تین برس کے گذرے ہین کہ اونکی شادی کر دی تھی اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ وہ عزیزہ مرحومہ جس کے ساتھ اون کا عقد ہوا تھا لاولد اس جہان سے اوٹھ گئی۔ اس صدمہ سے البتہ اون کو بڑا ملال ہے اللہ تعالے صبر عطا کر دے اور نعم البدل نصیب ہو۔ اس پیرانہ سالی مین ایک مصیبت عظیمہ میرے اوپر یہ ہوئی کہ اب تک اونکی اولاد کے دیدار سے مجھے اطمینان اور مسرت نہ حاصل ہوئی۔ وہ میری پہلی شادی سے جو والدین مغفورین نے کی تھی پیدا ہوا اگرچہ اور اولاد بھی ہوئی تھی مگر کوئی زندہ نہ رہی صرف اوس کی ایک بہن ہے جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہے اوس کی شادی مین اولاد تقریب مین پچیس تیس ہزار روپیہ صرف ہوے۔ عباسیون مین واجد علی سلمہ نام ایک لڑکے سے جو ہمارے خاندان کا نواسہ بھی ہے اوس کی شادی ہوئی۔ بہت لایق اور ہوشیار اور کارگزار ہے۔ اب تک الور کی ریاست مین معزز عہدے پر نوکر تھا۔ کئی مہینے سے بیکار ہے خدا اوس کی دین و دنیا رفاہ اور فلاح سے کاٹے ایک اوس کا بیٹا میرا نواسہ ہے ساجد علی نام کلام اللہ حفظ کرتا ہے بیس سپارے سے زیادہ حفظ کر چکا ہے بہت فطین اور ذہین ہے قیافہ اوس کا بہت اچھا ہے۔ اللہ تعالے اوسکی عمر مین برکت دیوے اور دین اور دنیا مین بآسایش بسر کرے[عہ] دو نکاح راقم نے اپنی خوشی سے کیے۔ ایک سیدہ کے ساتھ نکاح کیا تھا اوس سے میرا چھوٹا بیٹا ہے مولوی اکرم الدین احمد خان نام سلمہ اللہ تعالی تیرھوین رمضان المبارک سنہ ۱۲۶۰ھ مطابق ستائیسوین ستمبر

[illegible]

عہ نانا کی دعا مقبول ہوئی۔ حافظ ساجد علی صاحب وکیل اورنگ آباد کا وجود گرامی اسپر شاہد ہے ۔۱۰

۱۸۶۵ء کو پیدا ہوا فضل الٰہی سے نہایت سعید اور رشید ہوا۔ لیاقت اور قابلیت نوشت و خواند
فارسی کی بہت اچھی حاصل کی۔ عربیت مین متوسطات تک نوبت پہونچی تھی کچھ استعداد بھی
ہو گئی مگر تکمیل نہ کی۔ اپنے شوق سے انگریزی شروع کی۔ تین برس تک لکھنؤ کے کیننگ کالج مین
مشغول رہا۔ انی الجملہ لکھنے پڑھنے کی کچھ استعداد بھی ہو گئی تھی کہ اوسکی شادی جناب عم والا مقام مولوی
خلیل الدین خان بہادر مغفور کی پوتی کے ساتھ جو امیر الدین خان مرحوم کی بیٹی ہے کر دی جب
سے انگریزی کا شغل بھی اوس کا موقوف ہو گیا۔ مین چاہتا تھا کہ اوس مین اوسکو تکمیل ہو جائے
مگر اوس کی ہمت عالی مقتضی خانہ نشینی کی نہ ہوئی۔ جیسا اوپر اوس کی طرف ایما ہو چکی ہے
حیدرآباد دکن کا اوس نے سفر کیا اور وہان فوراً ایک معزز عہدہ پر مامور ہو گیا اور آیندہ امیدوار
ترقی کا ہے۔ اور آجکل میری خانہ نشینی مین مدار مصارف خانگی سارے کس و کو کا جو قریب
ایک سو آدمی زن و مرد ہین اوسی پر۔ اور میرے دو بھتیجے مولوی احسن الدین احمد خان اور مولوی ذکی الدین
خان سلمہم اللہ تعالےٰ پر جو تینون بھائی ایک ہی جگہ پر ہین۔ اور برادر عزیز حافظ مولوی ریاض الدین
خان سلمہ اللہ تعالےٰ پر ہے۔ اللہ تعالےٰ اون سب کی عمرون مین برکت دے اور خوش رکھے

ذکر نسب نامہ ملکزادون و مخدوم زادون قصبہ کاکوری کی ابتدائی فتح

اب ذکر اپنے نسب ناموں کا موافق پچھلے وعدہ کے ضرور ہوا۔ قدیم سے ہم
زبان بزبان سنتے چلے آئے ہین کہ ہم لوگ علوی ہین جن کے دو خاندان اس قصبہ
مین ہین ایک خاندان ملکزادون کا مشہور ہے اور ایک مخدوم زادون کا۔ یون نقل
کرتے ہین کہ ایک بزرگ علوی ابو بکر جامی نام جون پور مین سلطان حسین سلطان الشرق
کے عہد مین وارد ہوئے۔ اسعد الدین یا اسد الدین سالاری اون کے وزیر تھے اون کی بیٹی کے
ساتھ شادی ہوئی اون سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام نصیر الدین نصرت اور دوسرے کا
نام بہاء الدین کیقباد۔ اور قصبۂ کاکوری مین ایک راجہ بیس کی قوم کا تھا اوس کا نام تھا راجہ ساتھنا
اوس قصبہ مین ایک مرد شریف جو ظاہرا سید تھے اوسی راجہ کے سوارون مین نوکر تھے اونکا مکان
اوسی راجہ کے قلعہ کے نیچے تھا جس کا نام کاکورگڈھ تھا۔ وہ سید کہین اوسی راجہ کے کام کو گئے تھے

؎ اول تعلقداری (ڈپٹی کلکٹری) سے پنشن لی ۔ ؎ ایضاً۔

گھر مین اون کی بی بی اور ایک اونکی بیٹی ناکتخدا تھی۔ ساون کا مہینا تھا اون کے گھر مین ایک
درخت تھا اوس پر وہ جھولا جھولتی تھی۔ وہ راجہ بد معاش جوان تھا۔ ہاتھی پر سوار نکلا اوس
لڑکی پر اوس کی نظر پڑی۔ لوگ متعین کیے کہ اوس لڑکی کو لے آؤ۔ اوس لڑکی کی مان نے لوگونسے کہا
بہت اچھا مین اوس کو پوشاک اور زیور سے آراستہ کر دون جب تم لیجاؤ اور کوٹھری مین لیجا کے
پہلے اپنی لڑکی کو چھری سے ذبح کیا اور بعد اوسکے اپنے تئین قتل کیا۔ اوس لڑکی کا باپ جب گھر
مین پھر کے آیا سیدھا جونپور کو چلا گیا اور دن کو مشعلین جلا کے اور سر پر خون مین ڈوبا ہوا کپڑا ڈال کے
قصر سلطنت مین گیا۔ مشعلین دن کو جلانا اشارہ ہے ظلم کی تاریکی کی طرف۔ الغرض جب شاہ حسین
کو اس مظلمہ کی اطلاع ہوئی وہ بہت برہم ہوے اور اپنے وزیر اسعد الدین سالاری کے ساتھ مخفی
ایک بندوبست کیا کہ وہ بادشاہ سے ظاہر مین برہم ہو کے جونپور سے مع اپنے کس و کو کے دلی
کے ارادہ پر روانہ ہوے اور کسی مقام پر کاکوری کے قریب خیمہ کر کے راجہ ساتنا کو اطلاع کی اور یہ
پیغام دیا کہ ہم سے اور سلطان الشرق سے بد مزگی ہو گئی۔۔۔اس واسطے ہم اپنی سلطنت قدیم دلی مین
جاتے ہین اس سفر مین زنانیکا یعنی محل کے لوگون کا لیجانا موجب زحمت کا ہے اس واسطے آپ اگر
مہربانی سے ہمارے محل کے لوگون کو چند روز کے واسطے اپنے قلعہ مین جگہ دیجیئے کہ وہ حفاظت سے
رہین تو ہم بہت ممنون ہونگے دلی مین پہونچ کے اطمینان کے بعد ہم طلب کر لین گے راجہ چونکہ بد معاش تھا
وہ نعمت غیر مترقبہ سمجھا کہ لاکھون کا مال اور وزیر کے محل کی سیکڑون خوبصورت خوب صورت
بیگمات مفت ملتی ہین نہایت خوش ہوا اور نہایت عجز اور الحاح سے عرضی بھیجی کہ قلعہ حضور کا
ہے اور مین غلام ہون بخوبی حفاظت کرونگا اس واسطے بدرقہ کی حاجت نہین ہے قلعہ کے
اندر کوئی مسلح نہ آوے محل کے لوگ بے تکلف داخل ہون۔ اسعد الدین سالاری نے یہ بندوبست
کیا کہ دو ہزار زنانی ڈولی۔۔۔۔ ہر ڈولی پر دو سپاہی مسلح تلوار وغیرہ چھوٹے ہتھیار سے اور تیر و کمان
سے جو اوس وقت رایج تھے تیار کین اور خود کچھ اور بدرقہ کے ساتھ ہمراہ ہوے ظاہر مین جو مسلح
لوگ تھے وہ قلعہ سے باہر رہے ڈولیان سب جب قلعہ مین آ گئین چار ہزار سپاہی مسلح پردہ دونہ

کا اوٹھا کے نکل پڑے اور قتل عام شروع کر دیا۔ خود راجہ کو پکڑ کے سیکڑون عذاب سے قتل کیا
منقول یون ہے کہ سلطان حسین کا حکم تھا کہ کتے اور بلی تک وہان زندہ نہ چھوڑنا۔ یہ ظاہرا
مبالغہ ہے اس واسطے کہ مرد اور عورت اور لڑکے سپاہی اور پیشہ ور کسی کو زندہ نہ چھوڑنا اور سب
پیشہ کے لوگ جون پور سے ہمراہ کر دیے تھے کہ اس قصبہ مین نئے آباد ہون۔ چنانچہ یہ حکایت
ہمارے قصبہ مین سب خاص و عام کی زبان پر اباً عن جدٍ منقول چلی آتی ہے۔ ایک بہت بوڑھا
حجام جو ہمارے خاندان کا برتی تھا وہ بھی چھٹ پن مین ہم سے یہ حکایت نقل کرتا تھا اور کہتا تھا
کہ ہم بھی رئیس قدیم اس قصبہ کے ہین اور تمھارے اجداد کے ساتھ سلطان حسین کے بھیجے ہوے
آکے آباد ہوے ہین۔ الغرض یون منقول ہے کہ ساری کا کوری سلطان حسین نے اسعد الدین
سالاری کے اختیار مین چھوڑی اور اونکے دونون نواسے نصیر الدین نصرت اور بہاء الدین کیقباد یہان
آباد ہوے اونھین کو یا بہاء الدین کیقباد کی اولاد مین سے کسی کو ملک کا خطاب ہوا چنانچہ چند
پشت تک ملک کا لفظ اسما کے ساتھ ضم ہوتا تھا کہ وہ نسب نامہ سے معلوم ہوگا اور اونکی اولاد
سب ملکزادے کہلاتے ہین اور نصیر الدین نصرت کی اولاد سب مخدوم زادہ مشہور ہین اس واسطے کہ اونکی
تیسری پشت مین حضرت مخدوم نظام الدین قاری معروف بہ شیخ بھکاری یا شیخ بھیکہ قدس سرہ پیدا
ہوے جو بہت بڑے نامور مشایخ اور علماء کبار مین گذرے ہین اونکے عہد سے ساری اونکی اولاد
مخدوم زادے کہلاتے ہین آئین اکبری مین مشایخ کے زمرہ مین نام نامی اونکا مندرج ہے اور
بڑے بڑے امراے نامی اکبری عہد کے اون کے مریدین مین تھے چنانچہ ماہم انکہ جو اکبر بادشاہ
کی دائی تھین اور اونکے بیٹے یا بھائی امراے کبار اکبری مین تھے جن کا نام شمس الدین کوکہ مشہور
ہے اونھون نے وصیت کی تھی کہ حضرت کے جوار مین مدفون ہون اون کا بہت بڑا حظیرہ بنا ہوا ہے
اور عوام کی زبان مین ماہم ساہم کا روضہ مشہور ہے۔ حالات اوصفات حضرت کے نقل کرنے کے
واسطے ایک مجلد جداگانہ درکار ہے ان دونون خاندانون مین تو بسبب یکجدی ہونے کے قدیم
سے خلط تھا ایک اور خاندان عباسیون کا ہے یعنی نسل اون کا حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی طرف منتہی ہوتا ہے یہ خاندان بھی مدت سے ہمارے دونون خاندانون سے مخلوط ہے
اور اوسی خاندان مین منصب اس قصبہ کی قضا کا ہے اور وہ مدعی ہین کہ پہلے رئیس کاکوری کے اوسی
خاندان کے بانی ہین مگر سند قدامت کی ظاہرا فرمان اونھین سلطان حسین کا ہے تو غالبًا جب
اسعد الدین سالاری کی اولاد کو ریاست یہان ملی اوسی عہد مین سند قضا کی اوس خاندان کو ملی ہو
ایک اور صدیقی خاندان ہے جو کاکوری کے رؤسا مین ہین وہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی طرف
منتسب ہے وہ خاندان بھی پچھلے زمانہ مین دونون علوی خاندانون سے اور عباسی خاندان سے مخلوط
تھا۔ اب اوس خاندان مین صرف ایک گھر باقی ہے جن سے ہمارے خاندانون مین اختلاط ہے اور
کئی گھر مخدوم زادون کے اوس خاندان کے نواسے ہین جو اب تک ہمارے یہان مختلط ہین۔ کچھ گھر
اوس خاندان کے باقی ہین جن سے اختلاط نہین ہے۔ ایک اور خاندان ہے کہ وہ بھی اپنے تئین
صدیقی کہتے ہین مگر یہ راقم کو نہین معلوم ہے کہ اوسی صدیقی خاندان کے ہین یا اوس سے علاوہ کوئی
دوسرا خاندان ہے جتنے گھر اون کے ہین وہ سب چودھری کہلاتے ہین کسی عہد مین یہ منصب
اون کے خاندان مین مفوض ہوا ہوگا جو پچھلے زمانے مین ایک معتمد خدمت بادشاہی تھی اور اس
سلطنت اودھ کی ضبطی تک کچھ نہ کچھ کام اس منصب کا اون خاندانون مین رہا جب سے انگریزی
ہوئی تب سے صرف نام رہگیا ہے لیکن اوس خاندان سے ہمارے تینون خاندانون کے ساتھ کبھی
خلط اور آمیزش نہین ہوئی۔ ایک اور گھرانا تھا کہ اون کو شامی کہتے تھے ایک بزرگ مولوی حسن بخش
صاحب مرحوم اس گھرانے مین نامی ہوے اونھین کے ذریات کچھ باقی ہین کچھ مغول ہین سنتے ہین
کہ بعضے خاندان مغول کے اس قصبے مین بہت پرانے تھے یہان تک کہ کہتے ہین بعضے پالکی نشین
تھے اور پالکی پچھلے عہد مین یہ پالکی نہ تھی جو اب مروج ہے ظاہرا امراد اوس سے جھالردار پالکی ہے
جو بے عطاے سلطنت کے کوئی استعمال نہین کرسکتا تھا۔ اب بھی کچھ گھر باقی ہین مگر کوئی نام برآوردہ
اونمین نہین ہے سلطنت کی ضبطی تک سپاہ کے فرقہ مین سوارون مین چند لوگ نوکر تھے۔ لیکن وے
لوگ اونھین خاندانون کے ذریات مین ہین جو پالکی نشین کہلاتے تھے یہ ہمکو نہین معلوم ہے سنتے

یون ہین کہ وہ خاندان ہو وہ تالاب جو اس قصبہ مین ہے اوسکے کنارہ رہتے تھے۔ اوراب یہ
لوگ وہان سے الگ قصبے کے شمال کی طرف رہتے ہین۔ کچھ اور خاندان خوش باش بھی تھے اب
کوئی نام براوردہ اون مین نہین ہے۔ ہنود مین کایتھ کی کئی قوم ہین اونمین بھی کوئی نامی نہین ہے
چند لوگ روزگار پیشہ ہین کچھ کھاتے پیتے ہین۔ دو ایک بنیے کی قوم مین کچھ متمول ہو گئے ہین
مردم شماری انگریزی جو ہوئی اوس سے معلوم ہوا کہ کل عام وخاص آٹھ ہزار آدمی اب یہان کے
باشندون مین ہین۔ یہان تک طوالت اس قصبہ کے ذکر مین ہوئی۔ اب اصل غرض جو نسب نامہ
کے ذکر کی ہے وہ یہ ہے ہم نے اپنے والد ماجد مغفور سے سنا ہے کہ جناب حضرت جدامجد مغفور نے
ایک نسب نامہ پچھلے کاغذات اسناد سے لکھا تھا مگر یہ نہین معلوم ہوا کہ وہ خاص اپنے ہی خاندان کا
تھا یا سب خاندانون کا تھا سو وہ نسب نامہ شیخ فیض بخش صاحب مرحوم جو ایک بزرگ ہمارے
ملکزادون کے خاندان کے تھے وہ لے گئے لیکن خود اونھون نے ایک بہت بڑی کتاب تمام
کاکوری کے خاندانون کے نسب نامہ کی لکھی ہے شاید وہ نسب نامہ جناب جدامجد مغفور کا لکھا ہوا
اون کا کچھ معین ہوا ہو یا وہی اصل تھا اس کا حال ہم کو معلوم نہین ہے بموجب اوس نسب نامہ کے
جو وہی امر قدیم سے ہمارے دونون خاندانون مین ملکزادے اور مخدوم زادے کی زبان بزبان چلا
آیا ہے نسبت ان دونون خاندانون کی محمد ابن حنفیہ ابن علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ کی طرف ہے اور
بیچ مین واسطہ شیخ احمد جام کی طرف دونون خاندانون مین مشہور ہے چنانچہ ایک اور بزرگ
مخدوم زادون کے شیخ احسان علی صاحب مرحوم نے اوسی نسب نامہ کے مطابق مخدوم زادون کا
نسب اپنی بیاض مین لکھا ہے اور آخر مین اوس نسب نامہ کے یہ عبارت لکھی ہے۔ از کتاب مخدوم شیخ
بھیکھ قدس سرہ این چند سطور از بیاض شاہ حسن علی صاحب متوطن جورہ من اعمال بلدہ کالپی دربابِ
نسب نامہ نوشتہ شد انتہٰی۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ جناب حضرت شاہ تراب علی قدس سرہ نے
ایک کتاب کشف المتواری لکھی ہے اوس مین جو نسب نامہ مخدوم زادون کا لکھا ہے اوس سے اور
جو قدیم سے ہمارے دونون خاندانون مین مشہور تھا بڑا فرق ہے اور چونکہ وہ نسب نامہ کتاب

زاد الآخرت کے مقدمہ سے نقل ہوا ہے جو تصنیف ملا عبد الرشید ملتانی کی حضرت مخدوم شیخ بھیکہ کے خلفاؤن مین سے ہے بظاہر نہایت معتبر ہے اوس مین نصیر الدین تک تو اتفاق ہے جو قدیم نسب نامون مین نصیر الدین نصرت لکھا ہے اور اوس نسب نامہ مین امیر نصیر الدین دلیل اللہ لکھا ہے بعد اوس کے قدیم نسب نامون مین نصیر الدین نصرت ابن ابو بکر جامی مرقوم ہے اور اس نسب نامہ مین امیر نصیر الدین دلیل اللہ ابن ابو محمد خافی لکھا ہے اور اوسکے بعد بالکل ایک دوسرے کے خلاف ہے اور ابو محمد خافی کے کوئی بیٹے بہاء الدین کیقباد تھے یا اون کی شادی اسعد الدین سالاری کی بیٹی کے ساتھ اسکا حال بھی وہان نہین لکھا گیا۔ ایک امر مشتبہ نقل کرتے ہین کہ شیخ احمد جام علوی نہ تھے شاید فاروقی یا صدیقی تھے۔ غرض عجیب سانحہ ہے نہ مشہور قدیم کو بالکل ہم غلط کہہ سکتے ہین ورنہ انکشاف کشف المتواری کو خلاف واقع تصور کر سکتے ہین۔ بار خدایا اگر یہ کہیے کہ کوئی ایک اونمین سے نسب مادری ہے اور بسبب عظمت شان کسی بزرگ کے اوس طرف منتسب ہوا اور اصل سے سہو اور ذہول واقع ہو گیا۔ یا جیسا بعضے بزرگون کی زبان سے یہ بھی سنا ہے کہ اصل ہمارے خاندان ملک زادون کا انتساب حضرت ابو بکر صدیق کی طرف ہے اور شاید خواجہ احمد جام صدیقی تھے اور جو بزرگ ابو بکر جامی جون پور مین آئے اور اسعد الدین سالاری کی بیٹی کے ساتھ اون کی شادی ہوئی وہ صدیقی ہون غرض حقیقت حال اور غیب کا آگاہ خدا وند تعالے ہے۔ ہر صورت اس مقام پر ہم نسب نامہ اپنے خاندان آبائی کا موافق مشہورۂ قدیم کے جناب شیخ فیض بخش صاحب مرحوم کی کتاب سے نقل کرتے ہین اور جو انتساب ہمارے خاندان کو مخدوم زادون مین ہے اوس کو بموجب انکشاف کشف المتواری کے ہم نقل کرین گے۔ پس اول یہ ہے راقم عاصی مسیح الدین المخاطب بہ خان بہادر ابن قاضی علیم الدین خان بہادر ابن قاضی القضات قاضی نجم الدین خان بہادر ابن مولوی حمید الدین ابن مولوی غازی الدین ابن ملا محمد غوث ابن ملک ابو الخیر ابن ملک ابو العفا عرف ابو المکارم ابن ملک عبد السلام ابن ملک سیٹھے[1] ابن ملک چاند ابن ملک حسام الدین ابن

نسب آبائی موافق شہرت خاندان کی

[1] ملک سیٹھے اور ملک چاند دونو لقب ہین جو بسبب شہرت کے اسناد مین بھی لکھے گئے۔ اصل نام ان دونو بزرگون کے معلوم نہین ہوئے ۱۲ منہ

ملک نظام الدین ابن ملک بہاؔ الدین کیقباد - یہان تک ان بزرگون کے نام اسناد اور وثایق سے متحقق ہوے ہین اوس سے آگے موافق اشتہار قدیم دونون خاندان ملکزادون اور مخدوم زادون کے جن دونون خاندانون کا اتصال اسی پشت مین ہے یعنی بہاء الدین کیقباد ملکزادون کے جد اور نصیر الدین نصرت مخدوم زادون کے جد دونون حقیقی بھائی تھے بیٹے ابوبکر جامی کے ابن خواجہ درویش احمد ابن خواجہ احمد جام زندہ فیل ابن خواجہ ابی طالب ابن خواجہ محمد شاہ ابن خواجہ محمد رضا ابن خواجہ موسی ابن خواجہ عمران ابن خواجہ عثمان ابن خواجہ ابو حنیف ابن خواجہ اسفندیار ابن خواجہ ابو الحسن کوفی ابن خواجہ ابو تراب ابن خواجہ رضی الدین ابن خواجہ ابو القاسم ابن محمد حنفیہ ابن علی مرتضی سلام اللہ علیہ وکرم اللہ وجہہ - اور راقم کا انتساب مخدوم زادون کے خاندان سے دو وجہ سے معلوم ہے اور شاید کسی اور پشت سے بھی ہو کہ وہ معلوم نہین ہوا اول یہ ہے کہ راقم مسیح الدین ابن مولوی علیم الدین خان بہادر ابن قاضی القضات مولوی نجم الدین علی خان بہادر ابن جناب مولوی حمید الدین مغفور والدہ جدہ راقم کی والدہ مساۃ حیاتی بی بی بنت محمد حزم ابن محمد اکرم ابن محمد افضل ابن محمد اشرف ابن شیخ عبد القادر ابن شیخ شہاب الدین عرف سوندھے صاحب اور دوسری وجہ یہ ہے کہ راقم مسیح الدین ابن بی بی قطب النسا بنت بی بی شرفیت ہماری جدہ مادری کی والدہ بی بی ہدایت بنت شیخ حفیظ اللہ ابن امیر الرحمن ابن شیخ عصمت اللہ ابن شیخ عزیز اللہ ابن شیخ عبد الکریم ابن شیخ شہاب الدین عرف سوندھے صاحب اور شیخ شہاب الدین سوندھے صاحب ابن مخدوم نظام الدین قاری عرف شیخ بھیکھ یا شیخ بھکاری ابن قاری امیر سیف الدین ابن قاری امیر حبیب اللہ نظام الدین معروف بہ پیر کلان ابن قاری امیر نصیر الدین دلیل نعد ابن قاری محمد صدیق المعروف بہ ابو محمد خافی ابن قاری عبد اللہ ابن قاری عبد الصمد ابن قاری امیر شمس الدین خورد معروف بہ قاری محقق جامع جمع الجوامع کبیر لغت تفاسیر و احادیث ابن قاری عبد المجید دربان آستانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن حاجی الحرمین سلطان حسین ابن قاری امیر ابراہیم اور یہ قاری

نشان قلم راقم کا انتساب بطرف مخدوم نظام الدین قاری عرف شیخ بھیکاری [illegible]

امیر ابراہیم خلیفہ اور نواسہ حضرت سید عبد الرزاق خلف اور خلیفہ حضرت غوث الثقلین محی الدین گیلانی
قدس سرہ کے تھے اور ابن قاری سلطان عبد اللطیف ابن قاری امیر عبد اللہ خانی ابن مولانا
شمس الدین صابر ابن قاری مجید الدین خانی ابن قاری امیر سلیمان مفسر ابن مولانا وجیہ الدین احمد
ابن قاری محمد ابن قاری احمد ابن علی ابن محمد حنفیہ ابن جناب مستطاب امیر المومنین علی مرتضی
سلام اللہ علیہ و کرم اللہ وجہہ۔ اب انتساب ابنا عباسیہ کے خاندان مین لکھا جاتا ہے
یعنی راقم مسیح الدین ابن قطب النسا مغفورہ بنت شیخ غریب اللہ ابن شیخ محمد نوح ابن قاضی
محمد تقی ابن قاضی عبد الحلیم۔ اور جدۂ پدری راقم کی بنت شیخ محمد اسلم ابن قاضی محمد تقی ابن
قاضی عبد الحلیم۔ اور راقم کی جدہ مادری بنت بخشی رفعت اللہ خان ابن قاضی محمد واعظ ابن قاضی
حافظ ابن قاضی عبد الحلیم۔ تو تین واسطے قاضی عبد الحلیم کی طرف منتسب ہوئے

(نسب راقم الحروف از جانب عباسیوں کے خاندان کا)

ابن قاضی سعود ابن قاضی حسین ابن قاضی بایزید ابن مخدوم قاضی شیخ دانشمند ابن مخدوم
قاضی شیخ بہاء الدین ابن مخدوم قاضی شیخ کلان ابن مخدوم شیخ فضل اللہ ابن مخدوم شیخ
عنایت اللہ ابن مخدوم شیخ فخر الدین ابن مخدوم شیخ ابو البرکات ابن مخدوم شیخ طاہر ابن
مخدوم شیخ علی ابن مخدوم شیخ حسین ابن مخدوم شیخ منہاج الدین ابن مخدوم شیخ محمد ابن مخدوم
شیخ ضیاء الدین ابن مخدوم شیخ امین الدین ابن مخدوم شیخ کمال الدین ابن مخدوم شیخ مسعود
ابن مخدوم شیخ محمود ابن مخدوم صدر الدین حامد ابن مخدوم قاضی خواجگی ابن مخدوم احمد
ابن قاضی یحیے۔ ابن مخدوم قاضی علی ابن مخدوم قاضی احمد ابن مخدوم قاضی قاسم
ابن مخدوم قاضی عبد الملک ابن مخدوم قاضی احمد حاکم قلعہ ٹھٹھ ابن مخدوم ابراہیم ابن موفق ابن ابراہیم
ابن اسمٰعیل ابن محمد ابن علی ابن عبد اللہ ابن عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہان تک جو کچھ
اپنے حال مین مجھے لکھنا مقصود تھا وہ تمام ہوا۔

تمت

خاتمہ

مولوی سمیع الدین خان مرحوم کی خودنوشت آپ کے ملاحظے سے گذر چکی اون کی ایک دوسری تالیف تاریخ الخلفا اون کے فرزند رشید مولوی محمد اکرم الدین خان نے جو ریاست حیدرآباد مین اول تعلقداری کے عہدہ تک فائز ہوکر وظیفہ یاب ہوے ۱۳۱۵ھ مین مطبع بھیکاجی نارائن واقع اورنگ آباد دکن مین طبع کرائی تھی۔ اس کے شروع مین ۸ صفحہ پر اسی خودنوشت سے اخذ کرکے مولف کے مختصر سوانحی حالات اُنھون نے درج کیے تھے جس کے آخر مین یہ عبارت تھی:۔

"۲۴۔ دسمبر ۱۸۹۵ء کو آپ نے وطن مین معاودت فرمائی اور اپنا اکثر وقت تاریخ انگلستان (جس کا آخری جزو یہ خودنوشت ہے) کی تالیف مین جو نہایت نادر و مفید کتاب ہے اور حفظ کلام مجید مین صرف فرمایا قریب بین بائیس سیپارہ کے حفظ بھی کرلیے تھے۔ مگر علالت اور قضا نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔ اسی عرصے مین آپ کو چند دنون نواب ٹونک و رامپور کی مصاحبت مین بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

الغرض مولوی صاحب نے ابتداے سن شعور سے زمانۂ وفات تک اپنا وقت کبھی بیکار و رایگان نہین کیا۔ آپ کے تالیفات مین مفتاح الرشاد لکنوز المعاش والمعاد۔ اور جدول طلوع و غروب۔ اور تاریخ انگلستان اور شرح خطبۂ شقشقیہ۔ اور تاریخ الخلفا حالات خلفاے بنی امیہ و بنی عباس مین۔ اور تاریخ فارسی ہندوستان وادو ھریادگار ہین۔ آپ کے خیالات اگرچہ گذشتہ صدی کے بزرگوارون سے بالکل نئے اور علیحدہ تھے مگر

آپ اپنے مذہبی عقائد مین نہایت راسخ و مضبوط تھے جس کی تصدیق خود آپ کے کلام سے ہو سکتی ہے۔

۷۔ محرم ۱۳۰۹ھ مطابق ۳۰۔نومبر ۱۸۹۱ء کو آپ نے بعارضہ استسقا اس جہان فانی سے مقام کاکوری مین رحلت فرمائی۔ اللہ تعالے جناب ممدوح کو اپنے جوار رحمت مین جگہ دے۔"

تاریخ الخلفا جس زمانے مین لکھی گئی یا شایع ہوئی اوس وقت تو یقیناً بہت زیادہ قدر کے قابل تھی کہ غالباً اردو مین اوس سے پیشتر اس مبحث پر کوئی ایسی جامع کتاب نہین موجود تھی۔ لیکن اب بھی باوجودیکہ متعدد تالیفات و تراجم اس موضوع پر شائع ہو چکے ہین اوس کا مطالعہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اول تو لایق مولف نے اہتمام و تلاش سے عربی و فارسی کی قدیم تاریخون کا مطالعہ کرکے ضروری حالات اخذ کیے تھے۔ دوسرے تاریخی روایات کی تحقیق اور واقعات کے متعلق اظہار راے کا جہان تک تعلق ہے مصنف نے بہت آزادخیالی سے کام لیا ہے۔ البتہ موجودہ زمانہ زبان کی جس سلاست اور ترتیب مضامین کی جن خوبیون کا خوگر ہو گیا ہے وہ اوس مین نہ ملین گی۔ خدا کرے کہ مصنف کے اہل خاندان کی کوشش سے یہ کتاب دوبارہ زیور طبع سے آراستہ ہو جائے یا یہ سعادت بھی اس حقیر کی قسمت مین آئے۔

حال ہی مین مولوی حافظ محمد علی حیدر علوی کاکوروی نے "تذکرہ مشاہیر کاکوری" کے نام سے ایک بسیط کتاب شایع کی ہے جس مین کاکوری کے اکثر علما۔فقرا۔ شعرا۔امرا وغیرہ کے حالات درج ہین۔اس کے صفحات ۳۹۹-۴۰۳ مین مولوی مسیح الدین خان کا تذکرہ ہے۔ جو تمامتر اسی خود نوشت سے ماخوذ ہے۔ آخری عبارت جس مین تصانیف اور وفات کا ذکر ہے نقل کی جاتی ہے۔

"تصانیف ان کے حسب ذیل ہین :۔

(۱) مفتاح الرشاد لکنوز المعاش والمعاد فارسی مطبوع

(۲) جدول طلوع و غروب

(۳) تاریخ انگلستان مشہور بہ سفرنامۂ لندن - اردو غیر مطبوع - نہایت بے مثل تاریخ ہے

(۴) شرح خطبۂ شقشقیہ حضرت جناب امیر کرم اللہ وجہہ - غیر مطبوع -

(۵) تاریخ الخلفا اردو مطبوع -

(۶) تاریخ ہندوستان و اودھ - غیر مطبوع -

(۷) شرح مکتوب حضرت ابی بکر صدیق بنام حضرت علی - غیر مطبوع -

(۸) شرح الشرح رسالۂ نثر اللآلی غیر مطبوع

(۹) ضوابط ستہ غیر مطبوع - زبان فارسی کے اصول کے بیان مین -

انھون نے بمقام کاکوری بعارضۂ استسقا بتاریخ ۷ - محرم روز چہار شنبہ ۱۲۹۹ھ بعمر ۸۸ سال انتقال کیا - اور حظیرۂ خاندانی متصل چاند محل کاکوری مین دفن ہوے

قطعۂ تاریخ انتقال از مولوی محی الدین خان ذوق کاکوروی درصوری و معنوی

سال و ماہ فوت مولانا مسیح الدین خان | روز و تاریخیکہ رفت او جانب خلد برین

بین عیان زین مصرع و بگذار روئے اشتبا | یوم الاربعا وبدا ز ماہ محرم ہفتمین "

تاریخ الخلفا کا جو اقتباس پہلے درج ہوا اوس مین تاریخ انتقال ۷ - محرم ۱۲۹۹ھ ہجری مطابق ۳۰ - نومبر ۱۸۸۱ء ہے - یعنی سنہ ہجری غلط چھپ گیا ہے - مصرعۂ تاریخی کی شہادت قوی کے علاوہ صد سالہ جنتری دیکھی گئی تو ۳۰ - نومبر ۱۸۸۱ء عیسوی کو ۷ - محرم ۱۲۹۹ھ ہجری ہی سے مطابقت ہوتی ہے - ۷ - محرم ۱۲۹۸ھ تو ۱۹ - نومبر ۱۸۸۰ء کے مطابق تھی -

خود نوشت مطبوعہ کے صفحہ ۲ پر مصنف کے پردادا مولوی حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جس فارسی رسالہ کا ذکر ہے اوسے خود نوشت سے کوئی تعلق نہ تھا - اس لیے خارج کر دیا - انشاء اللہ العزیز یہ رسالہ علیحدہ چھپ جائیگا -

ظفر الملک - ۹ - اکتوبر ۱۹۲۸ء

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

فسانۂ عجائب
انشائے سرور ۶ر

امیر مینائی مرحوم

امیر اللغات نا مکمل
صنم خانۂ عشق
مرأۃ الغیب
محامد خاتم النبیین ۸ر
مینائے سخن
مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

سرمایۂ زبان اردو
مضمونہائے دلکش
نظم نگارین
رسالہ تذکیر و تانیث
قادۂ تاریخ
قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس [illegible]

فسانۂ نادر جہاں
پیاری سہیلی
[illegible]
[illegible]

منشی فضل حسین ثابت

[illegible]
[illegible]

پنڈت رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد ۴ جلد
سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلیٰ کے طرز کا ناول
کامنی
بچھڑی دلہن ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی
طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

مرزائی ۱۲ر
ماہ آستین ۱۲ر
بنگالی دلہن ۱۲ر
عشق فرنگ ۱۲ر
چترا [illegible] ۱۲ر
[illegible] ۱۰ر

پریم چند

پریم بتیسی
[illegible]

مولانا عبد الحلیم شرر

جنید بغدادی
خواجہ معین الدین چشتی
تذکرۂ مشاہیر عالم
مخدرات
قیس و لبنیٰ
مقدس نازنین
ایام عرب
فتح اندلس
ملک [illegible]
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور ۲ حصہ
الفانسو
مفتوح فاتح
فلپانا
زوال بغداد
لعبت چین
نیکی کا پھل
جویائے حق
بابک خرمی
طاہرہ
شوقین ملکہ
یوسف و نجمہ
گذشتہ لکھنؤ
شاعرانہ دماغ اور ... مضامین
آغاز و ختم سال
سیر رجال
تاریخی و جغرافی مضامین
مینا بازار

حکیم محمد علی خان مرحوم

رام پیاری کامل
عبرت کامل
حسن سرور کامل
اختر حسینیہ
نویل دیوی
جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ
نیرنگ جمال
گنجینہ
سیلفرڈ اور لوسی

خواجہ عبد الرؤف عشرت

زبان دانی
اصلاح زبان اردو
قواعد میر
اصول اردو
جان اردو
شاعری کی پہلی کتاب
دوسری کتاب
تیسری کتاب
لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

مجموعۂ کنشت
جام زہر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

یاد ایام
تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

تاریخ ابن خلدون جلد اول
〃 〃 دوم
〃 〃 سوم
〃 〃 چہارم
〃 〃 پنجم
〃 〃 ششم
〃 〃 ہفتم
〃 〃 ہشتم
〃 〃 نہم
〃 〃 دہم
〃 〃 یازدہم
سلطان صلاح الدین
نور الدین محمود

مولوی محمد علیم انصاری

الاسلام والنصرانیہ
فتح اندلس
ابو مسلم خراسانی
تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

سیرۃ الصدیق
علمائے سلف
تذکرۃ الشعراء [illegible]

حافظ اسلم جیراجپوری

سیرۃ الرسول
خلافت راشدہ
خلافت بنو امیہ
خلافت بنو عباس
عباسیۂ بغداد
علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

رحمۃ للعالمین
سفرنامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

اخبار الاندلس جلد
تاریخ مولدین
مختصر تاریخ اسلامی
عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

سیرۃ الرسول
تاریخ آل عثمان
حالات [illegible]
حالات قسطنطنیہ
تاریخ [illegible]

مفتی سجاد [illegible]

آئینۂ اکبری
حیات خسرو
امرائے ہنود

نوٹ: مہاتما بدھ کی مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۔۔ ۴ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم | مولانا حسرت موہانی | منشی احمد علی بی اے | مولوی سید سلیمان ندوی | خواجہ حسن نظامی | مولوی عبد الراشد الخیری

مولوی عزیز مرزا مرحوم
خیالات عزیز
دکن ہاردی

مولانا حسرت موہانی
شرح دیوان غالب
کلیات دیوان حسرت

منشی احمد علی بی اے
تاریخ تمدن
شباب لکھنؤ

خواجہ عباد اللہ اختر
صدیق اکبر
حضرت زید
مشاہیر اسلام
بغداد
دمشق
دیوان خواجہ شرح

سید سجاد حیدر بی اے
خیالستان
حکایات و احتساسات
زہرا
جلال الدین خوارزم شاہ

مولوی عبد الماجد بی اے
فلسفہ جذبات
مکالمات برکلے
پیام امن
تصوف اسلام
فلسفیانہ مضامین
زود پشیمان

مسٹر ظفر عمر بی اے
عورتوں کا کلب
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری
مستقبل اسلام

مفتی انوار الحق ایم اے
تاریخ ابو البشر
تذکرۃ الحبیب
حقائق اسلام

منشی محمد لطیف بی اے
اکبر
اورنگ زیب
رنجیت سنگھ
لارڈ کلائیو

پروفیسر فیروز الدین مراد
تحفہ سائنس
بادل کے پیچھے
خونابہ عشق

سید ولی اللہ بی اے
بندگی
کاس الکلام
لسان الغیب جلد اول
دوم
سوم
چہارم

پروفیسر نواب علی ایم اے
معارف الدین
تذکرۃ المصطفیٰ
صحف سماوی
شمع سخن

حکیم محمد شفاء علی بی اے
باپ کا گناہ
حسن کی قیمت

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

منشی عبد المجید سالک بی اے
جذبات فطرت حصہ اول
معارف ملت
مناظر قدرت
علم المعیشت

سید راس مسعود بی اے
نصاب اردو
جاپان کا تعلیمی نظم
تعلیمات

ماہ دیمبر
چھیا بیگم افسانے
چھیا بیگم

مولوی سید سلیمان ندوی
ارض القرآن
سیرۃ عائشہ
حیات امام مالک
خلافت عثمانیہ اور اسلام
خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
اسوۂ صحابہ جلد
سیرۃ عمر بن عبد العزیز
انقلاب الامم
تاریخ الحرمین الشریفین
تفرقے اسلام
فطرت نسوانی
شعر الہند جلد

مولوی عبد الباری ندوی
مبادی علم انسانی
برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
سیر الصحابہ جلد اول
سیر الصحابہ جلد
سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
اسوۂ حسنہ
کتاب الوسیلہ
لڑکی کی یاد

خواجہ حسن نظامی
قرآن آسان قاعدہ
میلاد نامہ
محرم نامہ
فاطمی دعوت اسلام
ذکر غوث پاک
کرشن جیون
شامی بہار
سیپارۂ دل
آکو موت
بیگمات کے آنسو / غدر دہلی کے افسانے
انالحق خطوط نویسی
روزنامچہ
بیوی کی تعلیم
بیوی کی تربیت
اولاد کی شادی
جگ بیتی کہانیاں
آپ بیتی
لوکی کہانیاں
سیر دہلی
سفرنامہ ممالک اسلامیہ
غدر دہلی کے افسانے
یزید نامہ
طمانچہ برخسار یزید
ابو دردائی
تسکین احساس
روزنامچہ ہند
اسلام کا انجام
مہر تقریر

مولوی عبد الراشد الخیری
النہار
صبح زندگی
شام زندگی
شب زندگی
نوحۂ زندگی
در شہوار
منازل السائرہ
سراب مغرب
بنت الوقت
قطرات اشک
جوہر قدامت
عروس کربلا
یاسمین شام
تیغ کمال
ماہ عجم
محبوب خداوند
سودۂ

نیاز فتح پوری
گہوارۂ / گلستان حلی
جذبات بھاشا
نگارستان
صحابیات
تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
چراغ سخن
نشتر یاس

تاریخ اندلس حصہ دوم / مرقعوں کے استقلال / مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزی دور کی حکومت کا آئینہ / خاندانی حالات

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ

۱۔ [illegible]

۲۔ [illegible]

۳۔ [illegible]

۴۔ [illegible]

۵۔ [illegible]

۶۔ [illegible]

۷۔ [illegible]